[redacted] اموزش

[redacted] شمارہ [redacted]] لاہور [جولائی ۱۹۵۲ء

اس شمارہ میں

مدیر : بشیر ہاشمی

معاونین : عبدالغفور چودھری
ایم - اے - عزیز

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

جولائی ۱۹۵۳ء

جلد ۶

شمارہ ۴

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور سے طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

تعلیمی مسائل

پاکستان کے وزیر اعظم عزت مآب جناب محمد علی صاحب نے حال ہی میں پریس کو ایک بیان دیا ہے ہمیں خوشی ہے کہ اس بیان میں آپ نے جہاں ملک کے بعض دوسرے اہم مسائل پر روشنی ڈالی ہے تعلیم کی اہمیت پر بھی زور دیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔

"میری حکومت ملک کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کی حتی المقدور کوشش کرے گی اسی لئے ہم نے اس مسئلے کو اور مسائل پر فوقیت دی ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کابینہ میں محکمہ تعلیم کے علاوہ وزیر معارف کے سپرد اور کوئی دوسرا محکمہ نہیں ہے ہماری تجویز ہے کہ ہم ملک کے تعلیمی نظام اور عوام کے خیالات و رجحانات اور ان کی تعلیمی ضروریات میں ہم آہنگی پیدا کریں اور ساتھ ہی ساتھ اسے اپنی ترقی و تعمیر کے لئے ایک مؤثر آلہ کار بھی بنا سکیں نیز اسے ایسے سانچے میں ڈھالیں جو ملک کی معاشی اور اقتصادی ضروریات کو پورا کر سکے اور بالخصوص سائنس اور ٹیکنیکل تعلیم کو فروغ دینے میں اس کی امداد ہمیں منزل کی طرف بڑھنے کی توفیق عطا کر سکے، اس لئے ملک کی تعلیمی ضروریات کا بالعموم اور کراچی کی بڑھتی ہوئی تعلیمی مانگ کا بالخصوص تفصیلی جائزہ لیا جا چکا ہے، اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ملک کے وسائل و ذرائع کے مطابق جلد سے جلد مناسب اقدام کیا جائے گا۔"

گزارش

ہمیں خوشی ہے کہ حکومت نے تعلیمی ضروریات کو محسوس کرتے ہوئے اس جگہ کو ایک ایسے مدبر کی نگرانی میں دے دیا ہے جو بحیثیت مدرس ایک مسلمہ شخصیت کے مالک ہیں، محترم جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی کو جامعی تعلیم و تدریس کا طویل تجربہ ہے، اس لئے اعلیٰ تعلیم کی توسیع و ترقی اور ضروریات کو ان سے بہتر سمجھنے والا کون ہو سکتا ہے، آج کل ہماری درسگاہوں میں توسیع ہو رہی ہے لیکن حق یہ ہے کہ اس توسیع میں تعلیم کے اونچے معیار کو اکثر فراموش کر دیا جاتا ہے اور کارکنوں کی قابلیت اور ان کے تبحر علمی کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا، اس لئے یہ درسگاہیں علم و حکمت کے سرچشمے بننے سے محروم رہ جاتی ہیں، آج اگر حکومت پاکستان صوبائی حکومتوں کی توجہ اس ضرورت کی طرف دلا کر انہیں آمادہ کار کر دے تو یہ بہت بڑی قومی خدمت ہوگی، کیوں کہ ان اعلیٰ درسگاہوں کو تو علم و فن کا مخزن ہونا چاہئے اور اسی سے ان کا ماحول خالی نظر آتا ہے، مرکزی حکومت کی اس توجہ اور دلچسپی سے کراچی کی وفاقی یونیورسٹی تو یقیناً فائدہ اٹھا سکے گی لیکن دوسری یونیورسٹیاں اس سے کماحقہ فیض یاب نہیں ہو سکیں گی۔

پچھلے پانچ سال سے ملک کے تعلیمی مسائل پر کافی غور و خوض کیا جا رہا ہے۔ ہمارے تعلیمی رجحانات کیا ہیں اور انہیں کیا ہونا چاہئے۔ ان تعلیمی مسائل پر ملک کے ماہرین تعلیم نے ایک مرتبہ نہیں کئی بار تعلیمی کانفرنسوں میں تبادلۂ خیالات کیا اور مختلف تعلیمی مسائل پر آزادی کے ساتھ گفتگو کی اور بے باکانہ انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا، اس لئے ہم آج یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ ان مذاکرات سے جو نتائج برآمد ہوئے معقول اور درست ہیں مگر کمی ہے تو انہیں عملاً ملک کے نظام کا دین جاری کرنے کی ہے، ہم نے اس سے پہلے بھی کہا ہے اور آج پھر اسی بات کو دہراتے ہیں کہ تعلیم کا کوئی دوامی نظریہ منظر عام پر نہیں لایا جا سکتا، اور نہ کوئی ایسا واحد نظام تعلیم ہی مرتب کیا جا سکتا ہے جو ملک کے طول و عرض کے لئے یکساں ہو اور ہر عہد میں اس کی ہمہ گیری مسلم ہو۔ تعلیم ایک متحرک اور بڑھنے والی قوت ہے جو ہماری زندگی اور معاشری ضروریات کے مطابق بڑھتی رہتی ہے۔ تعلیم اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اس لئے کسی تعلیمی نظریئے کو آخری اور حتمی کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ آج جس امر کا فیصلہ نہایت غور و خوض کے بعد کیا جا چکا ہے اور جسے تعلیمی ترقی و توسیع کے لئے مفید سمجھا گیا ہے، اس کی مدد سے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کرنی چاہیے، مانا کہ اس میں بہت سی خامیاں ہوں گی لیکن وقت

رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں ترمیم و تنسیخ اور اضافے بھی ہوتے رہیں گے، اور رفتہ رفتہ یہ خامیاں بھی دور ہو جائیں گی
ترقی پسند تعلیم کا مقصد اور ماحصل تجربہ ہی ہوتا ہے، اور ہمیں تجربات سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔

پچھلے دنوں ایک مغویہ نے ڈپٹی ہائی کمشنر برائے پاکستان متعینہ جالندھر کے پاس ایک طویل خط بھیجا۔ یہ خط پردرد بھی ہے اور افسوسناک بھی، اس مغویہ کا نام کرم بی بی ہے لیکن اب اسے نریندر کور کے نام سے پکارا جاتا ہے، کرم بی بی ایک ریلوے افسر کی بیٹی ہے جو ۱۹۴۷ء میں ہوگامیں تعینات تھا، ملک کی تقسیم کے بعد جو ہنگامہ شروع ہوا، اس میں کرم بی بی کو ہرکشن سنگھ نامی مدرس نے اغوا کرلیا۔ ہرکشن سنگھ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ کسی ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہے، اس مدرس کی عمر پچاس سال سے اوپر ہے، اور اگر ہم اس لڑکی کے بیان کو من و عن تسلیم کرلیں تو خجالت سے ہمیں اپنی نگاہیں نیچی کرلینی ہوں گی، ہرکشن نے جو کچھ کیا وہ ایک مدرس کے شایان شان نہیں، مذہبی عقائد سے قطع نظر یہ ہمارا ایمان ہے کہ مدرس کے آداب و اطوار اور ایک عام انسان کے عادات و خصائل میں نمایاں فرق ہونا چاہئے، اسے بحیثیت انسان اور زیادہ بلند و ارفع ہونا چاہئے کیونکہ اسکا کام صرف درس و تدریس ہی نہیں ہے، بلکہ اسے اپنی علمی فضیلت سے ہر اس شخص کو متاثر کرنا ہے جو اس سے متعلق ہو، اور اپنی قلبی سخاوت سے لطف و کرم کا وہ معیار قائم کرنا ہے جو دوسروں کے لئے نشان راہ بن سکے۔ آئیے آج ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں، اگر ہمارے دلوں میں نفرت کا ایک ہلکا سا شائبہ بھی موجود ہے تو اسے فی الفور دور کردینا ہمارا فرض ہے، ہم نے اس سے پہلے بھی لکھا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے پر آشوب زمانے میں بھی انسانیت بالکل مفلوج اور معطل نہیں ہوئی، بلکہ جود و سخا اور رحم و کرم کے بہت سے واقعات دیکھنے میں آئے، انسانوں نے انسان کی مدد کی، ہمیں ان واقعات کو ہمیشہ اپنی نگاہوں میں رکھنا چاہئے، تاکہ آپس میں نفرت بڑھنے نہ پائے، بلکہ محبت اور رواداری کی بنیادیں اور استوار ہو جائیں، ہم نے اس واقعے کا ذکر اس نظریئے سے کیا ہے کہ ان مثالوں سے ہماری آنکھیں ضرور کھل جائیں گی، اور ہم میں انسانی احترام اور انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔

احادیث نبوی میں مسئلہ نصاب

عبد الغفور چودھری

قواعد | عربی زبان کی حقیقت و ماہیت اور مسلمانوں میں کلام الٰہی اور احادیث کے تحفظ کی خواہش کی وجہ سے اس امر کی ضرورت پیدا ہوئی کہ قواعد اور اعراب کے اصول منضبط کیے جائیں۔ حضرت عمرؓ کے وقت تک مسلم افواج جزیرہ نما عرب کی حدوں سے آگے بڑھ چکی تھیں اور انہوں نے بہت سے غیر عرب ممالک کو فتح کر کے اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ سیاسی فتوحات کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور مذہبی فتوحات بھی عمل میں آئیں اور اسلامی فیضان کے سرچشموں کو ان عوام کے سامنے درست شکل میں پیش کرنے کی ضرورت خلفائے راشدین کے زمانہ میں شدت کے ساتھ محسوس کی جانے لگی۔ بدو بھی جو ریگستان کے وسط میں اپنے طرز کی ایک الگ زندگی بسر کیا کرتے تھے اعراب کے ادا کرنے میں دقت محسوس کرتے تھے۔ لیکن غیر عرب عوام کا مسئلہ اس کے مقابلہ میں زیادہ مرعوب کن تھا۔

ابی الاسود الدوالی کی سند پہ بیان کیا جاتا ہے۔

کہ ایک روز وہ حضرت علیؓ کے پاس گئے۔ جو بہت افسردہ اور مضمحل نظر آرہے تھے۔ ان کی بے چینی بہت محسوس ہو رہی تھی، اس لئے کہ انہوں نے کسی شخص کو غلط اعراب کے ساتھ قرآن پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ انہوں نے ابی الاسود سے کہا کہ میں نے عربی قواعد کے اصولوں پر ایک کتاب تالیف کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ابو الاسود نے اس خیال کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اس طرح آپ (حضرت علیؓ) زبان کو ایک نئی زندگی بخشیں گے، اور ان کے اس عمل سے زبان کا قیمتی سرمایہ محفوظ ہو جائے گا۔ جب وہ تین روز کے بعد وہ دوبارہ حضرت علی کے پاس گئے تو انہوں نے ان کو ایک کتاب دکھائی جس میں اسم فعل ا

حرف کی ترتیب کیسی ہوئی تھی۔ حضرت علی نے ابی الاسود کو ہدایت کی کہ وہ اس کام کو شروع کریں جنھوں نے اس میں حرف النصب کا اضافہ کیا۔ ایک دوسرے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت علی پہلے عالم تھے جنھوں نے اعراب کی علامتیں مقرر کیں۔

عربی زبان کی موثر تر تعلیم کے لئے اپنی مساعی اور اس کے متعلق عہد اسلامی کی پہلی صدی کے مسلمانوں کی خواہشوں کا اگر ہم تقابلی مطالعہ کریں تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس ملک میں یہ مسئلہ انوکھی دشواریوں سے پُر ہے۔ یہاں عربی زبان سیکھنے والوں میں متعدد تہذیبی اور لسانی گروہ ہونے کی وجہ سے یہ مسئلہ اور بھی پیچیدہ بن جاتا ہے۔ جب کبھی کسی معین پوری یا چینگا تک کے مسلمانوں کو فارسی آمیز اردو (ذریعۂ تعلیم) میں عربی زبان کے نحو کے ساتھ زور آزمائی کرتے ہوئے پایا جاتا ہے تو اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ اس ملک کے علماء کے طبقہ کو ہنوز ایک امر محال انجام دینا ہے اور عربی زبان سیکھنے والوں کے فائدہ کے لئے اردو اور ملک کی دوسری صوبائی زبانوں میں عربی کی ایک مناسب قواعد لکھنا ہے۔

ہمارے علماء کے طبقہ نے اسلامی قانون، علم مناظرہ اور ادب کے مطالعہ کے لئے جو گراں قدر اضافے کئے ہیں ان پر ہم بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آیا ہم اس کو عوام کے لئے ایک روحانی ترکہ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں یا یہ کہ ہم نے اوسطاً ایک مبتدی کو زبان پر عبور حاصل کرنے کے سلسلہ میں پیش آنے والی ابتدائی (نا ہموار ناقابل تسخیر) مشکلات کے حل کرنے میں کہاں تک مدد دی ہے۔ اور اس طرح سے اس زبان کو ملک کے روحانی ترکہ کے لئے ایک حقیقی اور موثر مبلغ میں تبدیل کر دیا ہے۔

کتابت (WRTING) اسلامی تعلیم کی تاریخ میں فن کتابت اور خطاطی کو بڑی عظمت حاصل ہے۔ مؤرخ کے لئے لفظ "قلم" ایک عجیب و غریب دلکشی کا حامل ہے، جس کی اصل اور تخلیق کی فوقیت کے بارے میں دلچسپ قصے بیان کئے جاتے ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق قلم اولین تخلیق

کنز العمال حصہ KNJUL حصہ پنجم صفحہ ۲۳۶ - ۲۳۹ (حیدر آباد اڈیشن)

میں ملتے ہے۔ اور قرآن کی ایک آیت ہے اقرا باسم ربك الذی خلق ہ خلق الانسان من علق ہ اقرا و ربك الاکرم ہ الذی بالقلم ہ علم الانسان مالم یعلم[۵۸] جس میں خدا نے فن کتابت کو اپنی منظوری اور پسندیدگی دی ہے۔ اور آدمی کے لئے اس کے استعمال کی تعریف کی ہے۔ مسلمانوں کی حمد و ثنا (DOXU-097) میں قلم بہت ہی متبرک نام ہے کیوں کہ کلام پاک میں یہ لفظ حلف کے طور پر استعمال ہوا ہے اور خدا کی ایک انتہائی شاندار حمد میں لکھا ہے کہ اگر روئے زمین کے تمام درختوں کے قلم بنائے جائیں اور تمام سمندروں کے پانی کی دوشنائی تو یہ تمام قلم اور روشنائی ختم ہو جائے گی لیکن خدا کی حمد و ثنا مکمل نہ ہو گی۔ ایک دوسری آیت میں آیا ہے نٓ والقلم وما یسطرون[۵۹]

اسلامی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس فن کی اہمیت قدیم زمانہ سے ہے۔ ایک قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک خبیث روح نے حضرت سلیمان سے تقریر کی نوعیت کے بارے میں دریافت کیا، انھوں نے جواب دیا کہ یہ (تقریر) ہوا کے ایک جھونکے کی مثل ہے، جب دریافت کیا گیا کہ اسے محفوظ کیسے کیا جائے تو انھوں نے جواب دیا کہ تحریر کے ذریعہ[۶۰]۔

ابتدا میں محض قرآنی متن کو تحریر کی شکل میں محفوظ کرنا اچھا سمجھا جاتا تھا۔ اس کا کچھ تو سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں چرمی کاغذ کی قلت تھی اور کچھ یہ خوف کہ کہیں احادیث کی طرح کا کوئی دوسرا ادب متن قرآنی سے خلط ملط نہ ہو جائے۔ لیکن جب تجربہ نے ثابت کر دیا کہ اس طرح کے خوف بے بنیاد ہیں تو احادیث کو لکھے جانے کی بھی منظوری آنحضرتؐ نے دے دی۔ مکہ کی فتح پر جب آپ نے اپنا خطبۂ فتحیابی پڑھا تو اس کے متن کو یمن کے ایک باشندے ابوشاہ کے لئے ضبط تحریر میں لائے جانے کی اجازت دے دی[۶۱]۔ آپ نے اس فن کی تعلیم کو رواج دیا اور ہر ممکن طریقہ سے اس کے سکھائے جانے کی حوصلہ افزائی کی۔ جنگ بدر کے قیدیوں سے وعدہ کیا گیا[۶۲]

---

۵۷ مفتاح السعادت، المستطرف باب "علم کی نقل"۔ ۵۸ سورۃ ۹۶ آیۃ ۴-۱ ۵۹ سورۃ ۶۸ آیۃ ۱
۶۰ مفتاح السعادت جلد اول صفحہ ۔ ۶۱ مسلم

کو اگر مدینہ کے باشندوں کو یہ فن سکھائیں تو انھیں آزاد کر دیا جائے گا۔ آنحضرتؐ کی ازدواج مطہرات میں سے ایک کو اس عہد کی ایک فاضل عورت نے لکھنا سکھایا۔

مسلم قانون میں غلاموں کو بہت سی سہولتیں دی گئی ہیں کہ وہ اپنے آقاؤں کو فدیہ دے کر آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ آزادی کے خواہاں غلاموں میں کتابت کا پیشہ عام تھا حضرت عائشہؓ کا آزاد کیا ہوا ایک غلام تھا جس نے اپنی مالکہ کے لئے قرآن نقل کیا تھا[1]

بیرون عرب کے ممالک سے جب تعلقات بڑھے تو تجارتی دستاویز کا مرتب کرنا اس وقت کی معاشی زندگی کا ایک اہم کام بن گیا۔ اور فقہ کی تمام کتابوں میں بلا استثناء ایک باب کتابت پر ضرور ہوتا ہے وصیت نامے کی دستاویز روزمرہ کی کاروباری زندگی کا ایک جزو تھیں۔ اور ہمارے پاس اس کی معتبر شہادت موجود ہے کہ آنحضرتؐ نے بستر مرگ پر اپنی امت کے لوگوں کے لئے ایک تحریری وصیت نامہ چھوڑنے کے واسطے لکھنے کا سامان منگایا تھا[2] آپؐ نے اپنے ہم عصر سلاطین اور دوسرے لوگوں کے نام جو مکتوب تحریر کئے تھے، وہ اب بھی احادیث کے مجموعوں اور اسلامی تاریخ کے رسالوں میں موجود ہیں۔

زرنوجی نے ہلال بن یاسر سے ایک روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ آنحضرتؐ کو اپنے صحابیوں سے علم و دانش کے مسئلہ پر تبادلہ خیالات کرتے دیکھا وہ آپؐ کے نزدیک گئے اور پوری مستعدی کے ساتھ استدعا کی کہ مجھے بھی آپ کی دانش مندانہ گفتگو سے مستفیض ہونے کا موقع دیا جائے۔ آں حضرتؐ نے ان سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے پاس قلم اور روشنائی ہے اور اس کا ثواب تمہیں ملتا ہے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ دوات کو یکطرف نہ کریں، کیوں کہ دوات روز قیامت اس کے تمام کارناموں پر محیط ہوتی ہے[3]

کسی جگہ ہم نے احادیث میں آئے ہوئے اس مقابلہ کا تذکرہ کیا ہے جو اکثر ایک استاد اور شہید کے درمیان کیا جاتا ہے، ایک حدیث کی رو سے قیامت کے روز عالم کی روشنائی کو

[1] ترمذی باب درمیان تفسیر قرآن [2] بخاری حصہ ۱۰۶ [3] صفحہ ۲۵

آخذش

شہید کے خون کے مقابلہ میں میزان پر رکھا جائے گا اور حسن بصری کے قول کے مطابق روشنائی کا یہ خون سے بھاری ہوگا [1]

آنحضرت کا عہد انسانی تعلقات اور روابط کا عہد تھا جس میں تقریر کو تحریر پر فتح حاصل تھی علم کی ابتدا اور اشاعت زبان سے ہوتی تھی، اور اگر الفاظ پر جوش تقریر کی شکل میں نہیں ہوتے تھے یا ان کا بیان خوش آئند نہیں ہوتا تھا تو ان کا کافی حسن زائل ہو جاتا تھا۔ یہ امر باعث حیرت ہے کہ اسلام کے ظہور کے بعد باوجود اس کے کہ چمڑی کاغذ کی زبردست قلت تھی۔ لکھنے کا رواج بڑی افراط سے عمل میں آگیا اور امام شافعی اور ابو یوسف کے زمانہ میں جو ظہور اسلام کے بہت بعد کا زمانہ ہے لوگ لکھنے کے لیے ہڈیاں اور سفال استعمال کرتے تھے۔

ایک حدیث ہے جس میں صاحب ایمان کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ علم کو تحریر کے ذریعہ محفوظ کر لے [2] لکھنے کے رواج میں یقیناً کسی حد تک شدت پیدا ہو گئی اور آپ کے چند صحابیوں نے علم کو قابل تحسین طور پر محفوظ کیا۔ ابو ہریرہؓ کے ایک بیان کے مطابق سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ کو جو احادیث کو ضبط تحریر میں لایا کرتے تھے۔ احادیث کے بارے میں زیادہ علم تھا بہ نسبت ابو ہریرہؓ کے جو احادیث کو یاد کر لیا کرتے تھے۔ آنحضرت نے ایک صحابی کو اجازت دی تھی کہ ... آپ جس چیز پر بھی بحث کریں وہ اسے تحریر میں لے آئیں۔ یہ کام (موجودہ زمانے کے) سٹینوگرافر کے کام سے تقریباً ملتا جلتا ہے۔ آنحضرت نے اس سلسلہ میں دوسرے لوگوں کے تمام اعتراضات کو مسترد کر دیا تھا [3] ایک عالم کا قول ہے کہ جو شخص علم کو تحریر میں نہیں لاتا اس کا شمار عالموں میں نہیں ہوگا۔ خلیل بن احمد کا قول ہے کہ وہ کبھی کوئی بات ایسی نہیں سنتے تھے جسے لکھ نہ لیتے ہوں اور کوئی بات ایسی نہ لکھتے تھے جسے یاد نہ کر لیتے ہوں اور کوئی بات ایسی یاد نہ کرتے تھے جس سے کوئی فائدہ نہ حاصل کرتے ہوں [4]

حسام بن عروا کے مسودات آتشزدگی کے روز تباہ ہو گئے تھے۔ ان کو جب اس حادثے کی اطلاع ملی تو چیخ کر بولے "کاش میں بھی اپنی اولاد اور ملکیت کے ساتھ تباہ ہو گیا ہوتا" عمر بن عبدالعزیز

---

[1] قصیدہ جلد اول حصہ اول [2] المختصر باب علم کے نقل کئے جانے کے بارے میں [3] ابی داؤد جلد اول صفحہ ۵۸ ، [4] المختصر۔

کے وقت تک یہ فن بہت عام ہو گیا تھا اور تحریری مواد اتنا وافر تھا کہ مذہبی قوانین کی پوری پوری نقلیں نقل کی گئیں اور مسودات ان کے مستورات کے مختلف صوبوں میں بھیجے گئے۔

بہت سے احکامات (INJUNCTIONS) ایسے ہیں جن میں تحریر کے ایک واضح، بے باک اور پرشکوہ انداز بیان کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ حضرت علی ایک بصیرت افروز خطبہ میں اسی چیز کو اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں "قلم کو روشن کرو کیوں کہ اسے خدا نے روشن کیا تھا" ایک دوسرے موقع پر انہوں نے کہا کہ تحریر نشانات (SYMBOLS) کو پیش کرتی ہے، اس لئے یہ جتنا بھی واضح ہو گی اتنا ہی (ان نشانات کے) مطابق ہو گی۔ انھوں نے تحریر میں حسن اور شکوہ کی تعریف کی ہے کیوں کہ اس سے تحریر کی قوت اظہار میں اضافہ ہوتا ہے۔

حضرت علی نے فن تحریر کے بارے میں جو ہدایات کی ہیں ان سے نہ صرف اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان کو علم سے زبردست محبت تھی بلکہ اس کا بھی کہ وہ فن کی صحیح اور خوبصورت طریقہ سے اشاعت کی زبردست خواہش رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی ہدایات میں جن باریک ترین تفصیلات کا اضافہ کیا ہے وہ موجودہ زمانہ کے کسی بھی تعلیم داں کے لئے باعث شہرت ہو سکتے ہیں اور ایک سیندی کے لئے آج بھی اتنا ہی مفید ثابت ہوں گے جتنا کہ تیرہ سو سال قبل آپ قلم کی تراش کو لمبا اور چوڑا اور قط کو دائیں جانب جھکا ہوا پسند کرتے تھے، آپ نے حروف تہجی لکھنے کے بارے میں جو ہدایات کی ہیں وہ شکل۔ آواز اور حرکت کی ہم آہنگی کا ایک خوش گوار مجموعہ ہیں۔ مثال کے طور پر آپ قلم کی اس چرچراہٹ سے جو حرف "نون" کی آخری کشش کو پورا کرتے وقت پیدا ہوتی ہے۔ یا "لام" کے دائرہ کو بناتے ہوئے قلم کی آہستہ آہستہ حرکت یا "با"، "تا" اور "طا" وغیرہ لکھتے وقت قلم کی مضبوط اور زیادہ مستحکم گرفت سے بہت لطف اندوز ہوتے تھے ایک عالم کی رائے میں تحریر انسان کا ایک امتیازی فعل (FUNCTION) ہے جس کی مدد سے اس کی فطری صلاحیتوں کو عمل کے ذریعہ اظہار کا موقع ملتا ہے، کاروباری معاملات اور معاشرتی

ے (حصہ پنجم صفحہ ۴۴ - ۲۴۳ باب در بیان علم

زندگی کے لیے ... موسیقی آلہ کار، حسن اور موزونیت کی اس محبت کا اظہار کا ذریعہ بن گیا تھا جس نے قوم کے فن کارانہ تحرکے میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ خطاطی کے ان عظیم الشان شاہ کاروں کا جو فن کے آزادی اور جمالیاتی ... میں ایک خوشگوار ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں، آں حضرت کے وقت کا کوفی رسم الخط اپنی سیدھی لکیروں اور بے لوچ دائروں کے ساتھ فن کارانہ اظہار کے لئے کافی نہیں تھا۔ لیکن بعد کے ماہرین فن نے خطاطی کے ان عظیم الشان مدرسوں کی بنیاد ڈالی جنھوں نے مکتب کے بچوں کے لئے اظہار کا ایک نیا اور نسبتاً آسان راستہ کھول دیا جو بعد کو دوسری زبانوں (MEDIA) میں فن کارانہ اظہار کے لئے ایک ابتدائی منزل بن گئی۔

علم حساب

آنحضرتؐ نے قانون وراثت (علم الفرائض) کے صحیح علم پر بہت زور دیا ہے اور ابو ہریرہؓ کے قول کے مطابق اپنی امت کے لوگوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اس علم کو خود بھی سیکھیں اور دوسروں کو سکھائیں، کیوں کہ شریعت کا ایک نصف اس علم پر مشتمل ہے[1]، آپ نے مزید بتایا ہے کہ قانون وراثت، علم (LEARNING) کی پہلی شاخ ہے جو برے دن آنے پر آپ کی امت سے چھین لیا جائے گا، ایک دوسرے موقع پر آپ نے پیشین گوئی کی ہے کہ آپ کی امت پر کچھ دن اس وقت آئیں گے جب وہ مال و دولت سے دوستی کر لیں گے اور حساب بھول جائیں گے[2]

ایک مستند ذریعہ سے علم وراثت کی تعریف یوں کی گئی ہے۔ علم کا وہ شعبہ (BRANCH) جس میں فقہ اور حساب کے بنیادی اصولوں پر بحث ہوتی ہے اور کسی خاص ترکہ میں اس کے دعوے داروں کے حصوں کی تعیین ہوتی ہے آنحضرت نے صاحب ایمان کو جب قانون وراثت سیکھنے کی تاکید کی تو وہ دراصل علم حساب کی موافقت میں ایک مذہبی فیصلہ دے رہے تھے، آپ نے ایک اور جگہ اعلان کیا کہ مذہب کا علم تین چیزوں پر مشتمل ہے، اور ان میں سے آخری وراثت کے ایک منصفانہ قانون کا علم ہے جو ان میں سے کسی سے کم اہم نہیں ہے[3]

---

[1] ابن ماجہ، [2] ابن حجر عسقلانی صفحہ ۴۱، [3] ابی داؤد، باب در بیان قانون وراثت۔

آنحضرت کاروباری زندگی میں اپنی عمر کے اوائل ہی میں داخل ہو گئے تھے اور کفارِ مکہ نے آپ کے ساتھ جو طعن آمیز تمسخر کئے تھے ان میں سے بدترین وہ تھا جب ایک شخص نے جو دوسروں کی طرح کھاتا تھا اور عامیوں کی طرح سرِ بازار پھرا کرتا تھا نبوت کا دعویٰ کیا۔ غالباً وہ شخص حساب کے آسان ترطریقوں میں اچھی دست گاہ رکھتا تھا، وراثت کے موضوع پر کتابوں میں متعدد مقدمات پائے جاتے ہیں جن کا فیصلہ آنحضرت نے جائے وقوعہ پر ہی کیا تھا، اور ان سے اس امر کا ثبوت بہم پہونچتا ہے کہ آپ کو حساب اور تناسب اور اربعۂ متناسبہ (RATIO AND PROPORTON) کے قاعدوں کا اچھا علم تھا۔

مسلمانوں نے بہت پہلے سے ریاضی کی طرف ایک پراسرار مستعدی کا اظہار کیا ہے اور ان کے چند کارنامے اتنے غیر معمولی تھے کہ انھوں نے اپنے عہد کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا۔

خواہر زادہ اپنی شرح میں لکھتے ہیں کہ حضرت علی کو حیرت انگیز طور پر اعداد پر عبور حاصل تھا۔ ایک مرتبہ ایک عیسائی نے آپ سے پوچھا کہ اصحابِ کہف کی غنودگی کے عرصہ کے متعلق قرآن اور شریعت موسوی میں جو اختلاف پایا جاتا ہے، اس کا کیا سبب ہے، قرآن کے مطابق یہ عرصہ تین سو نو سال ہے، اور انجیل کے مطابق تین سو سال، حضرت علی نے ایک لمحہ بھی تامل کئے بغیر بتایا کہ یہ اختلاف پیمائش وقت کے دو مختلف طریقوں کے رواج کی بنا پر ہے، ایک صورت میں طریقہ شمار قمری اور دوسری صورت میں شمسی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں علم وراثت کی استعداد کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور جو اس علم کو جانتا تھا اس کو اپنے ہم مرتبہ لوگوں میں بڑی عزت حاصل ہوتی تھی، حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ اطلاع ملی کہ کسی قبیلہ نے ایک آزاد کئے ہوئے غلام کو اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے، آپ کو ان کے اس انتخاب پر بڑی حیرت ہوئی۔ لیکن ان لوگوں نے اس انتخاب کو یہ کہہ کر حق بجانب ٹھہرایا کہ وہ قرآن خواں، قانونِ وراثت کا ماہر اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے صاحبِ انصاف شخص تھا [1]

[1] ابن ماجہ ( )

ریاضی کے تعلیموں کی نہ صرف وارثوں کے حقوق کے تعین کے سلسلے میں ضرورت پڑتی تھی بلکہ وہ معاشرتی اقتصادی زندگی کے پورے دائرہ پر محیط تھے۔ روزمرہ کے کاروباری معاملات۔ خرید و فروخت، ہنڈی یا چیک سب میں ریاضی کی استعداد کی ضرورت پڑتی تھی۔ اور حضرت عمر شریعت کے قوانین پر عمل درآمد کرنے میں اتنے مستعد تھے کہ انھوں نے اپنے لوگوں کو مطلع کر دیا تھا کہ اگر انھوں نے خرید و فروخت کی بابت مذہبی احکامات نہ معلوم کیے تو کوڑے لگائے جائیں گے پس ابن دوام کا مقولہ ہے کہ "اپنے بیٹے کو کتاب شروع کرانے سے قبل حساب سکھاؤ۔" عہ

عہ جلد دوم صفحہ ۱۴۹

ذہنی خارج قسمت کی
عدم استواری

فضل احمد

ذہانت کیا ہے؟

انسان کو دوسرے پست حیوانات پر صرف اس لئے شرف حاصل ہے کہ قدرت نے اسے ان سب سے زیادہ اور بلند پایہ قوت شعور عطا کی ہے۔ اس قوت شعور کو عرف عام میں سوجھ بوجھ یا ذہانت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مگر اس ذہانت کی اصل ماہیت کیا ہے یہ وہ سوال ہے جس کا تسلی بخش جواب دینے کے لئے ماہرین نفسیات نے بڑے جتن کیے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اب تک ذہانت کی کوئی ایسی تعریف نہیں کی جاسکی جو خالص سائنسی نقطۂ نگاہ سے تسلی بخش کہی جاسکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوجھ بوجھ ایک ایسا وصف ہے جسے صرف اطوار و کردار کی شکل میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ہم سمجھ کی پہچان میں صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ سمجھ دار آدمی کی حرکات و سکنات اور اس کا عام رویہ فلاں قسم کا ہوگا۔ وہ فلاں موقع کو فلاں طریقے سے نبا ہے گا۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا محال ہے۔ ظاہر ہے کہ خالص علمی نقطۂ نظر سے سمجھ کی یہ تعریف تسلی بخش نہیں، سمجھ ایک ایسا لطیف انسانی جوہر ہے جو تول ناپ کے کسی پیمانے کا شرمندۂ احسان نہیں اور چوں کہ ناپے تولے بغیر کسی چیز کے متعلق قطعی وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے اس لئے ماہرین نفسیات کو اس میدان میں ہار مانے بغیر چارہ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ سمجھ کی عام ظاہری علامات کا تجزیہ کرکے ان میں سے زیادہ بنیادی علامتوں کو اس کے وجود کی شہادت قرار دیں۔ یہ طریق کار عام عملی ضرورتوں کے لئے کافی ہے تاہم اس کے بنیادی علمی سقم کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

یوں تو ذہانت کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں۔ مگر اب سب کو تین بڑے گروہوں میں تقسیم

کیا جا سکتا ہے۔

(۱) شروع شروع میں ذہانت کو قوتِ متخیلہ کے مترادف خیال کیا جاتا تھا۔ فکر و نظر کی باریکی اور تخیل کی بلند پروازی سمجھ کی سب سے بڑی شناخت تھی۔ مگر اس نقطۂ نگاہ کی واضح خامی یہ ہے کہ اس کی رو سے تمام کم عمر بچے سوجھ بوجھ سے کورے قرار پاتے ہیں اور خود بالغ لوگوں کے بیشتر افعال بھی سوجھ بوجھ سے خالی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

(۲) مندرجہ بالا نقطۂ نگاہ کی عدمِ کفایت کو پورا کرنے کے لئے ذہانت کو اخذ کرنے کی قوت قرار دیا گیا۔ یعنی جس قدر جلد کوئی شخص کسی علم، ہنر یا طریقِ کار کو اخذ کرتا ہے وہ اسی قدر زیادہ ذہین ہے بظاہر یہ تعریف کافی تسلی بخش نظر آتی ہے مگر ذرا غور سے دیکھئے تو اس میں بعض خامیاں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اخذ کرنے کی قوت جانوروں میں کافی حد تک موجود ہے، صرف یہی نہیں بلکہ نباتات اور جمادات تک میں اس ملکہ کے آثار نظر آتے ہیں۔ مثلاً پودے کا جھکاؤ روشنی کے منبع کی طرف ہوگا۔ اگر روشنی کا منبع کسی وجہ سے اپنی سمت بدل لے تو پودا بھی اپنا جھکاؤ تبدیل کرے گا۔ اسی طرح اگر استرے کو کچھ دیر تک استعمال میں نہ لایا جائے تو وہ تیز ہو جائے گا۔

(۳) تیسرا اور جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ سمجھ اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھالنے کا نام ہے۔ جس قدر جلد اور زیادہ وقار، اعتماد کے ساتھ کوئی شخص اپنے آپ کو تبدیل شدہ حالات پر قابو پانے کے قابل پاتا ہے اسی قدر وہ سمجھ دار ہے۔

سمجھ کی یہ تینوں توضیحیں مختلف دوروں کے تعلیمی نظریوں کا ساتھ دینے کے لئے وضع کی گئی ہیں۔ آخری توضیح دورِ حاضر کی تعلیمی اور نفسیاتی تحقیقات سے زیادہ قریب ہے۔ تاہم جیسا پہلے کہا جا چکا ہے۔ اس کی نوعیت محض عملی ہے۔ علمی نہیں۔

ذہانت کی پیمائش

ذہانت ہر چند گریز پا اور لطیف ہی مگر اس کے وجود سے کسی کو انکار نہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی مسلم ہے کہ یہ جوہر سب کے حصے میں یکساں نہیں آیا۔ بعض افراد دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ ذہانت کی یہ عدم مساوات

صرف انسان تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ حیوانات میں بھی بعض افراد دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ سیانے نظر آتے ہیں۔ بہرصورت مختلف افراد کی ذہنی استعداد کا فرق پرانے زمانوں سے مسلم چلا آتا ہے۔ چوں کہ انسانی امور کو اچھی طرح سرانجام دینے کے لئے سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے، اس لئے ذہانت کو ہمیشہ ایک قابل فخر وصف قرار دیا گیا ہے اور عموماً اس کی نشوونما کو ضروری خیال کیا گیا ہے۔

قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ میں عوام کی ذہنی استعداد کسی خاص گنتی میں نہ تھی۔ سیاست اور ریاست کے اہم امور ایک مخصوص طبقہ سے متعلق تھے، اس لئے صرف اسی طبقہ کے نونہالوں کی ذہنی آبیاری ضروری خیال کی جاتی تھی، مگر دور حاضر نے اس امتیازی مراتب کا بڑی حد تک خاتمہ کر دیا، قومی اور ملکی امور میں عوام کے مشورہ کو ضروری خیال کیا جانے لگا۔ تعلیم عام ہوئی اور اس کے ساتھ قدرتی طور پہ طلبہ کی ذہنی استعدادوں کا جائزہ لینا ضروری خیال کیا جانے لگا، چوں کہ یہ دور عوامی دور ہونے کے علاوہ سائنس اور ٹکنالوجی کا دور بھی ہے، اس لئے ہر شے کے ابعاد ثلاثہ متعین کرنے کی دھن عام ہو، چنانچہ ذہانت کو تولنے ناپنے کی کوششیں بھی ہونے لگیں۔

ذہنی پیمائش کے تصور کو فروغ دینے والا پہلا شخص فرانسیسی عالم الفریڈ بینے ہے۔ بینے کی تعلیم بطور ایک طبیب اور وکیل کے ہوئی تھی ۱۹۰۴ء میں فرانسیسی وزارت تعلیم نے ایک کمیشن اسی مطلب کے لئے مقرر کیا کہ ضعیف العقل طلبہ کو عام طلبہ میں سے پہچاننے کے لئے طریقے وضع کئے جائیں تاکہ ان کے لئے الگ انتظام کیا جا سکے۔ بینے اس کمیشن کا ایک رکن تھا اس نے بڑی کاوشوں اور تجربوں کے بعد بعض آزمائشیں وضع کیں جنکی مدد سے طالب علم کی ذہنی عمر کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں، صرف یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ ہر عمر کے اوسط بچوں کے وسیع مشاہدہ کے بعد اس خاص عمر کے لئے بعض ایسے کام چنے گئے جو اس عمر کا ہر اوسط بچہ بخوبی کر سکتا تھا یہ کام اس عمر کی آزمائش کے اجزا قرار پائے۔ اس طرح بینے نے مختلف عمروں کے بچوں کے لئے مختلف آزمائشیں وضع کیں۔

ہر آزمائش ایک ذہنی عمر کی آئینہ دار تھی۔ مثلاً جو آزمائش آٹھ برس کے بچوں کے لئے تیار کی گئی

وہ آٹھ برس کی ذہنی عمر کی دلیل تھی۔ اگر کوئی سات سالہ بچہ اس آزمائش میں کامیاب ہو جائے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ گو اس کی عمر سات سال ہے مگر اس کی ذہنی عمر آٹھ سال ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی نو سالہ بچہ۔ نو سالہ آزمائش کی بجائے صرف آٹھ سالہ آزمائش میں ہی پورا اترتا تو اس کی ذہنی عمر بھی آٹھ سالہ ہی قرار پاتی بنے نے ان ذہنی آزمائشوں کو معیاری بنانے کے لئے کافی محنت کی۔ اور ایک مرتبہ ان پر نظر ثانی بھی کی۔ مگر عمر نے زیادہ وفا نہ کی، اس لئے ۱۹۱۱ء کے بعد اسے پھر نظر ثانی کی مہلت نہ ملی۔ تاہم ذہنی پیمائش اور ذہنی عمر کے تصورات عملی دنیا میں روشناس ہو چکے تھے اور بنے کا کام اس کے بعد دوسرے ملکوں میں دوسرے عالموں کے ہاتھوں پروان چڑھا۔

ذہنی خارج قسمت

بنے کی بیش قیمت تحقیقات کو یوں تو تمام ترقی یافتہ ملکوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مگر اس ضمن میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا فخر اضلاع متحدہ امریکہ کو حاصل ہے۔ اول اول گوڈارڈ نے بنے کی آزمائشوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور وائنلینڈ اسکول کے ضعیف العقل طلبہ پر اس کا تجربہ کیا، چوں کہ مترجم نے آزمائشوں کو امریکی ثقافتی رنگ میں رنگنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی، اس لئے یہ کوشش زیادہ مقبول نہ ہوئی۔ چند سال بعد پروفیسر ٹرمین نے ان آزمائشوں کا ایک نیا چربہ تیار کیا، جو خالص امریکی ماحول سے بھرپور ہے۔ ٹرمین کی تیار کردہ یہ آزمائشیں جو اسٹینفورڈ بنے کے نام سے موسوم ہیں، بہت مقبول ہوئیں۔

یہ ذکر پیچھے گذر چکا ہے کہ بنے نے طلبہ کی ذہانت کو ناپنے کے لئے ذہنی عمر کا آلہ ایجاد کیا تھا۔ ٹرمین نے اس میں کچھ اور ایزادی کر کے ذہنی خارج قسمت وضع کیا۔ ذہنی خارج قسمت دراصل ذہنی عمر اور اصل عمر کی باہمی نسبت کا نام ہے، ذہنی عمر کو اصل عمر پر تقسیم کیا جاتا ہے اور اعشاریہ کو دور کرنے کے لئے حاصل شدہ کسر کو ۱۰۰ سے ضرب دے دی جاتی ہے۔

$$\text{ذہنی خارج قسمت} = \frac{\text{ذہنی عمر}}{\text{اصل عمر}} \times ۱۰۰$$

ایک مثال سے اس کی مزید توضیح ہو جائے گی۔ فرض کیجئے کہ ذہنی آزمائش میں ایک ۸ سالہ بچے کی ذہنی عمر ۱۰ سال نکلی۔ اس کا ذہنی خارج قسمت $\frac{۱۰}{۸}$ × ۱۰۰ یعنی ۱۲۵ ہوگا، یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہوگی کہ ایک اوسط طالب علم کا اوسط ذہنی خارج قسمت ۱۰۰ ہوگا۔

امریکہ میں ذہنی خارج قسمت کی مقبولیت

ٹرمین اور اس کے ساتھیوں کے تجربوں نے ذہنی خارج قسمت کو امریکہ کے تعلیمی حلقوں میں بے حد مقبول بنا دیا۔ پہلی جنگ عظیم میں امریکی فوجی حکام کو وسیع پیمانہ پر ذہنی آزمائشوں سے کام لینا پڑا، اور اس طرح ماہرین نفسیات کی ایک بڑی جماعت کو اس کام میں عملی تربیت مل گئی۔ جنگ ختم ہونے پر یہ ماہرین ملک کے تعلیمی اداروں میں پھیل گئے، اور مدرسوں کالجوں اور فنی اور صنعتی درسگاہوں میں موزوں طلبہ کے انتخاب کے لئے ذہنی آزمائشوں کا عام رواج ہو گیا۔ اس توجہ کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ذہنی آزمائشوں کے بارے میں طرح طرح کے تحقیقاتی مطالعے شروع ہوئے اور اس طرح ان کا دائرہ عمل متواتر بڑھنے لگا۔ بینے نے جو آزمائشیں وضع کی تھیں وہ چھ سال کی عمر سے پیچھے نہ جاتی تھیں۔ اب کوئی دو سال سے لے کر ۲۰ سال کی عمر کے لئے آزمائشیں تیار ہو گئیں۔

ذہانت کی پیمائش کے سلسلے میں تعلیمی دنیا نے جس غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ عوام نے ذہنی خارج قسمت کو تھرمامیٹر کی طرح ایک بے خطا پیمانہ خیال کرنا شروع کر دیا۔ ایسا پیمانہ جو مخفی جبلی صلاحیتوں کی پیمائش کر کے بچے کی ترقی کے امکانات کا صحیح صحیح پتہ دے سکتا تھا۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کی دہائی ذہنی خارج قسمت کی ہمہ گیر مقبولیت کا زمانہ ہے۔ والدین اور معلموں نے اونچے ذہنی خارج قسمت کے ساتھ بڑی بڑی امیدیں باندھنی شروع کیں، ان غیر معمولی ذہانت کے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی گئی اور ان کی زمانہ مابعد تعلیم کی زندگیوں کا دلچسپی سے مطالعہ کیا گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ضعیف العقلی کو ختم کرنے کے لئے ہزاروں ضعیف العقل انسانوں کو اولاد پیدا کرنے کے ناقابل بنا دیا گیا۔

افسوس کہ واقعات اور تحقیقات کے نتائج نے ذہنی خارج قسمت کی اس ہمہ گیر سلطانی کے طلسم کو

بہت جلد توڑ دیا۔ ٹرمین اور دوسرے لوگوں نے غیر معمولی ذہانت کے چند گروہوں کا لگاتار کئی سال تک مطالعہ کیا اور انہیں بالآخر مایوسی سے یہ کہنا پڑا کہ ان کی بلند امیدیں پوری نہیں ہوئیں اور ان نوجوانوں نے عملی زندگی میں اپنے سے کوئی غیر معمولی امتیاز پیدا نہیں کیا۔ ٹرمین اور اس کے ساتھیوں نے تو یہاں تک کہہ دیا جہاں تک عملی زندگی کی کامیابی کا تعلق ہے ۱۴۰ یا ۱۵۰ سے اوپر ذہنی خارج قسمت کی ایزادی اس کامیابی کے ساتھ کچھ تعلق نہیں رکھتی۔ کامیابی کے لئے ذہانت کے علاوہ معاشرتی ہم آہنگی اور جذباتی توازن اور جذبۂ پیش قدمی کی بھی ضرورت ہے، اس لئے محض ذہنی خارج قسمت کو دیکھ کر کوئی پیش گوئی کرنا محال ہے۔

غرض ذہنی خارج قسمت کے بارے میں علمی رائے میں جو تبدیلی پیدا ہوئی اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جہاں ۱۹۲۷ء کی سالانہ کانفرنس کے موقع پر اس کے متعلق بڑی سرگرم خوش فہمیوں کا اظہار کیا گیا تھا وہاں ۱۹۳۹ء کی سالانہ کانفرنس کا نمایاں ردِ عمل مایوسی تھا۔ ماک ویل اور وٹی جیسے علماء نے اپنی مایوسی کا اظہار بہت کھلے الفاظ میں کیا اور اس امر پر زور دیا کہ ہمیں صاف صاف یہ اعتراف کر لینا چاہئے کہ بلند ترین ذہنی اوصاف کی پیمائش کے معاملے میں ذہنی خارج قسمت ایک بیکار آلہ ثابت ہوا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ذہنی آزمائشیں ایسے مواد سے تیار کی گئی ہیں جو متوقع اور غیر جذباتی ردِ عمل کا مطالبہ کرتا ہے، اس میں انفرادی اور تخلیقی ردِ عمل کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ چوں کہ بلند ترین ذہانت اچانک اور غیر متوقع صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کا نام ہے، اس لئے اس کے آثار کی تلاش ذہنی آزمائشوں کے دائرہ سے باہر کرنی چاہئے۔

بلند ذہنی خارج قسمت کے چند ایک مطالعوں نے یہ بات بھی ثابت کر دی کہ ان طلبہ کے بعض قریبی رشتہ دار ضعیف العقل تھے۔ اس طرح گویا ذہانت اور ضعیف العقلی کے وراثتاً منتقل ہونے کا نظریہ بھی متزلزل دکھائی دینے لگا۔

ذہنی خارج قسمت کی عدم استواری

غرض جوں جوں وقت گزرتا گیا ذہنی خارج قسمت کی قوتِ پیش گوئی اور اس کی استواری پر بھروسہ کم ہوتا گیا

ذیل میں چند ایسے تجربات کا ذکر کیا جائے گا جنہوں نے ذہنی خارج قسمت کی عدم استواری کو بڑی حد تک ثابت کر دکھایا ہے۔

بہت سے علماء نے متعدد تجربوں سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ تعلیمی عمل اور ماحول کو بہتر بنانے سے طلبہ کے ذہنی خارج قسمت میں مستقل ترقی پیدا کی جاسکتی ہے۔ حال ہی میں لندن یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کے پروفیسر پی۔ ای۔ ورنن نے اخبار ٹائمز کے تعلیمی ضمیمہ میں مضامین کا ایک سلسلہ شائع کیا تھا جس میں موصوف نے کہا کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ زائد تعلیمی مدد سے ذہانت میں کچھ فرق واقع نہیں ہوتا لیکن حال ہی میں جو تجربے میری نگرانی میں کئے گئے ہیں ان کا متفقہ نتیجہ یہ ہے کہ مسلسل زائد تعلیم کے اثرات وزنی بھی ہیں اور پائدار بھی، نیز یہ کہ طلبہ کے ایسے دو گروہوں کے ذہنی خارج قسمتوں کا موازنہ کرنا بالکل غلط ہے جن کی تربیت مختلف طور پر ہوئی ہو۔

اس قسم کا ایک تجربہ اسکیلز۔ ویل مین اور ملیمز نے ریاست آیووا کے ایک یتیم خانہ میں کیا جو سپاہیوں کے بچوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس یتیم خانہ میں کل ۴۶ بچے ایسے تھے جو ابھی مدرسہ جانے کی عمر کو نہ پہونچے تھے۔ ان کو دو برابر برابر اور ہم سر گروہوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک گروہ کا اوسط ذہنی خارج قسمت ۸۱ تھا اور دوسرے کا ۸۲۔ دوسرے گروہ کو قبل از مدرسہ تعلیم دی گئی اور پہلے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اس مطالعہ نے مندرجہ ذیل نتائج پیدا کئے۔

(الف) یتیم خانہ میں ۲۰۰ سے ۳۹۹ دن کی رہائش کے بعد جب دونوں گروہوں کی ذہنی آزمائش کی گئی تو قبل از مدرسہ تعلیم پانے والے گروہ کے اوسط ذہنی خارج قسمت میں بقدر ۴ کے اضافہ نظر آیا جب کہ دوسرے گروہ کے اوسط ذہنی خارج قسمت میں ایک درجہ کی کمی۔

(ب) ۴۰۰ یا ۴۰۰ سے زائد دنوں کی اقامت کے بعد قبل از مدرسہ تعلیم پانے والے طلبہ کے اوسط ذہنی خارج قسمت میں بقدر ۵ اضافہ ہوا جب کہ دوسرے گروہ کے خارج قسمت میں بقدر ۵ کمی۔

(ج) جن طلبہ کا ذہنی خارج قسمت ۸۰ یا اس سے اوپر تھا ان میں سے قبل از مدرسہ تعلیم پانے والوں نے اپنی حیثیت کو قائم رکھا جب کہ اس تعلیم سے محروم رہنے والوں کے ذہنی خارج قسمت میں بقدر ۲ کمی ہوئی۔

الگ بچوں کے متعلق تجربے

اسکوڈک نے ایسے بچوں پر تجربے کئے ہیں جنہیں دوسرے لوگوں نے پالنے کے لئے لے لیا تھا۔ اس کا پہلا تجربہ ۲۵ بچوں کے ایک گروہ سے متعلق ہے جنہیں چھ ماہ سے کم عمر میں ماؤں سے الگ کرکے اچھے گھرانوں کے حوالے کردیا گیا تھا۔ چھ کے سوا یہ تمام بچے حرامی تھے، ان کی حقیقی مائیں عموماً بہت گھٹیا قسم کی عورتیں تھیں۔ اور یہی حال ان کے حقیقی باپوں اور ان کے خاندانوں کا تھا۔ ان بچوں کی ذہانت کو پہلی مرتبہ دو سال کی اوسط عمر میں ناپا گیا اور دوبارہ ۴ سال ۲ ماہ کی اوسط عمر میں پہلی آزمائش پر اوسط ذہنی خارج قسمت ۱۱۶ تھا اور دوسری پر ۱۱۲۔ گویا یہ بچے مجموعی طور پر دونوں مرتبہ اوسط سے کافی اونچے ثابت ہوئے حالانکہ جس ماحول میں وہ پیدا ہوئے تھے اگر اسی میں ان کی تربیت بھی ہوتی تو معاملہ بالکل مختلف ہوتا۔

اسکوڈک کا دوسرا مطالعہ ۶۵ بچوں کے ایک گروہ سے متعلق ہے جنھیں اڑھائی اور پانچ سال کی عمر کے درمیان دوسرے گھروں میں منتقل کیا گیا تھا، یہ بچے بھی پست ترین معاشرتی ماحول سے لئے گئے تھے اور اوسط سے بلند تر گھروں میں پالنے کے لئے دیئے گئے تھے۔ اپنے گھروں کو چھوڑتے وقت ان کے اوسط ذہنی خارج قسمت ۹۲ اور ۹۹ کے درمیان تھے، ڈیڑھ سال بعد ان کا اوسط ذہنی خارج قسمت ۱۰۴ کو جا پہونچا اور دو مزید سالوں کے بعد ۱۰۸ تک ترقی کر گیا۔

اسپیئرز نے اس قسم کا ایک اور مطالعہ کیا ہے جو معاملے کے ایک نئے پہلو پر روشنی ڈالتا ہے یہ بچے ایسے تھے جنھیں عدالت اطفال نے "بے سہارا" قرار دے دیا تھا۔ پالنے والے والدین کے حوالے کئے جانے کے وقت ان کی عمریں چند ماہ سے لے کر پندرہ برس تک تھیں، ان میں سے اکثر کی مائیں ضعیف العقل تھیں، ان کے ذہنی خارج قسمتوں کا جو تجزیہ کیا گیا وہ نیچے درج ہے۔

حقیقی والدین کے ساتھ زمانہ قیام	ضعیف العقل ماؤں کے بچوں کا اوسط ذہنی خارج قسمت	صحیح العقل ماؤں کے بچوں کا اوسط ذہنی خارج قسمت
۰ — ۲ سال	۱۰۱	۱۰۰
۴ — ۵ ½	۸۴	۹۱
۶ — ۸ ½	۷۵	۹۱
۹ — ۱۱ ½	۷۲	۹۴
۱۲ — ۱۵	۵۳	۸۱

اس نقشے سے دو باتیں بالکل واضح ہیں، پہلی یہ کہ جس قدر زیادہ عرصہ شفیق والدین کے ساتھ رہا گیا ہے اسی قدر ذہنی خارج قسمت نیچے گرتا گیا ہے، دوسری نمایاں بات یہ ہے کہ ذہنی خارج قسمت کا انحطاط ضعیف العقل ماؤں کے بچوں کی صورت میں بہت زیادہ تیزی کے ساتھ رونما ہوا ہے، ان دونوں کو جب باہم ملا کر دیکھا جائے تو یہ نتیجہ ناقابل انکار نظر آتا ہے کہ بچے کا ماحول جس قدر زیادہ ذہنی محرکات حامل ہوگا اسی تناسب اس کی ذہانت ہوگی۔

خاتمہ کلام

فہم و ذکا مسئلہ انسانی اوصاف ہیں اور وراثت کے ساتھ ان کا تعلق ناقابل انکار ہے۔ ذہنی خارج قسمت کی تحریک نے انھیں اول اول پورے طور پر وراثت کے تابع دکھانے کی کوشش کی اور یہ خیال یقین کی حد کو پہونچنے لگا کہ ذہانت پیدائش سے پہلے مقدر ہو جاتی ہے، اس میں کمی بیشی محال ہے، ماہرین نفسیات کے ذمہ محض یہ فرض رہ گیا کہ وہ اس معین، غیر متبدل فطری صلاحیت کو ٹھیک ٹھیک ناپ کر اساتذہ اور والدین کو اس سے آگاہ کر دیں تاکہ ہر بچے کے حسب حال اسے مواقع بہم پہونچانے میں آسانی ہو، اس تحریک نے امریکہ میں بہت تیزی کے ساتھ جڑ پکڑی۔ والدین کو قدرتی طور پر بچوں کے بلند ذہنی خارج قسمت پر فخر ہونے لگا۔ اور اکثر حالتوں میں خود ایسے بچے بھی طرح طرح کی خوش فہمیوں میں مبتلا ہونے لگے۔ پست ذہنی خارج قسمت والدین اور اساتذہ دونوں کی نگاہوں میں ترقی اور بلندی کے منافی قرار پایا۔ واقعات اور مشاہدات نے بہت جلد ان دونوں مفروضوں کو جھٹلایا اور رفتہ رفتہ ماہرین نفسیات اور ذہنی خارج قسمت کے بڑے سے بڑے حامیوں کو یہ ماننا پڑا کہ اعلی ذہانت ہی کامیاب زندگی یا غیر معمولی امتیاز کی ضمانت قرار نہیں دی جا سکتی، زندگی کا رخ معین کرنے اور بلند مدارج پر پہونچنے میں کردار، شخصیت اور اس طرح کے دوسرے عوامل کو بہت بڑا دخل ہے۔ غرض ذہنی خارج قسمت کی ہمہ گیر سیادت اب ختم ہو چکی ہے، تاہم اس کے بے پناہ ریلے نے امریکی زندگی میں جن مضر اثرات کو جنم دیا تھا ان کا خاتمہ ابھی پورے طور پر ہونے نہیں پایا

سائنس اور ٹکنالوجی نے انسان کے ہاتھوں میں مادی اشیا کو تولنے ناپنے کے ایسے مکمل آلے دے دیئے ہیں کہ وہ طبعاً زندگی کے ہر گوشے کو اس قسم کے آلوں کے تابع دیکھنا چاہتا ہے علم ایات

اور علم الابدان کے ماہروں نے مدتوں بندھی ٹکی ساختوں اور بناوٹوں کی تلاش میں بے سود سرگردانی کی ہے اور آخر الامر اعتراف عجز پر خاتمہ ہوا ہے۔ ذہانت کی سی لطیف شے کو جو وراثت اور ماحول و مواقع ہر دو سے نامعلوم طور پر متاثر ہوتی ہے، غیر متبدل استواری کا حامل قرار دینا خود فریبی سے کم نہیں، اس ضمن میں پروفیسر اسٹاڈرڈ کا قول قابل ذکر ہے۔

گھٹیا قسم کے گھروں اور یتیم خانوں میں بچوں کا ماحول محرومی کا ماحول ہوتا ہے، اس لئے ذہنی خارج قسمت گرنے لگتا ہے، زیادہ خوش گوار ماحول میں جب ذہنی خارج قسمت کی پیمائش بعینہٖ پہلے کی طرح کی جاتی ہے تو اس کا رجحان بلندی کی طرف ہوتا ہے، کیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ استواری۔ عدم تبدل اور مقسوم کی جس تلاش کو علم الابدان اور علم الحیات کے ماہرین مدت سے خیرباد کہہ چکے ہیں، ماہرین نفسیات بھی اس سے ہاتھ اٹھائیں۔"

مدرسوں میں معالجۂ ذہنی

محمد عبدالعزیز

بچوں کی ذہنی قوتوں کی صحیح تربیت مدرسے کا ایک اہم فرض ہے۔ اگر ذہنی اور دماغی اعتبار سے بچے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہ لا سکے تو تعلیم کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ بگڑے ہوئے ذہن اور بگڑی ہوئی طبائع معاشرتی زندگی میں تعطل پیدا کر سکتی ہیں، اسے متحرک نہیں بنا سکتیں اور اگر مدرسے کی سماجی زندگی پر جمود طاری ہو جائے تو اس سے پورے معاشرے کا متاثر ہونا یقینی ہوتا ہے، اس لئے شروع ہی سے بچوں کے ذہنوں کو اتنا متنوع بنانے کی کوشش کی جائے کہ ان سے انفرادی اور اجتماعی فلاح کی توقع کی جا سکے، انھیں خود زندہ رہنے کا سلیقہ آ جائے اور وہ دوسروں کو زندہ رہنے کے آداب سکھا سکیں یہی وجہ ہے کہ آجکل ماہرین تعلیم نجی تعلقات کی افہام و تفہیم پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ بلکہ اس تحریک کو تعلیم گاہوں میں عام کرنے کی بھی کوشش کی جا رہی ہے، بچے کی تربیت کے لئے سازگار ماحول اور سماجی ہم آہنگی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اگر مدرسے میں بچے کو سکون و اطمینان میسر آ جاتا ہے اور اسے یہ بھی محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس ماحول میں وہ بالکل محفوظ ہے تو وہ ہر سبق کو جی لگا کر پڑھتا ہے اور ہر مشغلے میں اپنی یا اپنی جماعت کی کامیابی کے لئے کوشش کرتا ہے اور اس ماحول سے اتنی مطابقت پیدا کر لیتا ہے کہ مدرسے کی فتح و شکست اس کی اپنی ہار جیت ہوتی ہے، جب بچے میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے تو مسابقتی دور میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہتا، بلکہ تحریر و تقریر اور کھیل کود میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے اس لئے ماہرین تعلیم بچوں کو براہ راست ان روابط کا مفہوم سمجھانے کے وسائل کا جائزہ لے رہے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں مختلف تجربے کئے گئے اور مزید چھان بین کے بعد ذہنی صحت کو نصاب کا ایک لازمی جزو بنانے کے کچھ

طریقے بھی معلوم کر لئے گئے ہیں۔

پچھلے چند سال سے امریکہ کے بعض مدارس میں ذہنی صحت کو نصاب میں داخل کر لیا گیا ہے۔ لیکن کسی مضمون کو داخل نصاب کر لینا یا اسے دوسرے درسی مضامین کی طرح پڑھا دینا ہی کافی نہیں ہوتا اس کی پیچیدگی اور اس کے الجھاؤ کو سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے چنانچہ ان مدرسوں میں بیشتر اساتذہ نے مضمون کی افادیت اور اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا بلکہ انھوں نے بچوں کی زندگی میں اس نئے مضمون کے دوررس نتائج کی طرف توجہ بھی نہیں دی، بچوں کے رجحانات اور ان کے احساسات کو جانچنے کی کوشش بھی نہیں کی، یہ سچ ہے کہ ان کے پاس کوئی ایسا پیمانہ نہیں کہ وہ ان کے ذاتی ردِ عمل اور اس کی تفہیم کو ناپ سکیں اس لئے ذہنی صحت کی تدریس سے بچے جو تھوڑا بہت اثر قبول کرتے ہیں وہ بھی نذرِ تغافل ہو جاتا ہے اور مدرس ایک نا فرض شناس گلہ بان کی طرح ہر بچے کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا چلا جاتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ بچوں کے مزاج اور ان کی طبائع میں بہت اختلاف ہوتا ہے اور وہ اس بچے کی تعلیم و تربیت میں بھی دلچسپی نہیں لیتا جسے اس کی مدد اور اس کی شفقت سب سے زیادہ درکار ہوتی ہے۔ چاہئے تو یہ کہ مدرس بچے کی انفرادی صلاحیتوں کو معلوم کرنے کی کوشش کرے اور حسب ضرورت بچے کو اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں امداد دے۔ اس کی شخصیت کو کچلنے سے گریز کرے اور غیر سازگار ماحول میں اسے ماحول سے بغاوت کرنے کا موقع نہ دے۔ بلکہ اس کی فطرت کو ماحول آشنا بنانے میں غیر معمولی انہماک سے کام لے۔

پچھلے سال امریکہ کے ایک شہر سن سی نیٹی (CINCI NNATI) میں بچوں کی ذہنی تربیت کے سلسلے میں ایک تجربہ کیا گیا، اس تجربے میں سب سے پہلے بچوں کی طبائع اور ان کے عادات و اطوار کو معلوم کرنے کی کوشش کی گئی اور یہ درست ہے کہ جب انسانی مزاج کے سمجھنے اور اس کی عادتوں کا جائزہ لینے کے بعد بچوں کی تربیت کے لئے کوئی انتظام کیا جائے تو اس سے اچھے نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے، کیوں کہ جب تک مدرس میں بچوں کے تیور اور ان کے انداز کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی وہ ان کی شخصیتوں کی تعمیر میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور نجی تعلقات اور انفرادی خصوصیات کو ملحوظ رکھنا تو اس سے بھی زیادہ ضروری ہوتا ہے اس لئے کسی عملی اقدام سے پہلے اس سلسلے میں بعض اہم مسائل کا احاطہ کرنا لازمی ہے۔ سب سے پہلی چیز تو

مدرسوں میں ذہنی صحت کے نصاب کی اہمیت اور اس کی ماہیت کو سمجھنا ہے، ناظمین تعلیم اس سے کیا مراد لیتے ہیں، والدین اسے کس نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور مدرسین اسے کس طرح اپناتے ہیں، کیا ان سب کا ایک مقام پر جمع ہونا ممکن ہے، اور اگر نہیں تو ان میں سے ہر گروہ متباین نظریات کا حامل ہو سکتا ہے، اس لئے نصاب کے مقاصد کی توضیحات میں ان سب کا نظری اور عملی لحاظ سے متحد ہونا ضروری ہے، اس کے بعد دوسرا اہم مسئلہ ایسے اساتذہ کا انتخاب ہے جو اس مضمون کی تدریس کے لئے موزوں ہوں۔ ان کے جذبات و احساسات میں صرف شدت کا ہی نہ ہو، ان میں قیادت کا علم لے کر چلنے کی اہلیت بھی ہو۔ ایسے اساتذہ کی تربیت میں نجی روابط اور گروہی تعامل، بچوں کے احساسات اور خود مدرسین کے ردِ عمل کو سامنے رکھنا چاہئے، مدرس بے حس یا بے جان نہیں ہوتا، ایک انسان کی حیثیت سے وہ بھی ماحول کا اثر قبول کرتا ہے، بچوں کے کردار کے متعلق اس کی اپنی بھی رائے ہوتی ہے یا اپنی پسند و ناپسند کے مطابق وہ ہر بچے کے متعلق ایک رائے قائم کر لیتا ہے، بچہ اس ماحول میں کیا کچھ کرتا ہے اور اسے کیا کچھ کرنا چاہئے، ان حدود کو متعین کرنا مدرس کا فرض ہے، اپنی پسند و ناپسند سے بالا ہو کر اسے مستقبل کے خاکوں میں آب و رنگ بھرنا ہوگا، تیسرا مسئلہ سامان تدریس کی فراہمی ہے، اور جب اس نصاب کی نظری توضیح بھی ہو جائے، موزوں اساتذہ بھی منتخب ہو جائیں، فردی سامان تدریس بھی مہیا ہو جائے تو اس کے بعد سب سے اہم کام انفرادی توجہ سے بچوں کو ان مخصوص دھاروں میں ڈالنا ہوگا جو انہیں علم و عرفان کی تند و جولاں موجوں تک پہونچا سکے۔

یوں تو مختلف علوم کی تدریس کے لئے ایک نہیں بیسیوں طریقے وضع کر لئے گئے ہیں، اور اس سلسلے میں کئے دن مزید تجربات ہوتے رہتے ہیں، لیکن انسانی روابط کی تعلیم و تربیت کے لئے تدریسی معیار مقرر کرنا آسان نہیں، پھر بھی اگر آپ بچوں کے نجی مسائل میں حصہ لیں گے، ان کی خوشیوں میں شریک ہوں گے، ان کی مشکلوں میں ان کا ساتھ دیں گے تو اس سے ان کے باہمی مسائل بھی حل ہو جائیں گے، اور ان کی زندگی میں نیا ولولہ بھی پیدا ہو جائے گا، اس باہمی ارتباط میں استاد کے پیش نظر محض اپنی قدر و منزلت نہیں ہونی چاہئے، اسے اپنے ننھے ننھے شاگردوں سے محبت کرنا، ان کے مسائل کو سمجھنا اور ان کا مزاج آشنا بننا چاہئے، لیکن یہ تعلقات کافی نازک ہوتے ہیں، اور جب تک دونوں میں فکر و نظر کا اتحاد نہ ہو، اصولی تعاون اور اشتراک کا ناممکن ہے،

ہ کے مزاج میں صرف سنجیدگی اور درشتی ہی نہ ہو اس کی آنکھوں میں تلطف، نرمی اور خلوص جھلکتا ہو۔ اگر استاد کی شخصیت میں کوئی جاذبیت نہ ہو وہ انہیں صرف ڈرا کر چند ضابطے اور
دل یاد کرا سکتا ہو تو اس کی تدریس بچے کی شخصیت کو ہمہ گیر اور متنوع نہیں بنا سکتی، اس میں تو اپنی متعدد
بھی موجود ہونا چاہئے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی اچھے مدرس کی قدر و قیمت ہر شخص کی نگاہ میں ایک سی ہو
ے بلند مرتبہ تصور کر سکتا ہے، دوسرے گروہ کی نگاہ میں ممکن ہے وہ اتنا بلند و فائق ہو اس لئے اسے اپنی
کی انفرادی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہئے، اور بمصداق مثل "طبیب اپنا علاج آپ کرے" استاد کو صرف اپنی
ن سے ہی دو تین سال نہ جھونا پڑے گا، بلکہ اسے اپنے شاگردوں کی جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے
کی زندگی کے ایک ایک پہلو کا جائزہ لینا ہوگا اور پھر بوقت ضرورت اسے انکساری خاموشی کا
سامنا پڑے گا۔

انتخاب بچوں کی ذہنی صحت کا اہتمام و التزام اور انہیں ایک مقررہ نصاب کے زیر اثر چلانا ضروری ہے، اس کام کی تکمیل کے لئے اچھے کارکنوں کی ضرورت ہوگی، اور اچھے کارکنوں کا انتخاب
تا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کیا ہر مدرس بچے کے فطری رجحان کے پیش نظر اس کی ذہنی تربیت میں
لمتا ہے، اگر کسی وجہ سے بچے کا ذوق تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے اور اسے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار
نے کا موقع ہی نہیں ملتا تو ایسی تعلیم سے ذہنی تعطل پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے، اس لئے اساتذہ کے
یں ہوشیاری اور تدبر سے کام لینا ہوگا، اس سلسلے میں انتخاب سے پہلے امیدوار کے عادات و خصائل کا
ری ہے، اس انتخاب میں اساتذہ کے ذہنی افکار انتخاب کرنے والوں کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں وہ زیر تربیت
ں اٹھان اور ان کے فطری رجحانات کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں، اور ان کے آداب و اطوار کا مشاہدہ بھی
راگر ان اداروں میں کام کرنے والے اس مخصوص کام کے لئے چند طلبا کو منتخب کر کے انہیں ایسی
ہ انسانی روابط کے قیام کے لئے بچوں کی صحیح رہنمائی کر سکیں تو اس سے نہایت خوشگوار نتائج
ب۔

ات میں تجربہ کار اور اچھے اساتذہ بھی ہکا بکا رہ جاتے ہیں، اور اس حیرانی اور پریشانی میں وہ بچا

نفرادی خصوصیات بھی کھو بیٹھے ہیں، دوسروں کی اصلاح تو دور کی بات ہے انہیں خود اپنی اصلاح کی ضرورت یش آجاتی ہے، اور ذہنی صحت کی تدریس میں بجائے مایہ الامتیاز ہونے کے یہاں ان سے مایوسی ہوتی ہے۔ جب مرحلے میں یہ تجربہ شروع کیا گیا تو آسانیاں کم تھیں، دشواریاں زیادہ، کام کرنے والے کم تھے۔ تماشہ دیکھنے والے زیادہ دریں بھی اس نئے نصاب کی تدریس کے لئے بہت کم آمادہ ہوتے تھے۔ ان کے چہرے ان کے تذبذب اور شکوک ی غمازی کرتے تھے، اور بعض اساتذہ تو اس نئے تجربہ سے کچھ خوفزدہ سے نظر آتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ نفرت کی س شدت میں کمی ہوئی، اب اس نصاب سے بھی مدرسین کو دلچسپی پیدا ہوتی جاتی ہے، اور بچوں کی ذہنی حت کے قیام کے لئے روز بروز شغف پیدا ہوتا جاتا ہے، اور اب اصولی طور پر ذہنی صحت کی تدریس سے کسی کو ختلاف نہیں رہا، اور بفضلہ تعالیٰ اب لوگوں میں اس کا احساس شدت سے بڑھتا جا رہا ہے، اس عمومی دلچسپی ی وجہ سے کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو رضاکارانہ طور پر کام کرنے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں، لیکن اس مقام پر شخص کا انفرادی جائزہ لینا ضروری ہے، اس کی اس دلچسپی کے پس پشت کون سے محرکات ہیں، اگر ان محرکات کا م نہ ہوگا تو اس کی اس دلچسپی کی حد متعین کرنا مشکل ہوگا۔

سن سی ٹیٹی کے اساتذہ خاص اس موضوع پر متفق نہیں ہیں اور انہیں کئی گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ان میں سے ایک گروہ تو تربیت جسمانی کے مدرسین کا ہے، مدرسین کے اس گروہ کا تعلق محض نصاب صحت تدریس اور بچوں کی جسمانی تربیت سے ہوتا ہے، دوسرے وہ اساتذہ ہیں جو ٹریننگ کالج اور میری لینڈ یونیورسٹی کی انجمن سلامتہ بچگان سے متعلق ہیں، اور تیسرا گروہ ان اساتذہ کا ہے جنہوں نے اس مضمون کی تدریس کے لئے کوئی تربیت صل نہیں کی، اور انہیں اس سلسلے میں کوئی خاص تجربہ بھی نہیں ہوتا، لیکن ارباب انتظام بعض مصالح کے پیش نظر یں اس کام پر مامور کر دیتے ہیں، اس تجربہ گاہ میں ذہنی صحت کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں سب سے زیادہ کامیابی بیت جسمانی کے مدرس کو حاصل ہوئی ہے، اس سے پہلے اس کی شہرت ایک عمدہ فٹ بال کھلانے والے کی تھی اس نے ی صحت کی تدریس کا تجربہ بارھویں درجے کے بچوں سے شروع کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں اسے اس مضمون ے اتنا لگاؤ پیدا ہو گیا کہ اسے فٹ بال کھلانے میں بھی وہ لطف نہیں آتا تھا، اس نے تربیت جسمانی کے شعبے سے علیحدگی کے متعلق درخواست دی، اس درخواست سے اس کا مقصد انسانی روابط کی تدریس میں زیادہ وقت

ستاد کے مزاج میں صرف سنجیدگی اور خشکی ہی نہ ہو اس کی آنکھوں میں تلطف مزاج اور فتو حاج
ابھی جھلک موجود ہو اگر استاد کی شخصیت میں کوئی جاذبیت نہ ہو اور وہ انھیں صرف ڈنڈا گرچند قاعدے اور
اعدے کے اصول یاد کرا سکتا ہو تو اس کی تدریس بچے کی شخصیت کو ہمہ گیر اور متنوع نہیں بنا سکتی، اس میں تو اپنی تنقید
نے کا جذبہ بھی موجود ہونا چاہئے، یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی اچھے مدرس کی قدر و قیمت ہر شخص کی نگاہ میں ایک سی ہو
ب گروہ اسے بلند مرتبہ تصور کر سکتا ہے، دوسرے گروہ کی نگاہ میں ممکن ہے وہ اتنا بلند و فائز نہ ہو اس لئے اسے اپنی
تی اور بچے کی انفرادی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہئے، اور بمصداق مثل "طبیب اپنا علاج آپ کر" استاد کو صرف اپنی
دگی کے حقائق سے ہی روشناس نہ ہونا پڑے گا، بلکہ اسے اپنے شاگردوں کی جبلی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع
دینے اس کی زندگی کے ایک ایک پہلو کا جائزہ لینا ہوگا اور پھر بوقت ضرورت اسے انکساری اور خاموشی کا
من بھی تھامنا پڑے گا۔

ریسین کا انتخاب

بچوں کی ذہنی صحت کا اہتمام و التزام اور انہیں ایک مقررہ نصاب کے زیر اثر چلانا ضروری ہے، اس کام کی تکمیل کے لئے اچھے کارکنوں کی ضرورت ہوگی، اور اچھے کارکنوں کا انتخاب
بیشتر مشکل ہوتا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کیا ہر مدرس بچے کے فطری رجحان کے پیش نظر اس کی ذہنی تربیت میں
میاب ہو سکتا ہے، اگر کسی وجہ سے بچے کا ذوق تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے اور اسے اپنی صلاحیتوں کو ابھرنے کا
نے کا موقع ہی نہیں ملتا تو ایسی تعلیم سے ذہنی تعطل پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے، اس لئے اساتذہ کے
نخاب میں ہوشیاری اور تدبر سے کام لینا ہوگا، اس سلسلے میں انتخاب سے پہلے امیدوار کے عادات و خصائل کا
مطالعہ ضروری ہے، اس انتخاب میں اساتذہ کے تربیتی ادارے انتخاب کرنے والوں کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں وہ زیر تربیت
ساتذہ کی ذہنی اٹھان اور ان کے فطری رجحانات کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں، اور ان کے آداب و اطوار کا مشاہدہ بھی
سکتے ہیں، اور اگر ان اداروں میں کام کرنے والے اس مخصوص کام کے لئے چند طلبا کو منتخب کر کے انھیں ایسی
بیت دیں کہ وہ انسانی روابط کے قیام کے لئے بچوں کی صحیح رہنمائی کر سکیں تو اس سے نہایت خوشگوار نتائج
مد ہو سکتے ہیں۔

بعض حالات میں تجربہ کار اور اچھے اساتذہ بھی ہکا بکا رہ جاتے ہیں، اور اس حیرانی اور پریشانی میں وہ بچا

اور انھیں خصوصیات بھی محدود ہیں، دوسروں کی اصلاح تو دور کی بات ہے انہیں خود اپنی اصلاح کی ضرورت پیش آ جاتی ہے، اور ذہنی صحت کی تدریس میں بجائے مایہ افتخار ہونے کے ہمیں ان سے مایوسی ہوتی ہے، جب امریکہ میں یہ تجربہ شروع کیا گیا تو آسانیاں کم تھیں، دشواریاں زیادہ، کام کرنے والے کم تھے۔ تماشہ دیکھنے والے زیادہ مدرسین بھی اس نئے نصاب کی تدریس کے لئے بہت کم آمادہ ہوتے تھے۔ ان کے چہرے ان کے تذبذب اور شکوک کی غمازی کرتے تھے، اور بعض اساتذہ تو اس نئے تجربہ سے کچھ خوفزدہ سے نظر آتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ نفرت کی اس شدت میں کمی ہوئی، اب اس نصاب سے بھی مدرسین کو دلچسپی پیدا ہوتی جاتی ہے، اور بچوں کی ذہنی صحت کے قیام کے لئے روز بروز شغف پیدا ہوتا جاتا ہے، اور اب اصولی طور پر ذہنی صحت کی تدریس سے کسی کو اختلاف نہیں رہا، اور بفضلہ تعالیٰ اب لوگوں میں اس کا احساس شدت سے بڑھتا جا رہا ہے اس عمومی دلچسپی کی وجہ سے کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو رضاکارانہ طور پر کام کرنے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں، لیکن اس مقام پر ہر شخص کا انفرادی جائزہ لینا ضروری ہے، اس کی اس دلچسپی کے پس پشت کون سے محرکات ہیں، اگر ان محرکات کا علم نہ ہوگا تو اس کی اس دلچسپی کی حدود متعین کرنا مشکل ہوگا۔

منسوٹا کے اساتذہ جو اس موضوع پر متفق نہیں ہیں اور انھیں کئی گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ان میں سے ایک گروہ تو تربیت جسمانی کے مدرسین کا ہے، مدرسین کے اس گروہ کا تعلق محض نصاب صحت کی تدریس اور بچوں کی جسمانی تربیت سے ہوتا ہے، دوسرے وہ اساتذہ جو شکاگو اور میری لینڈ یونیورسٹی کی انجمن مطالعہ بچگان سے متعلق ہیں، اور تیسرا گروہ ان اساتذہ کا ہے جنھوں نے اس مضمون کی تدریس کے لئے کوئی تربیت حاصل نہیں کی، اور انھیں اس سلسلے میں کوئی خاص تجربہ بھی نہیں ہوتا لیکن ارباب انتظام بعض مصالح کے پیش نظر انھیں اس کام پر مامور کر دیتے ہیں، اس تجربہ گاہ میں ذہنی صحت کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں سب سے زیادہ کامیابی تربیت جسمانی کے مدرس کو حاصل ہوئی ہے، اس سے پہلے اس کی شہرت ایک عمدہ فٹ بال کھلانے والے کی تھی اس نے ذہنی صحت کی تدریس کا تجربہ بارھویں درجے کے بچوں سے شروع کیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں اسے اس مضمون سے اتنا لگاؤ پیدا ہو گیا کہ اسے فٹ بال کھلانے میں بھی وہ لطف نہیں آتا تھا، اس نے تربیت جسمانی کے شعبے سے اپنی علیحدگی کے متعلق درخواست دی، اس درخواست سے اس کا مقصد انسانی روابط کی تدریس میں زیادہ وقت

استاد کے مزاج میں صرف سنجیدگی اور درشتی ہی نہ ہو اس کی آنکھوں میں تلطف، مزاح اور ظرافت کی بھی جھلک موجود ہو۔ اگر استاد کی شخصیت میں کوئی جاذبیت نہ ہو وہ انھیں صرف ڈرا کر چند محاورے اور قواعد کے اصول یاد کرا سکتا ہو تو اس کی تدریس بچے کی شخصیت کو ہمہ گیر اور متنوع نہیں بنا سکتی۔ اس میں تو اپنی ... سننے کا جذبہ بھی موجود ہونا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی اچھے مدرس کی قدر و قیمت ہر شخص کی نگاہ میں ایک سی ہو ایک گروہ اسے بلند مرتبہ تصور کر سکتا ہے، دوسرے گروہ کی نگاہ میں ممکن ہے وہ اتنا پسندیدہ نہ ہو۔ اس لئے اسے اپنی ذاتی اور بچے کی انفرادی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اور بمصداق مثل "طبیب اپنا علاج آپ کرے" استاد کو صرف اپنی زندگی کے حقائق سے ہی روشناس نہ ہونا پڑے گا، بلکہ اسے اپنے شاگردوں کی جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے اس کی زندگی کے ایک ایک پہلو کا جائزہ لینا ہوگا اور پھر بوقت ضرورت اسے انکسار اور خاموشی کا دامن بھی تھامنا پڑے گا۔

مدرسین کا انتخاب

بچوں کی ذہنی صحت کا اہتمام والتزام اور اسے ایک مقررہ نصاب کے زیر اثر چلانا ضروری ہے۔ اس کام کی تکمیل کے لئے اچھے کارکنوں کی ضرورت ہوگی، اور اچھے کارکنوں کا انتخاب ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کیا ہر مدرس بچے کے فطری رجحان کے پیش نظر اس کی ذہنی تربیت میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے بچے کا ذوق تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے اور اسے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ہی نہیں ملتا تو ایسی تعلیم سے ذہنی تعطل پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے اساتذہ کے انتخاب میں ہوشیاری اور تدبر سے کام لینا ہوگا۔ اس سلسلے میں انتخاب سے پہلے امیدوار کے عادات و خصائل کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ اس انتخاب میں اساتذہ کے تربیتی اداروں کا انتخاب کرنے والوں کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں وہ زیر تربیت اساتذہ کی ذہنی اٹھان اور ان کے فطری رجحانات کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں، اور ان کے آداب و اطوار کا مشاہدہ بھی کر سکتے ہیں، اور اگر ان اداروں میں کام کرنے والے اس مخصوص کام کے لئے چند طلبا کو منتخب کر کے انھیں ایسی تربیت دیں کہ وہ انسانی روابط کے قیام کے لئے بچوں کی صحیح رہنمائی کر سکیں تو اس سے نہایت خوشگوار نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

بعض حالات میں تجربہ کار اور اچھے اساتذہ بھی ہکا بکا رہ جاتے ہیں، اور اس حیرانی اور پریشانی میں وہ بچے

اور اپنی خصوصیات بھی کھو دیتے ہیں، دوسروں کی اصلاح تو دور کی بات ہے انہیں خود اپنی اصلاح کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ اور ذہنی صحت کی تدریس میں بجائے مایہ الافتخار ہونے کے یہ ان سے مایوسی ہوتی ہے۔ جب امریکہ میں یہ تجربہ شروع کیا گیا تو آسانیاں کم تھیں، دشواریاں زیادہ، کام کرنے والے کم تھے۔ تماشہ دیکھنے والے زیادہ مدرسین بھی اس نئے نصاب کی تدریس کے لئے بہت کم آمادہ ہوتے تھے۔ ان کے چہرے ان کے تذبذب اور شکوک کی غمازی کرتے تھے، اور بعض اساتذہ تو اس نئے تجربہ سے کچھ خوفزدہ سے نظر آتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ نفرت کی اس شدت میں کمی ہوئی، اب اس نصاب سے بھی مدرسین کو دلچسپی پیدا ہوتی جاتی ہے، اور بچوں کی ذہنی صحت کے قیام کے لئے روز بروز شغف پیدا ہوتا جاتا ہے، اور اب اصولی طور پر ذہنی صحت کی تدریس سے کسی کو اختلاف نہیں رہا، اور بفضلہ تعالیٰ اب لوگوں میں اس کا احساس شدت سے بڑھتا جاتا ہے، اس عمومی دلچسپی کی وجہ سے کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو رضاکارانہ طور پر کام کرنے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں، لیکن اس مقام پر ہر شخص کا انفرادی جائزہ لینا ضروری ہے، اس کی اس دلچسپی کے پس پشت کون سے محرکات ہیں، اگر ان محرکات کا علم نہ ہوگا تو اس کی اس دلچسپی کی حدود متعین کرنا مشکل ہوگا۔

سن سی نیٹی کے اساتذہ خود اس موضوع پر متفق نہیں ہیں اور انھیں کئی گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ان میں سے ایک گروہ تو تربیت جسمانی کے مدرسین کا ہے، مدرسین کے اس گروہ کا تعلق محض نصاب صحت کی تدریس اور بچوں کی جسمانی تربیت سے ہوتا ہے، دوسرے وہ اساتذہ ہیں جن کا گہرا اور میری لینڈ یونیورسٹی کی انجمن مطالعہ بچگان سے متعلق ہیں، اور تیسرا گروہ ان اساتذہ کا ہے جنھوں نے اس مضمون کی تدریس کے لئے کوئی تربیت حاصل نہیں کی، اور انھیں اس سلسلے میں کوئی خاص تجربہ بھی نہیں ہوتا، لیکن ارباب انتظام بعض مصالح کے پیش نظر انھیں اس کام پر مامور کر دیتے ہیں، اس تجربہ گاہ میں ذہنی صحت کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں سب سے زیادہ کامیابی تربیت جسمانی کے مدرس کو حاصل ہوئی ہے، اس سے پہلے اس کی شہرت ایک عمدہ فٹ بال کھلانے والے کی تھی اس نے ذہنی صحت کی تدریس کا تجربہ بارھویں درجے کے بچوں سے شروع کیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں اسے اس مضمون سے اتنا لگاؤ پیدا ہوگیا کہ اسے فٹ بال کھلانے میں بھی وہ لطف نہیں آتا تھا، اس نے تربیت جسمانی کے شعبے سے اپنی علیحدگی کے متعلق درخواست دی، اس درخواست سے اس کا مقصد انسانی روابط کی تدریس میں زیادہ وقت

وقوف کرتا تھا۔ اس قسم کی انفرادی اور بعض حالات میں اجتماعی توجہ سے اچھے نتائج پیدا ہونے میں اور خصوصاً مدرس کے انہماک و خلوص کے زیر اثر ہوتا ہے۔ تربیت جسمانی کا یہ مدرس ہی سب سے زیادہ کیوں کامیاب ہوا، اس میں کوئی طلسماتی قوت تھی نہیں کہ اس نے اپنے شاگردوں کو مخصوص سانچوں میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ البتہ اس کامیابی کے اسباب دو علل ہوں گے، فی الحقیقت اس کامیابی کے تین اسباب تھے۔ اول یہ کہ وہ اپنے بچوں کے لئے ان کا ہیرو ہے۔ دوم وہ اپنے روزمرہ کے تعلقات اور روابط میں مخلص، ہمدرد اور جوشیلا ہے، اور اس میں سادگی مگر قدرے ضبط آفرین، ایمان داری بھی موجود ہے۔ سوم یہ کہ وہ بچہ کا امتحان سلیم الطبع ہے، اپنی کمزوریوں کو جانتا ہے اور حسب ضرورت وہ ان کے متعلق دوسروں سے امداد بھی لیتا ہے۔

ذہنی صحت کی تدریس کو مدرسے میں ایک زندہ حقیقت بنانے میں بالعموم ثانوی مدارس کو تین اہم مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے: مدارج، خوارج اور انجمن اشتراک باہمی یا محدود سماجی گروہ سے بعض بچے مقررہ معیار کے مطابق معروف کام کرتے ہیں، اور مدرسین کو ان کی تہذیب و تادیب میں اتنی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ دوسرا گروہ مدرسے کے آئین و ضوابط سے ہر وقت ٹکرانے کی فکر میں رہتا ہے، طبعاً وہ پہلے گروہ سے بغاوت کرنے پر مجبور ہوتا ہے، اور اپنے ذوق و شوق کو پورا کرنے کے لئے نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔ اور تیسرا گروہ ان بچوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنے عادات و خصائل اور عقائد و رجحانات کی بنا پر منفرد ہو جاتے ہیں۔ یہ محدود گروہی تعلقات بچوں کے ذہنی افق کو اور محدود کر دیتے ہیں، اور ان میں وسعت قلب و نظر پیدا نہیں ہونے پاتی۔ ذہنی اور دماغی اعتبار سے بچے کو اس وقت کسی بلند مقام پر لایا جا سکتا ہے، جب مدرس انہیں ان محدود گروہی اور باغیانہ نظریات سے بچاتا ہوا ایک مخصوص راہ پر ڈال دے جو عالمگیر انسانی روابط کو ان کی عادت اور مزاج بنا دے۔ اگر بچے انسان دوستی کو اپنی زندگی کا وطیرہ بنا لیتے ہیں تو یہی مدرس کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ تربیت جسمانی کے اس امریکی مدرس نے بچوں کی ذہنی صحت کے سلسلے میں جو اقدام کیا اس سے حیرت انگیز نتائج مرتب ہوئے، اس کی تدریس اور اس کی تعلیم و تربیت کا یہ اثر پڑا کہ موخر الذکر دو گروہوں میں طلبا کی تعداد کم ہونے لگی، وہ باغیانہ جذبات بھی رفتہ رفتہ معدوم ہونے لگے اور گروہ بندی اور جماعتی تقسیم کا جوش بھی ٹھنڈا پڑنے لگا اور بچوں کی اکثریت ایک معیاری اور ایک حد پر آنے لگی، اس کی اس تعلیم و تربیت کا مدرسے کی سماجی زندگی،

حقیقی احساس اور اخلاقی مزاج پیدا ہونے پایا۔ جسے مدرسے کے ارباب اقتدار نے بھی محسوس کیا۔

اسی قسم کا ایک اور تجربہ ایک دوسرے مدرسے میں کیا گیا۔ یہاں جن بچوں پر یہ تجربہ کیا گیا وہ نسبتاً عمر میں چھوٹے تھے، اور یہ تجربہ ریاضی کے ایک مدرس نے آٹھویں درجے کے بچوں پر کیا۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریاضی کا انسانی روابط اور باہمی تعلقات سے کوئی سروکار نہیں، اور یہ کسی حد تک صحیح بھی ہے، لیکن یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا، اور بچوں میں عمدہ خصائل اور اچھے سماجی تعلقات پیدا ہوتے گئے۔ اور ایک عالمگیر انسانی روابط کا خیال ان کے دل و دماغ میں چٹکیاں لینے لگا۔ بچوں میں اشتیاق کا پیدا کرنا مدرس کا کام ہوتا ہے، اور جب ان میں کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو انہیں ایک مخصوص راہ پر ڈالا جا سکتا ہے، ریاضی کی تدریس ہمہ گیر انسانی تعلقات کے قیام سے مختلف ہوتی ہے لیکن چوں کہ مدرس میں بچوں سے روابط پیدا کرنے اور انہیں اپنے قریب لانے کی صلاحیت موجود تھی، اس لئے وہ ان بچوں میں اعلیٰ ذہنی اقدار پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا، اس کی کامیابی کی دوسری وجہ گروہی مباحث میں اپنی شخصیت کو بچوں کے دل و دماغ پر مسلط کرنے سے گریز کرنا تھا، اس نے انہیں اپنے افکار و خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔ انہیں اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کی اجازت دی اور پھر اپنے مخصوص انداز میں ان کے سامنے اپنا نقطۂ خیال بھی پیش کیا، اس طرح رفتہ رفتہ انہیں موضوع زیر بحث کے صحیح تصور کو غیر شعوری طور پر قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

اس سلسلے میں بالعموم وہ اساتذہ ناکامیاب ہوتے ہیں جنہیں بچوں کے تجربۂ حالات کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے یا جو انفرادی تہذیب و تربیت کے ماہر ہوتے ہیں، یعنی وہ بیک وقت صرف ایک کج راہ بچے کی اصلاح تو کر سکتے ہیں لیکن بچوں کی پوری جماعت ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی، اور ذہنی صحت کی تدریس انفرادی اصلاح حال سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔

تربیت کا مسئلہ

اساتذہ کے انتخاب کے بعد ان کی تربیت کا مسئلہ سامنے آتا ہے، اس تربیت کا مقصد نو بچوں کے ذہنوں کو وسیع اور متنوع بنانا ہے اور ذاتی مفاد سے قطع نظر انہیں دوسروں کے احساسات اور ان کی ضروریات کو سمجھنا اور پیدا کرنے کا عادی بنانا ہے بسنہ ۱۹۴۲ء میں اس سی نیٹی میں یہ تجربہ ابتدائی مدرسے میں شروع کیا گیا، تجربہ کرنے والوں کے سامنے کوئی متعین نصب العین یا کوئی مقررہ منزل نہیں تھی

راستے کو محسوس کرنا، اس کی دشواریوں پر عبور حاصل کرنا اور منزل تک پہونچنا آسان نہیں تھا مگر اس بے سروسامانی کے عالم میں بھی انھوں نے اپنا تجربہ شروع کیا اور جو ساز و سامان میسر آیا اور جو فرنیچر، آلات و ادوات ...... پیلاکسد ادس میں مل سکے، انھیں کی امداد سے یہ کام شروع کیا گیا چناں چہ اس تجربے کو زیادہ ثمر بنانے کے لئے اور اسے ایک مخصوص راہ پر ڈالنے کے لئے کسی مرتب خاکے کا ہونا ضروری تھا، انھوں نے اپنے لئے خود ہی ایک راہِ عمل تجویز کی اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل کو اپنے تجربات کی اساس قرار دیا، دوسرا اہم مسئلہ ذہنی صحت کی تدریس کے لئے ضروری ساز و سامان مہیا کرنا تھا، اس میں بھی انھیں دقت محسوس نہیں ہوئی اور اس تجربہ گاہ میں بچوں کی ذہنی صحت کے نصاب اور اس کی تدریس کے متعلق اچھا خاصہ سامان جمع ہو گیا جس سے دوسرے متعلق حضرات اور ادارے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، آغازِ کار میں بچوں کی ذہنی تہذیب و تادیب کے لئے اس ادارے میں دو کتابیں استعمال میں لائی گئیں، ان میں سے "انسان کی اہمیت" - MAN IS IMPORTANT) اور "دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا" (COOPRATIVE LIFE) بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ اس ادارے میں اس سلسلے میں ایک اور اہم بات دیکھنے میں آئی ہے، بعض اساتذہ ذہنی صحت کے سامان تدریس کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے اور اسے ایک مخصوص طریق کار ہی کو اپنا نصب العین جا لیا قطعِ نظر اس سے کہ بچوں میں صحیح جذبہ کار پیدا ہو رہا ہے، یا وہ نصاب کی بھول بھلیوں میں پھنس کر اپنا سب کچھ کھو چکے ہیں، حالاں کہ عالم گیر انسانی روابط قائم کرنے کے لئے بچوں کو انسان کش نہیں، انسان آشنا بنانا ہوتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب گروہی مباحث میں وہ خود اس نتیجے پر پہونچیں کہ انسان کی توقیر اور اس کا احترام مقدم ہے، اور پھر اسی گروہ میں وہ دوسروں سے تعلقات پیدا کرنا اور دوسروں کا احترام کرنا سیکھیں، انھیں گروہی تعلقات کی بدولت آگے چل کر ان کے دل میں عالم گیر انسانی ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے، اس لئے غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ذہنی صحت کی تدریس انفرادی نہیں، اجتماعی ہے۔ جو مدرسین اس کام سے متعلق ہیں، اگر وہ ان گروہی مباحث اور جماعتی تعلقات سے آنکھیں بند کر کے بچوں کے ذہنوں کو بلند و ارفع بنانے کی کوشش کریں گے تو ان کا یہ کارنامہ کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مترادف ہوگا، انسان تعلقات سے سیکھتا ہے اور تعلقات سے ہی بنتا ہے، ورنہ اس کے دل و دماغ میں معصیت اور پسند و ناپسند کے ایسے نقوش ابھر آتے ہیں جن کا

تعلق براہِ راست اس کی پوری زندگی سے ہوتا ہے۔

اس طرح سن سبی نلیسٹی میں جن اساتذہ کو اپنی مساعی پر پورا اعتماد نہیں تھا، یا جن میں اس جذبۂ کار کی کمی تھی وہ گروہی مباحث سے بھی اپنا دامن بچانے لگے، اور محض نصاب کی چند موٹی موٹی باتوں پر درس و تدریس کا سلسلہ ختم کر دیتے تھے لیکن اس کے برعکس ایسے اساتذہ جنھیں خود اپنی ذات، اپنے جذبۂ کار اور اپنے طریقِ تدریس پر بھروسا تھا، انھوں نے ان تدریسی لوازم کو بعض حالات میں بالکل چھوڑ دیا اور بعض حالات میں ان کا معمولی سا استعمال روا رکھا، انھیں اپنی ذہنی اپج اور اپنے درسی طریقوں پر زیادہ اعتماد تھا۔ اس طرح انھوں نے گروہی مباحث کے نتائج ہی سے، اپنی راہ متعین کی، نصاب اور ساز و سامان پر کم بھروسا کیا، اپنی ذاتی سوجھ بوجھ اور لیاقت سے بچوں کو منزل آشنا بنانے کی کوشش کی۔

یہ تجربہ اس درسگاہ میں شروع ہوا تو کامیابی کے امکانات بہت کم تھے، مگر اپنی ہمت و مساعی سے یہ لوگ دوسروں کے لئے شمعِ راہ ثابت ہوئے، یہ درست ہے کہ درسی لوازم اور تعلیمی آلات و ادوات کو موجودہ نظامِ تعلیم اور طریقِ تدریس میں ایک اہم مقام حاصل ہے لیکن اس کے باوجود مدرسین کی اپنی ذاتی استعداد اور ذاتی لیاقت کو بھی موجودہ نظامِ تعلیم میں بڑا دخل ہے تعلیم کا انحصار محض ساز و سامان پر نہیں ہوتا، بلکہ ساز و سامان کے استعمال کرنے کی اہلیت پر ہوتا ہے، ذہنی صحت کی تدریس میں اساتذہ کو اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا، فی الواقع انھیں کی لیاقت پر اس نصاب کی کامیابی اور ناکامیابی کا انحصار ہے۔

معالج کی ضرورت

اس تفصیل سے غالباً بچوں کی ذہنی صحت کے لئے اچھے معالج کی ضرورت واضح ہو گئی ہو گی اور اس میں شک نہیں کہ ہی ذہنی معالج بچوں میں امعانِ نظر، وسعتِ خیال اور بلندیٔ کردار پیدا کر سکتا ہے، ذہنی بیماریوں کا علاج جسمانی بیماریوں سے زیادہ مشکل ہوتا ہے، اور معالجِ ذہنی کو ایک نہیں بیسیوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس بحث میں ذہنی صحت کے لئے اب تک جو طریقِ کار تجویز کیا گیا ہے، وہ گروہی مباحثے اور حسبِ ضرورت انفرادی اصلاح سے متعلق ہے، گروہی مباحثوں کے ذریعہ بچوں میں انسانی روابط کا احساس پیدا کیا جا سکتا ہے، اور ان مباحثوں کی کامیابی گروہی مباحث کے قائد کی صلاحیت اور اس کی ذاتی استعداد پر مبنی ہوتی ہے، اگر ان سماجی مذاکرات میں قیادت کسی سنجیدہ اور فہیم شخص کے

ہاتھوں میں ہوئی تو اس سے بچوں کی پوری جماعت کو فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ اسے ایک ہی عمر ایک ہی مزاج اور ایک ہی عقیدے کی پوری جماعت سے واسطہ پڑتا ہے، اور جو مسائل زیر بحث آتے ہیں ان کی شکل کم و بیش ایک سی ہوتی ہے، اس لئے ہر شخص کے نقطۂ خیال اور اس کی دلچسپی کو قائم رکھنے کے لئے مباحثے کا انداز ایک ہوتا ہے اور اس میں تجی واردات کو اپنی تجزیہ کاری کا کم موقع ملتا ہے، چنانچہ گروہی مذاکرات کے لیڈر اور اصلاح ذات کے معالج میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے، وہ دونوں کا علیحدہ علیحدہ طریق کار ہے لیکن اگر ان گروہی مباحثوں میں ہر رکن کی منفرد شخصیت کو پیش نظر نہ رکھا گیا تو اس سے کچھ زیادہ مقصد براری نہیں ہو سکتی، مانا کہ بچوں میں ایک اجتماعی شان اور دوسروں کے احساسات کا احترام پیدا ہو جاتا ہے، مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر بچہ مزاجاً اور خیالاً اس ماحول سے ہم آہنگی پیدا کرے، اس اختلاف رائے اور متضاد نظریات کو دور کرنے کے لئے اور پوری انسانی برادری کو ایک رشتے میں منسلک کرنے کے لئے ہر بچے کے رجحانات کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، اگر پورے گروہ کی ہم آہنگی کا جائزہ لیا جائے تو اس اختلاف کی شدت کا احساس ہو جاتا ہے، ایسے حالات میں اس بچے پر سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے جو کوششوں کے باوجود ذہنی صحت کی اس تدریس سے باغی ہو، دیکھنا یہ ہے کہ یہ بچہ اس ماحول کو اپنے لئے کیوں سازگار نہیں بنا سکتا، وہ اس سے کیوں گریز کرتا ہے، ایسے بچوں کی اصلاح سب سے ضروری ہوتی ہے، وہ معالج کی توجہ کے سب سے زیادہ محتاج ہوتے ہیں، بچے کی انفرادی ضروریات کو نگاہ میں رکھنا اور اس کی اصلاح کے مناسب طریقوں کو بروئے کار لانا اس کا فرض ہے، کیوں کہ وہ ان کا گروہی قائد بھی ہے اور ان کا استاد بھی، اور اس طرح اسے کچھ اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں، تجی تعلقات میں اسے ایک متوازن پالیسی اختیار کرنے کی فرصت بھی ہوتی ہے۔

مدرس کا فرض ہے کہ وہ اس کی اصلاح اور اس کے علاج کے مختلف وسائل و ذرائع کا صرف جائزہ ہی نہ لے انھیں اپنی نظر میں بھی رکھے، اور اصلاح حال کے جو مناسب وسائل ہوں ان سے بچے کی برابر امداد کرتا رہے، یوں تو امریکہ اور دوسرے ممالک میں اس قسم کے تجربات اکثر ہوتے رہتے ہیں، لیکن سن سی نیٹی میں جو تجربہ کیا گیا ہے وہ بچوں کے باہمی تعلقات کا ایک عمدہ اور مربوط پروگرام ہے، اس پروگرام سے ہر سال بچوں کی بہت بڑی تعداد متمتع ہوتی ہے، مدرسے میں نفسیاتی خدمات، پیشہ ورانہ مشورے، گھریلو ارتباط، سماجی نظام کا ادارہ اور ادارۂ معالجۂ ذہنی ایک ہی صدر کی زیر نگرانی کام کرتے ہیں اور چوں کہ ان تمام شعبوں کا تعلق انسانی روابط اور ہمدردی سے ہے اس لئے بچوں کی ذہنی بلندی کی خاطر ان سب کو

ایک مربوط شکل میں پیش کرنا مفید ہوگا، اس ادارے کا ذہنی معالج فی الحقیقت سماجی کارکن ہوتا ہے، اور وہ ان سب کو مربوط اور ہم آہنگ بنانے کی کوشش کرتا ہے اور وہ سماجی وحدے کے دشوار گزار مرحلوں سے خوب واقف ہوتا ہے، اس لئے کسی مخصوص واحدے میں بچوں کے داخلے اور ان کے اخراج کے مسائل کی تمام ذمہ داری اسی پر ہوتی ہے، اور وہ اپنی اس ذمہ داری کو بطریق احسن انجام دینے کی سعی کرتا ہے لیکن کسی واحدے میں بچوں کے داخلے یا ان کے اخراج کے مسائل اتنے اہم نہیں ہوتے، جو بچے کسی واحدے میں داخل نہیں ہو سکتے ان کے لئے ماحول کو سازگار بنانا اور ان کی رہنمائی کرنا زیادہ اہم ہوتا ہے، مدرسے یا معاشرے میں بعض ایسے عوامل مصروف بکار ہوتے ہیں جن سے بچے براہ راست متاثر ہوتے رہتے ہیں، اور حالات کے مطابق انسانی روابط پیدا کرنے کی تگ ودو میں دور یا نزدیک ہو جاتے ہیں۔

بہر صورت اگر مدرسے میں بچوں کی ذہنی سطح کو بلند کرنے کی جدوجہد کی جاتی ہے اور ذہنی معالج اجتماعی اور انفرادی روابط سے بچوں میں ہمہ گیر انسانی برادری کے لئے کوئی مقام پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے، اجتماعی یا گروہی مذاکرات کے ذریعہ اگر کوئی بچہ اس ذہنی بلندی تک نہ پہونچ سکے جو اس کے لئے تجویز کی گئی ہے تو اس کی ذہنی صلاحیتوں کو سمجھنے کی علیحدہ کوشش کرنی چاہئے سن سی ناٹی کے جس تجربے کا بار بار ذکر کیا گیا ہے، اس میں بالخصوص بچوں کی طبائع کے مطابق انھیں حسب ضرورت فرداً فرداً یا اجتماعی طور پر ایک مرکز پر لانے کی کوشش کی گئی، ایک سینیئر ہائی اسکول کے نیم سالہ میقات میں بہت سے طلبا نے بارھویں جماعت کے نصاب کے ذہنی صحت اور اس کے مذاکرات میں حصہ لیا، ان مذاکرات نے بچوں کی شخصیتوں پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے اور جب مذاکرات کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو انھوں نے اس سلسلے کو مزید جاری رکھنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی، اور جنسی مسائل کو سمجھنے اور ان کا کوئی معقول حل تلاش کرنے کی خاطر انھوں نے اس قسم کی ایک انجمن کے قیام کی تجویز پیش کی، اس سلسلے میں انھوں نے اس مدرس کی امداد حاصل کر لی جو جنسی مسائل کے حل کرنے میں ان کے لئے مدد و معاون ثابت ہو سکتا تھا، اور جو متعلم سکریٹری، ذہنی معالج اور اسکول پرنسپل کو کسی طریق کار کی تلاش میں ایک مقام پر جمع کر سکتا تھا وہ اپنی اس مشترکہ مساعی میں بالآخر کامیاب ہو گئے، اور مدرسے میں اوقات تدریس کے دوران ہی میں جنسی مسائل کی دوروزہ مذاکراتی انجمن کا قیام عمل میں آیا، اس انجمن کی رہنمائی کے لئے

ڈاکٹر اور مسز لڈل کو سن سی نیٹی آنے کی دعوت دی گئی۔ ڈاکٹر اور مسز لڈل دونوں کو مغربی دہلی کے ہائی اسکولوں میں اس قسم کے مباحث اور مذاکرات کی تنظیم کا وسیع تجربہ ہے۔ انجمن سے متعلق بچوں کی پانچ اور مختلف انجمنیں تھیں۔ ڈاکٹر اور مسز لڈل نے بچوں کو سوالات پوچھنے کا موقع دیا۔ بچے ایک پرچے پر سوالات لکھ کر ان کے پاس بھیج دیتے مگر انہیں اس میں اپنا نام درج کرنے کی اجازت نہیں تھی اس طرح ۲۲۰۰ طلباء نے ۲۶۷۷ سوالات پوچھے۔ ان سوالات کو بہت جلد انھوں نے مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ تاکہ ساعت گھر میں ایک موضوع سے متعلق سوالات بیک وقت زیر بحث آسکیں۔

ان سب کے علاوہ آٹھ بیرونی مشیروں کو بھی ان مذاکرات میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی اور بچوں کو اپنی جمی دشواریوں کو دور کرنے کا موقع دیا گیا۔ چوں کہ بچوں کی لیاقت میں اختلاف ہوتا ہے، بعض بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں اپنے متعلق کسی سے کچھ کہتے ہوئے شرم آتی ہے، اور بعض اپنی دقتوں کو بھری مجلس میں بھی بیان کر سکتے ہیں، ایسے شرمیلے بچوں کو سماجی صحت، پیشہ ورانہ رہ نمائی، سماجی مشغلے اور ذہنی معالجے کے سلسلے میں علیحدہ علیحدہ گفتگو کرنے کا موقع دیا گیا، بظاہر جو بچے ذہنی اعتبار سے طبعی سمجھے جاتے ہیں ان کے متعلق بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انھیں کوئی ایسی ذہنی دشواری نہیں ہوتی جس میں انھیں کسی امداد کی ضرورت پیش آئے، لیکن جب بچوں کو انفرادی طور پر علیحدہ علیحدہ اپنی دقتوں کو پیش کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے کا موقع ملا تو بہت سے ایسے بچے جن کی ذہنی سطح طبعی سمجھی جاتی تھی، اپنی مشکلات لے کر سامنے آگئے۔

ڈاکٹر اور مسز لڈل نے اس سلسلے میں کلیے کے ارکین سے ملاقات کی، جو سوالات بچوں نے پوچھے تھے، انھیں ان کے سامنے پیش کیا، چناں چہ اس اجتماع سے ایسے نتائج برآمد ہوئے جن کے متعلق بعض کلیوں کو وہم و گمان بھی نہیں تھا، اس نئے تجربے نے لوگوں کے سوئے ہوئے احساسات کو جگا دیا اور طلبا کے متعلق صحیح اطلاعات بہم پہونچائیں، ان علومات کی روشنی میں ہر شعبے میں زندگی کی ایک نئی لہر سی دوڑ گئی اور ہر شخص نے اپنے ساز و سامان اور اپنے جذبۂ کار کا محاسبہ کیا اور ایک نئی امنگ کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ڈاکٹر اور مسز لڈل نے بچوں کے والدین سے بھی بچوں کی صلاحیتوں اور ان کی ضروریات کے متعلق گفتگو کی۔

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مدرسے میں ذہنی صلاحیت کی تدریس کو جاری کرنا بہت ضروری ہے اس سے

یہ صرف معالجہ انسانی تعلقات ہی پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی کامگار رہتے ہیں، اس دور میں ادارۂ معالجۂ ذہنی کی ضرورت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور تعلیمی دارو میں تو اس کی اہمیت مسلّم ہے لیکن ترقی یافتہ ممالک میں بھی ان اداروں کا قیام ابھی ان کی ضروریات کے مطابق عمل میں نہیں آیا، ہمارا ملک تو خیر تعلیمی اعتبار سے بہت پیچھے ہے، ترقی یافتہ ممالک میں اب تک اس سلسلے میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی، اگرچہ ذہنی صحت کی تدریس کو موثر بنانے کے لئے ہر مدرسے میں ایک ایسے ادارے قیام نہایت ضروری ہے، اس ادارے کی امداد، اساتذہ کا انتخاب، بچوں کی دشواریوں کا صحیح جائزہ اور ان کی اصلاح کے لئے ایک واضح اور جانی بوجھی راہ اختیار کرنا بچوں کی فلاح و بہبود اور قومی اور انسانی یکجہتی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

المختصر انسانی روابط کے قیام کے لئے بچوں کو نصاب کی چند موٹی موٹی باتوں سے روشناس کرنے ہی سے سارے مسائل حل نہیں ہو جاتے، دراصل یہ تعلقات مدرس کی اپنی لیاقت اور اپنے طریق کار سے پھیل بھی سکتے ہیں اور محدود بھی ہو سکتے ہیں، اس لئے اس نصاب کی کامیابی یا ناکامیابی کا انحصار مدرس پر ہوتا ہے، وہ اس نصاب کی تدریس میں زندگی پیدا کر سکتا ہے، وہ اسے بچوں کی طبائع کا ایک جزو بنا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مدرس کے انتخاب پر اتنا زور دینے کی ضرورت ہے، نجی مسائل اور انفرادی معالجے کے گروہی مذاکرات بجائے خود مکمل نہیں ہوتے، ان سے تو مسئلے کے مافیہ تک پہنچنے میں امداد ملتی ہے، اور انہیں مذاکرات کے ذریعہ ان بچوں کو علیحدہ علیحدہ کیا جاتا ہے، جو مخصوص انفرادی معالجے کے محتاج ہوتے ہیں اور مدرس کا یہ فرض ہے کہ ایسے بچوں کو اس گروہ سے نکال کر ان کی مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرے۔

ہمارے اپنے معاملات

ایک سابق مدرس

اُجرت کا مسئلہ ایک ... زندگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ جب تک کسی مزدور کو اتنی اجرت نہ ملے جس سے وہ آبرومندانہ زندگی بسر کر سکے اس وقت تک اس سے یہ امید رکھنا عبث ہے کہ وہ پوری توجہ کام پر لگا سکے گا۔ موجودہ دور اجتماعی سودا بازی کا دور ہے۔ آج دنیا بھر کے مزدور اپنی ہستی کو منوانے اور معقول اجرت حاصل کرنے کے لئے انجمنوں اور جماعتوں میں منظم ہو رہے ہیں۔ ان حالات میں یہ بات بالکل قدرتی ہے کہ ہمارے اساتذہ بھی بہتر اجرتوں کے لئے اجتماعی جدوجہد کریں۔

معقول اجرت کا مطالبہ مزدور کا ایک ایسا حق ہے جسے سب تسلیم کرتے ہیں لیکن کیا ایک استاد محض ایک مزدور ہی ہے اور بس؟ غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کوئی ہوش مند استاد ایک اجیر کی حیثیت پر کبھی رضامند نہ ہوگا۔ وہ مزدور ضرور ہے مگر اس کے ساتھ ہی کچھ اور بھی ہے۔

سنہ ۱۹۴۴ء کے برطانوی قانون تعلیم نے برطانوی نظام تعلیم میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور عالمگیر جنگوں نے اس ملک کی قومی زندگی کی کایا کچھ اس طرح پلٹ دی ہے کہ نئے تقاضوں کے ساتھ نباہ کرنے کے لئے تعلیم کا سارا تانا بانا تبدیل کر دینا ضروری معلوم ہوا مگر ماہرین تعلیم اس بات پر یک زبان ہیں کہ ان انقلابی تبدیلیوں کو عملی جامہ پہنانے کا آخری انحصار برطانوی اساتذہ کے ذاتی اوصاف پر ہوگا۔ اس طرح حکومت پاکستان ان دنوں ایک چھ سالہ تعلیمی منصوبہ پر کاربند ہے، جس کی مدد سے ہماری نئی قومی زندگی کی بنیادیں قائم کرنا مطلوب ہے، نیز ہمارے وزیر تعلیم نے اس بات کا صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ اس منصوبہ کی کامیابی کا بہت کچھ مدار

اس بات پر ہوگا کہ ہمارے پاس کس قسم کے اساتذہ موجود ہیں، پس ظاہر ہے کہ استاد کے لئے خالی ایک مزدور ہونا ہی کافی نہیں، اس کے لئے صرف یہی ہونا کافی نہیں کہ ایک معقول اجرت لے کر اپنے کام کو فنی طور پر اچھی طرح انجام دے دے، بلکہ اس کے ساتھ ہی اس کا یہ بھی فرض ہے کہ اپنی شخصیت میں کچھ ایسے اوصاف پیدا کرے جن کی تاثیر اردگرد کے ماحول کو گرما دے، کیا یہ ذاتی اوصاف محض ایک معقول اجرت کے حاصل کر لینے سے پیدا ہو سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب صریح نفی میں ہے اس کے لئے اساتذہ کو الگ جدوجہد کرنا پڑے گی۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ؎ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یہ بات نہایت عجیب ہے کہ گو ہمارے ہاں اساتذہ کی کئی انجمنیں موجود ہیں، مگر ان سب کی گھڑ مبال تنخواہوں کے مسئلہ سے آگے کبھی نہیں بڑھیں۔ معقول اجرت شخصیت کی ترقی کے وسائل میں سے ایک اہم وسیلہ ضرور ہے، مگر یہ خود ہی سب کچھ نہیں، آزادیٔ ضمیر، معاشرتی انصاف اور مواقع کی یکسانیت وہ چند ضروری شرائط ہیں جن کے بغیر شخصیت کے پھلنے پھولنے کے امکانات بڑی حد تک ختم ہو جاتے ہیں، آج تک اساتذہ کی انجمنوں نے ان اہم امور کے بارے میں کیا کیا ہے؟ افسوس ہے کہ اس سوال کا جواب بہت مایوس کن ہے، حالانکہ یہ وہ چیزیں ہیں جن کا حاصل کرنا نہ صرف نسبتاً سہل ہے، بلکہ جن کا فقدان ہی استادوں کی عام پستی کے لئے ذمہ دار ہے۔

ہم پاکستان میں اسلامی جمہوریت کو برپا کرنا چاہتے ہیں، ایک ایسا نظامِ زندگی جو مساوات معاشرتی انصاف اور رواداری کی بنیادوں پر قائم ہو۔ لیکن نئی پود کو اس سنہرے نظامِ زندگی کی تربیت کون دے گا؟ کیا وہ استاد جو خود آزادیٔ ضمیر، معاشرتی انصاف اور مواقع کی یکسانیت سے محروم ہیں اور جن کو اسی محرومی نے "اسفل السافلین" کا مقام دے رکھا ہے؟ کیا ایک معقول اجرت اس محرومی کا بدل ہو سکتی ہے؟ شاید بعض لوگ دوسرے سوال کا جواب اثبات میں دیں، مگر میں خود اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ محرومی ایک صاحبِ ضمیر آدمی کے لئے ایک ایسا روحانی عذاب ہے جس کا مداوا کوئی مادی معاوضہ نہیں کر سکتا۔

آزادیٔ ضمیر سے کیا مراد ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر استاد کو ایسے امور میں جن کا تعلق مدرسے کے نظم ونسق سے نہیں۔ اپنی آزادانہ رائے کے استعمال کا پورا حق ہو، وہ ان معاملات میں ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہو کر اپنے طور پر سوچے اور اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرے، صدر معلم یا کسی دوسرے انتظامی افسر کو اس معاملے میں کچھ دخل نہ ہو، زمانہ قبل از تقسیم کے متعلق مجھے بھی طرح معلوم ہے کہ بہت سے اساتذہ کو ایک انجمن کی رکنیت پر صرف اس لئے مجبور کیا جاتا تھا کہ مدرسے کا صدر معلم اس انجمن کا صدر تھا، اور چوں کہ یہ صدارت اس کی ذاتی اغراض کے پورا کرنے کا بڑا موثر ذریعہ تھی، اس لئے استادوں کو کوڑے سے ہانک کر اس جماعت کے حلقۂ رکنیت میں دھکیلا جاتا تھا، استادوں کی یہ حالت تھی کہ پس پشت ناک بھوں چڑھاتے اور صدر معلم کو برا بھلا کہتے مگر اس کی موجودگی میں دم بخود ہو جاتے اور ہاں میں ہاں ملاتے، صدر معلم کو ان تمام باتوں کی خبر تھی۔ مگر وہ سختی سے آمریت کا قائل تھا، آخر جب میں نے جی کڑا کر کے اس انجمن کی رکنیت ترک کردی تو میں نے اپنے آپ کو بالکل تنہا پایا اور جب صدر معلم کا دست انتقام مجھ پر اٹھا تو کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ اس سے اتنا ہی کہے کہ بندۂ خدا تمہیں ایک رضاکارانہ انجمن کا خدائی فوجدار کس نے بنایا ہے؟ جب استادوں کی آزادیٔ ضمیر اور ان کی اخلاقی بالیدگی کا یہ عالم ہو تو کس طرح فرض کر لیا جائے کہ تنخواہ کا اضافہ ان میں روحانی بلندی پیدا کر دے گا، جس قوم کے اساتذہ اس بدترین قسم کی ذہنی غلامی کا شکار ہوں اس کی نئی پود کے لئے ذہنی آزادی حاصل کرنے کی کیا صورت ہو؛ اس سے یہ مراد نہیں کہ صدر معلم کو بالکل کوئی تفوق حاصل نہ ہو، انتظامی امور کی ذمہ داری بالآخر اس پر ہے اور ان امور میں اس کی رائے کو ضرور اولیت ملنی چاہیئے۔ لیکن باقی امور میں وہ اور تمام اساتذہ سب کے سب بطور شہری کے بالکل برابر ہیں، اس میدان میں کسی کی آزادی رائے پر جبری پابندی لگانا بہت بڑا قومی جرم ہے جس کا موثر سد باب ہونا چاہیئے۔

مدرسے کی زندگی میں معاشری انصاف سے کیا مراد ہے؟ اب یہ بات ہر جگہ تسلیم کر لی گئی ہے کہ مدرسہ معاشرے سے الگ تھلگ کوئی خود مختار شے نہیں وہ معاشرے کا آئینہ ہے اگر ہم

پنی قومی زندگی کی بنیاد معاشری انصاف پر رکھنا چاہتے ہیں تو مدرسہ کا نظام کا بھی اسی بنیاد پر تعمیر ہونا چاہیئے، مدرسے کا سارا کام کچھ ایسے مقررہ اصولوں پر انجام پانا چاہیئے جو ہر ایک پر یکساں طور پر لاگو ہوں، اگر صدر معلم یا کچھ معتبر قسم کے استادوں کو کچھ خاص مراعات حاصل ہوں اور باقی ان سے محروم رکھے جائیں تو نتیجہ ایک ایسی زہریلی فضا ہوگی جس میں اساتذہ کی انفرادیت کا گلا گھٹ کر رہ جائے گا، میں نے کئی صدر معلموں کو دیکھا ہے، جو اساتذہ سے تو یہ مطالبہ بڑی سختی سے کرتے ہیں کہ وہ بروقت مدرسے میں آئیں اور آخری منٹ تک اس کی چاردیواری کو نہ چھوڑیں۔ مگر خود اس اصول کی پابندی ضروری خیال نہیں کرتے، مدرسہ لگ جانے کے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد اطمینان سے آئے اور جب جی چاہا واپس چلے گئے۔

اسی طرح تقسیم کار کے معاملے میں اکثر اوقات کسی مقررہ اصول پر کام نہیں کیا جاتا مضامین کی تقسیم کو کچھ واضح، طے شدہ اصولوں کے ماتحت رکھنے کی بجائے اسے اکثر صدر معلم کی کرم بخشی کا ذریعہ بنا دیا جاتا ہے۔ گویا کسی استاد کو کوئی مضمون سونپتے وقت اس کی تعلیمی استعداد اور اس کے طبعی میلان کو نہیں دیکھا جاتا، بلکہ فیصلہ کن امر یہ ہوتا ہے کہ صدر معلم اس کو کون سا مضمون اور کون سی جماعت دینا پسند کرتا ہے، صدر معلم کی اس ذاتی پسند پر جو جو چیزیں اثر انداز ہو سکتی ہیں ان کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک صدر معلم نے اس "غلط بخشی" کے طفیل نویں جماعت کی ریاضی ایک ایسے استاد کے حوالے کر دی تھی جس بیچارے نے السنہ شرقیہ کے راستے سے بی اے پاس کیا تھا، حالاں کہ مدرسے میں قابل تر اور آزمودہ کار استاد موجود تھے، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ صدر معلم اس استاد کو بعض خصوصی خدمات کا صلہ دینا چاہتا تھا، ظاہر ہے کہ ایسا طریق کار ایک بہت بڑا قومی اور اخلاقی جرم ہے جس مدرسے میں اس قسم کے جرائم بلا روک ٹوک جاری رہیں وہاں بیچارے استادوں کے ذاتی اوصاف کے پنپنے کا کیا موقع باقی رہ سکتا ہے! بعض صدر معلم اپنے آپ کو ہر اصول سے بالا سمجھتے ہیں، اور اگر انہیں مجبوراً کچھ اصولوں کا لحاظ رکھنا پڑ جائے تو پھر خفیہ ریشہ دوانیوں سے ایسے حالات پیدا کر لیتے ہیں جن سے ان کی من مانی کارروائیاں

جادو کا پردہ پڑ جائے ۔ مثلاً ایک مدرسے میں یہ طے کر لیا گیا کہ جو استاد کسی جماعت کو انگریزی پڑھائے ، اگر اس کی تعلیمی قابلیت مانع نہ ہو جائے تو سال بسال وہ اس جماعت کے ساتھ ہی بڑھتا جائے ۔ تاآں کہ یہ جماعت آخری سال میں پہونچ جائے ۔ بظاہر یہ اصول بہت معقول تھا ، مگر اس سے صدر معلم کے اپنے مفاد پر براہ راست زد پڑتی تھی ۔ اس نے دسویں جماعت کو انگریزی پڑھانا خود اپنی اجارہ داری بنا رکھا تھا ۔ نویں سے عموماً پچاس فی صدی ایسے لڑکے دسویں میں چڑھائے جاتے تھے جو اس ترقی کے وقت ہی یونیورسٹی کے معیار پر پورے اتریں ۔ انگریزی میں سو فی صدی نتیجہ کے یقین کے بعد صدر معلم کے لئے یہ ڈھنڈورا پیٹنا بالکل آسان ہو جاتا تھا کہ اس کی تدریس لاجواب ہے اور دوسرا کوئی شخص اس کی جگہ نہیں لے سکتا ۔ تاہم یہ خطرہ مسلسل موجود تھا کہ اگر دسویں کے فریق ایک کی بجائے دو ہو گئے تو لا محالہ ایک اور استاد مقابلے میں کام کرے گا ، اور اس طرح اس روایتی ڈھول کا پول کھل جائے گا ، چناں چہ اب صدر معلم کی ساری کوشش یہی رہی کہ دسویں کے دو فریق نہ بننے پائیں ، نویں میں طلبا کی تعداد سوا سو سے بھی بڑھ جاتی رہی ، ہر سال خود صدر معلم کی طرف سے یہ چرچا بھی کیا جاتا رہا کہ اگلے سال سے دسویں کے دو فریق ضرور کر دیئے جائیں گے مگر دو فریق نہ ہونے تھے نہ ہوئے ۔ اب اس صورت میں اس حساس طبع استاد کی واردات قلبی کا اندازہ کیجیے جو سال بسال نویں جماعت کو صرف اس لئے پڑھاتا ہے کہ سال کے خاتمہ پر صدر معلم اس کی جماعت کے کوئی آدھے طلبا ترقی کے لئے چھانٹ لیا کرے اور بہت سے ایسے طالب علم جن کے متعلق استاد کو یقین ہو کہ وہ سال بھر کے کام کے بعد یقیناً کامیاب ہو جائیں گے نویں میں فیل کر دیئے جائیں ، اسے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ اگر اسے موقع دیا جائے تو وہ کئی غریب طالب علموں کی عمر عزیز کا ایک قیمتی سال بچا سکتا ہے ۔ مگر اسے یہ موقع نہیں دیا جاتا ۔ اسے اس اہم قومی خدمت سے باز رکھنے کے لئے طرح طرح کے جوڑ توڑ کئے جاتے ہیں ۔ کیا ایسی فضا اعلیٰ ذاتی اوصاف کی پرورش کے لئے سازگار ہو سکتی ہے ؟

غرض معاشری انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مدرسے کے انتظامی امور مطلق العنانی یا خفیہ جوڑ توڑ سے نہیں بلکہ کچھ واضح اور معقول اصولوں کے مطابق طے کئے جائیں اور یہ اصول سب پر بالکل عیاں ہوں

صرف یہی وہ صورت ہے جس پر ہر استاد کو یہ احساس ہوگا کہ جس خدمت کے لئے وہ موزوں ہے اسے اس کا جائز موقع دیا جا رہا ہے ۔ پس وہ اپنے کام کو پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دے گا۔ اور یہ چیز اس میں نہایت قیمتی ذاتی اوصاف پیدا کرنے والی ثابت ہوگی۔

مواقع کی یکسانیت معاشری انصاف کا ایک قدرتی نتیجہ ہے۔ بعض صدر معلم اساتذہ میں سے کچھ لوگوں کو خاص ترجیحی سلوک کے لئے چن لیتے ہیں اور یہ ترجیحی سلوک عموماً ذاتی مصالح کی بنا پر ہوتا ہے ، ظاہر ہے کہ علمی اور ذہنی اعتبار سے تمام اساتذہ ایک سطح پر نہیں ہو سکتے۔ اس لئے زیادہ قابل لوگوں کو کام کرنے کے زیادہ مواقع دینے پڑیں گے ، یہ شے مواقع کی یکسانیت کی ضد نہیں ، بالکل عین اس کے مطابق ہے ، اس اصول کا منشا صرف اس قدر ہے کہ ہر استاد کو پوری آزادی ہو کہ مدرسہ کی زندگی میں وہ جس بلندی تک پہونچ سکتا ہے بلا روک ٹوک پہونچ جائے ، صدر معلم کسی کا راستہ نہیں روکے گا ۔ اگر کوئی شخص دوسروں سے پیچھے رہ جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری اس کی اپنی نطری صلاحیتوں یا اس کے اپنے تساہل پر ہو ، صدر معلم کی جنبہ داری پر نہ ہو۔

تدریسی کام کی تقسیم کو چھوڑ کر باقی امور مثلاً چھٹی وغیرہ کے معاملے میں سب کے ساتھ ایک سا سلوک ہونا چاہئے ، بعض صدر معلم اس معاملے میں سخت جانبداری سے کام لیتے ہیں ، اس کی وجہ خواہ کچھ بھی ہوں ، اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض اساتذہ جب چاہیں اور جس قدر مفت چاہیں حاصل کر لیتے ہیں ، اور ان کے مقابلے میں بعض بیچاروں کے لئے ایک دن کی رخصت حاصل کرنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہو جاتا ہے ، اول الذکر طبقے میں کچھ تو منہ چڑھے لوگ ہوتے ہیں اور کچھ ایسے لوگ جن سے صدر معلم کسی نہ کسی وجہ سے خائف رہتا ہے ، ان دونوں گروہوں کو چھوڑ کر باقی لوگ یعنی ایسے اساتذہ جو نہ تو گھٹیا خوشامد کے عادی بن سکتے ہیں اور نہ سینہ زوری کے ، بیچارے معمولی مراعات سے بھی محروم رہتے ہیں ، مجھے خود اچھی طرح اپنا واقعہ یاد ہے ۔ سیکنڈ ماسٹر کو نیا مکان تعمیر کرنا تھا چنانچہ اس نے طبی سند پیش کر کے دو مہینے کی رخصت کا مطالبہ کیا ، صدر معلم کو سب چیز کا اچھی طرح علم تھا ، مگر یہ رخصت بلا حیل و حجت مل گئی ، اس سے اگلے سال میں نے طبی وجوہ پیدا

کی چھٹی مانگی۔ طبی سند پیش کی گئی۔ مقامی اسسٹنٹ سرجن نے اس کی تصدیق بھی کر دی۔ مگر صدر معلم نے مخالفت میں زمین و آسمان ایک کر دیا اور مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ رعایت مدرسے کے سیکنڈ ماسٹر کو مل سکتی ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ باقیوں کے لئے بھی عام ہے!

اسی طرح ایک دفعہ چند استاد یونیورسٹی کے امتحان ستمبر میں شریک ہوئے، اس خیال سے کہ یہ تعطیلات کا زمانہ ہے اس لئے امتحان میں شمولیت تدریسی کام میں حارج نہ ہوگی۔ ان میں سے کسی نے بھی محکمانہ اجازت حاصل نہ کی، لیکن ان سب میں سے مواخذہ کے لئے صرف ایک کو چن لیا گیا۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کے واقعات فسطائی نظام حیات میں تو سمجھ میں آ سکتے ہیں، لیکن ایک ایسا معاشرہ جو جمہوری ہونے کا دعویدار ہو ان میں ان کا رونما ہونا، حد درجہ قابل مذمت ہے۔ جن واقعات کا میں نے ذکر کیا ہے وہ سب کے سب زمانہ قبل از تقسیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاہم یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ان کا تعلق ایک ایسے مدرسے سے ہے جس کا صدر معلم اساتذہ کی ایک مشہور انجمن کا کرتا دھرتا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کس تلخی کے ساتھ یہ خیال رہ رہ کر میرے جی میں آیا کرتا تھا کہ جن استادوں کو شخصی آزادی کے ابتدائی حقوق بھی حاصل ہیں، ان کے نام پر ایک انجمن کا ڈھونگ رچانا صریح بددیانتی نہیں تو کیا ہے! معلوم نہیں آج حالات کیا ہیں تاہم میں بہت دور زمانے کی بات نہیں کر رہا، غالباً ابھی ہمارے مدرسین کے حالات ملازمت میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی، عہد غلامی میں ضبط و انتظام کے نام پر استادوں کی انفرادیت کو ختم کر دیا جاتا تھا: وہ روایات ابھی ختم ہوتی نظر نہیں آتیں۔

لیکن اگر ہم نئی پود کو بلند جمہوری اور اسلامی اقدار کا خوگر بنانا چاہتے ہیں تو مدرسے کا سارا ماحول سراپا جمہوری ہونا چاہیئے، مدرسے کے ہر استاد کو خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا یہ احساس ہونا چاہیئے کہ اسے آزادی ضمیر معاشرتی انصاف اور مواقع کی یکسانیت حاصل ہے، خود اساتذہ کے لیے اس ابتدائی شخصی آزادی کا مسئلہ تنخواہ کے مسئلے سے کسی طرح کم اہم نہیں، اس مسئلہ کی اہمیت کا احساس ان اساتذہ کو زیادہ شدت کے ساتھ ہوگا جن کی ذاتی عصمت ابھی نئی برین فضا کے سبب

نندفساد نہیں ہوتی۔

آخر اساتذہ کے لئے اس ابتدائی شخصی آزادی کی ضمانت کیوں کر ہو۔ ظاہر ہے کہ محکمہ کوئی ایسا ضابطہ نافذ نہیں کر سکتا جو اس آزادی کا تحفظ کر سکے۔ ابتدائی شخصی آزادی ایک ایسی لطیف قدر ہے جس کی پاسبانی محض ذاتی کوشش ہی کر سکتی ہے۔ اگر ہمارے اساتذہ اجیروں کی سطح سے بلند ہو کر کچھ قیمتی ذاتی اوصاف پیدا کرنا چاہتے ہیں تو انہیں فوراً ایک ایسی انجمن بھی بنانی چاہیے جو ابتدائی شخصی آزادی کے تحفظ کے لئے اجتماعی کوشش کرے۔ یہ انجمن قدرتی طور پر خالصتہً نائب مدرسوں پر مشتمل ہو گی۔ اگر صدر معلمین کو اس میں داخل کر لیا گیا تو اس انجمن کی ساری کارکردگی محض نمائشی الفاظ تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔ تاہم یہ انجمن صدر معلموں کی دشمن نہ ہو گی، وہ اپنے اراکین سے بہت سختی کے ساتھ یہ مطالبہ کرے گی کہ اپنے اپنے صدر معلموں کو انتظامی فرائض کی بجا آوری میں پوری پوری مدد دیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ انجمن اس بات کا بندوبست بھی کرے گی کہ اس کے اراکین آزادیٔ ضمیر، معاشری انصاف اور یکساں مواقع جیسے بنیادی حقوق سے کسی صورت میں محروم نہ کئے جائیں، یہ کام ایک یگانہ قومی افادیت کا حامل ہو گا کیوں کہ اس سے ہمارے عام اساتذہ ایسے بلند اور ذمہ دارانہ ذاتی اوصاف کے مالک بن جائیں گے، جو بالآخر معاشرے کے لئے شہریوں میں منعکس ہوں گے۔

امیل یا روسو کی تعلیم

توقیر مرزا رزتی — مسلسل ۲۳

لیکن پڑھنے کی بجائے شروع شروع میں ہم ان خیالات کو سن سکتے ہیں۔ اس لئے کہ گیت آنکھ کی بجائے کان کے ذریعہ زیادہ اچھی طرح یاد ہوتا ہے، علاوہ ازیں کامل موسیقی سیکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ گیت ہم خود ہی موزوں کریں اور خود ہی گائیں، ان میں پردوں کو ساتھ ہی ساتھ اکٹھا سیکھنا ضروری ہے، ورنہ کامل موسیقی کا علم ہمیں کبھی حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ ابتداءً اپنے نوآموز گوئیے کو آپ نیت میں شُد اور ادجاگ تال اور سُم کی دھرادپدون کی مشق کرائیں اور پھر ان دھرو پدوں کو نیت کے سیدھے سادے راگوں میں دھروائیے، پھر اسے ان کے باہمی تعلقات مبنی بر صحت سُم کی تعلیم دیجئے اور یہ کام تال دسم کے صحیح انتخاب کے ذریعہ بآسانی انجام پا سکتا ہے، کسی حال میں بھی آپ اسے کوئی ایسی چیز نہ بتائیں جو غیر معمولی یا جو جذبات اور اداکاری (نرت) کی طالب ہو۔ ایک سادہ اور سریلا گیت جو عام پردوں کے چھندن پر مبنی ہو اور جس کا آغاز نہایت صاف اور اُدجاگر ہو بہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ بآسانی پکڑا اور ساتھ دیا جا سکتا ہے لہٰذا آواز یا گلا اور کانوں کو سدھانے کے لئے اسے ہمیشہ طنبورے، سارنگی یا ستار پر گوانا چاہیے۔ ہم اپنے گیتوں کے انہی سروں کو زیادہ خوبی کے ساتھ ادا کرتے ہیں جنھیں ہم زیادہ امتیازی شان دینا چاہتے ہیں کوٹ تال الاپنے کے رواج کی یہی وجہ ہے۔ پردوں میں ایک دوسرے میں امتیاز قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان پردوں کے مقررہ نام اور سروقیاں ہوں، چنانچہ اسی لئے سروں کے نام اور حروف ابھی بھی باجے کے پردوں درگرا ما کے سروں سے متعلق کر دیئے گئے ہیں مثلاً = C

نوٹ: مترجم۔ سروں میں سند BASE OR LOWER) HIGHER مدھم (MIDDLE) کو کہتے ہیں۔

= پا = (A) معینہ غیر متبدل اور ہمیشہ ایک ہی پردے سے نکلنے والی آواز کو ظاہر کرتے ہیں۔ کھرج =
DOOR) اور دھیوت LA بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ کھرج ہمیشہ سا گراما کا آنش یا سا گما کا
کھب ہوتا ہے اور دھیوت ہمیشہ ما گراما کا آنش یا ساگراما کا دھیوت ہوتا ہے، پس اس طرح حروف
ے طریقہ موسیقی کی مقررہ اصطلاحوں کو ظاہر کرتے ہیں اور ان کے اجزا متعلقہ پردوں کی ہم خیل قرابت کی
ادف اصطلاحوں کو حروف پیانو یا ہارمونیم باجے کے پردوں کو بتاتے ہیں اور ان کے اجزا اگرامول کے
رح ظاہر کرتے ہیں۔ فرانسیسی موسیقی والوں نے ان میں ایک عجیب خلط ملط کر دی ہے۔ انھوں نے اجزائے
رف کو حروف کے ساتھ ملا دیا ہے۔ درآں حالیکہ پیانو کے پردوں کی علامتوں کے لئے انھوں نے ہمیں
دیے ضرورت معیار بتائے ہیں مگر گراماؤں کی چھندوں کے لئے ان لوگوں نے کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے
س لئے "سا"، اور "سر یا کھرج" ان کے نزدیک ہر حالت میں ایک ہی چیز ہیں۔ ایسا نہ ہے اور نہ ہونا چاہئے
ور اگر ایسا ہے تو بھلا "سا" کا کیا موضوع ہے، اسی وجہ سے ان لوگوں کا سرگم الاپنے کا طریقہ بلا وجہ
نہایت مشکل ہے اور نہ اس سے ذہن ہی کو کوئی مفہوم حاصل ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اس طریقے
میں مثال کے طور پر کھرج (DOORUT) اور گندھار (ME) کا مفہوم جیمڑ ہے گندھار ما - آرے
گندھارما۔ تیور گندھارما یا کوئی گندھارما ہی ہوگا۔ یہ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ جس
ملک میں علم موسیقی پر بہترین کتابیں شائع ہوتی ہوں، اسی ملک میں علم موسیقی کا سیکھنا دشوار ترین ہو جائے۔
ہمیں اپنے شاگرد کے لئے سیدھا سادہ اور واضح طریقہ اختیار کرنا چاہئے، اسے صرف دو گرام بتانے
چاہئیں، جن کا تعلق پائدار ہو اور جو ایک ہی علامت کے ذریعے ظاہر کئے جا سکتے ہیں۔ چاہے وہ گائے
چاہے وہ بجائے اسے بارہ سرتیوں میں سے کسی ایک سرتی پر اپنا گرام قائم رکھنا چاہیے۔ تاکہ وہ
سرتی اس کے لئے کھرج کا کام دے اور پھر چاہے وہ رکھب (D)، کھرج (C) یا پنچم = (G) میں چھیڑے
لیکن اس کا اختتام حسب گرام ہمیشہ کھرج = (DORRUT) یا دھیوت = LA پر ہی ہونا چاہئے
اس طریقے سے وہ آپ کا مطلب سمجھ جائے گا اور گانے بجانے کا حقیقی تعلق ذہن نشین کر لے گا۔
اس کا طرز عمل بہتر اور رفتار ترقی تیز تر ہو جائے گی۔ فرانسیسی جسے قدرتی سرگم کہتے ہیں اس سے زیادہ

مضحکہ خیز اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی ہے، یہ سرگم حقیقی معنوں کو نظر انداز کر کے ان کی جگہ دوسرے معنی استعمال کرنے پر مشتمل ہوتا ہے جو ہیں اور بھی بھٹکا دیتے ہیں، اگر گرام الٹ دیا جائے تو منقلب سرگم سے زیادہ قدرتی کوئی چیز نہیں ہو سکتی ہے، موسیقی کے متعلق میں کافی اور کافی سے بھی زیادہ بیان کر چکا ہوں، اسے جب تک کھیل تفریح سے زیادہ اہمیت نہ دی جائے، آپ جس طرح چاہیں سکھائیں ؎۱

غذا | اپنے جسمانی تعلقات کی حد تک ہم غیر اجسام کی حالت۔ ان کے اوزان۔ ان کی شکل اور رنگ روپ۔ کثافت۔ جسامت۔ فعل حرارت۔ استحکامت اور ان کی نقل و حرکت سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔ ہم یہ جان چکے ہیں کہ کس چیز سے قربت اور کس چیز سے بعد حاصل کیا جائے ان اجسام کی مزاحمت دور کرنے کے لئے کیا کیا جائے یا اپنی ذات کو ان سے محفوظ رکھنے کے لئے ان کا مقابلہ کیوں کر کیا جائے، لیکن یہ سب کچھ ابھی ناکافی ہے، ہمارا جسم برابر خراب و خستہ ہوتا رہتا ہے اسے مسلسل تر و تازہ رکھنے کی ضرورت رہتی ہے اور گو دوسرے مادوں کو اپنے مادے میں تبدیل کر لینے کی ہم میں قوت موجود ہے لیکن اس کے متعلق ہمارا انتخاب، بڑی لاپرواہی کے ساتھ ہوتا ہے ہر ایک چیز انسان کی غذا نہیں بن سکتی ہے اور جو چیزیں اس کی غذا بن سکتی ہیں وہ سب کی سب انسان کے لئے ہر وقت مساویانہ طور پر موزوں اور مناسب نہیں ہوتی ہیں، ان کا انحصار اس کے نسلی جیسے۔ سکونت ملک اور اس کی انفرادی طبیعت ہوتا ہے اور اس طرز معاشرت پر ہوتا ہے جو اس کا

؎۱ ہندی سرگم = سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ انگریزی گانے کی سرگم ڈو = DORRNT (RE) = رے (ME) = ما = نا i NA = سول i SOL = لا i LA = سا یا ٹی i CORT باجوں کی انگریزی سرگم C.D.E.F.G.A.B. ہیں گانے اور باجے دونوں کی سرگم ایک ہی ہے۔ ساگر اماکو انگریزی میں MAJOR SCALE اور ماگراماکو MINOR SCALE کہتے ہیں۔ سارے گاما پا دھانی پردوں کے ناموں اور اوزاروں کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اور کھرج (سر) ۲۲ ہیں، یعنی رکھب چار۔ گندھار سات، مدھم نو ہیں، پنچم تیرہ۔ دھیوت سترہ۔ نکھاد بیس۔ یہ سب سرتیوں کی تعداد کے لئے استعمال ہوتے ہیں، سرتیاں ۲۲ ہیں۔

دو سرتی (SEMI TONE) تین سرتی MAJOR 3rd سات سرتی (MINOR) 3rd چھ سرتی FOURTH نو سرتی

چار سرتی (TONE OR LEADING) سترہ سرتی (SIXTH) تیرہ سرتی۔ (FIFTH)

حل اسے اختیار کرتا ہے۔

اگر ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا پڑتا جبکہ ہمارا تجربہ ہمیں معتدل غذا کو پہچاننا اور اسے انتخاب کرنا سکھا دیتا تو ہم شاید بھوک کی شدت سے یا زہر کھا کر اپنی جان دے دیتے۔ لیکن کارساز حکیم و دانا نے جس نے کہ حیاتیوں کے لئے ہمیش ہی کو حفاظت خود اختیاری کا ایک ذریعہ بنا دیا ہے، ہمیں ذائقے کے ذریعہ بتا دیا ہے کہ کونسی غذا معدے کے لئے موافق اور قابل قبول ہو سکتی ہے، خدائی حکومت میں مخلوق عالم کے لئے ذاتی بھوک سے بہتر کوئی دوسرا طبیب یا ڈاکٹر موجود نہیں ہے اور بلا شبہ اس سلطنت کے اندر بہترین ذائقے کی غذا ہی انسان کے لئے بہترین اور خوشگوار غذا ہوتی ہے۔

یہی نہیں کہ ہمارا خالق یکتا صرف انہی ضروریات کو مہیا فرماتا ہے جو اس نے ہم میں پیدا فرمائی ہیں بلکہ وہ تو ان خواہشات کو بھی پورا کر دیتا ہے جو خود ہماری ہی پیدا کردہ ہوتی ہیں، اور یہ صرف ہماری ضروریات اور خواہشات کا صحیح توازن قائم رکھنے کے لئے ہی ہے کہ اس نے طرز معاشرت کے ساتھ ہی ساتھ ہمارا ذائقہ بھی بدلنے اور تغیر ہونے والا بنا لیا ہے، ہم قدرتی احکام سے جس قدر گریزاں ہوتے ہیں قدرتی ذائقوں سے اتنے ہی محروم ہو جاتے ہیں، یا یوں کہیئے کہ عادت فطرت ثانیہ بن کر اس قدر مکمل طور پر ہماری حقیقی فطرت کی جگہ حاصل کر لیتی ہے کہ ہم کلیتہً قدرت کے علم ہی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کامل ترین فطرتی ذائقہ سادہ ترین ہی ہونا چاہیئے تاکہ وہ بآسانی تبدیل ہو سکے لیکن جب ہمارے توہمات کی سان اس پر رکھ دی جاتی ہے اور اس پر نشو و نما ہو جاتا ہے تو پھر وہ ایک ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے جو بالکل ناقابل تبدیلی ہوتی ہے، جو شخص کسی ایک ملک کی معیشت کا بالذات پابند نہ ہوا ہو وہ ہر ملک کی طرز معاشرت سیکھ سکتا ہے، لیکن جو کوئی کسی خاص ملک کی عادتیں اختیار کر لیتا ہے وہ انھیں کبھی بدل نہیں سکتا ہے۔

ذائقہ

ہمارے جملہ حواسوں اور بالخصوص ذائقے کا یہی حال ہے، دودھ ہماری پہلی غذا ہے جس مزیدار اور لذیذ ذائقہ اشیاء کو ہم ابتداءً ناپسند کرتے ہیں آہستہ آہستہ ہم ان کے

ہم ان کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ ابتدائی انسان کی غذا پھل ترکاریاں اور ساگ پات تھیں۔ مابعد نمک مرچ مسالے وا، اور بھنا ہوا گوشت اس کی غذا بن گئی۔ ایک دیہاتی آدمی جب کبھی پہلی مرتبہ شراب چکھتا ہے منہ بناتا اور اسے تھوک دیتا ہے، بلکہ ہم شہریوں تک میں جس شخص نے بیس سال کی عمر تک خود شراب نہ چکھی ہو وہ اس کا عادی نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر ہمیں بچپن ہی میں شراب کا استعمال نہ سکھایا جائے۔ تو ہم سب کے سب نہایت سلیم الطبع اور مطمئن لوگ بن جائیں، اس میں شک نہیں کہ جس قدر ہمارے ذائقے سادہ ہوں گے اتنے ہی وہ عام ہوں گے۔ زیادہ مسالے دار غذائیں اکثر ناپسند ہی کی جاتی ہیں لیکن کیا آپ کو آج تک کوئی ایسا آدمی بھی ملا جو پانی اور روٹی کو ناپسند کرتا ہو؟ قدرت کی منشا یہی ہے، اس لئے ہمارا اصول بھی یہی رہے گا کہ جب تک بچے کا ابتدائی ذائقہ محفوظ کیا جا سکے بچے کو نہایت ہی سادہ اور معمولی غذا ہی دی جائے۔ نیز اور بہا تر ذائقوں سے اس کی زبان کو نا آشنا ہی رکھئے۔ اور اسے ہمیشہ ایک ہی قسم کی غذا نہ دیجئے۔

میں فی الحقیقت یہ نہیں معلوم کرنا چاہتا کہ یہ طرز معاشرت صحت بخش ہے یا نہیں۔ میرا مطمح نظر ایسا بالکل نہیں ہے، بلکہ مجھے بس اتنا ہی جاننا کافی ہے کہ یہ طرز معاشرت فطرت کے قریب تر ہے، اور دیگر حالات سے بخوبی موافقت کر سکتی ہے، میری رائے میں وہ لوگ بڑی غلطی پر ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ بچوں کو وہی غذا دینی چاہیئے جو وہ بڑے ہو کر استعمال کریں گے، حالاں کہ جب ان کی طرز معاشرت ہی وہ نہ رہے گی تو پھر ان کی غذا وہی کیوں کر رہے گی؟ ایک شخص جو محنت مشقت مصائب اور پریشانیوں سے عاجز اور درماندہ ہو جاتا ہے، اسے مزید غذا کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ اس کے دل و دماغ کو مزید تر و تازگی حاصل ہو سکے، ایک بچہ جو اپنے کھیلوں سے خود بخود تر و تازہ ہوتا رہتا ہے۔ اسے نشوونما کے دور میں زیادہ مقدار غذا کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس میں رس پیدا ہو۔ علاوہ بریں ایک سن رسیدہ شخص کا کام کاج، مصروفیتیں اور سکونت مستقل ہوتی ہیں، لیکن ایک بچے کے مقدر کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہوگا؟ لہٰذا بچے کو معینہ طور پر کسی جانب آشنا نہ جھکنے دینا چاہیئے کہ بوقت ضرورت وہ اپنے طبعی میلان کو بلا دقت تبدیل نہ کر سکے۔ اس کی تربیت اور پرورش ایسی نہ ہونی چاہیے کہ

غیر ممالک میں اگر اس کے ہمراہ کوئی فرانسیسی باورچی نہ ہو تو وہ بھوکا ہی مر جائے۔ اسے زندگی مابعد میں یہ کہنے کا موقع دملنا چاہیے کہ کھانے کے قابل صرف فرانس ہی میں غذا میسر ہو سکتی ہے۔ یہ تو اپنے وطن کی تعریف کرنے کا ایک نیا ڈھنگ ہے۔ میں تو اس کے برخلاف یہ کہتا ہوں کہ فرانس والے ہی وہ لوگ ہیں جو عمدہ غذا سے ناآشنا اور محروم ہیں۔ اس لئے کہ ماکولات کھانے کے قابل بنانے کے لئے انھیں اس قدر فن کی ضرورت پڑتی ہے۔

تمام مختلف حواسوں میں عموماً ذائقہ ہی صرف وہ حس ہے کہ جس سے ہم بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ لہٰذا محض ماحولی اشیا کا خیال رکھنے کی نسبت اس امر کا فیصلہ کرنا ہمارے لئے زیادہ ضروری ہوگا کہ کونسی چیز ہماری فی الواقع جزو بدن بن سکتی ہے۔ بہت سے معاملات میں صرف چھونے سننے اور دیکھنے سے کسی قسم کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا ہے۔ لیکن ذائقے کو تقریباً ہر چیز متاثر کرتی ہے۔ علاوہ بریں اس حس کا تمام تر عمل مادی اور طبعی ہوتا ہے۔ جملہ حواسوں میں صرف یہی ایک حس ہے جس میں تصورات کا دخل نہیں ہے یعنی ذائقے کی حس میں کم از کم قیاس کو تو بہت ہی کم دخل ہے۔ حالاں کہ تعاملی اور دیگر حواسوں کے تاثرات کے اندر اکثر اخلاقیات کی رہ نمائی بھی کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسے زندیق اور عیش پسند دل یا شہوانی اور حقیقتاً ذکی الحس طبائع جنھیں دوسرے حواس بآسانی متحرک کرتے رہتے ہیں، ذائقے سے عموماً لاپرواہی رہتے ہیں۔ اس چیز سے جو بظاہر ذائقے کو دوسرے حواس کا تابع بناتی ہے اور ہمارے طبعی رجحان کو حواس کی طرف ہوتا ہے ذلیل کرتی ہے، میں بالکل مغائر نتیجہ اخذ کرتا ہوں یعنی یہ کہ بچوں کی رہبری کا بہترین ہادی ان کا ذائقہ ہی ہوتا ہے، حرص تکبر اور نمود کی نسبت زیادہ بہتر ہوتا ہے، اس لئے کہ حرص ایک ایسی فطرتی خواہش ہے جس کا انحصار بالراست حیات ہی پر ہوتا ہے اور تکبر و نخوت محض ان روایات اور رسومات کا نتیجہ ہوتی ہیں جو انسانی توہمات کی باندیاں ہر قسم کی خرابی اور بدی کی بنیاد ہوتی ہیں۔ یقین مانیے کہ ایک بچہ بہت جلد ہی کھانا کھانے کی فکر کو ترک کر دیتا ہے اور جب اس کا دل زیادہ معروف ہوتا ہے تو اس کا ہاضمہ بھی سست ہو جاتا ہے، پس جب وہ سن رسیدہ ہوگا تو دیگر شدید اور زبردست خواہشات کا ہجوم حرص کو تو نکال باہر کرے گا۔ لیکن کبر و نخوت کو اعد بھی

ہو جاتی ہے، اس لئے کہ تمام دنیوی خواہش دیگر خواہشوں کے لئے ہی پیدا ہوتی ہیں یا ان سے ہی
ان سب کو ہضم کر جاتی ہے، میں نے اکثر ایسے لوگوں کا مطالعہ کیا ہے جو عمدہ غذا کی طرف زیادہ متوجہ
رہتے ہیں اور صبح اٹھتے ہی جن کو پہلی فکر یہی ہوتی ہے کہ آج کیا چیز کھانی چاہئے، یہ لوگ اپنے
کھانے پینے کی تفصیلی پالیبس (PALYSIUS) کی کشتی کی تفصیل کے مانند بیان کرتے ہیں۔ میں نے
دیکھا ہے کہ یہ چہل سالہ عمر والے پیران نابالغ ہوتے ہیں جن میں نہ طاقت ہوتی ہے، نہ پھرتی ہمیں ان
اور غبی لوگوں پر زیادہ کھانا کھانے کی ہی پھٹکار ہوتی ہے۔ ایک پیٹو کا دماغ ہمیشہ اس کی زبان کے ذائقے
کے اندر ہی رہتا ہے، وہ سوائے کھانے کے دوسرا کوئی کام ہی نہیں کر سکتا ہے، وہ اس قدر احمق
اور نالائق ہوتا ہے کہ اس کا ٹھکانہ ہمیشہ محض دسترخوان ہی رہتا ہے اور محض کھانے ہی کی قسمیں
اس کے لئے ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن سے کہ وہ کسی قسم کی واقفیت رکھتا ہے، بغیر کسی ماتم کے آپ بچے کو
اپنے کام میں مشغول رہنے دیجئے، ہمارے اور اس کے دونوں ہی کے لئے اسی میں بہتری ہے،
اس بات کا خوف کرنا تو بڑی کم ہمتی یا تھوڑدلی کی بات ہے کہ بچے کے دل میں جو کسی زیادہ بہتر
کام کے لئے ہوتا ہے کہیں حرص اور لالچ گھر نہ کر بیٹھیں، بچے کو اپنے کھانے کے سوا کبھی ہرگز کسی اور چیز کی
پرواہ نہیں ہوتی ہے، کسی دوسری طرف بچہ قطعاً دھیان ہی نہیں دھرتا ہے، غذا تو ہر قسم کی اچھی
ہی ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں دوسری طرف بھی دھیان رکھنا ضروری ہے، پھر بھی میں اس پست آلادگی کو
نادانی کے ساتھ استعمال کرنے کی آپ کو ہرگز اجازت نہ دوں گا۔ عز و وقار کے مقابلہ میں جو صالح عمل کا
ثمرہ ہوتا ہے۔ میں آپ کو نفیس اور لذیذ چیزوں پر ہرگز اعتماد نہ کرنے دوں گا۔ لیکن بچپن کھیل کود اور
تفریح کا دور ہوتا ہے۔ اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ محض جسمانی ورزشوں کا صلہ مادی اور معقول کیا
نہ ہوگا۔ پس میں یہ کہتا ہوں کہ کوئی بچہ اگر کسی درخت کی پتنگ پر رکھی ہوئی ایک ٹوکری کو دیکھ کر اپنی
گوپن یا غلیل کے ذریعہ اسے اتار لے تو کیا یہ انصاف نہ ہوگا کہ اس میں کا کچھ حصہ اسے بھی
مل جائے اور ایک عمدہ ناشتہ جس کے حصول میں اس کی طاقت صرف ہوئی ہے اس کی تلافی کر دے
اسپارٹا کا ایک نوعمر سپوت دوں کے خوف کا مقابلہ کرتے ہوئے اگر کسی باورچی خانے میں بہت ہمت سے

سامنے داخل ہوکر ایک لومڑی کے بچے کو چرا کر اور اپنے دامن کے اندر چھپا کر لے آئے اور وہ لومڑی کا بچہ اسے اندر ہی اندر اس قدر نوچے اور کاٹے کہ وہ لہولہان ہو جائے اور وہ پکڑے جانے کی شرمندگی کے باعث اپنی آنتوں کو بغیر چوں وچرا اور تیوری پر بل ڈالے کتروا دے تو کیا اب اس کے لئے یہ جائز نہ ہوگا کہ اس مال غنیمت کو اپنے قبضے میں رکھے، اور جس شکار نے اسے چبایا ہوا سے وہ خود کھا جائے۔ عمدہ کھانا ہمیشہ کسی کام کا صلہ نہ ہونا چاہیئے لیکن بعض بعض وقت ایسی سعی کا نتیجہ ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے جو اس کے حصول کے لئے کی گئی ہو جس کیک کو میں پتھر پر رکھا کرتا ہوں اسے اسمٰعیل تیز دوڑنے کا انعام خیال نہیں کرتا بلکہ وہ یہی جانتا ہے کہ اس کیک کو حاصل کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ سب سے پہلے اس مقام پر پہونچ جایا جائے۔

اس سے سادہ غذا کے اصولوں کے متعلق میری کوئی تردید نہیں ہوتی ہے۔ کیوں کہ بھوک کی ترغیب کے لئے بچے کی اشتہا میں ہیجان پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ آپ کو چاہیئے کہ اس کو محض سیر کر دیں، آپ معمولی سے معمولی اشیاء کے ذریعہ بھی اشتہا کو مطمئن کر سکتے ہیں، بشرطیکہ بچوں کا ذائقہ نفیس بنانے کی کوشش نہ کی جائے، دائمی اشتہا جو ان کی بالیدگی کی ضروریات کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ ان کے لئے بہترین سالا مہیا کرتی ہے، پھل دودھ اور کیک جو معمولی روٹی سے ذرا بہتر ہو اور سب سے بڑھ کر ان اشیا کو استعمال کرانے کی معقول ترکیب ایسے ذرائع نہیں ہیں کہ ان کے ذریعہ کسی مزیدار چیز کے ذائقے سے آشنا اور ان کی اپنی خوراک سے بیزار کئے بغیر بچوں کے فلسفہ کی رہنمائی ہم دنیا کے پرلے کنارے تک کر سکتے ہیں۔

گوشت سے بچوں کی بے اعتنائی اس امر کا ایک ثبوت ہے کہ گوشت کا مزا خلاف فطرت ہوتا ہے، بچے ترکاریوں کی غذا کو ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً دودھ پیسٹری اور پھل وغیرہ کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ پس آپ یاد رکھئے کہ اس فطرتی مذاق کو بدل کر اگر ان کی ذاتی صحت کی خاطر نہ سہی تو کم از کم ان کی خاصیت اور چلن ہی کی خاطر آپ انہیں گوشت خور نہ بنائیے، کیوں کہ اس کا کیا جواب ہے کہ گوشت خور دوسروں کے مقابلہ میں عموماً خونخوار اور ظالم ہوتے ہیں، جو ہر زمانے میں اور ہر مقام پر تسلیم کیا جا چکا ہے

انگریز اپنے مظالم[1] کے لئے مشہور ہیں اور گونڈ[2] اپنی رحم دلی کے لئے، تمام وحشی ظالم ہوتے ہیں، اور یہ میلان طبعی ان کے رسم و رواج کے باعث نہیں ہوتا ہے، بلکہ یہ سنگ دلی گوشت خوری ہی کی وجہ سے ہوتی ہے، یہ لوگ جنگ میں اس طرح جاتے ہیں جیسے کوئی شکاری شکار کو جاتا ہے اور انسانوں سے ایسا سلوک روا رکھتے ہیں جیسا کہ ریچھوں سے سلوک کیا جاتا ہے۔ چناں چہ لندن کی عدالتوں[3] میں کوئی قصائی گواہی نہیں دے سکتا اور نہ جراح کی شہادت قابل قبول ہوتی ہے۔ بڑے بڑے جرائم پیشہ خون پی کر قتل کی تیاری کرتے ہیں، ہومر نے گوشت خور سائکلوپس (CYCLOPS) کو خون خوار اور ہیبتناک آدمی بیان کیا ہے۔ اور کنول کے پھول کھانے والوں کو اس قدر خوش خلق ظاہر کیا ہے کہ جو کوئی تجارت کی غرض سے ان کے پاس چلا جاتا تھا پھر اپنے گھر واپس ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔

پلوٹارک (PLUTARCH) کہتا ہے "آپ مجھ سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ فیثاغورث جنگلی جانوروں کے گوشت سے کیوں پرہیز کرتا تھا۔ لیکن میں خود آپ سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ اولین گوشت خور آدمی کو کتنی بڑی جرأت اور ہمت کی ضرورت ہوئی ہو گی جب کہ اس نے اپنے ہونٹوں کو مقتول کا گوشت لگایا ہو گا اور جس نے مرتے ہوئے جانور کی ہڈیاں اپنے دانتوں سے توڑی ہوں گی اور جس کے سامنے جب کہ نعشیں اور مردہ اجسام رکھے ہوئے ہوں گے اور وہ ان اعضا کو نگل رہا ہو گا

---

[1] میں جانتا ہوں کہ انگریز اپنی انسانیت اور قومی ہمدردی کی خاصیت کے بڑے گیت گاتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں اور خود کو اچھے فضائل کے لوگ مشہور کرتے ہیں، لیکن یہ دعویٰ ان کا فضول اور ناحق کا ہے اور کوئی بھی ان کی بابت ایسا خیال نہیں رکھتا۔

[2] یعنی جو گوشت سے گوروں سے بھی زیادہ اجتناب کرتے ہیں۔ گوروں ہی کی مانند شریف اور نیک طبیعت ہوتے ہیں، لیکن چوں کہ ان کے اخلاق زیادہ منزہ نہیں ہیں اس لئے ان کا طریقہ عبادت بھی زیادہ معقول نہیں ہے، لہٰذا وہ اتنے اچھے آدمی خیال نہیں کئے جاتے۔

[3] میری کتاب کے ایک انگریز مترجم نے مجھے اس غلطی کی طرف متوجہ کیا۔ پس ہم دونوں نے تصحیح کر لی۔ قصاب اور جراح دونوں عدالت میں بطور گواہ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن فوجداری مقدمات میں قصاب جیوری کے رکن نہیں مقرر کئے جا سکتے۔ البتہ جراح مقرر کئے جا سکتے ہیں۔

یہ چند لمحے قبل یہیں میں کی آوازیں نکال رہے ہوں گے۔ دعائیں رہے ہوں گے۔ چلّا رہے ہوں گے اور دیکھ رہے ہوں گے، اس کے ہاتھوں نے ایک ذی روح مخلوق کے سینے میں کیوں کر چھری بھونکی ہوگی؟ اس کی آنکھیں قتل کے منظر کو کیوں کر دیکھ سکی ہوں گی؟ وہ ایک بیچارے عاجز جانور کا ہلاک ہونا۔ بھننا اور ٹکڑے ٹکڑے ہونا دیکھ کر کیوں کر ضبط کر سکا ہوگا؟ وہ اس کے تھرتھراتے ہوئے گوشت کے نظارے کی تاب کیوں کر لا سکا ہوگا؟ کیا اس کی بو سے اس کے معدے کا منہ پھر نہ گیا ہوگا؟ زخموں سے خون صاف کرتے اور اپنی انگلیوں سے اس کے سیاہ اور معیوب دھبے چھڑاتے وقت کیا اس کو نفرت اور تکلیف نہ ہوئی ہوگی۔ اور وہ خوف زدہ نہ ہوا ہوگا؟

۱ ——— "جلی ہوئی کھال جو زمین پر تڑپی ہو

۲ ——— اور سکڑتا ہوا گوشت جو سیخ پر بھنا ہو"

ان دونوں کو آدمی بغیر تھرتھری کے نہیں کھا سکتا کیوں کہ اس کو یہ آوازیں اس کے سینے میں سے آتی ہوئی سنائی دیتی ہیں،

پہلی مرتبہ جب آدمی نے قدرت کی تذلیل کر کے یہ خوفناک غذا تیار کی ہوگی تو اس وقت اس نے بھی یا کچھ اسی کی مانند محسوس کیا ہوگا، یعنی جبکہ پہلی مرتبہ زندہ مخلوق کھانے کی اشتہا محسوس کر کے اس جانور کو کھانا چاہا ہوگا جو تھوڑی دیر قبل چیر رہا ہوگا، اور جب اس بھیڑ کو جو اس کے ہاتھ چاٹا کرتی ہوگی اس نے قتل کر کے اعضا اعضا علیحدہ اور ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا حکم دیا ہوگا۔ قابل حیرت تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس بے دردی کی ابتدا کی نہ کہ وہ جو اس سے کنارہ کش ہوئے ہیں اور پھر ابتدائی انسانوں کے لئے تو ایک حد تک معقول عذر بھی موجود تھے جواب ہمارے لئے موجود نہیں ہیں اور اس وقت ان عذروں کی عدم موجودگی ہی ہماری بے رحمی اور وحشی پن کو سوگنا زیادہ کر دیتا ہے۔

دورِ حاضر کے لوگوں سے ابتدائی آدمی کہتا ہے "دیوتاؤں کے منظورِ نظر محبوب فانی انسان ہمارے زمانے کا اپنے زمانے سے مقابلہ کر اور دیکھ کہ تو کس قدر خوش حالی اور عیش و عشرت میں بسر کر رہا ہے، اور ہم کس قدر بدبخت اور مصیبت زدہ تھے، اس وقت زمین نئی نئی وجود میں آئی تھی ہوا مرطوب اور

ہماری تھی اور موسموں کا کوئی نظام قائم ہوا تھا۔ کرۂ ارض کی زمین پر تقابلی سطح بدلنے والے میدانوں کی روشوں کے نیچے غرق تھی اور جھیلوں، تالابوں اور بے تحاشا دلدلوں سے پٹی پڑی تھی، مابقی بیچ گھنے جنگلوں اور لق و دق صحراؤں سے گھرا ہوا تھا۔ کوئی عمدہ قسم کا میوہ یا پھل کہیں پیدا نہ ہوتا تھا نہ ہمارے پاس زراعتی آلات تھے اور نہ ہم ان کے استعمال سے واقف تھے۔ اور جن لوگوں نے کبھی کچھ بویا ہی نہ تھا ان کے لئے در فصل کا کبھی وقت ہی نہ آتا تھا چناں چہ بھوک ہم کو ہر وقت گھیرے رہتی تھی، جاڑوں میں درختوں کی چھالیں اور گھاس ہی ہماری عام غذا تھی، سبز درختوں اور جھاڑیوں کی جڑیں ہماری تقاریب کا دعوتی سامان اور پھر جب لوگوں کو ساری کا پھل۔ اخروٹ۔ چلغوزے، بادام جوز، جائفل اور بلوط کے پھل ہاتھ آ گئے تو بلوط اور دیودار کے درختوں کے گرد جنگلی گیتوں کی آواز پر ناچنے اور زمین کو ماتا ماتا الاپنے لگے۔ صرف یہی ہمارا میلا اور تہوار تھا اور یہی ہمارا کھیل تماشہ۔ ہماری مابقی زندگی ساری کی ساری رنج و غم درد دکھ اور بھوک ہی میں گذر جاتی تھی"

جب خالی خولی اور ننگی زمین نے ہم کو غذا دینی بھی بند کر دی تو بالآخر محض حفاظت خود اختیاری کے لئے ہم قدرت کے خلاف جدوجہد کرنے پر مجبور ہو گئے اور مصیبت زدہ ساتھیوں کے ساتھ خود ہلاک ہو جانے کی بجائے ان کو کھا جانے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن اے ظالم انسانو! خون بہانے کی آخر تم کو ایسی کونسی مجبوری درپیش ہے؟ جن نعمتوں سے تم ہر چہار طرف سے گھرے ہوئے ہو ذرا ان پر غور تو کرو اور جو فواکہات تم کو زمین مہیا کرتی ہے ذرا ان کو دیکھو تو سہی اپنے کھیتوں اور باغوں کی دولت پر نظر ڈالو تم کو جانور تک پینے کے لئے دودھ اور اوڑھنے کے لئے اپنا اون دیتے ہیں اب تم کو اس سے زیادہ اور کیا چاہئے؟ جب کہ تمہارے پاس کھانے پینے سے زائد سامان پہلے سے بھی موجود ہے تو پھر یہ قتل اور غارت گری کس قدر دیوانگی اور پاگل پن ہے؟ ہماری دھرتی ماتا کو رزق نہ دینے کے الزام میں تم کیوں برا بھلا کہتے ہو؟ تم مقدس قانون کے بانی سیرس (CERES) اور آرام و آسائش پہنچانے والے باکس (BOCCHUS) کی نافرمانی کیوں کرتے ہو۔ کیا مخلوق کی حفاظت کے لئے ان کی بڑی بڑی نعمتیں کافی نہیں ہیں، کیا آپ ایسا دل رکھتے ہیں کہ

ملاکردہ پھلوں کو ہڈیوں کے ساتھ دسترخوان پر رکھیں اور اس دودھ کے ساتھ ان جانوروں کا گوشت بھی کھائیں جنھوں نے وہ دودھ دیا ہو؟ شیر اور چیتے جن کو آپ جنگلی درندے کہتے ہیں اپنی فطرت سے مجبور ہیں۔ اور وہ دوسرے جانوروں کو اس لئے مارتے ہیں کہ وہ خود اپنی زندگی قائم رکھ سکیں لیکن آپ ان سے ہزار درجہ زیادہ خونخوار اپنی ذاتی فطرت کا خواہ مخواہ مقابلہ فرماتے ہیں۔ اور نہایت بے درد اور بے رحم عیاشی میں پڑ جاتے ہیں، جن جانوروں کو آپ کھاتے ہیں وہ دوسروں کو کھانے والے نہیں ہوتے۔ آپ درندوں کو نہیں کھاتے بلکہ آپ درندوں کو اپنے لئے نمونہ بناتے ہیں اور اس پیاری اور عزیز جان کے آپ درپے ہو جاتے ہیں جو کسی کو نقصان نہیں پہونچاتی اور جو آپ کے ساتھ رہ کر آپ ہی کی خدمت کرتی ہے اور اس کے صلے میں وہ آپ ہی کا کھانا بن جاتی ہے"

او غیر فطرتی قاتل! اگر تو اس بات پر مصر ہے کہ قدرت نے تیری ساتھی مخلوق کو جو تیری ہی مانند گوشت پوست والی ہے تیرے کھانے ہی کے لئے بنایا ہے تو تو ذرا اس خوف اور دہشت کا تو خیال کر جو تجھ پر ایسی تقاریب میں قدرتاً چھا جاتا ہے، جانور کو قتل کر اور میں کہتا ہوں اپنے ہاتھ سے چاقو چھری استعمال کئے بغیر قتل کر بلکہ شیر اور ریچھ کی مانند اپنے ناخونوں سے اسے نوچ اور چیر کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر۔ لے یہ بیل اور اس کے ٹکڑے کاٹ۔ اس کی کھال میں اپنے پنجوں کو گڑا دے۔ لے یہ بھیڑ اور اسے زندہ ہی کھا جا۔ گرم گرم ہی اس کا گوشت نگل جا اور خون پینے کے ساتھ ہی اس کی روح کو ہضم کر جا۔ ہائیں! تو تو کانپتا اور تھرّاتا ہے۔ زندہ اور تڑپتے ہوئے گوشت کو تو دانتوں میں دبا کر مجروح کرنے کی بھی ہمت نہیں کرتا۔ او بے رحم اور ظالم انسان! تو جانور کو پہلے ذبح کرتا ہے اور پھر کھاتا ہے گویا تو اسے دو دو بار مارتا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ گوشت کو دیکھ کر تو منہ تک موڑ لیتا ہے اور اس سے کراہت کرتا ہے، تجھے اس کی ہیئت تبدیل کرنے کی غرض سے ادیانے۔ بھوننے اور مسالے اور دوائیں لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تو قصائیوں باورچیوں اور سیخ لگانے والوں کا محتاج رہتا ہے تاکہ منظر قتل کی ہیبت کو یہ لوگ اس سے دور کر کے مردار گوشت کو ایسا بنا دیں کہ تیرا ذائقہ فریب میں آ کر اس مذاقِ شے کو قبول کرے اور تجھے ایسی نعشوں کو کھانے کی دعوت دے سکیں، جن کا منظر تجھے خود کو

پامال ہو چکا ہے۔

مندرجہ بالا قول کا اصل گو غیر موضوع ضرور ہے لیکن میں اسے درج کرنے پر مجبور ہوں، میرا خیال ہے کہ چند ہی قارئین اسے ناگوار خیال فرمائیں گے۔

المختصر بچوں کو بشرطیکہ معمولی اور سادہ غذا کے علاوہ کسی اور غذا کا عادی نہ بنائیں، آپ جو چاہیں حسب پسند جی بھر کر کھانے دیں، دوڑنے اور کھیلنے دیں، اور اس کا آپ یقین رکھیں کہ وہ کبھی ضرورت سے زائد نہ کھائیں گے اور نہ انھیں کبھی سوء ہضمی کی شکایت پیدا ہوگی لیکن اگر آپ انھیں آدھا ہی پیٹ کھانا کھلائیں گے تو یاد رکھئے کہ آپ کی نگاہ جب کبھی چوکے گی وہ اس کا ممکنہ فائدہ اٹھائیں گے اور اتنا کھائیں گے کہ بیمار پڑ جائیں گے۔ ٹھونس ٹھونس کر وہ حلق تک اتنا بھر لیں گے کہ اس سے زائد کی گنجائش ہی نہ رہے گی۔ ہماری اشتہا محض اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ ہم اس پر خلاف فطرت پابندیاں اور قیود عائد کر دیتے ہیں، کبھی اس کی مخالفت کرتے ہیں کبھی اسے دباتے ہیں کبھی اس کے لئے نسخہ تجویز کرتے ہیں، کبھی اس میں کمی کرتے ہیں اور کبھی زیادتی۔ ترازو ہر وقت ہمارے ہاتھ میں رہتی ہے جو معدے کو نہیں ہمارے تاثرات کو تولتی رہتی ہے۔ اب میں ایک عام مثال کی طرف آپ کو متوجہ کرتا ہوں کہ کسانوں کے ہاں نعمت خانہ اور پھلوں کا چھیکا ہر وقت کھلا رہتا ہے لیکن ان کے بچوں یا بوڑھوں کو کبھی سوء ہضمی کا شاکی نہیں سنا گیا۔

بہر حال اگر اتفاقاً کوئی بچہ زیادہ کھانے والا ہو جو میرے طرز عمل کے تحت ہونا تقریباً ناممکن ہے تو بچے کو اس کے محبوب ترین کھیلوں میں اس قدر محو اور منہمک رکھا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی چاہے تو اسے بھوکوں ہی مار سکتا ہے۔ اساتذہ بتلائیے کہ اس محفوظ اور سہل العمل ہتھیار کو آپ کیوں کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہیرو دوٹس کا بیان ہے کہ لیڈیا[1] والوں نے قحط سالی سے تنگ آ کر اس قسم کے کھیل

---

[1] قدیم مورخین نے بہت سے ایسے واقعات بیان کئے ہیں جو گو غلط ہی کیوں نہ ہوں لیکن کافی کارآمد ہو سکتے ہیں۔ مگر ہم اس چیز سے لاعلم ہیں کہ ہم تاریخ سے حقیقی فائدہ کیوں کر حاصل کریں (باقی حاشیہ صفحہ ۶۴ پر ملاحظہ ہو)

ایسا نہ کرتے تھے کہ وہ ان میں موجود کر سارا سارا دن بھوک کو ٹال دیتے تھے، اور فاقے سے گذارا دیا کرتے تھے، آپ کے استاد نے یاد بار ہیروڈوٹس کی تحریر کو پڑھا تو ضرور ہو گا لیکن کبھی یہ خیال دکیا ہو گا کہ اسے بچوں سے کیوں کر متعلق کیا جا سکتا ہے ان میں سے کوئی استاد شاید مجھ پر یہ اعتراض کر بیٹھے کہ بچہ رات کا کھانا اپنے سبق پر قربان کرنا پسند نہیں کرتا ہے تو جناب عالی یہ بالکل سچ ہے، مجھے اس قسم کے کھیل کا تو کبھی خیال بھی نہیں گذرا۔

شامہ ذائقے کا قوت شامہ سے وہی تعلق ہے جو نظر کا لمس سے ہے، بو آگے آگے آتی ہے اور ذائقے کو خبردار کر دیتی ہے کہ تو فلاں فلاں مادوں سے متاثر ہو گا اور حسبِ سابق احساس کے مطابق کسی ایسی چیز کا تجربہ کرنے یا اس سے بچنے کی ترغیب دیتی ہے، سنتا ہوں کہ جنگلی لوگوں کا احساس شامہ ہمارے احساس کے بالکل متضاد اور مخالف ہوتا ہے، اور خوشبوؤں اور بدبوؤں کے متعلق ان کا تخیل بھی جدا ہوتا ہے، میں بہرحال ایسا یقین کرنے کو قطعًا تیار نہیں ہوں محض بو کا احساس خالص ایک لطیف احساس ہوتا ہے جو حواس شامہ کی بجائے خیالات ہی کو زیادہ متاثر کرتا ہے، اور جس میں پیش خیالی کو وہ ابھارتا ہے، اسی کی امداد سے اپنا کام بھی انجام دیتا ہے۔ پس جیوں کہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے اور جنگلی لوگوں کا مذاق متمدن لوگوں سے بالکل جدا ہوتا ہے، اس لئے لازمی ہے کہ ذائقے اور اس بو کے متعلق بھی جو اس ذائقے کا اعلان کرتی ہے، دونوں کو بالکل مختلف خیالات قائم کرنے کی رہنمائی ہوتی ہو، گھوڑے کے پیٹھے کے سڑے ہوئے گوشت میں ایک تاتاری کو اتنی ہی لذت معلوم ہوتی ہے جتنی کہ کسی شکاری کو اعلیٰ قسم کے تیتر کے گوشت میں مزہ آتا ہے۔

پھولوں کی بھینی بھینی مہک کی مانند ہمارے مجہول احساسات بھی ان لوگوں کے خیال میں نہیں آ سکتے ہیں جو باغوں کی سیر کرنے کی بجائے چلتے پھرتے زیادہ ہوں اور آرام و سکون حاصل کرنے کے لئے کافی محنت و مشقت سے کام نہ لیتے ہوں، بھوکوں کو ایسی خوشبو میں حظ نہیں حاصل ہو سکتا جو کھانے کی آمد کا اعلان نہ کرتی

ہو ۔

(صفحہ ۵ سے آگے) محض تاریخوں کی تنقید اور تشریح ہی ہماری توجہ کے قابل ہوتی ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ مفید سبق یا عبرت حاصل کرنے کی نسبت تواریخ کے اندراجات کی صحت یا عدم صحت ہمارے لئے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، ایک دانش مند آدمی کو چاہئے کہ تاریخ کو وہ ایسے قصوں کا ایک جال خیال کرے جن کے اخلاقی سبق انسانی دل سے صحیح میل کھاتے ہوں۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

مانٹسوری کانگریس

۲۵ مئی ۵۳ء کو دسویں بین الاقوامی مانٹسوری کانگریس پیرس میں منعقد ہوئی، فرانس کے وزیر معارف نے اپنی حکومت کی جانب سے مختلف ممالک کے مندوبین کا خیر مقدم کیا، اور اپنی افتتاحی تقریر میں ڈاکٹر ماریا مانٹسوری کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے خراج عقیدت پیش کیا، آپ نے فرمایا۔ "مادام مانٹسوری کو بچوں کی صلاحیتوں کے پرکھنے کا عجیب ملکہ تھا، اور اس سلسلے میں حق یہ ہے کہ دنیا میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکا۔"

برازیلی مندوب کا دنیریو نے بھی مادام مانٹسوری کے طریق تدریس کو سراہا، اس نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "بچوں کی تعلیم و تدریس کے سلسلے میں مانٹسوری نے جو نئی طرح ڈالی، رفتہ رفتہ اس نے ایک انقلابی صورت اختیار کر لی اور اس کے اثرات آج ہر ملک اور ہر قوم کے نظام تعلیم میں نمایاں ہیں، اس لئے اس کی افادیت کے پیش نظر اس طریق تعلیم کو پھیلانے کی کوشش کرنی چاہئے اور آج تو ہمیں اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے" اور اس نے ڈاکٹر مانٹسوری کے حسب ذیل جملے کو دوہرایا۔ "اگر آپ اپنی آئندہ نسلوں کو متحد الخیال بنانا چاہتے ہیں کہ وہ یونیسکو کے متعلق کچھ سوچ سکیں تو سب سے پہلے مانٹسوری طریق تعلیم کے مطابق ان کی تربیت کیجیے۔"

سہ پہر کو این میری برناڈ سیکریٹری جنرل مانٹسوری ایسوسی ایشن فرانس نے مانٹسوری طریق تعلیم کی نمائش کا افتتاح کیا۔

اس سال کے اجتماع کا مقصد یہ تھا کہ ہم اس دور میں بچے کو کس طرح، ماحول آشنا بنا سکتے ہیں، تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس عہد میں اپنے لئے کوئی مقام پیدا کر سکے۔

میریو مانٹسوری (ڈاکٹر مانٹسوری کی بیٹی)، ملائم موضوع پر اور اس سے متعلق موضوعات پر شام کی تقریر ہوا

ایک سلسلہ جاری کیا، ان تقریروں میں جو موضوع زیر بحث آئے ان میں سے بچے کے لئے اور عمدہ ماحول مہیا کرنا، ناقبل مدرسہ تعلیم ایسا ماحول کیوں کر مہیا کر سکتی ہے، نوجوان اور جدید ادب وغیرہ بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

اس کانگریس کے اجلاس کے دوران میں مانٹسوری طریق تعلیم کے ذریعہ تاریخ، موسیقی، ڈرائنگ السنہ اور جغرافیہ کی تدریس کے تکنیکی مظاہرے دکھائے گئے۔

مقاصد اور مواقع

پچھلے دنوں یارک (انگلستان) میں نیشنل ایسوسی ایشن آف ہیڈ ٹیچرز کا اجلاس منعقد ہوا، اس جلسے میں مسٹر آر. ای. منٹگمری نے صدر کے فرائض انجام دیئے، آپ نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا: "ہمارے مدارس کے تربیت یافتہ طلبا اپنے بزرگوں کے صحیح جانشین ہوتے ہیں، لیکن یہ مدرسے کا فرض ہے کہ بچے کی صحیح تعلیم و تربیت کا خیال رکھے اور ان میں عقل و فہم اور بصیرت پیدا کرے، بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں یہی کافی نہیں ہے کہ انھیں کتاب کے بہترین مواد سے روشناس کیا جائے، بلکہ اس سے کہیں زیادہ ضروری بچوں کا بہترین اساتذہ سے روشناس اور متعلق ہونا ہے۔ مدرسوں میں آج اچھے اساتذہ کی کمی کی ایک بڑی وجہ ناموزوں اور غیر مناسب مشاہرے ہیں، وزارت محنت نے صنعت و حرفت میں ہفتہ وار آمدنی کے متعلق جو اعداد و شمار پیش کئے ہیں اس کی رو سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر اکتوبر ۱۹۳۸ء اور اکتوبر ۱۹۵۲ء میں کسی مزدور کی ہفتہ وار آمدنی کا موازنہ کیا جائے۔ تو اس میں ۱۹۵ فی صدی کا اضافہ ہو چکا ہے لیکن مدرسین کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے، اگر اسی کے مطابق اساتذہ کی تنخواہوں کا جائزہ لیا جائے تو اسی زمانے میں اساتذہ اور استانیوں کی تنخواہوں میں علی الترتیب صرف ۱۰۲ اور ۱۰۷ فی صدی کا اضافہ ہوا ہے اور لندن میں ۷۶ اور ۸۰ فی صدی۔ دوسرا اہم سبب یہ ہے کہ لازمی تعلیم کے بعد بچوں کو بہت کم گذارہ الاؤنس دیا جاتا ہے۔

میرے خیال میں اساتذہ کی تعداد میں معتدبہ اضافہ کرنے کے لئے تربیتی ادارے طلبہ کے داخلے کے لئے اپنے معیار کو کچھ کم کر دیں، لیکن غالباً میرا یہ مشورہ ماہرین تعلیم کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا، کیوں کہ اس کا جواب یہی ہوگا کہ معیار تو پہلے ہی کچھ اتنا اونچا نہیں ہے۔"

سرکاری جریدہ کے اعلانات

ای/۲۰۱۶۶۲ م بشیر الدین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۱۹۴۶) ۱۳۰/۲۵۰ معلم انگریزی سنٹرل ماڈل اسکول لاہور چودھری عبدالسلام کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے مدرس انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول دیپالپور ضلع منٹگمری مقرر ہوئے۔

چودھری عبدالسلام۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی مدرس انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول دیپالپور ضلع منٹگمری بجائے م بشیر الدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے مدرس انگریزی گورنمنٹ سنٹرل ماڈل اسکول لاہور مقرر ہوئے۔

کی/۱۸۶۵۲ م۔ محمد صدیق ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول قصور کو ۲۰ اپریل ۱۹۵۸ء سے پی۔ ای۔ ایس (دوم) میں ترقی ملی۔ یہ جگہ چودھری عبدالغنی کے ملازمت سے سبکدوش ہونے کی وجہ سے خالی ہوئی۔

م۔ محمد شریف ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ اے۔ ڈی آئی ایس گوجرانوالہ کو ۸ جون ۱۹۵۸ء سے پی۔ ای۔ ایس (دوم) میں ترقی ملی اور وہ م۔ عبدالحمید کی جگہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ ضلع شاہپور مقرر ہوئے۔

م۔ محمد ظریف۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ اے۔ آئی۔ ایڈ (لندن) اے۔ ڈی۔ آئی۔ ایس سیالکوٹ کو ۸ جون ۱۹۵۸ء سے پی۔ ای۔ ایس (دوم) میں ترقی ملی۔ اور وہ م۔ منظور احمد کی جگہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شاہپور مقرر ہوئے۔

۱۱۹۶۹/ م۔ نذیر احمد خان نیازی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ عارضی مدرس سائنس گورنمنٹ ہائی اسکول میاں والی م۔ شیر بہادر بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے مدرس سائنس گورنمنٹ نارمل اسکول میاں والی مقرر ہوئے (بمشاہرہ ۱۳۰/۲۵۰)

م۔ علم الدین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۲۰۵۰) ۱۳۰/۲۵۰ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ساہیوال (شاہپور) آزمائشی۔ م۔ قادر بخش کی جگہ جو ڈسٹرکٹ بورڈ کی ملازمت میں واپس ہو چکے ہیں تاریخ حاضری سے معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول للہ مقرر ہوئے (بمشاہرہ خود)۔

م۔ محمد اصغر بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ایک امیدوار چودھری علم الدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری

معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ساہیوال مقرر ہوئے (بشاہرہ خود)

م۔ محمد انور۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۱۰۴) ۱۳۰/۲۵۰ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ (شاہپور) آزمائشی ایک خالی آسامی پر معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول للہ مقرر ہوئے (تاریخ حاضری سے بشاہرہ خود)

م۔ محمد الدین۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۳) ۱۳۰/۲۵۰ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول شاہپور صدر۔ م۔ محمد انور کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ بشاہرہ خود مقرر ہوئے

م۔ محمد مالک۔ بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (نمبر ۵۳۶) ۱۳۰/۲۵۰ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ (گجرات) م۔ محمد الدین انور کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول شاہپور صدر مقرر ہوئے (بشاہرہ خود)

م۔ غلام حسین رضا بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایک امیدوار۔ م۔ محمد مالک کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ (گجرات) بشاہرہ ۱۳۰ — ۱۰ — ۲۰۰ — ۱۰ — ۲۵۰ ایک سال کے لیے آزمائشی مقرر ہوئے اس زمانے میں دو سال سے زیادہ توسیع نہیں ہو سکتی۔

م۔ خدا بخش۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۲۲۶) ۱۳۰/۲۵۰ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال (جہلم) آزمائشی م۔ محمد حسین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کی جگہ جن کا تقرر ہو چکا تھا لیکن ملازمت اختیار نہیں کی۔ تاریخ حاضری سے بشاہرہ خود معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول للہ (جہلم) مقرر ہوئے۔

ایس علی عباس بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۲۲۶) ۱۳۰/۲۵۰ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بوچھال کلاں (جہلم) م۔ خدا بخش کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال (جہلم) مقرر ہوئے۔ بشاہرہ خود۔

شیخ نثار احمد انصاری بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایک امیدوار ایک خالی آسامی پر بعدم اختر جعفری کی جگہ جن کی خدمات کی اب ضرورت باقی نہیں رہی۔ تاریخ حاضری سے معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو (اٹک) بشاہرہ ۱۳۰ — ۱۰ — ۲۰۰/۱۰ — ۲۵۰ ایک سال کے لیے آزمائشی مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں دو سال سے زیادہ توسیع نہیں ہو سکتی۔

م۔ غلام مسعود۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۵۱۵ ۔ ۱۳۰/۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پوچھال کلاں جہلم آزمائشی ایک خالی آسامی پر تاریخ حاضری سے معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال مقرر ہوئے بشاہرۂ خود

م۔ رشید احمد خاں۔ ایف۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی (نمبر ۵۴۵ ۔ ۱۳۰/۲۵۰) قائم مقام لیکچرر ریاضیات گورنمنٹ کالج کیمبل پور جن کے تبادلے کے احکام بحیثیت مدرس سائنس گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ ضلع لائل پور مقرر ہوئے۔

ای/۱۹۷۰۳ م۔ اللہ دتا ملک بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایک امیدوار جو اس وقت بحیثیت قائم مقام مدرس انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول رینالہ خورد چودھری عبدالسلام کی جگہ کام کر رہے تھے، م۔ دوست محمد بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کی جگہ جو ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں ۱۵ اپریل ۵۳ء سے معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول رینالہ خورد (منٹگمری) بشاہرہ ۱۳۰ - ۱۰ - ۲۵۰ ایس۔ ای۔ ایس۔ اے۔ دی برانچ (شعبہ رجال) ایک سال کی آزمائش پر مقرر ہوئے۔ اس زمانہ آزمائش میں دو سال سے زیادہ توسیع نہیں ہو سکتی۔

ای/۱۸۹۹۹ م۔ عبدالرحیم بٹ ناظر مدارس برائے تربیت جسمانی گوجرانوالہ جو ان دنوں اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں کام کر رہے ہیں۔ ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے۔ قائم مقام ناظم تعلیمات جسمانی گورنمنٹ کالج منٹگمری مقرر ہوئے بشاہرہ ۲۲۵ - ۱۵ - ۴۵۰ - ایس۔ ای۔ ایس۔ اے۔ دی برانچ (شعبہ رجال کالج کیڈر)

ای/۱۷۶۶۷ خواجہ محمود حسن بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (نمبر ۹ ۔ ۱۳۰/۲۵۰) نائب ناظر مدارس ضلع گوجرانوالہ مقرر ہوئے۔ بشاہرۂ خود

چودھری محمد مسعود خاں بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ دی (نمبر ۴۹ ۔ ۱۳۰/۲۵۰) نائب ناظر مدارس ضلع لائل پور بعد خواجہ محمود حسن کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے نائب ناظر مدارس ضلع جھنگ مقرر ہوئے بشاہرۂ خود

ای/۱۷۷۰۱ م۔ محمد یار خاں۔ بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ دی (نمبر ۴۱۴ ۔ ۱۳۰/۲۵۰) معلم ثانویہ گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ م۔ محمد شفیع بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ - ۲۵۵) کی جگہ جو گورنمنٹ نارمل اسکول مظفر گڑھ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو چکے ہیں معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان مقرر ہوئے (بشاہرۂ خود)

ای/۱۷۷۵۵ م۔ ظہور احمد خاں۔ بی۔ اے (پنجاب) بی۔ ٹی (سندھ) ایک امیدوار ایک خالی آسامی پر جو اس مدرسے کے لئے منظور کی گئی ہے۔ تاریخ حاضری سے معلم انگریزی گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ (گوجرانوالہ) مقرر ہوئے بشاہرہ ۱۳۰ - ۱۰ - ۲۰۰/۱۰ - ۲۵۰ ایس۔ ای۔ ایس۔ اے۔ دی برانچ (شعبہ رجال) ایک سال کے لئے آزمائشی۔ اس

آموزش

۶ شمارہ ۵] لاہور [اگست ۱۹۵۳ء

اس شمارہ میں

مدیر : بشیر ہاشمی

معاونین : عبدالغفور چودھری
ایم - اے - عزیز

۱ -
سر پرستی

۲ - ا
اور صوبائی

۳ - ا
ایڈیٹر (پرنہ
میں چھپے ہ

۴ - ی
کا چندہ آٹھ
مینجر کو بہ

۵ - ار
تجارتی معاملا

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

اگست سنہ ۱۹۵۳ء

جلد ۶

شمارہ ۵

سالانہ چندہ

پاکستان کے لئے ۶ روپے

غیر ممالک کے لئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا۔

امتحان کے نتائج

پنجاب یونیورسٹی کے مختلف امتحانوں کے نتائج کا اعلان ہو چکا ہے۔ اس سال حسب معمول پھر نتائج بہت ہی خراب رہے۔ طلبہ کی دو تہائی سے زیادہ تعداد ناکامیاب رہی ہے۔ ہر سال طلبہ کی بڑی اکثریت کا امتحان میں ناکامیاب ہوجانا اور نتائج کی فی صدی گھٹنا کچھ اتنا عام ہو چکا ہے کہ اب ہم نے اس کے متعلق محسوس کرنا یا سوچنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ امیدوار امتحانوں میں شریک ہوتے ہیں اور ناکامیاب ہو جاتے ہیں، دو ایک دن تک تو ہم اس قومی نقصان کی چبھن محسوس کرتے رہتے ہیں۔ مگر بہت جلد ہمیں اس خسارے کا خیال بھی نہیں رہتا چناں چہ امتحانات کی یہ ناگوار صورت حال مسلسل جاری ہے، اور بظاہر اس کے ختم ہونے کا امکان بھی نہیں لیکن اگر ٹھنڈے دل سے ان نتائج کا تجزیہ کیا جائے تو اسے محض قومی خسارے پر ہی محمول نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تو غریب طالب علموں پر ایک ظلم ہے۔ اور افسوس تو یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اس ظلم کا احساس بھی نہیں اور ہم اپنی اس تنگنائے سے بچنے کے لیے بھی تیار نظر نہیں آتے۔ اگرچہ شروع شروع میں لوگوں نے اس کے خلاف احتجاج بھی کیا اور رنج و غصے کا اظہار بھی۔ مگر ہماری گول مول اور چکر دینے والی باتوں نے اسے اور الجھاؤ میں ڈال دیا اور ہماری بدخواہی اور بداندیشی نے احتجاج کو بھی دبا دیا، اس لیے اس بے اعتدالی نے ہمارے تعلیمی نظام کار میں اپنے لیے ایک مستقل مقام پیدا کر لیا ہے، جس کا بظاہر کوئی معقول حل نظر نہیں آتا۔ اس طرح احتجاج اور تنقید کی جو آوازیں بلند ہوئی تھیں وہ بھی فضا میں ایک گونج پیدا کرنے کے بعد خاموش ہو چکی ہیں، اور اس سے ان تمام کوششوں پر بھی اوس پڑ گئی جن کا مقصد تنقید یا ان خرابیوں کو منظر عام پر لانا تھا۔

اس سال طلبہ بالعموم انگریزی میں ناکامیاب ہوئے ہیں۔ پچھلے چند سال سے انگریزی کا معیار گرتا جا رہا ہے اور طلبہ کی فی صدی کامیابی میں روز بروز بے اعتدالی اور عدم توازن پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اگر ہم اس مضمون کی تدریس کی طرف زیادہ توجہ دیں اور طلبہ کو زبان کے مبادیات سے بطریق احسن روشناس کرا کے انہیں ایک مقررہ معیار پر لانے کی کوشش کریں تو غالباً یہ کام حسب دل خواہ اور توقعات کے عین مطابق ہوگا۔ مدرس کی حیثیت سے پڑھانے والوں کا فرض ہے کہ وہ طلبہ کو مضمون کے مالہ و ماعلیہ سے بخوبی واقفیت دلانے کی کوشش کریں۔ ہاں اگر محض چند مضامین یا چند محاورے رٹوا دینا ہی امتحان اور اس میں کامیابی حاصل کرنا ہی تحصیل علم میں منتہی ہوتا ہے تو اس سے نہ طلبہ کبھی زبان و ادب میں دستگاہ حاصل کر سکتے ہیں اور نہ اس سے نجی طور پر خود متمتع ہو سکتے ہیں۔ کالجوں اور اسکولوں میں اگر اس مضمون کی تدریس کی جانب تھوڑی سی اور توجہ کی جائے تو زبان کی تفہیم میں مزید سہولتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔

اس مقام پر غالباً یہ سوال پوچھنا بے جا نہ ہوگا کیا ہم نے کبھی اس مسئلے کو خالص سائنسی نقطۂ نگاہ سے پرکھا، اس کے مسائل اور اس کے تقاضوں کو جانچا، اس کا خارجی تجزیہ کیا، اور کیا کبھی اس سلسلے میں کسی تحقیقی کام کا سلسلہ شروع کیا۔ کیا کبھی انگریزی، اردو اور پنجابی الفاظ کی ساخت اور ان کے معنوں کا تقابلی مطالعہ کیا۔ کیا ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اردو اور پنجابی کی لسانی معلومات انگریزی زبان کی تفہیم اور اس کے سیکھنے میں کس حد تک مدد دے سکتی ہیں اور کہاں تک اس کی رفتار ترقی کو روک سکتی ہیں۔ اگر ان انگریزی الفاظ کی ایک فہرست مرتب کی جائے جو بالعموم اردو اور پنجابی میں مستعمل ہیں تو یہی فہرست باضابطہ ذخیرۂ الفاظ کے انتخابات میں امداد دے سکتی ہے اور اگر بیسک انگلش (BASIC ENGLISH) کے ذخیرۂ الفاظ کو تصرف میں لایا جائے، اور ان میں اضافہ بھی کیا جائے تو سینئر طلبہ انگریزی زبان کی تحصیل میں اس سے امداد لے سکتے ہیں۔ اور اظہار خیال کے لئے ان کے پاس الفاظ کا اچھا خاصہ ذخیرہ بھی جمع ہو سکتا ہے اور وہ اس کی مدد سے اپنے مافی الضمیر کو بھی بیان کر سکتے ہیں۔

یہ اور اسی نوعیت اور اسی قسم کے دوسرے مسائل کسی ایسی قوم کے لئے ایک خوفناک چیلنج ہوا کرتے ہیں جو اپنے تعلیمی [illegible] آزادی کے بعد [illegible] ہوتی ہے۔ اور جو اپنے نوجوانوں میں احساس فخر اور بلندی فکر پیدا کرنے [illegible] ہے ہم اس چیلنج کو قبول کر کے اپنے نظام کا میں چند بنیادی تبدیلیاں کرنے میں عزم مصمم نہیں کر پائے۔

احادیثِ نبوی میں مسئلہ نصاب

عبدالغفور چودھری

شاعری

احادیث کے مطابق اچھی شاعری کو محض ایک بے حد حساس شخصیت اور دبے ہوئے جذبات کے اظہار کے لئے آلہ کار نہ ہونا چاہئے۔ شاعری عاشقانہ حظ نفس کا ذریعہ نہیں اور نہ آواز (موسیقی) اور استعارات کی دولت پر دادِ عیش دینے سے تعبیر ہے، یہ ایک ایسا پر مقصد عمل ہے جو ایک شخص کے دوسرے سے روابط پیدا کرنے کے لئے راہیں کھولتا ہے، ان کو چند بیش قیمت تجربات میں برابر کا شریک بناتا ہے اور تہذیبی اور معاشرتی معنوں میں جمہوری تصورات کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ "ٹالسٹائی کے مطابق اسی نگاہ سے زمانہ قدیم کے لوگ، سقراط افلاطون اور ارسطو فن کو دیکھتے تھے۔ اسی طرح پر عبرانی پیغمبران اور قدیم عیسائی، فن کو خیال کرتے تھے اور اسی طریق پر مسلمان فن کو سمجھتے تھے" ۱؎

احادیث کے رسائل میں شاعری سے متعلق ابواب میں شعرا اور ان کی منظومات کی جانب ایک مناسب رویہ کا انکشاف ہوتا ہے، احادیث کے مطابق شاعری کو ایک فلسفہ حیات کا حامل ہونا چاہئے اور ناظرین کو ایک پیغام دینا چاہئے۔ آنحضرتؐ کو اپنے ہم عصر شعراء کے الزامات سے متنفر کرنے کا پورا پورا حق حاصل تھا، لیکن آپ نے ہمیشہ دعویٰ سے کہا کہ چند معزز (شعراء) ایسے بھی ہیں جو اس سے مستثنیٰ ہیں۔

"جادو کی طرح مسحور کر دینے والے چند بیانیہ فقرے ہیں۔ علم اتنا تاریک جتنا جہالت۔ شاعری فلسفہ کی طرح سبق آموز اور تعریف آفت کی طرح مضرت رساں" ۲؎

ایک دوسرے موقع پر جب آپؐ کی موجودگی میں شاعری کا ذکر کیا گیا تو آپؐ نے بتایا کہ شاعری اظہار کے سوا

۱؎ ٹالسٹائی: فن کیا ہے؟ صفحہ ۱۱۵ ۔ ۲؎ ۱۲۹ ۔ ۳؎ بخاری

پر بھی نہیں، اگر یہ اچھا ہے تو قابل تعریف ہے اور اگر برا تو اس کی مذمت کرنا چاہیے۔ شاعری کے متعلق انجاب میں بری شاعری کی زوردار الفاظ میں مذمت کی گئی ہے۔ بری اسی مفہوم میں جو آیات قرآنی میں لیا گیا ہے وہ شاعری جن کی تقلید گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ ان پر جو خاص الزام عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہر وادی کی سیر کرتے ہیں لیکن بظاہر کوئی ایک مقصد نہیں رکھتے اور نہ عالی ظرف تصورات کے حامل ہوتے ہیں۔

افلاطون نے فن تعلیم کے باب کے ایک مخصوص حصہ اس شاعری کی مذمت پر صرف کیا ہے جو کمسن دماغ پر برا اثر ڈالتی ہے۔ انھوں نے یونان کے چند بڑے بڑے شعراء کی طرف سے ایسا ہی ناقدانہ رویہ اختیار کئے جانے کی پرزور اپیل کی ہے۔ "اور ہم کو ہومر اور دوسرے شعراء سے استدعا کرنی چاہیے کہ وہ غصہ نہ ہوں اگر ہم یہ اور اس قسم کی دوسری عبارتیں قلم زد کردیں، اس لئے نہیں کہ وہ عوام کے لئے غیر شاعرانہ یا غیر دلکش ہیں، بلکہ اس لئے کہ ان میں جتنا زیادہ شاعرانہ حسن ہوتا ہے اتنا ہی کم وہ لڑکوں اور ان لوگوں کے لئے موزوں ہوتے ہیں جو آزاد رہنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور جنھیں موت سے زیادہ غلامی سے ڈرنا چاہیے۔" ۱؎

ابتداءً مسلمانوں میں شاعری نصاب تعلیم کا مستقل جزو نہیں ہوا کرتی تھی، اس لئے کہ اس وقت وہ میں تھی اور اس کا جوش ان کے خون میں ہوا کرتا تھا، لیکن بعد میں جب یہ محسوس کیا گیا کہ شاعری کو مکتب میں ایک مستقل جگہ ملنی چاہیے تو چند بڑے بڑے مفکرین نے بڑی جانفشانی کے ساتھ شاعری کو بچوں کی درسی کتابوں سے الگ کردیا۔ عمر بن عتبہ نے ایک خط کے ذریعہ اپنے بیٹے کے اتالیق کو ہدایت کی تھی کہ وہ اس کو صرف عفیف RESPECTABLE شاعری پڑھائیں ۲؎

قرآن کا اسلوب بیان مثالی شان و شوکت کا حامل ہے اور احادیث کی زبان غیر مبہم اور دلکش ہے اسی لئے آنحضرتؐ کو اچھی شاعری کا کافی ادراک تھا۔ آپ اسے اخلاقی یا معاشرتی سرگرمی کا ذریعہ استعمال ہونے کی حیثیت سے سراہتے تھے اور لبید کی شاعری کو اس کی اخلاقی قوت اور عالی ظرفانہ دلکشی کے باعث قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اکثر انتہائی پسندیدگی کے ساتھ خدا کی غیر مترقبہ بزرگی کے متعلق ان کے مشہور اشعار نقل کیا کرتے تھے۔

۱؎ جمہوریہ افلاطون۔ جوٹ کا ترجمہ، باب در بیان فن تعلیم۔ ۲؎ ملاحظہ ہو عقد الفرید

جس قسم کی شاعری سے آپ محظوظ ہوتے تھے وہ عمل کی شاعری تھی۔ اور اکثر صحابی جب کسی سفر میں
پ کے ساتھ ہوتے تھے تو شاعرانہ کلام پڑھ کر سناتے تھے۔
مکہ میں آپ کے داخلہ کے وقت عبداللہ ابن رواحہ نے جو اشعار پڑھے تھے وہ اس فاتحانہ داخلہ کی یاد کو
ہ کرتے ہیں۔ جب عبداللہ نے للکارتے ہوئے لہجہ میں "دور ہوجاؤ اس کے راستہ سے، اے کافروں کے بیٹو!"
بیرہ پڑھا تو عمرؓ نے انہیں ٹوکا لیکن آنحضرتؐ نے آگے پڑھنے کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ کیوں کہ
الفاظ کو مارنے کے مقابلہ میں کفار کے لئے زیادہ پریشان کن تھے۔ آپؐ حسّان بن ثابت کے بڑے
رپرست تھے جن کو آپؐ کی مدح پڑھنے کے لئے ایک منبر مہیّا کر دیا گیا تھا اور اس طرح ایک مخصوص اعزاز
شا گیا تھا۔ آپؐ نے اعلان کیا تھا: "یقیناً روح القدس حسّان کے ساتھ ہے۔" ؎۱
حسّان کے علاوہ صحابیوں میں اور بھی کئی شاعر تھے جن کی منظومات ایک کتابچہ کی شکل میں پائی جاتی
ں۔ ان میں سے چند کے پورے دیوان ہیں جو ان کے پورے کلام پر مشتمل ہیں۔ صاحبانِ فضل و کمال کے اس
رہ میں کعب بن زہیر کو آنحضرتؐ کی شان میں لکھی ہوئی ایک مدح (نعت) کے ذریعے ایک قتل موقوف کرانے
کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ مدح قدیم شاعروں کے انداز میں ایک شاعرانہ رجز کے ساتھ شروع ہوتی ہے اور اس کے
خری شعر پہ خود آنحضرتؐ نے اصلاح دی تھی۔ ایک دل کش اور سادہ شعر میں کعب نے آنحضرت کو ایک مہلک
ار سے تشبیہ دی ہے "یقیناً رسول ایک (درخشاں) روشنی ہیں۔ اور نور آپ سے مستعار کیا جاتا ہے۔ آپؐ
ک ہندی تلوار ہیں۔ اور تمام ہندی تلواروں میں سے وہ جو سب سے زیادہ مستعد ہے"
آنحضرتؐ نے مشورہ دیا کہ "تمام ہندی تلواروں میں سے" کی بجائے "اللہ کی تمام تلواروں میں سے" رکھا
ئے۔ اس اصلاح سے شعر کی روحانی تپش اور سادگی کی شان میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے۔ اور دوسرا مصرعہ
رتی کی تکرار کے سقم سے پاک ہو گیا ہے۔
آنحضرتؐ کو جاہلیت کی شاعری کا بھی ذوق تھا۔ ایک مرتبہ دوران سفر میں آپؐ نے اپنے پیچھے بیٹھے
ہوئے ایک شخص سے امیہ بن ابی صلت کے چند اشعار پڑھنے کی درخواست کی اور اس نے سو اشعار سنائے

؎۱ ابی داؤد جلد اول صفحہ ۳۲۸		؎۲		حسن الصحابہ از ذہبی

ایک دوسرے موقعہ پر آپؐ نے امیہ کو بہت امتیازی طور پر داد دی، جب آپؐ نے اعلان کیا کہ وہ زبان سے صاحب ایمان تھا لیکن دل سے منکر۔

چند ذرائع کے مطابق کہا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے کم از کم دو موقعوں پر خود اشعار نظم کئے اور غالباً دونوں موقعوں پر آپ کا مقصد یہ تھا کہ عمل اور جذبات کی موزونیت میں اضافہ اور حرکت کی موزونیت سے زور پیدا کیا جائے یہ دو موقعے جنگ خندق اور مدینہ کی مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کی رسم کے تھے۔ ؎۱

ایک مرتبہ آپؐ خواتین کے ساتھ سفر کر رہے تھے اور ابی سینیا کا ایک غلام حدی خوانی کر رہا تھا۔ اس موسیقی سے یقیناً اونٹ کی رفتار تیز ہو گئی تھی اس پر آنحضرتؐ نے اس سے کہا کہ آہستہ چلے اور اتنی احتیاط کے ساتھ گویا اس کے اونٹوں پر شیشے کے برتن لدے ہوں ؎۲

احادیث کے مطابق اچھی شاعری کا تصور یہ ہے کہ وہ ایک اخلاقی قوت ہے جو اعلیٰ معاشرتی مقاصد پورے کرتی ہے اور جب ہم اس تصور کا اس مخصوص مدرسہ ناقدین کی آراء سے جو اس نقطۂ نظر کے قائل ہیں مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ تصور آج بھی تازگی بخش اور جدید معلوم ہوتا ہے۔ ؎۳ ٹالسٹائی کا قول ہے۔ "پہلے لوگ ڈرتے تھے کہ مبادا فن کے کاموں میں کسی کو تخریب کا موقع ہاتھ آ جائے۔ اس لئے انھوں نے فن کی یک لخت ممانعت کر دی، اب ان کو صرف یہ خوف ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس لذت سے محروم رہ جائیں جو فن ان کو بخشتا ہے اور وہ ہر فن کی سرپرستی قبول کر لیتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ آخری غلطی پہلی کے مقابلے میں زیادہ فاحش ہے۔ اور یہ کہ اس کے نتائج (پہلی کے مقابلے میں) کہیں زیادہ مضرت رساں ہیں" ؎۴

تاریخ عربوں کے قدیم ادب میں کوئی رسالہ ایسا نہیں ہے جس میں گذشتہ واقعات کا مسلسل بیان ہو، جو بھی تاریخی مواد ملتا ہے، وہ کسی تاریخی دن، کسی جنگ یا کسی قبیلہ کی تباہی کے نظم یا نثر میں جذباتی بیان پر مشتمل ہے، وہ اس امر کو نہیں محسوس کرتے تھے کہ انسانی معاملات میں کوئی منضبط عنصر ہوتا ہے۔ اور یہ کہ بنی نوع انسان کی تاریخ ایک دوسرے سے غیر متعلق حکایات کا غیر مسلسل بیان نہیں

؎۱ صحیح بخاری جلد دوم) باب در بیان شاعری از آزاد بلگرامی باب سوم صفحہ ۸ — ۲۲۲ سبحۃ المرجان
؎۲ مسلم جلد دوم باب در بیان عورتوں کے حق میں نیکی ؎۳ ٹالسٹائی فن کیا ہے صفحہ ۲۰۲ — ۱۹۵

بلکہ ہزار ہا سال پر مشتمل واقعات کی ایک ایسی مسلسل لڑی ہے جس میں دونوں مہینوں کا طول وقت کی عظیم الشان وسعت کے سامنے بہت حقیر ہے۔ آنحضرتؐ بنی نوع انسان کی تاریخ کے اس تسلسل کی تہہ کو پہونچتے ہوئے ہمیشہ اعلیٰ تر موضوع میں اخلاقی سبقوں کو دہراتے اور ان پر زور دیتے رہے جنھیں قوموں کی یکے بعد دیگرے تباہیوں نے نمایاں حیثیت دے دی۔

آپ کے نزدیک تاریخ (واقعات) ماضی کی کوئی زرق برق زنجیر نہیں ہے۔ اور نہ یہ کوئی ذہنی تفریح ہے جس سے تخیل اور رومان پسندی کے جذبات برانگیختہ ہوں، آپ کے خیال میں انسان کی پوری تاریخ مقصد الٰہی کے تابع ہے اور یہ ناقابل انکار اور مدلل اصول کہ جو شخص بھی فطرت کی آواز پر لبیک نہیں کہتا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کیفر کردار کو پہونچتا ہے اس کی رہ نمائی کرتا ہے۔ آپؐ نے اپنے صحابیوں کو بنی اسرائیل کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کی اجازت دی، اس لئے نہیں دی تھی کہ یہودیوں کے لئے مقرر کئے ہوئے ضابطۂ حیات سے استفادہ حاصل کریں۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی اخلاقی تعلیمات کی پاکیزگی اور معاشرتی زندگی اور اشتراکی ساعی کے عظیم الشان اسباق سے بہرہ ور ہوں۔

آپؐ تاریخ یہود کے واقعات بیان کرنے کی اجازت دیتے تھے، ایک اور دوسری روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ کی مجلس میں تاریخ یہود پر اتنی دیر تک گفتگو ہوتی رہی کہ نماز کا وقت آگیا ۔ احادیث اسلامی کے مسلم الثبوت عالموں کا قول ہے کہ ان کی تاریخ اتنی معتبر نہیں ہے، جتنی کہ آنحضرت اور ان کے عہد کی تاریخ اور اس کا سبب انتقال زمانہ اور (تاریخی) شہادتوں کے باقاعدہ تسلسل کا فقدان ہے۔

جو لوگ آپ کی موجودگی میں ایام جاہلیت کے قصے بیان کیا کرتے تھے ان کو آپ بڑی کریم النفسی اور ضبط و صبر سے سنتے تھے، ایک شخص سے جو ایک سو سے زائد بار آپ سے شرف ملاقات حاصل کر چکا تھا، روایت ہے کہ آپ کے صحابی اکثر ایام جاہلیت کے بارے میں گفتگو کیا کرتے تھے، اور اس زمانہ کی منظومات پڑھا کرتے تھے آنحضرت خاموشی کے ساتھ ان کو سنا کرتے تھے، اور اکثر آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلا کرتی تھی (غالباً کسی خوشگوار لطیفہ کو سن کر کیوں کہ اس دوران میں لطائف و ظرائف کی بر ابر رہا کرتی تھی)۔

۱۔ ابی داؤد جلد اول صفحہ ۱۰۹ ۲۔ المنتقر صفحہ ۵۲

عہد خلافت کے آغاز میں قصہ گوئی کا عام رواج تھا اور حضرت عمرؓ پہلے خلیفہ تھے جنھوں نے تمیم الداری کو کہانیاں (حکایات) سنانے کی اجازت دی، جو کھڑے ہو کر سنایا کرتے تھے قصہ گو کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی حکایات کو نبیوں اور عہد گذشتہ کے ان لوگوں کے تذکرے تک محدود رکھے جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ حضرت عمر کی رائے میں قرآن میں حضرت یوسف کا قصہ اس قسم کے ادب کے لئے ایک معیار پیش کرتا ہے ؎۱

طب

کتب احادیث میں ہمیشہ ایک باب طب پر ہوتا ہے اور اکثر زرنوجی کے قول کے مطابق عالم کو طب کی کچھ استعداد ضرور ہونا چاہیئے: تاکہ وہ اپنی کلید جسمانی کو صحت مند حالت میں رکھ سکے وہ (اس سلسلہ میں) شیخ الامام ابو العباس المستغفری کے لکھے ہوئے رسالہ طب النبی کے (مطالعہ کی)، رائے دیتے ہیں۔ ؎۲

ایک حدیث کے مطابق علم کی صرف دو قسمیں ہیں۔ علم الادیان اور علم الابدان ان لوگوں کے لئے جو طبابت کا پیشہ اختیار کرتے ہیں، امراض کے علاج کا باقاعدہ علم ہونا آنحضرت کی اس حدیث کی رو سے ایک مذہبی فرض قرار پاتا ہے جس میں آپ نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر کوئی نیم حکیم، کسی شخص کا علاج کر رہا ہو اور وہ شخص مر جائے تو اس کو لازم ہے کہ دیت (خون بہا) ادا کرے۔ جو شخص طب کا علم رکھے بغیر دوسروں کا علاج کرتا ہے وہ اس شخص کی موت کا ذمہ دار ہوگا جو اس کے ہاتھوں مرے گا۔ اور اس کو چاہیئے کہ دیت ادا کرے ؎۳

آنحضرتؐ اکثر معمولی تکالیف کا علاج کیا کرتے تھے اور آپ کے معالجہ میں اکثر ایک خوشگوار احساس ظرافت کی چاشنی ہوا کرتی تھی، ایک مرتبہ ایک شخص کے پیٹ میں درد تھا، اس کا بھائی آنحضرت کے پاس مشورہ کے لئے آیا۔ آپ نے شہد تجویز کیا، وہ شخص تین بار واپس آیا اور ہر بار یہی بتایا کہ مریض کو کوئی افاقہ نہیں چوتھی بار جب وہ پھر آیا تو آنحضرتؐ نے اس سے کہا کہ خدا سچا ہے لیکن اس کے بھائی کا معدہ جھوٹا ہے

؎۱ کنز العمال، باب در بیان علم ؎۲ زرنوجی صفحہ ۱۳
؎۳ ابی داؤد، باب در بیان طبابت بغیر علم۔

آپؐ نے اس کو مشورہ دیا کہ ایک مرتبہ پھر اس (مریض) کو ایک خوراک شہد کھلائے۔ اس مرتبہ مریض کو نمایاں فائدہ ہوا۔

ابن خلدون پورے موضوع کو خالص سائنسی ناویہ نگاہ (تناظر) سے دیکھتے ہیں، جو اس مفکر اعظم کے شایانِ شان ہے، ان کی رائے میں آنحضرتؐ کے مجوزہ علاجوں کو مذہبی ہدایات کی سی اہمیت نہیں حاصل ہو سکتی اس لئے کہ آپ کا مشن (دائرۂ عمل) فن طب کی اشاعت نہیں تھا، البتہ آپ کے بتائے ہوئے علاجوں کو علاج بالعقیدہ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے، اس لئے نہیں کہ وہ علم طب کے اصولوں کے بالکل مطابق تھے۔ بلکہ اس لئے کہ دوا کی تاثیر میں عقیدہ کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے، اس طرح ابن خلدون نفسیاتی طریقۂ علاج کے اعتبار سے ایسے علاج کی اہمیت کو پیش کرتے ہیں۔ ؎

علم ہیئت مسلمانوں نے علم ہیئت کی ترقی میں بہت بڑی مدد دی ہے، ان کی جنتریاں اور جدول فلکی (ASTRONOMICAL CHARTS) ان کی رصدگاہیں اور آلات عربی میں جدید ہیئت کی علمی اصطلاحات ان تمام چیزوں سے اس امر کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ زمانہ قدیم ہی سے یہ فن علم کا ایک معزز شعبہ سمجھا جاتا تھا، لیکن جب اس فن میں ستاروں کے اثرات پر توہمانہ عقیدہ کا دخل ہونے لگا تو اسلام نے بڑی جرأت کے ساتھ اس سے احتراز کیا اور اس قسم کے رجحان کی یک قلم مذمت کی۔

اس طرح آنحضرتؐ نے علم ہیئت کو نہیں بلکہ نجوم کو بھی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ قرآن میں علم ہیئت کو ریاضی کا ایک شعبہ تسلیم کیا گیا ہے جو اجرام فلکی کی گردش پر بحث کرتا ہے، اور ایک ریاضی سورج اور چاند کی ہے "پھر آیا ہے" اور ہم نے چاند کے لئے اس کی منازل مقرر کی ہیں یہاں تک کہ وہ ایک پرانی شاخ (SPRIG) میں تبدیل ہو جاتا ہے"۔

الغزالیؒ کے قول کے مطابق علم نجوم میں علت اور معلول (CAUSE AND EFFECT) کے رشتہ سے بحث ہوتی ہے اور سیاروں کی حرکت (گردش) کے متعلق اسی طرح پیش گوئی کی جاتی ہے جس طرح ایک طبیب علامات کو دیکھ کر کسی شدید مرض کے حملہ کی پیشین خبری کرتا ہے۔

؎ ملاحظہ ہو ان کا دیباچہ (PROLOGOMENA) باب در بیان طب

آنحضرتؐ نے اپنی امت کو پہلے سے آگاہ کر دیا تھا کہ ایک ایسا وقت آئے گا کہ جب یہ علم نجوم میں تبدیل ہو جائے گا اور ستارے علم غیب اور توہمانہ عقیدہ کی علامات بن جائیں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ میری امت پر مستقبل میں تین قہر (CALAMITIES) نازل ہوں گے اور ان میں سے ایک یہ ہوگا کہ انھیں نجوم پر عقیدہ ہو جائیگا۔

حضرت عمرؓ نے اس فن کے علمی فوائد کا مزید وضاحت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے اور اس کے ساتھ کسی قسم کی لغویات کے منسوب کیے جانے کی گنجائش نہیں رکھی ہے۔ فلکیات کو صرف خشکی اور سمندر میں سمت معلوم کرنے میں مدد لینے کی غرض سے سیکھو اور اس سے آگے اس سے کوئی کام نہ لو۔

غیر ملکی زبانیں: یہ غلط فہمی بہت عام ہے کہ آنحضرتؐ کے زمانہ میں تعلیم کے مافیہ صرف قرآن اور احادیث پر مشتمل تھے لیکن بہت معتبر طور پر اس امر کا ثبوت بہم پہونچتا ہے کہ نصاب تعلیم محض مذہبی ملحوظات (CONSIDERATION) تک محدود نہیں تھا، آنحضرت کی مسجد کے صحن میں بھی جو گفتگو اور بحث مباحثے ہوا کرتے تھے ان کے موضوعات اکثر و بیشتر دنیوی امور سے متعلق ہوا کرتے تھے، ہمسایہ ممالک سے روز بروز ان کے تعلقات اور اختلافات میں اضافہ ہو رہا تھا جس کی وجہ سے وہ غیر ملکی زبانوں کے مطالعہ پر مجبور ہوئے اور بیرونی فتوحات نے اس کی ضرورت محسوس کرائی کہ وہ مفتوح عوام کی تہذیب، رسم و رواج، نظم و نسق اور نظام حکومت کے بارے میں مزید گہرا علم رکھیں۔

حسابات اور تنقیح حساب کے لئے دیوان کی اصطلاح ایرانیوں کی باضابطہ (OFFICIAL) فرہنگ سے مستعار کیا گیا ہے، اور حساب دانی کے پورے نظام کو (ایرانیوں) سے مستعار کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے پاس خالص دنیاوی نوعیت کا معتد بہ علم ہو گیا۔ آنحضرتؐ کی حیات ہی میں غیر ملکی زبانوں کو سیکھنے کا رواج ہو گیا تھا اور زید بن ثابت کی روایت پر ہمارے پاس ایک حدیث ہے جس میں آنحضرتؐ نے بتایا ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ کو شامی زبان میں لکھے ہوئے خطوط ملے اور آپ ان کے مافیہ کو نہیں سمجھ سکے، آپؐ نے یہ کام کسی یہودی کے سپرد کرنا پسند نہیں کیا، چنانچہ ان (زید بن ثابت) سے اس زبان کو سیکھنے کی فرمائش کی زید نے حیرت انگیز طور پر سولہ دن کے مختصر عرصہ میں وہ زبان سیکھ لی اور یہودیوں کے پاس سے آئے ہوئے خطوط کو سمجھنے اور ان کا جواب دینے لگے ۔ف

ابن اسحٰقؒ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرتؐ فارسی کے چند الفاظ بول سکتے تھے۔ اور ایک مرتبہ جب سلمانؓ فارسی آپ کے پاس آئے تو آپؐ نے "درست..... وغیرہ"[۱] الفاظ بولے اور محمد بن عامل کے قول کے مطابق ان کا مطلب غالباً مہمان کا پرجوش خیر مقدم کرنا ہوتا تھا، آنحضرتؐ کے پاس سجل نامی ایک کاتب تھا اور تحریر کو مٹی سے خشک کرنے اور کان پر قلم لگانے کے بارے میں چند احادیث ہیں۔ لیکن ان کی صحت قدرے مشکوک ہے[۲]

تمثیل بڑے بڑے ماہرین کے لئے حکایات (PARABLES) کے ذریعہ تعلیم دینے کا طریقہ اخلاقی تعلیم کے لئے بہت ہی موثر آلہ کار ثابت ہو چکا ہے، یہ طریقہ بچوں اور سادہ دل بالغوں دونوں کے لئے یکساں طور پر موثر ہے، اگر ایک کو حکائتی عنصر سے دلچسپی ہوتی ہے تو دوسرا اس کے اخلاقی لب و لہجہ میں کشش پاتا ہے۔ اس قسم کا ادب اخلاقی اصولوں کی وضاحت کی ایک سادہ اور بے تصنع شکل پیش کرتا ہے۔ تشبیہ یا استعارہ ایک جداگانہ تصور کی تزئین یا اس کی وضاحت کے لئے استعمال ہوتا ہے اور حکایت اخلاقی زندگی کے کسی اصول کو مثال کے ذریعہ واضح کرتی ہے اور اسے اصلیت اور حقیقت کا جامہ پہناتی ہے۔

احادیث میں جو حکایات آئی ہیں وہ انجیل کی حکایات کے مقابلے میں زیادہ طویل اور مکمل ہیں اور قصہ کے اخلاقی تار و پود میں کسی انسانی شے (SOMETHING — HUMAN) کا اضافہ کرتی ہیں۔ اندھے گنجے اور کوڑھی کی ایک مشہور حکایت ہے جن میں سے ہر ایک کے جسمانی امراض خدا کے رحم و کرم سے اچھے ہو گئے اور ان کے پاس کافی مال و دولت بھی ہو گیا لیکن اس کے باوجود بھی ان کے روحانی امراض (کثافت) نہیں دور ہوئے۔ احادیث میں اندھے آدمی کو اس شخص سے تعبیر کیا گیا ہے جس کی اندرونی بصارت واپس آ گئی ہو۔ ایک دوسری سادہ حکایت میں تین قسموں کو کھیتوں پر کام کرنے والے مزدوروں کے تین گروہ بتایا گیا ہے جس میں سے دو گروہ کام نامکمل چھوڑ کر بغیر مزدوری لئے واپس چلے گئے اور تیسرے گروہ کو جو اسلام کی نمائندگی کرتا ہے اور جس نے دوپہر بعد سے کام شروع کیا تھا پورے دن کی اجرت ملی کیوں کہ اس نے اپنے آقا کی مرضی پوری کی تھی[۳] ایک دوسری حکایت تین مسافروں کی ہے جو ایک لڑھکتی ہوئی چٹان سے ایک غار میں بند ہو گئے تھے۔

---

[۱] صحیح البخاری صفحہ ۷۶ ۱۷۵ [۲] ابی داؤد

احادیث کی ایک اور قسم ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے حیرت انگیز طور پر موثر ہیں۔ اور دلوں میں احترام پیدا کرتی ہیں، یہ احادیث عربی اور دوسری زبانوں کے ایک نئی قسم کے ادب میں پیش پیش رہی ہیں انھوں نے نسلوں تک شعراء اور مصنفین کے تخیل میں جان ڈال دی ہے، اور آخر میں اقبال کے جاوید نامہ کی شکل میں اس قسم کے ادب کا شاندار نمونہ پیش کیا ASIN کے مطابق ڈانٹے کی کومیڈیا ڈیوائینا اس قسم کی احادیث سے براہ راست مستفیض ہوئی ہے۔

یہ احادیث ایک انوکھی شان و شوکت کی مالک ہیں۔ اور یقینی طور پر وحشی عربوں کے لئے ضبط نفس کا ایک موثر آلہ کار ثابت ہوئی ہوں گی جن کے جذبات بسا اوقات ریگستان میں چلنے والی باد سموم کی طرح بھڑک اٹھتے تھے۔ ان احادیث میں رستادانہ ضبط (CLASSICAL RESTRAINT) کی آن بان اور معتوب کے لئے ایک دبی ہوئی ہمدردی پائی جاتی ہے۔ تاہم وہ احساس عدل اور گناہ اور سزا کے درمیان ایک قریبی رشتہ کی مظہر ہیں، ان لوگوں کے لئے جو ایک عرصہ تک گالی کا جواب گالی اور تھپڑ کا جواب تھپڑ سے دینے کے اصول کو برتتے چلے آرہے تھے، یہ احادیث یقیناً ایک خاص اپیل رکھتی ہوں گی۔ یہ احادیث اخلاقی نتائج کے نظریے کی بہترین مثال ہیں۔

صبح کے اجتماع میں آپ رات کو خواب کے تجربات بیان کرتے اور دوسروں کو بھی اپنے تجربات بیان کرنے کی دعوت دیتے، ایک مرتبہ آپ نے بیان کیا کہ کس طرح آپ نے دیکھا کہ ایک دروغ گو کا منہ چیر کر اس کو اذیت میں مبتلا کیا جا رہا ہے اور کیسے ایک عالم کو جو دوسروں کو قرآن پڑھاتا تھا لیکن خود اس سے غفلت برتتا تھا۔ اس کا سر کچل کر سزا دی گئی۔ فرائڈ FREUD کے ایسے ماہرین نفسیات کے ہاتھوں خواب کی تعبیر بیان کرنا ایک بہت معزز علم بن گیا ہے۔

فرائڈ نے (LEORNADO DE VINCI) کے خوابوں کا نمایاں مطالعہ کیا ہے۔ لیکن ان کی سرگرمیاں بہت محدود ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ مستقبل کے سائنس دان انسانی فکر و عمل کے سرچشموں کے اعلیٰ اور وسیع تر تصورات کی روشنی میں اس موضوع پر مزید مفید تحقیق کریں گے۔[1]

---

[1] خواب کی ان تمثیلات کے لئے ملاحظہ ہو بخاری باب الجنائز

نجی معلّمی کے بعض پہلو

فضل احمد

نجی معلمی یعنی پرائیویٹ ٹیوشن آج کل ہماری تعلیمی زندگی کا ایک ضروری جزو ہے، تاہم اسے موجودہ صورت اختیار کئے کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا، دیہاتی مدرسوں میں تو آج بھی یہ چیز قریب قریب نا پید ہے. مگر شہروں اور قصبوں میں اس کی عمومیت کا حال غالباً سب کو معلوم ہے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں ایک قصبے سے میٹرک پاس کرکے ۱۹۲۷ء میں لاہور آیا تو پہلی بار پرائیویٹ ٹیوشن کا نام سنا. آج قصبوں میں بھی اس کی حکمرانی ہے. اور شاید وہ دن دور نہیں جب دیہات میں بھی لوگوں کے لئے اپنے بچوں کو نجی معلمی کا سہارا ڈھونڈے بغیر تعلیم دلانا محال ہو جائے۔

کسی شہر یا قصبے میں آپ کو اگر کبھی کسی والد سے یہ پوچھنے کا اتفاق ہو کہ آپ کا صاحب زادہ پڑھائی میں کمزور کیوں ہے؟ تو جھٹ جواب ملے گا کہ لڑکا ہے تو بہت ذہین مگر کیا کیا جائے مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ ٹیوشن رکھ دوں اور آپ جانتے ہیں کہ اس کے بغیر وہ بے چارہ کیا کر سکتا ہے؟ اگر اسی طرح کسی لڑکے سے پوچھا جائے کہ کیوں میاں صاحب زادے تم پڑھنے سے جی کیوں چراتے ہو؟ تو فوراً جواب ملے گا کہ صاحب مجھے پڑھنے کا شوق تو بے حد ہے. مگر کیا کروں گھر والے ٹیوشن رکھ کر نہیں دیتے. بھلا اس کے بغیر میں کیوں کر پڑھ سکتا ہوں غرضیکہ والدین اور طلبہ دونوں فریقوں کے ذہنوں میں یہ بات پختہ ہو چکی ہے کہ امتحان میں کامیاب ہونے کے لئے نجی معلمی کا سہارا لازمی ہے۔

اس افسوسناک ذہنیت کے نتائج کیا ہیں؟ اس کا سب سے خطرناک نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مدرسوں سے سال بسال نوعمر طلبہ کا جو انبوہ کثیر تعلیم سے فارغ ہو کر نکلتا ہے وہ ذہنی طور پر اپاہج اور سہاروں کا محتاج ہو کر

مطلب ہے یوں تو ان میں امتحانوں میں اول درجہ پانے والے اور بہت اونچے نمبر حاصل کرنے والے لوگ بھی شامل ہوتے ہیں مگر ذہنی توانائی کے لحاظ سے مناسب کے سب بے بسی کی ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں، اگر کوئی فرق ہوتا ہے تو صرف اتنا کہ ان میں سے بعض دوسروں کے اشاروں کو زیادہ جلدی اخذ کر لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور بعض بے چاروں کو بار بار سمجھانا پڑتا ہے، تب کہیں جاکر وہ بات کو سمجھ پاتے ہیں لیکن جہاں تک اپنی ذہنی اپج اور آزادانہ سوجھ بوجھ کا تعلق ہے ہمارے مدرسوں کے کامیاب طلبہ عموماً ایک ہی منزل پر نظر آتے ہیں، وجہ بالکل ظاہر ہے۔ زمانہ طالب علمی میں انھیں خود سوچنے اور ناقدانہ کام کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ اوقات مدرسہ میں تو استاد کی زیر ہدایت کام کرنا ہی تھا، گھر پر آکر بھی پڑھنے لکھنے کا کام کرنے کے لئے نجی معلم کی ضرورت پیش آئی اور گھر کا مطالعہ صرف ان دو ایک گھنٹوں تک محدود ہو گیا جب استاد صاحب ٹیوشن پڑھانے آئیں۔ ماں باپ اور طالب علم ہر دو کو یقین ہو گیا کہ تجربہ کار استاد کی رہنمائی میں ایک گھنٹہ پڑھ لینا طالب علم کے اپنے طور پر چھ گھنٹے پڑھنے سے زیادہ مؤثر ہے بس اس جادو اثر نسخہ کے استعمال کے بعد کسی مزید کاوش کی ضرورت نہ والدین نے ضروری سمجھی، نہ طالب علم نے۔ باقی رہا استاد تو وہ بھلا جنت الحمقا کے ان باسیوں کو اس غلط فہمی سے کیوں چونکانے لگا؛ اس کا فائدہ تو اسی میں ہے کہ اس کی جادو اثر نجی معلمی کا ڈنکا بجے اس لئے وہ اس ڈھول کے پیٹنے میں والدین اور طلبہ دونوں سے پیش پیش رہتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کوئی کان ایسا نہ رہے جس تک یہ آواز نہ پہنچے۔ ان تمام باتوں کا مجموعی نتیجہ سب کے سامنے ہے ہمارے مدرسے روز بروز ایسے نوجوانوں کو کار زار زندگی میں بھیج رہے ہیں جن کے اذہان بہت سی معلومات سے اٹے ہوتے ہیں، مگر جن میں اعتماد نفسی اور سلیقہ کار نام کو نہیں ہوتا۔ یہ اوصاف انھیں زندگی کے تلخ تجربوں سے اخذ کرنے ہوتے ہیں۔

ذی استطاعت لوگوں کے بچوں پر اس صورت حال کا جو اثر ہوتا ہے اسے تو بہر صورت چھوڑیئے نادار طلبہ جس بری طرح سے نجی معلمی کے مضر اثرات سے تباہ ہو رہے ہیں وہ خصوصیت کے ساتھ قابل افسوس ہے پہلے یوں ہوا کرتا تھا کہ اگر کوئی غریب طالب علم کسی وجہ سے پڑھائی میں پیچھے رہ جاتا تو وہ اپنے سے اچھے ہم جماعتوں کے ساتھ مل کر کمی پوری کرنے کی کوشش کرتا، اسے نہ صرف خود ہی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی مشق

ہو جاتی بلکہ مدد کرنے والے ساتھی کے لئے بھی یہ چیز بے حد نامارہ رساں ثابت ہوتی، اب صورت حال بالکل مختلف ہے آج کل مدرسہ کے سارے ماحول کو نجی معلمی کے اثرات نے کچھ اس طرح گھیر رکھا ہے کہ طالب علم امیر ہو یا غریب نجی معلمی ہی کو سب دکھوں کا تریاق خیال کرتا ہے، اگر جیب اجازت نہیں دیتی تو اس کی کوئی اور صورت تلاش کر لی جاتی ہے۔ لیکن بہرحال ٹیوشن کے بغیر چارہ نہیں، آپ لاکھ تلقین کریں کہ کوئی متبادل طریق کار طلبہ یا والدین کی تشفی کر دے لیکن وہ اس سے کبھی مطمئن نہ ہوں گے، نجی معلمی کو تعلیمی صحت مندی کے لئے اس قدر ضروری خیال کیا جانے لگا ہے کہ اگر والدین میں یہ توفیق نہیں کہ معلم مدرسہ کی خدمات حاصل کر سکیں تو پھر گلی محلّے کے کسی بابو کسی ریٹائرڈ ملازم اور کسی اور لکھے پڑھے آدمی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، کسی شہر یا قصبے کے گلی کوچوں میں نکل جائیے، آپ کو جگہ جگہ اس قسم کے خود ساختہ مدرس جماعتیں لئے بیٹھے نظر آئیں گے، ہر چند یہ لوگ نہ ضروری تعلیمی قابلیت کے مالک ہوتے ہیں اور نہ طریقہ ہائے تعلیم ہی سے واقف، مگر چونکہ سستے داموں نجی معلمی کے فیوض کو فروخت کرتے ہیں، اس لئے غریب طلبہ کی ان کے ہاں خوب بھیڑ رہتی ہے معلوم نہیں یہ لوگ اچھے نتائج دکھانے کے لئے کیا طریقے اختیار کرتے ہیں، تاہم اتنا ضرور ہے کہ ان میں سے ہر ایک ماہر تعلیم ہونے کا مدعی اور فن تشہیر کا امام ہوتا ہے، اور ان دکانوں کی رونق زیادہ تر انھی ہتھکنڈوں کی مرہون منت ہوا کرتی ہے۔

مفلس والدین میں سے اکثر اسی ٹوہ میں رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح کسی استاد یا کسی اور پڑھے لکھے آدمی سے راہ و ربط پیدا ہو جائے، جوں ہی اگلے شخص کو ذرا ہمدردی کی طرف مائل پایا جھٹ اس سے نجی معلمی کی بھیک طلب کی، یہ چیز صرف ان پڑھ والدین تک ہی محدود نہیں بلکہ نچلے اوسط درجہ کے ملازم لوگوں کا عام طریقہ یہی ہے، مجھے ایک مدرس کا حال اچھی طرح معلوم ہے، بے چارے نے ایک دردمند دل اور ملنسار طبیعت پائی تھی، اس کے باوجود وہ زیادہ میل جول سے کتراتا تھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند مرتبہ کے تلخ تجربہ نے اسے پھونک پھونک کر قدم رکھنے پر مجبور کر دیا ہے، شروع شروع میں حلقۂ احباب کے وسیع کرنے کا شوق تھا مگر دیکھا کہ جہاں ذرا علیک سلیک ہوئی وہیں مطالبہ ہونے لگا کہ لڑکا کچھ کمزور ہے اسے وقت دیجئے گا، اب یا تو آنکھیں بدل کر کورا جواب دیا جائے۔ اور یا اس بلا کو اپنے

سر تھوپا جائے۔

مجھے خود اس بارے میں کافی تلخ تجربہ ہے ایک صاحب سے پرانے خاندانی تعلقات تھے۔ اب وہ بچارے خود بوڑھے اور ریٹائرڈ تھے، گذارے کی کوئی معقول صورت نہ تھی، بڑا لڑکا دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک روز آئے اور اپنی پریشانیوں کا ذکر کرنے لگے، میں نے کہا خیر جوں توں کر کے چند ماہ گذار لیجیے لڑکا میٹرک پاس کر کے کہیں کام پر لگ جائے گا تو آپ کو سہارا مل جائے گا۔ فرمانے لگے کہ اس بارے میں تو مجھے سب سے بڑی فکر دامن گیر ہے۔ لڑکا بہت کم زور ہے، ٹیوشن رکھ دینے کی مجھ میں ہمت نہیں، تمہارے پاس اس غرض سے آیا ہوں کہ اسے کچھ سدھار دو، بس صرف چند ہفتوں کی چھٹی پر تھا، چناں چہ ان کے ارشاد کی تعمیل ہو گئی، لڑکے کو انگریزی اور حساب کی کچھ بنیادی باتیں سمجھا دی گئیں اور تاکید کر دی گئی کہ اب اسی طور پر خود کام کیے جاؤ۔ ضرور کامیاب ہو جاؤ گے، مگر صاحب زادے کے لئے بلا سہارے ایک قدم اٹھانا دوبھر تھا، خود بخود کام کیسے کرے، میٹرک میں پہلی دفعہ ناکام ہو گئے، اگلے سال جوں توں کر کے پاس ہوئے تو کالج میں داخل ہونے کے لئے مچل گئے باپ نے بہتیرا سمجھایا کہ کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر لو مگر ایک نہ سنی، اس پر طرہ یہ کہ ایف۔ اے میں داخل ہوئے تو پھر وہی پہلی سی چال بے ڈھنگی۔ بوڑھے والد اب پھر مارے مارے پھر رہے ہیں کہ صاحب زادہ کی پرائیویٹ ٹیوشن کی کوئی راہ نکل آئے، ادھر حالت یہ ہے کہ گھر میں کھانے کو نہیں ہے ؎

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

غرض ناسازگار حالات جو پہلے طبیعت اور کردار کی پختگی کا باعث ہوا کرتے تھے اب عموماً ہلاکت آفریں ثابت ہو رہے ہیں، نجی معلمی کے زہریلے اثرات نے ہماری تعلیمی زندگی کی ساری فضا کو اس حد تک زہریلی بنا دیا ہے کہ نسیم جاں فزا کے جھونکے بھی اب اپنی تاثیر بدل چکے ہیں۔ نادار طبقہ کے اکثر بے بہا جوہر جو پہلے آزادانہ جد و جہد کے طفیل خوب چمکا کرتے تھے اب عموماً دبے کے دبے ہی رہ جاتے ہیں، نجی معلمی کا غالباً یہ سب سے بڑا قومی نقصان ہے۔

مدرسہ کے استادوں کے متعلق اکثر شکایت کی جاتی ہے کہ وہ والدین کا تعاون حاصل نہیں کرتے لیکن نجی معلمی کے دور دورے نے اس بارہ میں جو عملی مشکلیں پیدا کر دی ہیں ان کا علم کچھ انہی لوگوں کو ہے جنھیں کہ

انجام دینا پڑتا ہے۔ استاد کے لئے والدین کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو وہ خط لکھ کر والد کو مدرسے میں بلائے، یا خود اس کے مکان پر ملنے جائے۔ اب اگر والد ذرا بھی کھاتا پیتا آدمی ہے تو دونوں صورتوں میں اسے جھٹ یہی گمان گذرے گا کہ استاد اس کے بیٹے کی پرائیویٹ ٹیوشن کا خواہاں ہے پس وہ ساری بات اسی ذہنی پس منظر میں کرے گا۔ استاد لاکھ چاہے کہ اپنا اصل منشا واضح کرے مگر ساری کوشش بے کار ہے۔ اگر والد نے پہلے سے بچے کی ٹیوشن کا بندوبست کر رکھا ہے تو وہ استاد کے مشوروں کو بلکہ اس کی ملاقات کو سراسر ایک حاسدانہ دخل اندازی خیال کرے گا لیکن اگر اسے ابھی ٹیوشن کی تلاش ہے تو وہ ہر طریق پر استاد کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کرے گا۔ اگر والد مفلس اور نادار ہے تو وہ لامحالہ اپنی زبوں حالی کا واسطہ دلا کر استاد سے نجی معلمی کی بھیک مانگے گا۔ غرض استاد کی حقیقی منشا کے پورا ہونے کے امکانات ہر صورت میں بہت بعید ہوں گے۔

بے چارے استاد کو اس ضمن میں ایک اور دشواری کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اول اول جب بعض اساتذہ ملازمت میں داخل ہوتے ہیں تو یہ عہد کر کے آتے ہیں کہ نجی معلمی کے پاس تک نہ پھٹکیں گے لیکن جوں ہی آئے ہوئے چند ہفتے یا چند ماہ گذرے کسی روز صدر معلم کے ہاں پیشی ہوئی اور چند رسمی باتوں کے بعد حکم ملا کہ فلاں صاحب کا فلاں صاحبزادہ جو فلاں جماعت میں پڑھتا ہے، اس کے لئے ٹیوشن کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں آپ اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں، اتنے روپے ماہوار مل جایا کریں گے، اور یوں بھی وہ صاحب بڑے آدمی ہیں ان کے ساتھ مراسم قائم ہو جانے سے آپ کو کئی ایک فوائد ہوں گے۔ اب استاد عجب مخمصے میں ہے، ہاں کرے تو اپنے بلند ارادوں کا خون اپنے ہاتھوں کرے اور اگر انکار کرے تو صدر معلم کی ناراضگی یقینی ہے۔ حال ہی میں مجھے ایسے واقعے کا علم ہوا۔ استاد نے جی کڑا کر کے صدر معلم کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ اس پر صدر معلم نے جھنجلا کر کہا۔ واہ عجب آدمی ہو، کیا تمہیں روپیہ کاٹتا ہے؟ گھر آتے رزق کو دھکے دیتے ہو! میں نے تو محض تمہارے فائدے کے لئے یہ پیشکش کی تھی، ورنہ دوسرے استاد بڑی نیازمندی سے یہ کام قبول کریں گے۔ غرضیکہ گو ہر صدر معلم خود نجی معلمی سے دامن بچانا ضروری خیال کرتا ہے لیکن اکثر صدر معلم اس تعلیمی کاروبار کے دلالوں کی حیثیت بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔

یہ ایک صدر معلم کا ذاتی تجربہ ہے جو اپنے مدرسے کو صوبے بھر کا بہترین مدرسہ کہتے نہ تھکتے تھے۔ مگر حالت یہ تھی کہ اس بندۂ خدا نے بڑے جتن کرکے استادوں کی تنخواہوں کو بڑھنے سے غالباً اس لئے روک رکھا تھا۔ کہ اس طرح یہ لوگ نجی معلمی سے بے نیاز ہو جائیں گے اور میرے نتائج اچھے نہ رہیں گے۔ مدرسے میں جب کوئی آسامی خالی ہوتی اور کسی امیدوار کو تھوڑی تنخواہ قبول کرنے پر پس وپیش ہوتا تو اسے نجی معلمی کی پیل پیل کے سبز باغ دکھائے جاتے اور فی الواقع اس ضمن میں اسے بالکل کھلی چھٹی دیدی جاتی کہ جو جی میں آئے کرے۔

اساتذہ کی یہ چند در چند مجبوریاں تصویر کا صرف ایک رخ پیش کرتی ہیں، بہت سے ایسے مدرسین بھی نظر آئیں گے جو مدرسی کی تربیت لینے سے پہلے بھی نجی معلمی کی دکانیں چلا رہے تھے اور جنھوں نے تربیت محض اس غرض سے حاصل کی کہ اس دکان کی رونق اور بڑھے۔ یہ لوگ عموماً اپنی نجی معلمی کی کامیابیوں کا ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتے اور نہایت دیانت داری سے ان کامیابیوں ہی کو اپنے اچھا معلم ہونے کا سب سے بڑا ثبوت خیال کرتے ہیں، یہ بات کبھی ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آئی کہ ایک اچھا استاد وہ نہیں جو چند گنتی کے طلبہ کو امتحان کی چھلنی میں سے گذرنے کا گر سکھا دے، بلکہ صحیح معنوں میں اچھا استاد وہ ہے جو اپنی جماعت کے بیشتر طلبہ میں آزاد مطالعہ اور عملی جستجو کی عادتیں پیدا کر دے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے اچھے سے اچھے مدارس میں بھی تدریس کا کام زیادہ تر انھی ہاتھوں میں ہے جو نجی معلمی کے فن میں یکتا گنے جاتے ہیں، پچھلے سال میرے ایک دوست کو اپنی ایک عزیزہ کو گھر پر پڑھانے کے لئے استاد کی ضرورت پیش آئی، ایک بہت مشہور مدرسے کے ایک معلم کے ساتھ ان کے مراسم تھے۔ ان کی طرف رجوع کیا گیا، انھوں نے دامن چھڑانے کے لئے بڑے ہاتھ پاؤں مارے مگر یہ کسی قیمت پر اپنی ہٹ سے باز نہ آئے، آخر بے بس ہو کر استاد موصوف نے فرمایا کہ معاملہ اصل میں یہ ہے کہ میں صبح پانچ بجے گھر سے نکل جاتا ہوں اور رات کو گیارہ بجے واپس آتا ہوں، اب اگر آپ میری ہی خدمات حاصل کرنے پر مصر ہیں تو میں گیارہ بجے کے بعد حاضر ہو جایا کروں گا۔!

یہ بات غالباً ماننی پڑے گی کہ نجی معلمی کو رواج دینے میں استادوں کی اقتصادی پستی کو بہت کچھ دخل ہے اسے واحد سبب تو قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن یہ ایک اہم سبب ضرور ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اساتذہ اس [illegible] مناسب [illegible] نہیں رکھتے۔ اصل میں یہ اساتذہ کا قصور نہیں، بلکہ فطرت انسانی کی

لازمی ہے، جب معاشرہ کسی جماعت کے جائز حقوق کی طرف سے بے پروائی برتے گا تو لامحالہ وہ جماعت اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کوئی اور راہ ڈھونڈے گی، ایسی راہ جو غیر قانونی ہونے کے باوجود معاشرہ کو برداشت کرتے ہی بنے کیوں کہ اس کے بغیر متعلقہ جماعت اپنے فرائض انجام دے ہی نہیں سکتی، بعینہٖ یہی صورت نجی معلمی کے بارے میں پیدا ہوئی ہے، معاشرے نے استاد کا معقول معاوضہ مقرر کرنے میں بخل سے کام لیا اور استاد نے اپنا پیٹ پالنے کے لئے نجی معلمی کا ضمنی پیشہ وضع کر لیا، اب اگر انسانی کمزوریاں استاد کو اس راستہ پر ضرورت سے آگے لے جاتی ہیں تو اسے ایک حد تک معذور سمجھنا چاہیئے۔

اس بحث میں نجی معلمی کے جن پہلوؤں پر نگاہ ڈالی گئی ہے، ان سے اس قدر واضح ہو گیا ہوگا کہ یہ چیز ہماری تعلیمی زندگی کی صحت مندی کے لئے حد درجہ نقصان دہ ہے، یہ ایک ایسا گھن ہے جو تعلیمی عمارت کو اندر ہی اندر سے کھائے جا رہا ہے، یہ امر بھی بالکل عیاں ہے کہ استاد کو معقول معاوضہ نہ دیکر معاشرے نے اپنے مالی بوجھ کو ہرگز ہلکا نہیں کیا، جو بچت اس نے تھوڑی تنخواہ کی صورت میں کی تھی اس سے کہیں زیادہ اسے نجی معلمی کی فیس کے طور پر ادا کرنا پڑ رہا ہے، اس سارے سودے نے اساتذہ اور طلبہ کی ذہنی اور روحانی صحت مندی کو جو صدمہ پہونچایا ہے، اس کی تلافی غالباً کوئی رقم نہیں کر سکتی، تعلیمی زندگی کی صحت اس مرض کی بدولت اب اس حد تک ندر فساد ہو چکی ہے کہ ایک سرسری نگاہ بھی اس کو فوراً دیکھ سکتی ہے، اب تک اس افسوسناک صورت حال کے تدارک کے لئے کچھ نہیں کیا گیا، چھوٹے بڑے تمام ان خرابیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "خاموش رہنے کی سازش" نے سب کے لب بند کر رکھے ہیں، لیکن اس صورت حال سے دیر تک نباہ نہ ہو سکے گا ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو اس نازک مسئلہ کے تمام پہلوؤں کی اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد اصلاح حال کے لئے سفارشیں پیش کرے، کیوں کہ یہ مسئلہ اب اس قدر ہمہ گیر اور پیچیدہ صورت اختیار کر چکا ہے کہ انفرادی کوششیں اس ضمن میں کچھ سود مند ثابت نہیں ہو سکتیں۔

بچوں کی تعلیم و تربیت میں گھریلو تعاون

محمد عبد العزیز

موجودہ نظام تعلیم میں مدرسے کے دوش بدوش گھر بھی بچے کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے لئے ایک اہم ادارہ ہے۔ بچے کو اخلاق و آداب سکھانے کی ساری ذمہ داری محض مدرسین ہی پہ عائد نہیں ہوتی، اس میں اچھے گھریلو ماحول کو بھی کافی دخل ہوتا ہے۔ گھر کے پست ماحول سے نکل کر مدرسے کی خوش آئند فضا میں وسعت نظر اور بلندی کردار پیدا نہیں ہو سکتی اور اس کے برعکس جن بچوں کو گھروں میں اچھی تعلیم ملتی ہے اور مدرسے میں انہیں دوراز کار مشاغل میں مصروف رہنا پڑتا ہے تو ان کی طبائع میں بھی کچھ عجیب تضاد پیدا ہو جاتا ہے اور یہ تضاد انفرادی طور پر بچے کے لئے تو مضر ہوتا ہی ہے، اس سے پورے سماج کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ درس و تدریس بجائے خود ایک فن یا تکنیک ہے جس کا براہ راست مدرس سے تعلق ہوتا ہے، اس خیال میں والدین اور اکثر مدرسین بھی شامل ہیں اور یہ نظریاتی اختلاف ہمارے ملک میں تو اکثر تنازعات کی صورت اختیار کر لیتا ہے، یہ درست ہے کہ بچے کو عمدہ کھانا کھلانا، صاف ستھرا لباس پہنانا اور انہیں آمادہ کار رکھنا گھر کا ایک اہم فرض ہے لیکن فرائض کی یہ حدود کھلانے، پہنانے اور مدرسہ بھیجنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتیں، یہ تو غیر معین اور آفاق گیر ہیں، ان فرائض سے عہدہ برا ہونے اور بچوں کی صلاحیتوں کو بطریق احسن بروئے کار لانے اور انہیں مفید شہری بنانے میں مدرسہ اور گھر مدرسوں کا ایک خاص حصہ ہیں۔ اس سلسلے میں حسب ذیل تین مثالیں دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی۔

پچھلے دنوں ... میں ایک بچہ ... اس کی تعلیمی پستی کے پیش نظر اس کے ...

مدرسہ آنے کی زحمت دی گئی۔ پہلے دو خطوط کی تو انھوں نے مطلق پروا نہ کی، جب ہیڈ ماسٹر کی تیسری تحریر ان کے پاس پہونچی تو وہ بہت زیادہ برہم ہوئے اور غالباً مدرسے کی تادیب کے لئے فوراً چل پڑے ان کے چہرے کا آثار چڑھاؤ ان کی غمگین نگاہیں۔ ان کی مصنوعی مسکراہٹ ان کا منہ چڑھا رہی تھیں۔ بات تو بہت لمبی چوڑی ہے۔ المختصر انھوں نے یہ فرمایا کہ بچے کی اس اخلاقی اور تعلیمی کج روی کی تمام تر ذمہ داری مدرسے پر عائد ہوتی ہے۔ ہمارا اس سے کوئی سروکار نہیں، ہم بچے کو اچھے سے اچھا کھانا کھلاتے ہیں، عمدہ لباس پہناتے ہیں اور اسے پڑھنے کے لئے مدرسہ بھیج دیتے ہیں، اب اگر اس میں کج خلقی اور بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا ذمہ دار مدرسہ ہے۔ ہم اپنے فرض سے سبک دوش ہو جاتے ہیں..
......" لیکن شائد انھوں نے اپنے دل کے روزن میں جھانک کر اپنی اندرونی کیفیات کو محسوس کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ کیا بچے کی جسمانی، روحانی، ذہنی اور اخلاقی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار صرف مدرسہ ہوتا ہے، یا اس کے بنانے بگاڑنے میں گھریلو ماحول کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔

کچھ دنوں پہلے ایک امریکی مدرسے میں گھریلو تعاون کے سلسلے میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، ایک مدرس نے ایک چھوٹے سے بچے کے والدین کے پاس حسب ذیل تحریر روانہ کی۔

"آپ کے بچے چارلس میں لاماسکیت (آنکھوں کی ساخت کا نقص) کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ براہ کرم اس کی تشخیص کے بعد اس کے علاج کی سبیل کریں۔"

دوسرے دن چارلس کے والد نے مدرس کے خط کا جواب ان الفاظ میں دیا۔ "میں نہیں سمجھ سکا کہ چارلس نے کیا کیا لیکن میں نے رات ہی اسے قرار واقعی سزا دے دی، صبح کو اگر آپ اس کی تادیب کریں گے تو میرے خیال میں وہ درست ہو جائے گا۔"

ایک قصباتی مدرسے میں ایک مدرس کے ساتھ کچھ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا، مدرس نوجوان تھا اس کے دل میں ملک و ملت کی خدمت کا جذبہ بھی موجود تھا اور جدید تعلیمی رجحانات سے بھی نابلد نہیں تھا جب وہ مدرسے میں پہونچا تو اس کا ماحول اسے کچھ مردہ مردہ سا نظر آیا، قدامت اور فرسودگی سے قطع نظر وہاں تو کسی کو نہ بڑے بچے اور اپنے فائدے نقصان کا بھی خیال نہیں تھا۔ اس نے مہینے ڈیڑھ مہینے کام کرنے کے بعد

بچوں کے والدین سے ملنا شروع کیا بعض نو مدرس کے انہماک سے خوش ہوئے اور اس کے ساتھ تعاون کیا بعض نے اسے ورغلانا قصدا سمجھا۔ اور بعض تو اس کی اس "نامعقول حرکت" پر بہت برہم ہوئے، مدرس اور ایک بچے کے والد کی گفتگو کے چند جملے مندرج ذیل ہیں:۔

"تو آپ کے خیال میں روشن خاں بہت کم زور ہے" بچے کے والد نے ذرا تند و تیز بلکہ تحکمانہ لہجہ میں پوچھا۔

"جی ہاں! تعلیمی اعتبار سے ہی پست نہیں ہے، اس کی اخلاقی حالت بھی قابل تحسین نہیں ہے، اس سے دوسرے بچوں پر بھی برا اثر پڑتا ہے" مدرس نے ذرا سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ چودھریوں کے بچے بھی بداخلاق ہونے لگے "ہم للّی یا یاؤلی" تھوڑے ہیں چودھری ہیں" چودھری صاحب نے ہنکارتے ہوئے فرمایا۔

"اخلاقی پستی یا بلندی میں بندہ و آقا یا چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں ہوتی" مدرس نے جوش میں آکر جواب دیا۔

"یہ وعظ تو کسی اور کو دیجیے! میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ چودھری لال دین کا لڑکا اس مدرسے میں دس سال سے پڑھ رہا ہے، اس کے متعلق کبھی کسی نے کوئی شکایت نہیں کی، آپ ہی ایک ایسے شخص ہیں جو اس کے کام اور اخلاق کے شاکی ہیں"

"جی۔ بجا ارشاد! اس کے بڑے بھائی کی بھی یہی حالت ہے"

"کیا کہا اس کے بڑے بھائی کی .... معلوم ہوتا ہے آپ بالکل ناتجربہ کار ہیں، دیکھیے! میں اپنے بچوں کی برائی سننے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوں، اچھے بچوں کو برا کہنا شرافت نہیں"

یہ مثالیں بظاہر متنازع معلوم ہوتی ہیں، ایک مثال ایسے باپ کی ہے جو بچے کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں اور دوسری مثال ایسے باپ کی ہے جو بچے کی تعلیم و تربیت کی خاطر دست تعاون بڑھانے کے لئے تیار ہے، لیکن اس کی طبعی عجلت پسندی نے مدرس کی تحریر کو بچے کی کم کوشی اور کام سے گریز پر محمول کیا، اس لئے خود بھی سزا دی اور مدرس کو بھی سزا دینے کی تلقین کی، صحیح حالات کا جائزہ لینے سے پہلے اور بچے کا جرم معلوم کئے بغیر اسے سزا دینا غیر مناسب ہی نہیں ظلم ہے، شکایت کچھ اور ہے علاج کچھ اور اس قسم کی تادیب سے بچے کی شخصیت پر بجائے اچھا اثر پڑنے کے ہمیشہ برا اثر پڑتا ہے، اور

قولاً اور عملاً تعلیم و تربیت کی جس ہمہ گیری کا مدرسہ پرچار کرتا ہے، اس سے بچے فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔

تیسری مثال ایسے باپ کی ہے جسے نہ اپنی ذمہ داری کا احساس ہے اور نہ مدرسے کی ذمہ داری سے کوئی دلچسپی اس کی مثال اس روایاتی پٹھان کی سی ہے جس کا ناعاقبت اندیش بیٹا ایک نووارد مہمان پر خنجر آزمائی کرنا چاہتا ہے لیکن باپ اسے اس لئے نہیں روکتا کہ یہ اس کا پہلا وار ہے کہیں اس امتناع سے بچے میں بزدلی نہ پیدا ہو جائے، اس لئے باپ نے مدرس کی باتوں کو قابل توجہ نہ سمجھا۔ اور بچے کو اپنی کوتاہ بینی سے بدراہ ہونے کا موقع دیا، اس نظری عدم مطابقت اور اس عملی بے ربطی کی وجہ سے بچے کے عادات و اطوار میں خوش سلیقگی پیدا نہیں ہونے پاتی اور سماج کا یہ مفید شہری گھر اور مدرسے کے عدم تعاون کا شکار ہو جاتا ہے، ہم اس بے راہ روی کو دیکھتے ہیں، اس کے عواقب و نتائج کا بھی جائزہ لیتے ہیں اور اس تعاون کی ضرورت کا لوگوں کو احساس بھی دلاتے ہیں لیکن چوں کہ ہم خود نشاط کار سے ناآشنا ہوتے ہیں اس لئے اپنی ذمہ داری کو دوسروں کے سر تھوپتے رہتے ہیں اور گم کردہ راہ مسافر کی طرح منزل سے دور حقائق سے بے پرواہ اپنے خیالات کی بھول بھلیوں میں پھنسے رہتے ہیں۔

لیکن ایک روشن خیال طبقہ ایسا بھی ہے جو گھر اور مدرسہ کے اشتراک کو سماج کی تعمیر نو کے لئے ضروری سمجھتا ہے، یہ درست ہے کہ تدریس بھی ایک فن ہے، کسی شخص کو ہر فن میں یکساں مہارت نہیں ہوتی۔ مگر یہ تصور کر لینا کہ انسان میں سرے سے تدریسی صلاحیتوں کا فقدان ہوتا ہے ماننے کی بات نہیں، تعلیم و تدریس میں مشاہدہ، مطالعہ اور عمل معلم کو تعلیمی تکنیک سے قریب کر دیتا ہے۔ اور مشاہدے، مطالعے اور عمل کی صلاحیتیں ہر شخص میں موجود ہوتی ہیں جن سے حسب ضرورت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور چوں کہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں گھر اور مدرسہ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، دونوں کی فطری و نظری یگانگت اور اشتراک عمل ہی میں ان کی پریشان نظری کا علاج ڈھونڈا جا سکتا ہے، اس لئے جو لوگ بچوں کی تعلیم و تربیت میں خود دلچسپی لیتے ہیں ان کی نگاہوں میں اس اشتراک کی ضرورت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے، والدین اور مدرسین دو ایسے گروہ ہیں جو ایک نقطۂ خیال پر متفق ہو کر سماج کے لئے مفید اور کارآمد کام کر سکتے ہیں۔ اور دونوں کی کشمکش سماجی ترقی کو مفلوج اور معطل کر سکتی ہے، اس لئے یہ سمجھنا کہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں

والدین کو بقدر ضرورت بھی حصہ نہیں لینا چاہئے، کوتاہ بینی اور کم سوادی کی دلیل ہے۔ بچے کے سماجی ماحول کی اگر بنیادی اختلاف ہوا یا اس کے نظام کار میں عدم مطابقت ہوئی تو اس سے محض اس خاندان کا ایک بچہ ہی متاثر نہیں ہوتا، پورا معاشرہ اس کی زد میں آجاتا ہے، اور زندگی کسی نظریاتی خلا میں متعلق حقائق سے ہم کنار ہونے سے محروم رہ جاتی ہے، اس سے نہ تو سماج کے مختلف ممبروں کے عقائد و رجحانات میں یکسانی پیدا ہونے پاتی ہے اور نہ اتحاد کار۔ طبیعتوں کا یہ اختلاف اور افکار و خیالات کا یہ تضاد انہیں گم کردہ راہ کر دیتا ہے جس سے کوئی انفرادی یا اجتماعی مفاد وابستہ نہیں ہوتا۔

جب بچہ مدرسے میں آتا ہے تو دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر نئی نئی باتیں سیکھتا ہے، ہر سبق میں اسے ایک نئی راہ نظر آتی ہے، وہ ان سب کو بغور دیکھتا ہے اور سنتا ہے، ان کا جائزہ لیتا ہے اور اپنی طبیعت کے مطابق ان میں سے بعض چیزوں کو اپنا لیتا ہے اور بعض کو ترک کر دیتا ہے، بعض باتیں اسے پسند آتی ہیں، اور بعض مرغوب خاطر نہیں ہوتیں، رفتہ رفتہ یہی اس کی عادت بن جاتی ہے، فی الحقیقت مدرسے میں بچہ جو کچھ پڑھتا یا سیکھتا ہے، یا کسی موضوع پر بحث و تمحیص کرتا ہے اس میں اس کے مشاہدے مطالعے اور عمل کو دخل ہوتا ہے، اگر گھر اس کے معلوماتی افق کو وسیع کرنے میں اس کی امداد کرے تو وہ کم وقت میں بہت مفید اور کارآمد باتیں سیکھ سکتا ہے، جن کا اس کی عملی زندگی سے گہرا تعلق ہوگا، اس موقع پہ غالباً امریکہ کے ایک ماہر تعلیم بلیس گوڈی کونز کے اپنے ذاتی تجربے کو نقل کرنا بے جا نہ ہوگا، وہ لکھتا ہے — "بچہ جو کچھ اپنے ماحول اور مدرسے میں سیکھتا ہے گھر میں اسے پختہ کیا جا سکتا ہے، میرے سامنے ایک ایسے خاندان کی مثال ہے جس کے سربراہ کو بچوں کی تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی اور بالخصوص امریکی تاریخ سے اسے بہت زیادہ شغف تھا، بچوں کی زندگی پر اس کے اس شغف کا اثر بھی پڑنا ضروری تھا، چناں چہ یہ بچے تاریخ میں کبھی ناکامیاب نہیں ہوئے۔"

اسی طرح بعض مدرسے بھی بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں کافی غور و فکر سے کام لیتے ہیں، جنگل میں پودے اگتے ہیں تو طبعی ماحول کے مطابق لمبے تناور یا پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، لیکن بچوں کو اس طرح نذر ہوا نہیں کیا جا سکتا، اس لئے ان کے مطالعے کے مضامین اور ان کے اوقات تدریس کی ایک مکمل اسکیم

کرلی جاتی ہے اور یہ اسکیم ہر بچے کے والدین کے پاس بھیج دی جاتی ہے، تاکہ اس کی روشنی میں گھر بھی بچوں کی تعلیم و تربیت میں اہم حصہ لے سکے، چنانچہ سال کے شروع ہی میں ایک مرکزی مدرسے نے اپنی جماعت کے بچوں کے والدین کے پاس ایک تحریر روانہ کی اس کے مندرجات یہ ہیں۔

"اس سال ہم ان انڈین کے متعلق معلومات حاصل کریں گے جو ریاست نیویارک میں رہتے ہیں، اگر آپ اپنے بچے کو متعلقہ مجموعہ اشیاء کو دکھانے کا اہتمام کریں جو ان انڈین کی زندگی سے متعلق ہیں تو اس سے بچے کو بہت زیادہ فائدہ حاصل ہوگا، یا کچھ انڈین گھرانوں میں جاکر بچے کو ان سے متعارف کرائیں، اس کے علاوہ کتب خانے میں بہت سی ایسی کتابیں جن میں صرف انڈین قوم ہی کا ذکر واذکار ہے، کچھ کتابیں تو مدرسے کے کتب خانے میں بھی ہیں، مگر ان کے مطالعہ سے بچے کی معلومات میں اور اضافہ ہوگا، کیا آپ اپنے بچے کے لئے لائبریری کارڈ بنوا سکتے ہیں، سال کے دوران میں کسی وقت ہم انڈین صنعت و حرفت اور دستکاری کی نمائش لگائیں گے۔"

ایک دوسرے اسکول میں، اگرچہ بچوں کے والدین کے پاس اس قسم کی تحریریں نہیں بھیجی جاتیں لیکن بچوں کی فلاح کے پیش نظر آغاز سال ہی میں والدین اور مدرسین کا ایک مشترکہ اجلاس ہوتا ہے، اس اجلاس میں والدین کو پورے سال کے کام سے روشناس کیا جاتا ہے، نصاب تعلیم، نظم اور اس کی دوسری جزئیات پر مباحثے ہوتے ہیں، اور بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے لئے کوئی راہ نکال لی جاتی ہے گھر اور مدرسے کے اس تعاون اور اشتراک عمل سے سماج میں زندگی کی نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں تو ... بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایسے مذاکرات کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے، تعلیم کی افادیت اور اس کے نظام سے عدم واقفیت کی صورت میں والدین اپنے فرائض محسوس نہیں کرتے، جاہل اور کم لکھے پڑھے والدین سے تو ہم اتنی توقع بھی نہیں رکھتے لیکن جو تعلیم یافتہ مہذب اور ترقی یافتہ کہلاتے ہیں وہ بھی اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت سے کچھ ایسے غافل ہوتے ہیں، جیسے انھیں ان سے کوئی سروکار ہی نہیں، اس لئے اگر ہمارے مدارس سوئے ہوئے والدین کے احساس فرض کو جگانے کی کوشش کریں تو ہماری بہت سی دقتیں حل ہو سکتی ہیں۔

بچے کے لئے گھریلو امداد کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس سے روزانہ اس کے درسی اور سماجی مشاغل کے متعلق کچھ سوالات پوچھے جائیں مثلاً آج تم نے کیا کچھ پڑھا ہے، گھر کے لئے تمہیں کیا کام دیا گیا ہے۔ کہیں وقت تو

محسوس نہیں ہو رہی۔ اور ہاں آج تو تمہارے ہاں مباحثہ بھی تھا تم نے اس میں حصہ لیا، اس قسم کے استفسارات سے بچے کے مشاغل اور تعلیمی حالت کا بآسانی جائزہ لیا جا سکتا ہے لاہور کے ایک معروف اسکول میں نویں اور دسویں جماعت کے طلبا کے لئے فوجی قواعد لازمی ہے، اور تیرہ سال کی عمر کے سارے بچے۔ جے۔ سی۔ سی میں داخل کر لئے جاتے ہیں۔ آغاز سال میں نویں جماعت کے سارے طلبا کو فوجی لباس کی گٹھڑی ملی، ایک بچے نے گھر پہونچ کر اپنی ماں سے یہ کہا کہ مجھے فوج میں بھرتی کر دیا گیا ہے اور غالباً کچھ اس انداز میں کہا جیسے اس کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کیا گیا ہے۔ ماں کی ممتا اور پھر موجودہ مشرقی ماں کی ممتا "بھلا یہ کھردرا لباس میرا بچہ کیسے پہن سکتا ہے" گھر میں کہرام مچ گیا، دوسرے دن بچے کے ساتھ ایک ملازم بھی آیا اس نے کہا "صاحب تو گھر میں موجود نہیں ہیں۔ بیگم صاحبہ نے یہ فرمایا ہے کہ ہمارے بچے کو ہماری اجازت کے بغیر فوج میں کیوں بھرتی کر لیا گیا ہے"۔ ملازم کو سمجھا بجھا کر واپس کر دیا گیا، دو تین روز بعد بچے کے والد آئے اور انھوں نے اس فوجی قواعد کے متعلق مزید تحقیقات کیں اور جب انھوں نے نوجوانوں کو سپاہیانہ لباس میں دیکھا تو انھیں کچھ اطمینان خاطر نصیب ہوا، اور اپنے بچے کو اس ضروری تربیت سے محروم رکھنے کا پھر کوئی منصوبہ نہیں باندھا، اور بچہ فوجی قواعد میں برابر شریک ہوتا رہا، اس واقعے سے گھر اور مدرسے کے اشتراک عمل ہی نہیں، دونوں کے ذہنی تعاون کی ضرورت بھی واضح ہو جاتی ہے، اگر والدین کو مدرسے کے اس نظام کار سے واقفیت ہو تو اس قسم کے واقعات پیش نہ آئیں، فوجی تعلیم بھی نصابی تعلیم کا ایک جزو ہے اور اس میں حصہ لینے سے بچے کا وقت برباد نہیں ہوتا، اس کی جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی صحت بھی قائم رہتی ہے

اس طرح بچوں کی تعلیم و تربیت میں گھر ایک اہم حصہ لے سکتا ہے، گھر کا یہ فرض ہے کہ وہ بچوں کی معلومات کو ہم آہنگ بنانے کی کوشش کرے، بچہ بہت سی چیزیں مدرسے میں سیکھتا ہے، بہت سی باتیں مدرسے کی فضا سے دور کسی بیرونی ماحول میں سیکھتا ہے، اگر ان معلومات میں تسلسل اور ربط نہ ہو اور اگر یہ تمام نا مکمل اور بے جوڑ ہوں تو اس سے بچے کا کسی ذہنی کش مکش کا شکار ہو جانا بعید از قیاس نہیں، اس لئے بقول ایک ماہر نفسیات کے مربوط تعلیم بچے کی ذہنی، اخلاقی اور سماجی تعمیر و تشکیل کے لئے نہایت اہم ہے۔

لیکن بچوں کی معلومات کو ہم آہنگ اور مربوط بنانے کے لئے تعلیم کے صحیح اطلاق کی ضرورت ہوتی ہے ہمارے نصاب تعلیم میں بعض ایسی چیزیں شامل ہیں جن کی تحصیل کے لئے اور جن میں مہارت پیدا کرنے کے لئے کا

وقت درکار ہوتا ہے۔ اور مدرس کو اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ اپنی نجی توجہ سے بچے کو ماہر بنا سکے، وہ صرف مہارت پیدا کرنے کی ترغیب دے سکتا ہے مثلاً زبان کی تدریس میں ———————————— طریق خطاب کیا ہوگا۔ لفافے پر پتہ کس طرح لکھتے ہیں۔ کاروباری خط کیسے لکھا جاتا ہے۔ کسی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کون سے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں۔ اس قسم کی ایک نہیں بیسیوں چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں جن کا سیکھنا ضروری ہوتا ہے اور یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں فی الواقع بہت اہم ہوتی ہیں۔ اگر ان میں مہارت پیدا نہ کی جائے تو ذہن میں ان کا ہلکا سا خاکہ بھی نہیں رہ جاتا اور مہارت پیدا کرنے کے لئے مدرسے میں اتنا وقت بھی نہیں ہوتا اس تسلسل سے مہارت پیدا ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ بچے کو گھر میں مشق کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت ملے، جو باتیں بچہ مدرسے میں سیکھتا ہے، اگر اسے ان کی مشق کا موقع ملے تو اس کی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے، ورنہ اس کا علم بے ربط، بے وقیع اور سطحی ہوگا۔ اور آگے چل کر وہ اپنی معاشری زندگی میں کوئی مقام پیدا نہیں کر سکے گا۔

اس میں شک نہیں کہ خطوط نویسی، انشاپردازی کا ایک لازمی جزو ہے اور اس میں مہارت پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن گھریلو خطوط میں جس اختصار، بے تکلفی، بے باکی کی ضرورت، اور جس خیال آفرینی سے گریز کی ضرورت ہوتی ہے، مدرسے میں گھریلو آزادی کا یہ ماحول پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ مدرسے میں اس قسم کے خطوط لکھنے میں کچھ بدمزگی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ سال گرہ کے موقع پر شکریئے کے خطوط اور یہ اطلاع دینا کہ سلمیٰ اب بالکل اچھی ہے۔ ریڈیو اسٹیشن کے ناظم کے پاس پروگرام کے متعلق کچھ نئی تجویزیں بھیجنا یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں گھر میں بیٹھ کر لکھی جا سکتی ہیں لیکن مدرسے میں نہیں، بچے کا ذہن آسودہ اور خیالات مرکوز ہوتے نہیں، مدرسے میں ہمیشہ ایک مخصوص انداز ہوگا اور رٹی پٹائی باتوں کی بار بار تجدید اور اسی سے بے لطفی پیدا ہوتی ہے یہاں تو کسی فن کی داغ بیل ڈالی جا سکتی ہے، گھر میں اسے مکمل اور متنوع بنایا جا سکتا ہے۔

اگر بچے کے درسی اور سماجی مشاغل میں والدین تھوڑی بہت دلچسپی لینا شروع کر دیں اور گھر اور مدرسہ افہام و تفہیم کی حدود سے گزر کر تعاون و اشتراک کی منزل پر آ جائیں۔ تو گھر کو ایک اور تعلیمی مشغلے کی طرف توجہ دینی ہوگی، مدرسے میں بچے نے جو کچھ پڑھا ہے یا جو کام اسے گھر میں کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ اس میں

اس کی رہنمائی کر دینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ جب تک بچے کی ذہنی صلاحیتوں کا جائزہ نہ لیا جائے، یا اس بچے کی استعداد کو پرکھا نہ جائے وہ اس تعاون و اشتراک سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اگر والدین اپنے بچوں کی تعلیم میں بالواسطہ نہیں براہِ راست دلچسپی لینا اپنا فرض تصور کر لیں اور اپنی مصروفیتوں کے باوجود بچے کی شخصیت کی تعمیر میں حصہ لینے لگیں تو نتائج بہت امید افزا ہو سکتے ہیں۔ بچے کے کام کی جانچ پڑتال کے بعد والدین کا یہ فرض ہے کہ اس کی دقتوں کی اطلاع مدرس کو بھی پہنچائیں اور بچے کی ذہنی صلاحیتوں کا جو معیار خود قائم کیا ہے، اس سے مدرس کو بھی روشناس کریں۔ جو دقتیں اسے پیش آتی ہیں، اس کا ذکر بھی کریں۔ اس کی پسند و ناپسند کی نفسیاتی تحلیل کا مختصر مگر واضح خاکہ مدرس کو بھی پیش کر دیں۔ دوسرے ممالک میں اس قسم کے تجربے ہو رہے ہیں اور ان تجربوں سے بچے کما حقہٗ متمتع ہوتے ہیں۔ وہ والدین بچوں کی تعلیم و تربیت سے روگردانی نہیں کرتے بلکہ اسے اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ بچوں کی ذہنی اور دماغی تحلیل کے نتائج مدرسین تک پہونچا دیتے ہیں، اور گھر میں والدین کے مشاہدے اور بچے کی انفرادیت کے تجربے مدرسین کے لئے مطلب مفید ہو سکتے ہیں، جو بات مدرسے میں رہ کر بچے کی شخصیت کے متعلق نہیں معلوم کی جا سکتی، گھر میں اس کا آشکارا ہو جانا قرین قیاس ہے۔

مجھے خود ایک بچے سے اس کی ذہانت، استعداد یا اس کے جذبۂ کار سے شکایت نہیں تھی، اس کی بے جا خاموشی سے شکایت ضرور تھی۔ میں نے اس کی اس ذہنی شرم کو دور کرنے کی بہت کوششیں کیں لیکن مجھے اس میں کچھ نمایاں کامیابی نہ ہوئی، اس کے متعلق میں نے اس کے والد کے پاس ایک مختصر سی تحریر بھیجی۔ دو دن کے بعد وہ مجھ سے ملے۔ بچے کے متعلق کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی، کچھ عجیب بات ہے کہ وہ بھی اس کی اس کم گوئی اور کم آمیزی کے شاکی تھے، دوران گفتگو میں انہوں نے اس کے معمولات کا ذکر کیا جس سے اس کی ذہنی کیفیات کا مجھے بھی علم ہوا، اسے کھیل کود سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اور گھر میں بھی وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں بند ہو کر کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف رہتا تھا۔ اس کے والد نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ شام کو اس کے ساتھ خود مختلف کھیلوں میں حصہ لے کر اسے کھیلنے کی ترغیب دلائے۔ اس سے رفتہ رفتہ اس نے خود کھیل میں دلچسپی کا اظہار شروع کر دیا۔ اس کی اس ذہنی شرم کو دور کرنے کے لئے میں نے بھی بعض ایسی ذمہ داریاں اس بچے

سپرد کر دیں جن میں اسے بیک وقت مختلف الخیال بچوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ بچوں سے اس خلط ملط کا اس پر بہت اچھا اثر پڑا۔ اس کی کم گوئی اور کم آمیزی ختم ہوئی، پھر سکوت ٹوٹی تو اس کے ذاتی جوہر کھلے تحصیل علم کے ساتھ ساتھ اب اس میں اپنی علمی استعداد کو اپنی زندگی پر منطبق کرنے کا بھی سلیقہ آگیا، اور اس نے بہت سے خطاکار بچوں کو کام کرنے کا عادی بنا دیا، اور جب کبھی جماعت میں گروہی مقابلے ہوئے تو جس گروہ کا وہ لیڈر ہوتا وہی اول آتا۔ اس کے والد وقتاً فوقتاً ملتے رہتے ہیں، اور ہم اس کی اصلاح کے لئے بہتر وسائل پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں گھر اور مدرسہ کے تعلقات اکثر کشیدہ نہیں، تو کشیدگی کے قریب قریب ضرور رہتے ہیں، اس لئے بچے کی مناسب ذہنی اور جسمانی تربیت نہیں ہونے پاتی، اگر والدین اور مدرسین کو ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملے تو مدرسے کے گھٹے ہوئے ماحول میں تر و تازگی پیدا ہو جائے اور ہر متعلم اپنی جگہ پر خوش و خرم نظر آئے، ترقی یافتہ ممالک میں تو معلمین اور والدین کی مشترکہ انجمنیں اس اہم فرض کو انجام دیتی ہیں، ان انجمنوں کے اجلاس میں بچوں کے متعلق والدین اور مدرسین اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں، ان کے ذہنی اٹھان کا جائزہ لیتے ہیں، ان کی اگلی پچھلی ترقی کا موازنہ کرتے ہیں، اور پھر ان کی ضرورت کا خاکہ تیار کر کے مشترکہ تعاون سے اس میں ایک رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں معلمین اور والدین کی یہ انجمنیں امریکہ اور یورپ میں کافی پھیل رہی ہیں اور جو والدین اکثر مدرسے میں آتے رہتے ہیں، انھیں اپنے بچوں کی تعلیمی ترقی کا بھی علم ہوتا رہتا ہے، اور ان کے اس تعاون سے بچے میں وسعت نظر، بلندی خیال اور حق آگاہی بھی پیدا ہوتی رہتی ہے دونوں کے عدم تعاون سے جس بے راہ روی کا احتمال ہو سکتا تھا اس طرح وہ دور ہو سکتا ہے لیکن یہاں یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے، کیا والدین بچوں کو باقاعدہ درس دیا کریں، مثلاً کسی ناگہانی حادثے یا بیماری کی وجہ سے بچہ پڑھائی میں پیچھے رہ جاتا ہے اور وہ اپنی اس کمی کو پورا کر کے جماعت کے دوسرے طلبا کے ساتھ مل جانا چاہتا ہے، یا کوئی ایسا بچہ جو اپنے ساتھیوں میں نسبتاً عمر میں بڑا ہے لیکن ذہین اور اپنے کام میں مستعد، کیا اس کو گھر میں اتنی تعلیم دی جائے کہ وہ کم سے کم ایک درجہ اور آگے بڑھ جائے، یا ایسا بچہ جس کی تعلیمی حالت نہایت خراب ہو۔ جسے زیادہ وقت اور زیادہ امداد کی ضرورت ہو کیا والدین انھیں گھر میں

باقاعدہ پڑھا سکتے ہیں۔

ان مسائل پر سیکڑوں بحثیں ہو چکی ہیں، اور ان کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن موضوع زیر بحث کے متعلق آج بھی کچھ نہ کچھ کہنا مفید ہوگا۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ دونوں گروہ ان متنازع مسائل میں کہاں تک متفق ہیں، بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوالات گھریلو تعاون کے سلسلے میں نئے مسائل پیدا کر دیں گے جن کا حل کرنا بجائے خود دشوار ہو جائے گا، لیکن اس سے پہلے کہ ہم ان مسائل کے متبائن پہلو پر غور کریں، اچھا ہوگا کہ دونوں گروہوں کے عقاید و خیالات کا تجزیہ کریں، اس سلسلے میں ایک مفکر نے اپنے تجربات کی روشنی میں جو حقائق لکھے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) دونوں گروہ کے پیش نظر بچوں کی فلاح و بہبود ہوتی ہے اور ان میں سے کوئی بھی بچے کی ناکامیابی کا خواہاں نہیں ہوتا، دونوں کے خیال میں بچے کا ناکامیاب ہونا اسے نئی نئی مشکلات میں پھنسا دیتا ہے اس لئے اس کی تعلیمی، اخلاقی، روحانی، جسمانی اور ذہنی اقدار کو فروغ دینے میں اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اس کی امداد نہایت ضروری ہے تاکہ اپنی استعداد کے مطابق وہ اچھے سے اچھا کام کر سکے۔

(۲) دونوں گروہ بچے کو اس کی لیاقت اور استعداد سے آگے بڑھانے کے حق میں نہیں ہیں، اس تیزی سے بچے کو آگے بڑھانا بچے کے لئے کبھی مفید نہیں ہوتا۔ ان میں سے ہر گروہ کا یہ خیال ہے کہ بچے کی طبعی اور صحت مند ترقی کے لئے جسمانی، ذہنی اور جذباتی قوت میں اعتدال اور ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ بچے میں کج روی پیدا ہو جائے گی۔

(۳) ہر دو گروہ کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ گھر اور مدرسے کے معیار میں یکسانیت اور توازن ہو، دونوں میں گہرا ربطہ ہو، بعد المشرقین نہ ہو، بچے کے لئے مدرسہ اور گھر دونوں بہت اہم تربیت گاہیں ہیں، انھیں بچوں پر اعتماد اور بھروسا ہونا چاہئے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ دونوں گروہ مل کر بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک لائحہ عمل تیار کرلیں اور اس دستور العمل کی روشنی ہی میں انھیں بلند سے بلند تر مقام تک لے جانے میں کامیابی ہو سکتی ہے۔

(۴) یہ کہنا کہ تعلیم و تدریس صرف گھر یا مدرسے میں ہوتی ہے، درست نہیں اور ان دونوں میں سے کوئی

اس پر مصر بھی نہیں، انسان تو عمر بھر کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے اور بچوں میں تلاش و جستجو کا مادہ زیادہ ہوتا ہے، وہ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے بہت کچھ سیکھتے رہتے ہیں مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کے معمولات سے یہ بہت سی باتیں غیر شعوری طور پر سیکھ جاتے ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ تعلیم کا سلسلہ تادیر جاری رہتا ہے اور بچے میں تو اپنے گردوپیش کے اثرات قبول کرنے کی زیادہ اہلیت ہوتی ہے، جو کچھ وہ دیکھتا ہے یا جو کچھ وہ سنتا ہے۔ اسے بے لاگ اختیار کرلیتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس سے اسے کوئی فائدہ پہونچے گا یا یہ اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اس لئے دونوں گروہ بچوں کی استعداد اور لیاقت کے مطابق نئے نئے خیالات اور نئی نئی باتوں کے قبول کرنے کے مواقع بہم پہونچانے میں متفق ہیں: بچے کے ذہنی اُفق کو وسیع کرنے کا یہی ایک موثر طریقہ ہے کہ اس کے ماحول کو ہم آہنگ اور مربوط بنادیا جائے۔

۵) مدرسے میں جو نصاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے اس سے ان کی زندگی کی جملہ ضروریات پوری نہیں ہوتیں، نصاب کو پڑھ کر بچہ اپنی عملی زندگی میں کامیاب نہیں ہوسکتا اور ہر عمدہ اور ضروری چیز داخل نصاب نہیں ہوتی، اس لئے بچے کو اپنے گردوپیش اور ماحول سے بھی بہت کچھ سیکھنا ہوتا ہے، بہت سی ایسی باتیں ہیں جنھیں بچہ مدرسے میں سیکھتا ہے اور بہت سی ایسی باتیں ہیں جنھیں گھر سیکھتا ہے اور پھر ان باتوں کے اعادے کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی، اس لئے دونوں گروہوں کو اپنی اپنی حدود میں کام کرنا چاہیئے ایک کو دوسرے سے شکایت کا موقع نہ ملے۔

اگر مدرسہ اور گھر بچوں کی ہمہ گیر ترقی کے خواہاں ہیں اور اپنے تعاون و اشتراک عمل سے ان کی فلاح و بہبود کا کام کرتے رہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ بچے ان کے اس اشتراک سے فائدہ نہ اٹھائیں، خوش قسمت ہے وہ سماج جس کے مختلف اداروں میں اتنا اشتراک و تعاون ہو اور خوش قسمت ہیں وہ بچے جو اس معاشرے میں پیدا ہوئے، ورنہ گھر اور مدرسے کے عدم تعاون سے بچے کی شخصیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے، ترقی یافتہ ممالک میں تو والدین اور مدرسین میں ایک ارتباط پیدا ہو چلا ہے، اور یہ ارتباط آنے والے ہمہ گیر تعاون اور اشتراک عمل کا پیش خیمہ ضرور ہے، اب اگر ہم اپنی سماجی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں۔ اپنے مدرسوں کے نظام کار کا مشاہدہ کرتے ہیں، اپنے گھریلو ماحول کا ذرا بنظر غائر مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے: یہاں

گھر اور مدرسے میں تعاون کا سرے سے ہی فقدان ہے، اور ایسی صورت میں ہم میں نہ کوئی قومی کردار پیدا ہو سکتا ہے اور نہ اجتماعی مفاد کا کوئی صحیح تصور ہمارے سامنے آ سکتا ہے۔ کیا ہمارے مدرسے اس تعاون اور اشتراکِ عمل کے حصول کے لئے اقدام کریں گے؛ مانا کہ والدین جاہل ہیں، معاشرہ بگڑا ہوا ہے، ذہن پراگندہ ہیں۔ دلوں میں فراخی نہیں۔ لیکن اگر ہماری طبیعتوں میں جوشِ عمل اور جذبۂ کار کی ایک رمق بھی موجود ہے تو ہمیں اس میں یقیناً کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

ہائی کلاسز کے لئے طبیعات کا گھریلو معمل

پروفیسر عبدالغفور ایم ایس سی، لیکچرر پنجاب یونیورسٹی

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ہائی کلاسز کے طبیعات کے تجربے صرف اسکولوں کے معمل میں ہی ہو سکتے ہیں، اور ان کے لئے بہت قیمتی اپریٹس کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ صرف چار پانچ روپے کا سامان خرید کر آپ آدھے سے زیادہ تجربے گھر پر ہی کر سکتے ہیں، اور اگر دس پندرہ روپے خرچ کر سکیں تو تقریباً سارے تجربے گھر پہ کئے جا سکتے ہیں۔ اس چیز کو ثابت کرنے کے لئے ہم نصاب کے تجربوں کو ایک ایک کر کے ان کی تشریح کریں گے۔

اعشاریہ کا استعمال

ہائی کلاسز کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ سائنس میں ہر ایک چیز کے ناپ کا استعمال اعشاریہ میں کرنا چاہئے۔ اس کے استعمال کی وجوہ بھی دیں کہ اعشاریہ کو آسانی سے جمع و تفریق کیا جا سکتا ہے۔ مگر کسور عام کو آسانی سے جمع تفریق نہیں کیا جا سکتا۔ نیز ضرب اور تقسیم میں بھی اعشاریہ سے آسانی رہتی ہے۔

ترازو کا استعمال

میکانیات یعنی (MECHANICS) کے تجربوں میں ترازو اور درجہ دار سلنڈر بہت استعمال ہوتے ہیں، ان سب تجربوں کے لئے وہ ترازو بہت اچھا کام دے سکتی ہے جس سے کہ حکیم دوا وغیرہ تولتے ہیں۔ اور گوٹے والے گوٹا وغیرہ تولتے ہیں سنار بھی یہی ترازو استعمال کرتے ہیں۔ ایک ایسا ترازو خرید لیں اور اس کے دھاگہ باندھ کر اس کو کسی کیل سے لٹکا لیں۔ بائیں طرف والے پلڑے میں باریک سوراخ کر کے اس میں سے ایک دھاگہ گذار کر گرہ لگا دیں تاکہ اس دھاگہ سے ٹھوس کو لٹکا کر اس کو پانی میں تولا جا سکے۔ اگر وزن مخصوص معلوم کرنا ہے تو تولے ماشے اور رتی کے باٹ استعمال ہو سکتے ہیں۔ مگر کثافت معلوم کرنے کے لئے گرام کے باٹ ہی استعمال کرنا پڑیں گے۔ اگر پلڑے میں سوراخ سے ترازو خراب ہونے کا ڈر ہے تو دھاگے کو

گھر اور مدرسے میں تعاون کا سرے سے ہی فقدان ہے، اور ایسی صورت میں ہم میں نہ کوئی قومی کردار پیدا ہو سکتا ہے اور نہ اجتماعی مفاد کا کوئی صحیح تصور ہمارے سامنے آسکتا ہے، کیا ہمارے مدرسے اس تعاون اور اشتراکِ عمل کے حصول کے لئے اقدام کریں گے؟ مانا کہ والدین جاہل ہیں معاشرہ بگڑا ہوا ہے، ذہن پراگندہ ہیں۔ دلوں میں فراخی نہیں۔ لیکن اگر ہماری طبیعتوں میں جوشِ عمل اور جذبۂ کار کی ایک رمق بھی موجود ہے تو ہمیں اس میں یقیناً کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

ہائی کلاسز کے لئے طبیعات کا گھریلو معمل

پروفیسر عبد الغفور ایم ایس سی لیکچرر پنجاب یونیورسٹی

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ہائی کلاسز کے طبیعات کے تجربے صرف اسکولوں کے معمل میں ہی ہو سکتے ہیں، اور ان کے لئے بہت قیمتی اپریٹس کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ صرف چار یا پانچ روپے کا سامان خرید کر آپ آدھے سے زیادہ تجربے گھر پر ہی کر سکتے ہیں، اور اگر دس پندرہ روپے خرچ کر سکیں تو تقریباً سارے تجربے گھر پر کئے جا سکتے ہیں، اس چیز کو ثابت کرنے کے لئے ہم نصاب کے تجربوں کو ایک ایک کر کے ان کی تشریح کریں گے۔

اعشاریہ کا استعمال

ہائی کلاسز کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ سائنس میں ہر ایک چیز کے ناپ کا استعمال اعشاریہ میں کرنا چاہئے اس کے استعمال کی وجہ بھی دیں کہ اعشاریہ کو آسانی سے جمع و تفریق کیا جا سکتا ہے۔ مگر کسور عام کو آسانی سے جمع تفریق نہیں کیا جا سکتا۔ نیز ضرب اور تقسیم میں بھی اعشاریہ سے آسانی رہتی ہے،

ترازو کا استعمال

میکانیات یعنی (MECHANICS) کے تجربوں میں ترازو اور درجہ دار سلینڈر بہت استعمال ہوتے ہیں، ان سب تجربوں کے لئے وہ ترازو بہت اچھا کام دے سکتی ہے جس سے کہ حکیم دوا وغیرہ تولتے ہیں۔ اور گوٹے والے گوٹا وغیرہ تولتے ہیں سنار بھی یہی ترازو استعمال کرتے ہیں، ایک ایسا ترازو خرید لیں اور اس کے دھاگہ باندھ کر اس کو کسی کیل سے لٹکا لیں۔ بائیں طرف والے پلڑے میں باریک سوراخ کر کے اس میں سے ایک دھاگہ گذار کر گرہ لگا دیں تاکہ اس دھاگہ سے ٹھوس کو لٹکا کر اس کو پانی میں تولا جا سکے۔ اگر وزن مخصوص معلوم کرنا ہے تو تولے ماشے اور رتی کے باٹ استعمال ہو سکتے ہیں۔ مگر کثافت معلوم کرنے کے لئے گرام کے باٹ ہی استعمال کرنا پڑیں گے۔ اگر پلڑے میں سوراخ سے ترازو خراب ہونے کا ڈر ہے تو دھاگے کو

لاکھ سے پلڑے کے نیچے چپکا لیں اور دھڑا کرلیں یعنی ترازو ٹھکا کر پلڑے ہم وزن کرلیں۔

گریجوایٹیڈ سلنڈر (درجہ دار سلنڈر) یہ خریدنا ہی پڑے گا، سستا سا خرید لیں، اس کی ضرورت حجم ناپنے اور کثافت معلوم کرنے میں پڑتی ہے لیکن اگر وزن مخصوص یا کثافت اضافی معلوم کرنا ہے۔ تو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

طبیعات کے معمل کے لئے سامان کی فہرست ترازو۔ باٹ، درجہ دار سلنڈر، سنٹی میٹر والا فٹ، سنٹی گریڈ تھرمامیٹر، چپٹا بجلی کا سیل، قطب نما۔ اسپرٹ لیمپ، موم بتی تاگے کی ریل۔ مجوف آئینہ (جو آئینہ ایک طرف سے سادہ اور ایک طرف مجوف ہو وہ بازار میں بکتا ہے) (CONCAVE MIRROR) محدب عدسہ (CONVEX LENS) (بازار سے ایک روپیہ کا مل جائے گا۔ اگر آتشی شیشہ مل جائے تو وہ بھی کام دے دے گا) پنوں کا پیکٹ۔ گتہ۔ چاقو۔ قینچی۔ آئینہ کا ٹکڑا۔ کارک۔

قطر ناپنا قرص کا قطر ناپنے کے لئے اس کے کنارے پر سیاہی کا نشان لگا کر کاغذ پر گھمائیں تو اس طرح اس کا محیط معلوم ہو جائے گا محیط سے قطر نکال لیں۔ سلنڈر یا سلاخ کا قطر معلوم کرنے کے لئے اس کے گرد تاگا لپیٹ کر حسب معمول طریقہ سے محیط نکال لیں وغیرہ وغیرہ

بڑی چیز کا قطر دو بلاک کے درمیان رکھ کر حسب معلوم طریقہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔

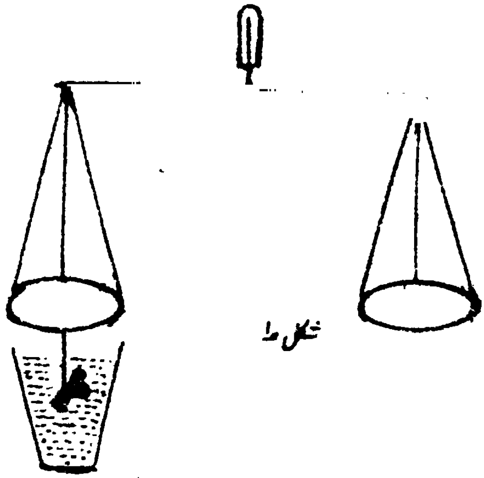
حجم ناپنا بے ڈول چیز کا حجم درجہ دار سلنڈر سے ہی ناپا جا سکتا ہے۔ سلنڈر گولے وغیرہ کا حجم فارمولے سے ہی نکالا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے قطر اور لمبائی ناپنا پڑے گی جو آسانی سے ناپی جا سکتی ہے۔

طبیعات کے نصاب کے تجربے

ایک تولہ = ۷۰ ۵ گرام

میکانیات کے تجربے ٹھوس کا وزن مخصوص معلوم کرنا :- اگر لوہے، تانبے اور شیشہ کا وزن مخصوص معلوم کرنا ہو تو اس چیز کی کوئی ٹھوس چیز لے لیں۔ پہلے ٹھوس کا ہوا میں وزن کرلیں اس کے بعد ٹھوس کو بائیں پلڑے کے نیچے تاگے سے لٹکا لیں جس کا طریقہ شکل سے ظاہر ہے۔ اور ٹھوس کو کسی گلاس میں پانی بھر کر پانی میں ڈبوئیں اور دائیں پلڑے میں باٹ رکھ کر وزن کریں یہ وزن ٹھوس کا پا

وزن ہوگا۔ اب وزن مخصوص یا کثافت اضافی کا فارمولا لگائیں، پھر اس تجربے میں تولے، ماشے اور رتی کے باٹ استعمال کر سکتے ہیں



شکل ۲

مائع کی کثافت اضافی معلوم کرنا شیشے کی ڈاٹ یا لوہے یا پیتل وغیرہ کی کوئی ٹھوس لے لیں۔ پہلے اُس کا ہوا میں وزن کر لیں، اس کے بعد ٹھوس کو تاگے سے لٹکا کر پانی کے گلاس میں ڈبو دیں، اور اس طرح ٹھوس کا پانی میں وزن معلوم کریں، اس کے بعد گلاس میں وہ مائع بھر دیں، جس کی کثافت اضافی معلوم کرنی ہے، اور ٹھوس کو مائع میں ڈبو کر ٹھوس کا مائع میں وزن معلوم کریں اور پھر مائع کی کثافت اضافی کا فارمولا اُس سے نکال لیں۔ اس تجربے میں تولے، ماشے کے باٹ استعمال ہو سکتے ہیں۔

کارک کا وزن مخصوص معلوم کرنا حسب معمول طریقے سے اسی اپریٹس سے معلوم ہو سکتا ہے، جو کہ مائع یا ٹھوس کی کثافت اضافی کے لئے اوپر دیا گیا ہے تولے ماشے کے باٹ استعمال ہو سکتے ہیں

کثافت اضافی کی بوتل سے کثافت اضافی نکالنا اس کے لئے دو تولے والی چھوٹی شیشی استعمال کریں شیشی کو ہمیشہ اتنا بھریں کہ ہوا کا ایک بھی بلبلا اندر نہ رہے اور پھر کارک لگا دیں۔ بہتر ہے کہ کارک ایسا ہو کہ بالکل اندر جا کر شیشے کے منہ کے بالکل ہموار آ جائے ایسی شیشی ذرا ڈھونڈنی پڑے گی۔

ٹھوس کی کثافت نکالنا حجم کے لئے درجہ دار سلنڈر استعمال کرنا ہی پڑے گا۔ باقی حسب معمول طریق سے کثافت نکال لیں۔ اگر سیسے کے چھرّے کی کثافت معلوم کرنی ہو تو تیس چالیس چھرّوں کا حجم اور

وزن معلوم کریں اور پھر ایک تجربے کا ۔

مرکز ثقل معلوم کرنا :۔ یہ تجربہ گھر میں آسانی سے ہو سکتا ہے ۔

حرارت کے تجربے

سنٹی گریڈ تھرمامیٹر بازار سے خرید لیں۔ کلوری میٹر کی بجائے کوئی ٹین کا ڈبہ استعمال کریں جو کہ اسی سائز کا ہو جو کہ کلوری میٹر کا ہوتا ہے۔ بیکر کی بجائے گلاس استعمال ہو سکتا ہے ۔

موم کا درجہ پگھلاؤ معلوم کرنا | یہ تجربہ گھر میں آسانی سے ہو سکتا ہے۔ بیکر کی بجائے گلاس استعمال کریں۔ اور گلاس کو واٹر باتھ میں گرم کریں گلاس کے پانی کو ہلاتے رہیں جیٹ (J E T) خود بنالیں ۔

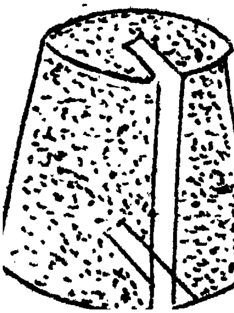
پانی یا دیگر مائع کا درجہ پگھلاؤ | شیشے کی صراحی کی بجائے بوتل استعمال کریں اور بوتل میں مائع ڈالیں۔ اور بوتل کو سینڈ باتھ میں گرم کریں (سینڈ باتھ اور واٹر باتھ بنانے کا طریقہ پہلے درج کیا جا چکا ہے)

حرارت مخصوص معلوم کرنا | ٹھوس کو گرم کرنے کے لئے، ٹھوس کو دو تین امتحانی نلیوں میں بھر دیں، اور امتحانی نلیوں کو واٹر باتھ میں رکھ کر گرم کریں اور پندرہ منٹ تک پانی کو ابلنے دیں اور گرم ٹھوس کا درجہ حرارت ۱۰۰ درجے لے لیں ۔

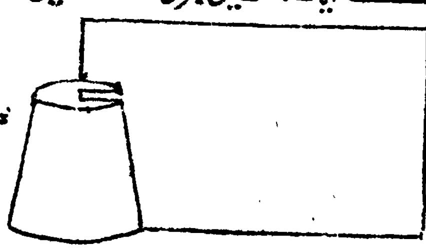
برف کی حرارت | یہ تجربہ گھر میں ہو سکتا ہے

روشنی کے تجربے

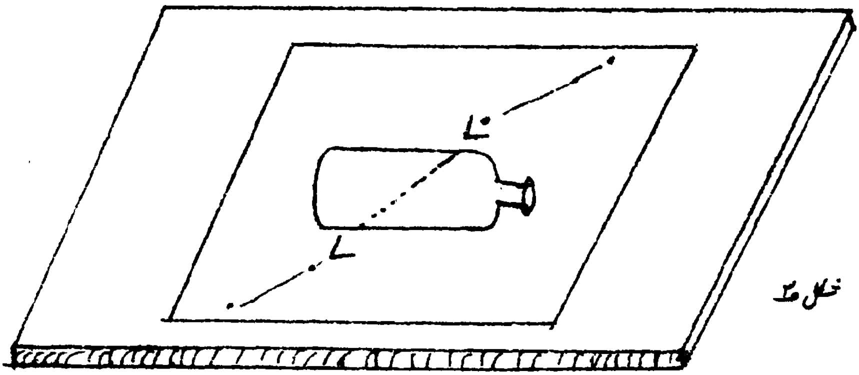
روشنی کے انعکاس کے اصول | اس کے لئے بازار سے دو آنے کا چوکور آئینہ خرید لیں اور اس کا فریم اتار کر اس کو ایک کارک میں جھری دے کر لگا دیں تاکہ میز پر کھڑا ہو جائے جیسا کہ شکل ۲۵ سے ظاہر ہے۔ باقی تجربہ حسب معمول ہی لگا کر کریں۔



شکل ۲۵



روشنی کے انعطاف کے اصول (LAWS OF REFRACTION) اس کے لئے اگر شیشے کا چوکور پیپر ویٹ مل جائے تو بہت اچھا ہے، ورنہ ایک کانچ کی شیشی میں جس کی سائڈ بھی چپٹی ہو، اس میں پانی بھر کر میز پر چپٹا لٹا دیں اور پن لگا کر حسب معمول تجدید کریں، جیسا کہ شکل میں دکھایا گیا ہے، اگر شیشہ پتلا ہے تو نسبت انعطاف پانی کی نکل سکتی ہے۔



شکل

مجوف آئینہ کا طول ماسکہ معلوم کرنا بازار سے ایک ایسا آئینہ خریدیں جس کے ایک طرف معمولی منہ دیکھنے والا آئینہ ہوتا ہے اور دوسری طرف جس میں منہ بڑا نظر آتا ہے، یہی مجوف آئینہ ہے۔ اس کا طول ماسکہ ناپنے کے لئے ایک ایسے کمرے میں جس میں اندھیرا ہو، اور جس میں دور کی چیزیں نظر آسکیں، آئینہ کا رخ دور کی چیز پر اس طرح کرو کہ دور کی چیز کی روشنی آئینہ پر پڑے، کوئی دور کی بلڈنگ یا درخت لے لیں جس کا فاصلہ ۲۰ گز کے قریب ہو۔ اب آئینہ کے سامنے ایک سفید کاغذ رکھیں جو کسی گتے کے ٹکڑے پر چپکا دیا گیا ہو۔ اس کو اسکرین (SCREEN) کہتے ہیں، اسکرین کو آگے پیچھے کریں جتنی کہ دور کی چیز کا صاف اور واضح عکس اسکرین پر آجائے۔ اب اسکرین سے آئینہ تک کا فاصلہ کسی فیتے سے سینٹی میٹر میں ناپ لیں یہی طول ماسکہ ہے۔

دوسرا طریقہ موم بتی والا ہے، ایک موم بتی کو جلا کر آئینہ سے کوئی ایک گز کے فاصلہ پر رکھیں اور اسکرین کو آئینہ کے نزدیک لا کر آگے پیچھے ہٹائیں جتنی کہ ایک صاف اور واضح عکس موم بتی کے شعلے کا اسکرین پر بن جائے اس کے بعد حسب معمول موم بتی کا فاصلہ آئینہ سے ناپ لیں اور موم بتی کے عکس کا فاصلہ آئینہ سے ناپ لیں اور

تار مولا لگاکر طول ماسکہ معلوم کر لیجئے ۔

محدب عدسہ کا طول ماسکہ معلوم کرنا

بازار سے ایک آتشی شیشہ خرید لیں یا محدب عدسہ خرید لیں۔ تقریباً ایک روپے کا مل جائے گا، عینک والوں سے بھی مل جاتا ہے۔ عدسہ کو ایک ہاتھ میں پکڑ کر کسی دور کے فاصلہ کی چیز کے سامنے رکھیں، دوسرے ہاتھ میں اسکرین پکڑ کر عدسہ کے پیچھے رکھیں اور آگے پیچھے کریں حتیٰ کہ صاف اور واضح عکس یا شبیہ اسکرین پر آ جائے، اب اسکرین اور عدسہ کے درمیان کا فاصلہ سینٹی میٹروں سے ناپ لو۔ یہی عدسہ کا طول ماسکہ ہے۔

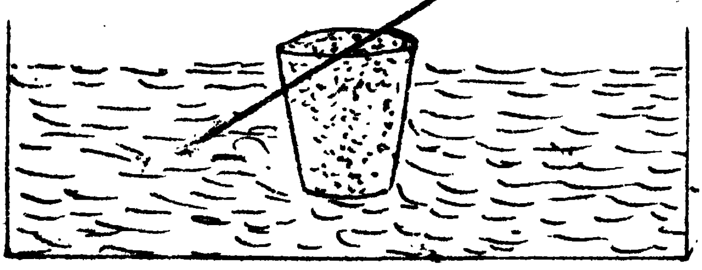
دوسرا طریقہ موم بتی والا ہے۔ عدسہ کو کسی لکڑی کے ٹکڑے پر موم لگا کر سیدھا کھڑا کریں اور ایک موم بتی جلا کر عدسہ سے دو فٹ کے فاصلہ پر رکھیں اور عدسہ کے پیچھے ایک اسکرین کو آگے پیچھے کریں حتیٰ کہ موم بتی کا عکس یا شبیہ اسکرین پر آ جائے اس کے بعد حسب معمول طریقہ جو کتابوں میں درج ہے استعمال کریں اور فارمولا لگا کر عدسے کا طول ماسکہ نکالیں۔

احتیاط:۔ تجربے کو اندھیرے کمرے میں کرنا چاہیئے۔

مقناطیس بنانا

مقناطیس جس سے روپیہ وغیرہ پرکھا جاتا ہے لے لیں۔ اور موزے بُننے کی لوہے کی سلائی خرید لیں۔ مقناطیس کے ایک سرے کو حسب معمول سلائی کے اوپر رگڑیں تو سلائی مقناطیس بن جائے گی۔

تجربہ کے لئے قطب نما بنانے کے لئے ایک کپڑے سینے کی سوئی کو مندرجہ بالا طریقہ سے مقناطیس بنائیں اور ایک کارک پانی میں تیرا لیں اور اس پر یہ سوئی رکھ دیں (جیسا کہ شکل ۵ سے ظاہر ہے) تو سوئی شمالاً جنوباً رُخ کرے گی اور یہ قطب نما کی بجائے استعمال ہو سکتی ہے۔



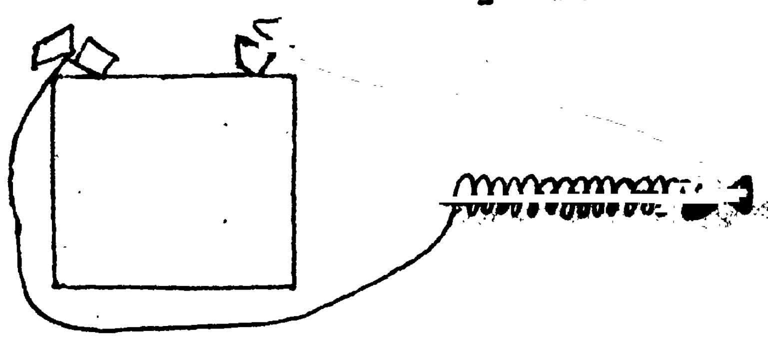
شکل ۵

برقی رَو سے مقناطیس بنانا

ایک بجلی کا ئیل (CELL) خرید لیں، یا تو چپٹا ئیل لے لیں جس کے دو پتیاں لگی ہوتی ہیں۔ اس میں چھوٹی والی پتی مثبت + ہے اور بڑی والی پتی منفی — ہے۔ یا بصورت دیگر ٹارچ کا ایک گول سیل لے کر اس کے ایک تار + کے ساتھ بحال کرا لیں اور دوسرا تار — کے ساتھ۔ بجلی والا خود ہی تم کو بتا دے گا کہ چپٹا سیل جہت والی طرف — ہے اور جس طرف کالا سا ہے اور بیچ میں پیتل کا چھوٹا سا دائرہ سا ہے وہ + ہے۔

واضح رہے کہ مثبت اور منفی والے تاروں کو آپس میں ہرگز نہ ملائیں۔

مقناطیس بنانے کے لئے ایک لوہے کا پانچ انچ لمبا کیل لیں اور اس کے اوپر بجلی کا اکہرا تار اس طرح لپیٹیں جس طرح سانپ بل کھاتا ہے وضاحت کے لئے شکل ملاحظہ ہو اور بجلی کے تار کے سروں کو سیل کے تاروں سے تھوڑی دیر چھوئیں بس کیل مقناطیس بن جائے گا۔



برقی رَو کی سمت معلوم کرنا

اگر بجلی کے تار کو اب سیدھا کر لیں اور سیل الگ ہٹا دیں تو تار کو قطب نما کے اوپر پکڑنے سے قطب نما ہٹ جائے گا۔ اس سے برقی رَو کی سمت حسب معمول طریقہ سے جو کتاب میں درج ہے نکال لیں۔

برقی رَو سے پانی پھاڑنا

چپٹا سیل لے کر اس کی پتیوں پر تار لپیٹیں، واضح رہے کہ تار کا تانبا نکال کر تانبے کو پتی سے چھوئیں ورنہ انفعال (CON TACT) نہ ہوگا۔ اب ایک چینی کی پیالی میں پانی ڈال کر تھوڑا سا نمک حل کر لیں۔ سیل کے دونوں تاروں کو اس پانی میں ڈبو دیں، مگر ایک دوسرے سے ایک دو انچ کے فاصلے پر رکھیں آپس میں نہ چھوئیں تو تاروں کے سروں پر گیس کے بلبلے نظر آئیں گے۔ یہ بلبلے گیس

ایمیل
یا
روسو کی تعلیم

ترجمہ قیوم مرزا رزقی

مسلسل نمبر ۲۴

بُو ایک خیالی احساس ہے اور چونکہ یہ رگوں پر جلا چڑھا دیتی ہے اس لئے دماغ پر بھی اس کا اثر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ اسی باعث یہ جسم میں وقتی تر و تازگی ضرور پیدا کر دیتی ہے لیکن نتیجتاً ہمیں کمزور ہی کرتی ہے۔ اس کے اثرات عشق و محبت میں بالعموم نہایت مجرب ثابت ہوتے ہیں۔ بناؤ سنگار کے کمرے کی بھینی بھینی خوشبوئیں جیسا آپ خیال کرتے ہیں، کوئی ایک معمولی پھندا نہیں ہوتی ہیں اور میں تو مشکل ہی سے یہ طے کر سکتا ہوں کہ کسی ایسے ذی ہوش اور ایک حد تک بے حس آدمی کو میں مبارکباد دوں یا اس سے ہمدردی کروں جو اپنی محبوبہ دل کے مستعملہ پھولوں کے ہار کی خوشبو سے کبھی متاثر نہ ہوتا ہو۔

لہٰذا حس شامہ بچپن کے ابتدائی دور میں زیادہ تیز اور ذکی نہ ہونی چاہئے تخیل جو تبدیلی پذیر جذبات سے بہت متاثر نہ ہوا ہو مشکل ہی کسی امنگ یا ولولے کی تاب لا سکتا ہے اور ہمیں اس بات کا تجربہ ہوتا نہیں کہ ایک حس کے ذریعہ دوسری حس کے موجودہ امکانات کو قبل از وقت معلوم کر سکیں۔ اس نظریے کی توثیق مشاہدے سے بھی ہوتی ہے۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ بچوں کی حس شامہ بالکل کمزور اور ناکارہ سی ہوتی ہے۔ یہ اس لئے نہیں ہوتا کہ بچوں کے حواس عمر رسیدہ لوگوں کے حواسوں سے کسی حال میں کم ذی حس ہوتے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بچوں سے کسی تخیل کا تعلق بھی نہیں ہوتا ہے۔ انھیں ہماری طرح نہ تو راحت اور مصیبت کا باسانی تجربہ حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی وہ خوشامد اور مخالفت سے متاثر ہی ہو سکتے ہیں۔ خیال کرتا ہوں کہ میرے ہی طریقہ کے اندر متقابل اجسام کی تشریح کئے بغیر ہم یہ باسانی جان سکتے ہیں کہ مردوں کی نسبت

عورتوں کو خوشبوؤں اور عطریات کا اتنا زیادہ شوق کیوں ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ کینیڈا کے لال چمڑی والے صغر سنی ہی میں اپنی حس شامہ کو سدھا کر اتنا لطیف اور ذکی بنا لیتے ہیں کہ اپنے ساتھ کتے رکھنے کے باوجود بھی وہ ان سے کام لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے ہیں، بلکہ وہ خود اپنے کتے آپ ہی ہوتے ہیں میں بلاشبہ اس بات پر یقین کامل رکھتا ہوں کہ کھانوں کی خوشبو بچوں کو اگر اس طرح سونگھنی سکھائی جائے جس طرح کتے اپنا شکار سونگھتے ہیں تو بچوں کی بھی حس شامہ تقریباً اتنی ہی مکمل ہو جائے گی لیکن اس حس کی پختگی سے مجھے بجز اس کے اور کوئی زیادہ حقیقی فائدہ نہیں دکھائی دیتا ہے کہ ایک بو اور مذاق کے درمیانی تعلق کا مشاہدہ کرنا سیکھ جائے۔

ان تعلقات میں تمیز کرنا سیکھنے پر خود قدرت ہی نے ہم کو مجبور کر رکھا ہے جس نے اول الذکر حس کے عمل کو آخر الذکر حس کے ساتھ اس طرح لازم ملزوم قرار دیا ہے کہ ناک اور زبان دونوں کو ایک دوسرے کے بالکل متصل ہی قائم کیا ہے اور منہ کے اندر ہی اندر دونوں کے مابین ایک راست تعلق قائم کر دیا ہے : تاکہ ہم کسی شے کو بھی بلا سونگھے نہ چکھ سکیں، محض بچے کو دھوکے میں رکھنے یا فریب دینے کے لئے میں ان تعلقات کو زیادہ پیچیدہ نہیں بنانا چاہتا یعنی دواؤں وغیرہ کے ذائقوں کو خوشبوؤں اور عطریات وغیرہ کے ذریعہ پوشیدہ کرنا وغیرہ، اس لئے کہ حواسوں کے مابین کسی قسم کی عدم مطابقت پیدا کرنا دغا اور فریب سے بھی کہیں زیادہ بدتر چیز ہوتی ہے، فی الحقیقت حس دوسری حس کو مغلوب تو کر لیتی ہے لیکن دوا جیسی کی تیسی بدمزہ ہی رہتی ہے اور یہ ناگوار بدمزگی جس کا اس وقت تجربہ ہو سکتا ہے ہر ایک حس پر چھا جاتی ہے پس مابعد خفیف ترین احساس سے بھی اس کے خیال میں دیگر حسیات کی یافتنا ہو جاتی ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ خوشبو بھی اس کو بدبو ہی معلوم ہونے لگتی ہے پس ہماری احمقانہ تدابیر اس طور پر مجموعتہً اعلیٰ احساسات کی نسبت ناگوار اور ادنیٰ احساسات میں مزید اضافہ کر دیتی ہیں۔

میں اس کتاب کے حصص مابعد میں ایک قسم کی چھٹی حس کی تربیت و تعلیم کا ذکر کروں گا، جس کو معمولی عقل و فہم سے موسوم کرتے ہیں، یہ اس لئے نہیں کہ یہ حس تمام مخلوق عالم میں عام طور پر موجود ہوتی ہے، بلکہ یہ اس لئے کہ حواس خمسہ کے باقاعدہ اور منظم استعمال سے یہ چھٹی حس پختگی حاصل کرتی ہے اور بیرونی حالات کو مجموعتہً دیکھ کر آدمی کو اشیا کے خواص کی تمیز کرنا سکھاتی ہے لہٰذا اس چھٹی حس کی کوئی خاص معینہ جگہ نہیں ہے، بلکہ اس کا ٹھکانا خاص الخاص دماغ کے اندر رہتا ہے اور اس چھٹی حس کے احساسات جو محض اندرونی ہوتے ہیں تخیلات کہلاتے ہیں، ان تخیلات کی مجموعی تعداد ہی ہماری

ایمیل
یا
رُوسو کی تعلیم

تو قیر مرزا رزاقی

مسلسل نمبر ۲۴

بُو ایک خیالی احساس ہے اور چوں کہ یہ رگوں پر پھیلا چڑھا دیتی ہے اس لئے دماغ پر بھی اس کا اثر بہت زیادہ پڑتا ہے، اسی باعث یہ جسم میں وقتی تر و تازگی ضرور پیدا کر دیتی ہے لیکن نتیجتاً ہمیں کمزور ہی کرتی ہے، اس کے اثرات عشق و محبت میں بالعموم نہایت مجرب ثابت ہوتے ہیں، بناؤ سنگار کے کمرے کی بھینی بھینی خوشبوئیں جیسا آپ خیال کرتے ہیں، کوئی ایک معمولی پھندا نہیں ہوتی ہیں اور میں تو مشکل ہی سے یہ طے کر سکتا ہوں کہ کسی ایسے ذی ہوش اور ایک حد تک بے حس آدمی کو میں مبارکباد دوں یا اس سے ہمدردی کروں جو اپنی محبوبہ کے مستعملہ پھولوں کے ہار کی خوشبو سے کبھی متاثر نہ ہوتا ہو۔

لہٰذا حس شامہ بچپن کے ابتدائی دور میں زیادہ تیز اور ذکی نہ ہونی چاہئے تخیل جو تبدیلی پذیر جذبات سے ہنوز متاثر نہ ہوا ہو مشکل ہی کسی امنگ یا ولولے کی تاب لا سکتا ہے اور ہمیں اس بات کا تجربہ ہوتا نہیں کہ ایک حس کے ذریعہ دوسری حس کے موجودہ امکانات کو قبل از وقت معلوم کر سکیں، اس نظریئے کی توثیق مشاہدے سے بھی ہوتی ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ بچوں کی حس شامہ بالکل بے حس اور ناکارہ ہی ہوتی ہے، یہ اس لئے نہیں ہوتا کہ بچوں کے حواس عمر رسیدہ لوگوں کے حواسوں سے کسی حال میں کم ذکی حس ہوتے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بچوں سے کسی تخیل کا تعلق بھی نہیں ہوتا ہے، انھیں ہماری طرح نہ تو راحت اور مصیبت کا باسانی تجربہ حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی وہ خوشامد اور مخالفت سے متاثر ہی ہو سکتے ہیں، خیال کرتا ہوں کہ میرے ہی طریقہ کے اندر مقابل اجسام کی تشریح کئے بغیر ہم یہ باآسانی جان سکتے ہیں کہ مردوں کی نسبت

عورتوں کو خوشبوؤں اور عطریات کا اتنا زیادہ شوق کیوں ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ کینیڈا کے لال چمڑی والے صغر سنی ہی میں اپنی حس شامہ کو سدھا کر اتنا لطیف اور ذکی بنا لیتے ہیں کہ اپنے ساتھ کُتے رکھنے کے باوجود بھی وہ ان سے کام لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے ہیں، بلکہ وہ خود اپنے کتے آپ ہی ہوتے ہیں میں بلاشبہ اس بات پر یقین کامل رکھتا ہوں کہ کھانوں کی خوشبو بچوں کو اگر اس طرح سونگھنی سکھائی جائے جس طرح کتے اپنا شکار سونگھتے ہیں تو بچوں کی بھی حس شامہ تقریباً اتنی ہی مکمل ہو جائے گی لیکن اس حس کی پختگی سے مجھے بجز اس کے اور کوئی زیادہ حقیقی فائدہ نہیں دکھائی دیتا ہے کہ ایک بچہ بو اور ذائقے کے درمیانی تعلق کا مشاہدہ کرنا سیکھ جائے۔ ان تعلقات میں تمیز کرنا سیکھنے پر خود قدرت ہی نے ہم کو مجبور کر رکھا ہے جس نے اول الذکر حس کے عمل کو آخر الذکر حس کے ساتھ اس طرح لازم ملزوم قرار دیا ہے کہ ناک اور زبان دونوں کو ایک دوسرے کے بالکل متصل ہی قائم کیا ہے اور منہ کے اندر ہی اندر دونوں کے مابین ایک راست تعلق قائم کر دیا ہے: تاکہ ہم کسی شے کو بھی بلا سونگھے نہ چکھ سکیں، محض بچے کو دھوکے میں رکھنے یا فریب دینے کے لئے میں ان تعلقات کو زیادہ پیچیدہ نہیں بنانا چاہتا یعنی دواؤں وغیرہ کے ذائقوں کو خوشبوؤں اور عطریات وغیرہ کے ذریعہ پوشیدہ کرنا وغیرہ، اس لئے کہ حواسوں کے مابین کسی قسم کی عدم مطابقت پیدا کرنا دغا اور فریب سے بھی کہیں زیادہ بدتر چیز ہوتی ہے، فوقیت تر حس دوسری حس کو مغلوب تو کر لیتی ہے لیکن دوا جیسی کی تیسی بدمزہ ہی رہتی ہے اور یہ ناگوار بدمزگی جس کا اس وقت تجربہ ہو سکتا ہے ہر ایک حس پر چھا جاتی ہے پس مابعد خفیف ترین احساس سے بھی اس کے خیال میں دیگر حسیات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ خوشبو بھی اس کو بدبو ہی معلوم ہونے لگتی ہے پس ہماری احمقانہ تدابیر اس طور پر مجموعتاً اعلیٰ احساسات کی نسبت ناگوار اور ادنیٰ احساسات میں مزید اضافہ کر دیتی ہیں۔

میں اس کتاب کے حصص مابعد میں ایک قسم کی چھٹی حس کی تربیت و تعلیم کا ذکر کروں گا جس کو معمولی عقل و فہم سے موسوم کرتے ہیں، یہ اس لئے نہیں کہ یہ حس تمام مخلوق عالم میں عام طور پر موجود ہوتی ہے، بلکہ یہ اس لئے کہ حواس خمسہ کے باقاعدہ اور منظم استعمال سے یہ چھٹی حس پختگی حاصل کرتی ہے اور بیرونی حالات کو مجموعتاً دیکھ کر آدمی کو اشیا کے خواص کی تمیز کرنا سکھاتی ہے۔ لہٰذا اس چھٹی حس کی کوئی خاص معینہ جگہ نہیں ہے، بلکہ اس کا ٹھکانا خاص الخاص دماغ کے اندر رہتا ہے اور اس چھٹی حس کے احساسات جو محض اندرونی ہوتے ہیں تخیلات کہلاتے ہیں، ان تخیلات کی مجموعی مقدار ہی ہماری

یت کا پیمانہ ہوتی ہے۔ اور ہمارے خیالات کی صحت کا دارومدار ان کے صحیح اور صریح ہونے پر ہوتا ہے۔ ایک شے کا دوسری شے سے مقابلہ کرنے کے فن کو انسانی عقل یا دلیل کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ لہٰذا جس فن کو میں بچے کی دلیل یا تمیز کہتا ہوں وہ متعدد حواسوں کے مشترکہ تجربات کے ذریعہ حاصل کردہ سادہ تخیلات پر مبنی ہوتی ہے اور جس حس کو میں ذہنی دلیل کے نام سے موسوم کرتا ہوں وہ چند مشترک سادہ تخیلات کے پیدا کردہ مرکب تخیلات پر مبنی ہوتی ہے۔

اگر میرا طرز عمل فی الواقع قدرتی ہے اور اس کے استعمال میں مجھے کوئی مغالطہ بھی نہیں ہوا ہے، تو میں نے اپنے شاگرد کو اب احساسات کے منطقے سے گذار کر بچگانی دلیل کی سرحد پر پہنچا دیا ہے۔ پس ان حدود کے باہر ہمارا پہلا ہی قدم مردانہ قدم ہوگا۔ لیکن اس سے قبل کہ ہم مزید پیش قدمی کریں ہمیں تھوڑی دیر سانس لے کر ابھی طے کردہ منزل پر ایک ناقدانہ نظر ڈال لینی چاہیے۔ زندگی کے ہر مخصوص دور اور مدارج کی ایک ذاتی پختگی ہوتی ہے۔ ہم اب تک سن رسیدہ آدمی کا ذکر سنتے آئے ہیں، لیکن اب ہم ایک سن رسیدہ بچے کا ذکر کریں گے جو بالکل ایک نیا تجربہ ہوگا اور کچھ کم پر لطف نہ ہوگا

فانی مخلوقات کی زندگی کچھ ایسی محدود اور بے مایہ ہے کہ موجودات کا محض نظارہ اس میں کوئی ولولہ پیدا نہیں کرتا ہے۔ یہ تو صرف نظر ہے جو باطنی حقیقت کو آراستہ اور مزین کر کے پوشیدہ کر دیتی ہے۔ اور اگر تخیل اس شے میں ایسی جاذبیت پیدا نہ کر دے جو ہمارے حواس کو متاثر کرتی ہو تو خشک اور پھیکا مزہ صرف ہمارے حواسوں تک ہی محدود رہ جائے۔ اور ہمارا دل سرد کا سرد ہی پڑا رہ جائے۔ موسم خزاں کے زیورات سے مزین ہو کر دھرتی ماتا انگور کی دولت کا مظاہرہ کرتی ہے جو ہماری آنکھوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن یہ خوش منظری ہمارے دل کو متاثر کرنے سے محروم ہی رہتی ہے۔ اس لئے کہ احساس کی نسبت زیادہ تر ہمارے خیالات ہی کی پیدا کردہ ہوتی ہے موسم بہار جب سارے کا سارا جنگل برہنہ اور بے پتوں کا نظر آتا ہے، درخت بے سایہ ہو جاتے ہیں، گھاس کی کونپلیں بمشکل پھوٹنی شروع ہوتی ہیں، پھر بھی یہ منظر ہمارے دل پر کافی اثر ڈالتا ہے، قدرت کی اس حیات جدید میں ہم اپنی ذاتی زندگی کی تروتازگی موجود ہوتی ہوئی محسوس کرتے ہیں، فتوحات ماضیہ کی یاد میں ہم غرق ہو جاتے ہیں، عیش و عشرت مصائب و خوشی کے وہ آنسو جو کسی پر کیف جذبے کا ساتھ دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں، ہماری آنکھوں میں آ جاتے ہیں۔ انگوروں کی فصل کا زمانہ گو بڑی تروتازگی، زندہ دلی اور چہل پہل کا ہوتا ہے۔ تاہم اس کا نظارہ ہے

آنسو بہائے بغیر ہی کر لیتے ہیں۔

اور یہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ تصور جسم بہار کے منظر میں آنے والے موسموں کی تصاویر کا اندازہ کرتا ہے۔ آنکھ نازک نازک کونپلوں کو نکلتا ہوا دیکھنے لگتی ہے، اور روحانی آنکھ ان کے پھلوں پھولوں گھنے پتوں بلکہ ان کی آخری حد تک کو دیکھ لیتی ہے جو ان میں پنہاں ہوتے ہیں، روحانی آنکھ پل بھر میں یکے بعد دیگرے تمام منازل و مدارج کو خلط ملط کر دیتی ہے، اور پھر ہماری آنکھ ان تمام چیزوں کو عموماً اس طرح نہیں دیکھتی جیسی کہ وہ ہوں گی، بلکہ وہ اس طرح دیکھتی ہے جس طرح کہ ہم دیکھنے کے خواہاں ہوتے ہیں، اس لئے کہ تصور کو اس وقت صرف انتخاب ہی کرنا ہوتا ہے۔ خزاں میں ایسا نہیں ہو سکتا ہے، اس لئے کہ ہم اس وقت مناظر کی صرف حالت موجودہ ہی کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور اگر اس وقت ہم بہار کا خیال باندھیں بھی تو جاڑا درمیان میں حائل ہو جاتا ہے اور ہمارا تصور جاڑے سے کپکپاتا ہوا اس کی کہر اور برف ہی کے اندر فنا ہو جاتا ہے۔

رجولیت کاملہ کے مقابل بچپن کی رعنائیوں میں بھی کچھ اسی قسم کی جاذبیت جلوہ نما نظر آتی ہے، آدمی کو دیکھ کر ہمیں حقیقی مسرت محض اس وقت حاصل ہوتی ہے جبکہ اس کے کارناموں کی یاد ہماری وہ نمائی اس کے ماضی کی طرف کرتی ہو اور ہمارے تصور میں اس آدمی کا بچپن تازہ ہو سکتا ہو اور ہم اس کے زمانہ حال کو دیکھتے ہوئے ضعیفی مستقبل کی تصویر کا تصور قائم کرنے پر کہیں مجبور ہو جائیں تو اس کے زوال اور انحطاط کا محض خیال ہی ہمارا سارے کا سارا مزا اور لطف کرکرا کر دینے کو کافی ہو جائے گا۔ کسی کو تیزی کے ساتھ قبر کی طرف پیش قدمی کرتا ہوا دیکھنے میں کوئی لطف حاصل نہیں ہو سکتا ہے، کیوں کہ صرف موت ہی کا ایک نقشہ سارے منظر کو بالکل بھیانک اور ڈراؤنا بنا دیتا ہے، لیکن جب کبھی میں کسی دس بارہ سالہ تندرست و توانا اور چاق چوبند بچے کا تصور باندھ لیتا ہوں تو چاہے وہ اس کے زمانہ حال کے متعلق ہو چاہے مستقبل کے، اس کے متعلق میرے دل میں سارے کے سارے اچھے اور اعلیٰ خیالات نمایاں ہونے لگتے ہیں، وہ بچہ مجھے ایسا پُرجوش پُرخلوص اور زندہ دل نظر آتا ہے جو گندے تفکرات اور دلی بے چینیوں سے آزاد ہوتا ہے اور جو اپنی موقتی زندگی میں محو ہو کر اس زندگی کی تکمیل میں مست ہو جاتا ہو جو اس کے ذاتی وجود کی حدود کے باہر تک پھیلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، میں بچے کو دیکھتے ہوئے اس وقت کو پیش نظر رکھتا ہوں جبکہ بچہ اپنی روز افزوں عقل، ذہانت اور طاقت یعنی ان ترقی پذیر قوتوں کو استعمال کر سکے گا جن کا وہ ہر وقت

ثبوت دیتا رہتا ہے۔ میں ایسے بچے کو بڑی ہی دل چسپی کے ساتھ دیکھتا ہوں اور عمل ہی دل کے تصوری دل چسپی کے ساتھ مکمل انسان کا نقشہ کھینچ لیتا ہوں اور اس کی مہکا خیز سرگرم زندگی میری نبضوں کی رفتار کو تیز تر کر دیتی ہے جتنی کہ میں خود اسی کی زندگی بسر کرتا ہوا محسوس کرنے لگتا ہوں اور اس کی قوت سے اپنی خلاقی قوت کو بھی تیز تر کر لیتا ہوں۔

مقررہ وقت آپہونچتا ہے، گھنٹہ بجتا ہے اور منظر بدل جاتا ہے، بچے کی آنکھوں میں ایک دم سے دھندلا پن چھا جاتا ہے اور اس کی خوشی و مسرت فرار ہو جاتی ہے، بچپن کی جملہ خوشیاں اور سارے کے سارے وہ آزاد کھیل جن میں کہ وہ دل چسپی لیا کرتا تھا اب خیر باد ہو جاتے ہیں اور ایک سنگ دل اور بے درد انسان نمودار ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ کر کہتا ہے "آئیے جناب میرے ساتھ ادھر تشریف لائیے"۔ اور بے چارہ ناچار وہ بچہ اس کے ساتھ ہو لیتا ہے، ان دونوں کے کمرے میں داخل ہوتے وقت میری نظر کتابوں پر پڑتی ہے جو کہ اس عمر والوں کے لئے نہایت ہی ثقیل اور بدمزہ غذا ہوتی ہے، یہ غریب اور بے بس بچہ چلنے کے لئے تیار اور پھر چار سمت ایک نہایت حیرت انگیز اور درد بھری نظر ڈال کر دوار ہو جاتا ہے، اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوتے ہیں لیکن انھیں آنکھ سے ٹپکا نہیں سکتا، سینہ آہوں سے پُر ہوتا ہے لیکن انھیں منہ سے نہیں نکال سکتا۔

میرے پیارے سندر اور خوش مزاج شاگرد تجھے اس قسم کے خوف کی کوئی وجہ نہیں، تیری زندگی کا ایک لمحہ بھی کھٹکنے اور عاجز ہونے کے لئے نہیں ہے، تیرا دن بے فکری سے اور رات سکون کے ساتھ گذرتی ہے اور تیرے وقت کا حساب خوشیوں کی مقدار سے لگایا جاتا ہے، اور اس بدنصیب مخلوق کی روانگی پر آ کر میں تسلی و تشفی بخش رہا تھا! دیکھئے وہ آگیا۔ اس کو آتا ہوا دیکھ کر میں اپنے دل میں خوشی کی ایک لہر محسوس کر رہا ہوں اور اس خوشی میں وہ خود بھی میرا شریک نظر آرہا ہے، وہ جس سے اس وقت مل رہا ہے وہ اس کا ایک مخلص دوست اور ساتھی ہے، جب کبھی وہ مجھے دیکھتا ہے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ اب تفریح کا وقت آگیا ہے، ہم ایک دوسرے کے کبھی محتاج نہیں رہتے لیکن ہمارے تعلقات نہایت ہی اچھے ہیں، اور ہم کو کبھی اتنی خوشی حاصل نہیں ہوتی جتنی کہ ہم دونوں کو اکٹھا رہنے میں حاصل ہوتی ہے۔

اس کی وضع قطع اس کے چہرے مہرے اور پیشانی پر اعتماد اور قناعت ہویدا نظر آتی ہے۔ تندرستی اس کے منہ پر برستی ہے اور اس کے مضبوط اور مستقل قدم اس کی طاقت کی گواہی دیتے ہیں، اس کے رنگ روپ میں ملالت تو نہیں لیکن نزاکت ضرور موجود ہے، پھر بھی زنانے پن کا تو نام بھی نہیں ہے، اس کے چہرے کو ہوا اور سورج نے پہلے ہی جوانمردانگی ثبت کر دی ہے، اس کے گول گول اعضا اور پٹھے اس کی ابھرتی ہوئی شخصیت کی علامتوں کو پہلے ہی ظاہر کرنے لگے ہیں اور اس کی آنکھیں جو حیات کی لَو سے ہنوز منور نہیں ہوئی ہیں تاہم اپنا خانگی سکون کم از کم قائم ضرور کئے ہوئے ہیں۔ وہ دیرینہ مصائب و آلام سے آشنا ہو کر ابھی کافی نہیں ہوئی ہیں اور نہ ہی اس کے رخساروں پر لگاتار آنسو بہنے کے نشانات نمایاں ہوئے ہیں، اس کی سریع الرفتاری اور پُراعتماد نقل و حرکت میں اس کی عمر کی قدرتی قوت اور آزادی کے اطمینان کو ملاحظہ فرمائیے وہ اپنے چلن اور کردار میں آزاد اور وسیع النظر ہے لیکن ریاکاری اور بدتمیزی کی اس میں لگاوٹ تک نہیں ہے اس کا سر جو کتب کے مطالعہ کی غرض سے اب تک نہیں جھکا ہے، ابھی اس کی چھاتی پر نہیں لٹکا ہے۔ اور اسے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ سر اٹھاؤ۔ میرا شاگرد شرم و خوف سے بھی اپنا سر کبھی نہ جھکائے گا۔

اے بھلے مانسو! اس کو اپنے درمیان جگہ دو۔ اس سے بلا کھٹکے سوال و جواب کرو۔ بے ہودگی، نامعقولیت یا داشت گوئی کا اس سے ذرا بھی خوف نہ کھاؤ، اس سے آپ کو یہ خوف نہ ہونا چاہئے کہ وہ آپ کو اپنے قابو میں کرلے گا اور آپ کو اپنی ذات سے مخاطب رہنے کی اس قدر توقع رکھے گا کہ آپ کو چھٹکارہ ہی حاصل نہ ہو سکے گا۔ نہ ہی آپ کو میرے شاگرد سے کسی داد و ستائش کی امید رکھنی چاہئے، اور نہ ہی وہ آپ سے ان باتوں کا ذکر کرے گا جو میں نے اس کو سکھائی ہیں، اس سے آپ سیدھی سادی اور خالص صداقت کے علاوہ اور کسی چیز کی ہرگز توقع نہ رکھیں۔ اس بات کا ذرّا برابر بھی لحاظ کئے بغیر کہ آپ پر اس کا کیا اثر ہو گا میرا شاگرد آپ سے اپنے قصور کا بالکل ایسی ہی آزادی کے ساتھ اعتراف کرے گا جیسا کہ وہ کسی صداقت یا حقیقت کا اظہار کرتا ہے وہ اپنے نطق کا استعمال مبتدیوں کی سی مجسم سادگی اور بھولے پن کے ساتھ کرے گا۔

بچوں کے نیک شگون پر ہماری جان جاتی ہے۔ ہم برابر ان حماقتوں کے طوفان پر کف افسوس ملتے ہیں اور ماتم کرتے رہتے ہیں، جو ہماری ان تمناؤں کو مغلوب اور شکست کر دیتی ہیں جنھیں کہ اپنی ذاتی مرضی کی

[illegible] ہم کسی اتفاقیہ جذبہ پر مبنی کر لیتے ہیں۔ پس اگر میرا شاگرد اس قسم کی پیشین گوئیوں کا موقع بہت کم دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ مجھے اس قسم کی افسردگی اور آزردگی کا بھی تو بہت ہی کم موقع دیتا ہے، اس لئے کہ وہ تو کبھی کوئی بیکار بات زبان پر لاتا ہے، اور نہ ہی یہ جانتے ہوئے کہ کوئی سننے والا مخاطب موجود نہیں ہے، وہ خواہ مخواہ کی بکواس سے اپنے آپ کو ہلکان کرتا ہے۔ اس کے خیالات گو ہیں تو معدودے چند لیکن واضح اور معقول نہیں ہیں اور گو اسے حفظ کوئی چیز نہیں ہے لیکن اس کا عملی تجربہ بہت وسیع ہے، اور اگرچہ ہماری نام نہاد کتابوں کو وہ دیگر بچوں کی مانند نہیں پڑھ سکتا ہے لیکن قدرت کی کتاب کا مطالعہ دیگر اطفال کے مقابلہ میں اس کا بہت وسیع ہے، اس کے خیالات محض اس کی زبان کی نوک ہی پر نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ اس کے دماغ کی پیداوار ہوتے ہیں، اور گو اس کی قوت حافظہ ضرور کمزور ہے، لیکن قوت فیصلہ بے حد درست ہے، وہ صرف ایک ہی زبان بول سکتا ہے لیکن اس زبان میں وہ جو کچھ بیان کرتا ہے اس کو خوب سمجھ کر بیان کرتا ہے اور دوسرے بچوں کے مقابلہ میں گو اس کی تقریر اچھی نہ بھی ہو لیکن عمل ان سے کہیں بہتر اور اعلیٰ ہے۔ عادت۔ رسم و ریت اور رواج کے معنوں سے وہ بالکل ناآشنا ہے، جو کام وہ کر چکا ہے اس کا اثر اس کے آج کے کاموں پر بالکل نہیں ہوتا ہے۔ وہ کسی اصول کا پابند ہے نہ کسی شخص کا مطیع اور نہ ہی وہ کسی شخص کی نقل کرتا ہے، اس کا قول و فعل اس کی آزاد [illegible] ہوتا ہے ایسی ایسی سے آپ لکھی ہوئی تحریروں اور ضد کی مانند سمجھائے ہوئے افعال کی توقع [illegible] اور خود بخود [illegible] ہوتا ہے [illegible] آسان ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے [illegible] جاتی ہیں وہ [illegible] عملی زندگی بسر کرنے والوں کی عادتیں خفیف اور کمزور ہوتی ہیں۔

عادت کی حکومت صرف کمزور دماغوں ہی پر ہوتی ہے اور ایسے ان کمزور دماغوں [illegible] ہمیشہ مفید عادت یہی ہونی چاہئے کہ وہ [illegible] کسی وقت ضرورت کے مطابق ہونے کے عادی [illegible] کوئی مفید عادت ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ [illegible] کے [illegible] کا مطیع ہو سکے۔ اس کے [illegible] ہر ایک عادت بری اور عیب

ہرگز نہ دیکھیں، بلکہ حقیقی خیالات کے ایمان دارانہ اظہار اور طبعی میلان کے پیدا کردہ طرز عمل کی توقع رکھیں۔
آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اپنی موجودہ حالت کے متعلق تو چند اخلاقی تخیلات وہ اپنے ذاتی رکھتا ہے، لیکن انسانیت کے متعلق اور کچھ بھی تخیل نہیں رکھتا ہے، اور درحقیقت اس سے وہ فائدہ بھی کیا حاصل کرسکتا ہے۔ اس لئے کہ ہنوز وہ سماج کا کوئی عملی رکن نہیں بنا ہے، آزادی ملک یا ان امور کے متعلق جو معمولاً انجام دیئے جاسکیں اگر آپ اس سے ذکر کریں گے تو وہ آپ کو ان کی حد تک سمجھ سکے گا، یہ وہ خوب جانتا ہے کہ اس کی ذاتی چیزیں اس کی ملک کیوں ہیں اور دوسری چیزیں اس کی ملک کیوں نہیں ہیں، بس آگے اللہ اللہ خیر سلا۔ فرائض واجب یا اطاعت گذاری کا آپ اس سے ذکر کیجئے، اس کو یقین جانئے خبر بھی نہ ہوگی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کسی کام کی انجام دہی کا آپ اس کو حکم دیجئے واللہ اس کے کان پر جوں بھی نہ رینگے گی لیکن ہاں اگر آپ اس سے یہ فرمائیں۔ "اگر تم اس وقت میری خوشی پوری کرو گے تو میں بھی بوقت ضرورت تمہارے کام آؤں گا اور معاوضہ ادا کردوں گا" تو وہ فوراً ہی بلا تامل آپ کا کام پورا کردے گا، اس لئے کہ شخصی دائرہ سلطنت کو وسعت دینے کی غرض سے وہ اس سے زیادہ کسی اور چیز کی فکر نہیں رکھتا کہ وہ آپ سے اپنے ایسے حقوق حاصل کرے جنہیں وہ جانتا ہے کہ آپ کے نزدیک وہ قابل وقعت اور احترام ہوں گے، ممکن ہے کہ دوسروں میں وقعت حاصل کرنے یا اپنی ذاتی جگہ کو علیٰ حالہ قائم رکھنے کی اس کو کوئی فکر نہ ہو لیکن اول الذکر خیال اگر اس کے دل میں گھر کر جائے تو سمجھ لیجئے کہ وہ قدرتی سلطنت کو خیرباد کہہ چکا ہے اور ریاکاری اور مکر کا دروازہ بند کرنے میں آپ ناکام رہے ہیں۔
اپنی ذات کی حد تک جب کبھی اس کو کسی امداد کی ضرورت لاحق ہوگی تو جو کوئی بھی سامنے ہوگا وہ اس سے بلا دریغ اور بے دھڑک امداد کا طالب ہو جائے گا، بادشاہ سے بھی وہ اسی بے تاملی کے ساتھ اعانت کا طالب ہوگا جس کے ساتھ وہ اپنے ملازم سے اس کا طالب ہوتا ہے، اس کی نظر میں سب انسان برابر ہیں آپ سوال کے طرز ہی سے جان جائیں گے کہ وہ اس چیز سے واقف ہے کہ وہ آپ سے مطالبہ نہ کرے بلکہ ممنون احسان ہو کر استمداد کا خواہاں ہو اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ مراعات منظور کرنے کے لئے انسانیت آپ کو مجبور کرتی ہے، اس کے الفاظ نہایت مختصر اور سیدھے سادے ہوتے ہیں، اس لب و لہجہ چہرہ ہر

جب ہم کسی اتفاقیہ جلسہ پر مبنی کر لیتے ہیں۔ پس اگر میرا شاگرد اس قسم کی پیشین گوئیوں کا موقع بہت کم دیتا ہو تو اس کے ساتھ ہی وہ مجھے اس قسم کی افسردگی اور آزردگی کا بھی تو بہت ہی کم موقع دیتا ہے ، اس لئے کہ وہ نہ تو کبھی کوئی بیکار بات زبان پر لاتا ہے ، اور نہ ہی یہ جانتے ہوئے کہ کوئی سننے والا مخاطب موجود نہیں ہے ، وہ خواہ مخواہ کی بکواس سے اپنے آپ کو ہلکان کرتا ہے۔ اس کے خیالات گو ہیں تو محدود سے چند لیکن واضح اور معقول نہیں ہیں اور گو اسے حفظ کوئی چیز نہیں ہے لیکن اس کا عملی تجربہ بہت وسیع ہے ، اور اگرچہ ہماری نام نہاد کتابوں کو تو وہ دیگر بچوں کی مانند نہیں پڑھ سکتا ہے لیکن قدرت کی کتاب کا مطالعہ دیگر اطفال کے مقابلہ میں اس کا بہت وسیع ہے ، اس کے خیالات محض اس کی زبان کی نوک ہی پر نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ اس کے دماغ کی پیداوار ہوتے ہیں ، اور گو اس کی قوت حافظہ ضرور کمزور ہے ، لیکن قوت فیصلہ بے حد درست ہے ، وہ صرف ایک ہی زبان بول سکتا ہے لیکن اس زبان میں وہ جو کچھ بیان کرتا ہے اس کو خوب سمجھ کر بیان کرتا ہے اور دوسرے بچوں کے مقابلہ میں گو اس کی تقریر اچھی نہ بھی ہو لیکن عمل ان سے کہیں بہتر اور اعلیٰ ہے ۔ عادت ، رسم و ریت اور رواج کے معنوں سے وہ بالکل نا آشنا ہے ، جو کام وہ کر چکا ہے اس کا اثر اس کے آج کے کاموں[ملہ] پر بالکل نہیں ہوتا ہے۔ وہ نہ کسی اصول کا پابند ہے نہ کسی شخص کا مطیع اور نہ ہی وہ کسی شخص کی نقل کرتا ہے ، اس کا قول و فعل اس کی آزاد مرضی کا تابع ہوتا ہے ، پس اس سے آپ لکھی ہوئی تقریروں اور بندھے سدھائے ہوئے افعال کی توقع

ملہ عادت کی دلفریبی فطرتی مجبوریت کا نتیجہ ہوتی ہے اور اگر اس عمل کو جاری رکھا جائے تو وہ پانی بہاؤ ہے اور خود بخود نشو و نما پاتی رہتی ہے ۔ بیٹھے لیٹے کوئی کام کرنا آسان ہوتا ہے ۔ ایک چال ڈھال پر چلنا بھی آسان ہوتا ہے ۔ اسی باعث ہم دیکھتے ہیں کہ بوڑھوں اور کاہلوں میں جو عادتیں نمودار ہو جاتی ہیں وہ بے حد شدید ہوتی ہیں ، جوانوں اور عملی زندگی بسر کرنے والوں کی عادتیں خفیف اور کمزور ہوتی ہیں۔

عادت کی حکومت صرف کمزوروں ہی پر ہوتی ہے اور یہ ان کو روز بروز کمزور اور ناتواں بناتی رہتی ہے ۔ بچوں میں مفید عادت یہی ہونی چاہئے کہ وہ بلا کسی وقت ضرورت کے مطیع ہونے کے عادی ہوں اور آدمی کے لئے کوئی مفید عادت ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ بلا کسی تکلیف کے عقل کا مطیع ہو سکے ۔ اس کے ماسوا ہر ایک عادت بری اور معیوب ہے ۔

ہرگز نہ رکھیں، بلکہ حقیقی خیالات کے ایمان دارانہ اظہار اور طبعی میلان کے پیدا کردہ طرزِ عمل کی توقع رکھیں۔

آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اپنی موجودہ حالت کے متعلق تو چند اخلاقی تخیلات وہ اپنے ذاتی رکھتا ہے، لیکن انسانیت کے متعلق وہ کچھ بھی تخیل نہیں رکھتا ہے، اور درحقیقت اس سے وہ فائدہ بھی کیا حاصل کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہنوز وہ سماج کا کوئی عملی رکن نہیں بنا ہے، "آزادی" "ملک" یا ان امور کے متعلق جو معمولاً انجام دیئے جا سکیں اگر آپ اس سے ذکر کریں گے تو وہ آپ کہ ان کی حد تک سمجھ سکے گا، یہ وہ خوب جانتا ہے کہ اس کی ذاتی چیزیں اس کی ملک کیوں ہیں اور دوسری چیزیں اس کی ملک کیوں نہیں ہیں، بس آگے اللہ اللہ خیر سلّا۔ فرائض واجب یا طاعت گذاری کا آپ اس سے ذکر کیجئے، اس کو یقین جانئے خبر بھی نہ ہوگی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کسی کام کی انجام دہی کا آپ اس کو حکم دیجئے واللہ اس کے کان پر جوں بھی نہ رینگے گی لیکن ہاں اگر آپ اس سے یہ فرمائیں۔ "اگر تم اس وقت میری خوشی پوری کردو تو میں بھی بوقت ضرورت تمہارے کام آؤں گا اور معاوضہ ادا کردوں گا" تو وہ فوراً ہی بلا تامل آپ کا کام پورا کردے گا، اس لئے کہ شخصی دائرۂ سلطنت کو وسعت دینے کی غرض سے وہ اس سے زیادہ کسی اور چیز کی فکر نہیں رکھتا کہ وہ آپ سے اپنے ایسے حقوق حاصل کرے جنہیں وہ جانتا ہے کہ آپ کے نزدیک وہ قابل وقعت اور احترام ہوں گے، ممکن ہے کہ دوسروں میں وقعت حاصل کرنے یا اپنی ذاتی جگہ کو علیٰ حالہ قائم رکھنے کی اس کو کوئی فکر نہ ہو لیکن اول الذکر خیال اگر اس کے دل میں گھر کر جائے تو سمجھ لیجئے کہ وہ قدرتی سلطنت کو خیرباد کہہ چکا ہے اور ریاکاری اور نمود کا دروازہ بند کرنے میں آپ ناکام رہے ہیں۔

اپنی ذات کی حد تک جب کبھی اس کو کسی امداد کی ضرورت لاحق ہوگی تو جو کوئی بھی سامنے ہوگا وہ اس سے بلا دریغ اور بے دھڑک امداد کا طالب ہو جائے گا، بادشاہ سے بھی وہ اسی بے تاملی کے ساتھ اعانت کا طالب ہوگا جس کے ساتھ وہ اپنے ملازم سے اس کا طالب ہوتا ہے، اس کی نظر میں سب انسان برابر ہیں آپ سوال کے طرز ہی سے جان جائیں گے کہ وہ اس چیز سے واقف ہے کہ وہ آپ سے مطالبہ نہ کرے بلکہ ممنونِ احسان ہو کر استمداد کا خواہاں ہو اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ مراعات منظور کرنے کے لئے انسانیت آپ کو مجبور کرتی ہے، اس کے الفاظ نہایت مختصر اور سیدھے سادے ہوتے ہیں، اس لب و لہجہ، چہرہ ہر

اور اس کی حرکات و سکنات اس ہستی کے مشابہ ہیں جو اطاعت اور انکار دونوں سے ہی مساویانہ طور پر ناآشنا ہو اس انداز میں نہ تو غلامانہ ذہنیت عجز و انکساری ہے اور نہ آقا کا سا تمردانہ لب و لہجہ۔ بلکہ اس کے اندر انسانیت پر ایک قسم کا معتدل اعتماد ظاہر ہوتا ہے، ایک مخلوق کی یہ ایک شریفانہ، پُرتاثیر، آزاد لیکن ذی حس اور منکسر سی کیفیت ہوتی ہے جو ایک دوسری آزاد لیکن ذی قوت اور ہمدرد ہستی کی امداد کی خواہاں ہوتی ہے۔ پس اگر آپ میرے شاگرد کی استدعا قبول فرمائیں گے تو وہ آپ کا مشکور نہ ہوگا لیکن یہ ضرور محسوس کرے گا کہ وہ آپ کا مقروض ہو گیا ہے، اور اگر آپ امداد سے انکار کردیں تو وہ آپ سے نہ شکوہ کرے گا اور نہ اصرار اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ ہر دو باتیں لاحاصل اور بےکار ہیں، وہ یہ کبھی نہ کہے گا کہ فلاں شخص نے میری امداد کرنے سے انکار کردیا۔ بلکہ وہ یہی کہے گا کہ فلاں شخص کے لئے میری امداد کرنا ممکن نہ تھا اور جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کسی ضرورت کو ایک دفعہ محسوس کرنے کے بعد اس کے خلاف ہم پھر کبھی بغاوت نہیں کرسکتے۔

اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیجئے اور گفتگو کئے بغیر اس کے افعال کی نگرانی رکھئے اور یہ غور کیجئے کہ وہ کیا کرتا ہے اور کس طرح کرتا ہے، وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کو اس کی آزادی کا یقین دلایا جائے، اس لئے وہ خود بلا سوچے سمجھے محض دکھانے کے لئے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کرسکتا ہے کوئی کام نہیں کرتا کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ وہ ہمیشہ اپنا خود آقا ہے؟ وہ چست، ہوشیار اور مستعد ہے، اور اس کی نقل و حرکت بلحاظ عمر سرگرم اور پرجوش ہے، لیکن آپ ایک بات بھی اس کے عمل میں ایسی نہ پائیں گے جو بلاوجہ یا بے مقصد ہو اس کی خواہش چاہے کچھ ہی ہو وہ اس چیز کے لئے کبھی کوشش نہیں کرے گا جو اس کی استطاعت کے باہر ہو کیونکہ تجربہ کے ذریعہ وہ یہ سیکھ چکا ہے کہ وہ کتنی قدرت رکھتا ہے، اس کے ذرائع میں اور مقصد کا ہمیشہ لحاظ ہوتا ہے اور کامیابی کے یقین بغیر وہ کبھی کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا ہے، اس کی نظر گہری اور صحیح ہوتی ہے، وہ کبھی ایسی حماقت نہیں کرتا ہے کہ لوگوں سے جاکر وہ ان چیزوں کے متعلق دریافت کرنے لگے جن کو وہ خود دیکھ رہا ہو وہ خود ان چیزوں کو جانچتا ہے اور قبل اس کے کہ وہ کسی اور سے اس کے متعلق کچھ دریافت کرے اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے لئے اپنے ذاتی جملہ ذرائع صرف کرچکا ہے۔ اگر اس کو کوئی غیر متوقع دشواری پیش آجائے تو وہ نسبتاً زیادہ پریشان نہیں ہوتا ہے۔

اور اگر کوئی خطرہ پیش آ جائے تو وہ بہت ہی کم خوف کھاتا ہے، اس کے خیالی تصورات ہنوز خوابیدہ ہیں ان کو جگانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی گئی ہے، وہ محض اصلیت ہی کو دیکھتا ہے اور خطرہ کو صرف اتنی ہی اہمیت دیتا ہے جتنی کہ اس میں ہو اس لئے وہ کبھی اپنے اوسان باختہ نہیں ہونے دیتا۔ ضرورت کے خلاف وہ کبھی بغاوت نہیں کرتا۔ ضرورت کا اس کی گردن پر بڑا بوجھ رہتا ہے جس کا جوا وہ زندگی بھر اٹھائے رہے گا اور خوب عادی ہو جائے گا پس وہ ہر وقت ہر کام کے لئے تیار رہتا ہے۔

کام ہو یا کھیل دونوں اس کے لئے ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں، اس کا کھیل اس کا کام ہے دونوں میں اس کے پاس کوئی امتیاز نہیں ہے، ہر کام میں وہ دلچسپی کا لطف اور آزادی کی بہار مہیا کر لیتا ہے اور اپنے دل کے رجحان اور علم کی وسعت کو آشکارا کر دیتا ہے، ایک ہشاش بشاش، شوخ چشم، پر امن فارغ روش اور کشادہ و خنداں پیشانی بچے کو اہم ترین امور سے کھیلتے اور معمولی سے معمولی امور سے تفریح کرتے ہوئے دیکھنے سے زیادہ قابل قبول، پر اثر اور خوش منظر کیا کوئی اور دوسرا نظارہ بھی ہو سکتا ہے!

اب کیا آپ اس کو بذریعہ توازن جانچنا چاہتے ہیں؟ دوسرے بچوں میں اس کی مرضی پر آپ اسے چھوڑ دیجئے، تو آپ فوراً ہی ملاحظہ فرمائیں گے کہ زیادہ ترقی کس نے کی ہے۔ بچپنے کی تکمیل کے قریب تر کون پہنچ چکا ہے، اور یہ کہ شہر کے جملہ بچوں میں اس سے زیادہ ہنرمند اور طاقتور دوسرا کوئی بچہ نہیں ہے کم سن کسانوں کا گو طاقت میں مساوی ہے لیکن مہارت میں ان سے کہیں یارہ ہے، ہر چیز جو بچے کی دسترس میں ہو اس کا وہ اندازہ لگاتا ہے، عقل لڑاتا ہے اور تمام دوسرے بچوں سے کہیں زیادہ پیش بینی کا مظاہرہ کرتا ہے، دوڑنا کودنا چیزوں کا منتقل کرنا اور بوجھ اٹھانا یا فاصلہ کا اندازہ لگانا کھیلوں کا ایجاد کرنا یا انعام جیتنا وغیرہ بھی کوئی قابل لحاظ کام ہیں، وہ ان سب کو اپنی مرضی کے مطابق اس طرح انجام دیتا ہے کہ آپ اس کو یہ کام انجام دیتے ہوئے دیکھ کر یہی فرمائیں گے کہ "قدرت خود اس کی مطیع ہو گئی ہے" وہ اپنے ساتھیوں کی رہبری اور ان پر حکمرانی کرنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے، اس کی قابلیت اور تجربہ حق اور حکومت کی جگہ حاصل کر لیتے ہیں۔ کسی لباس اور کسی نام کے تحت بھی وہ ہمیشہ پیش پیش ہی رہے گا۔ اور ہر جگہ وہ دوسروں پر حکومت ہی کرے گا، اس کی برتری سب محسوس کریں گے اور وہ بے خبری میں ان کا

آقا بن جائے گا اور وہ سب نادانستہ اس کی خدمت کرنے لگیں گے۔

بچپنے کے کمال کو وہ پہونچ چکا ہے، اس نے بچوں کی زندگی بسر کی ہے، اور اس کی رفتار ترقی آسودگی قربان کر کے نہیں خریدی گئی ہے بلکہ اس نے دونوں اکٹھی حاصل کی ہیں جبکہ وہ بچپن کی عقل حاصل کر رہا تھا اس وقت بھی وہ اتنا ہی آزاد اور آسودہ تھا جتنا کہ اس کی صحت نے اجازت دے رکھی تھی، اگر کاٹ تراش کرنے والی موت اس کو ہم سے منقطع کر کے ہماری امیدوں پر پانی ڈال دیتی تو اس کی زندگی اور موت دونوں کا ہم ماتم کرتے، ہم کو اس امر کا مزید غم نہ ہوتا کہ ہم نے اس کو تکلیف میں رکھا، ہم یہی خیال کرتے کہ کم از کم اس کا بچپن تو عیش و آرام سے گذر گیا اور ہم نے اس کو کسی ایسی چیز سے محروم تو نہیں رکھا جو قدرت نے اس کو عطا کی تھی۔

اس ابتدائی تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ محض عقلا اور زیرک ہی اس کو پسند کرتے ہیں پست خیال یا عوام کی نظر میں ایسی محتاط تعلیم دیا ہوا بچہ ایک گاؤدی نمنے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا ہے۔ استاد شاگرد کی نسبت اپنی ذاتی منفعت کا زیادہ خیال رکھتا ہے، اس کو یہ دکھلانے کا بڑا خیال رکھتا ہے کہ اس نے ذرا سا بھی وقت ضائع نہ جانے دیا، وہ اپنے شاگرد کو ایسے ماحول سے مزین اور آراستہ کرتا ہے جو کسی دوکان کی بیرونی آرائش اور زینت کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے، یعنی ایسے ہنر یا کمال سکھاتا ہے جن کا ہر وقت مظاہرہ کیا جا سکتا ہے اور اگر وہ بآسانی دکھائے جا سکیں تو ان کے مفید یا غیر مفید ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے، اپنے حافظہ کو بچہ بلا امتیاز خرافات کے بنڈلوں سے لاد لیتا ہے، پس جب بچے کا امتحان لیا جاتا ہے تو وہ اپنے ظروف دکھا دکھا کر باہر حسن دیتا ہے اور ناظرین کو دکھانے کے بعد پھر اپنا بنڈل بغل میں دبا کر روانہ ہو جاتا ہے میرا شاگرد بالکل مفلس ہے، اس کے پاس مظاہرے کا کوئی سامان نہیں ہے، صرف اس کی ایک ذات ہے جس کا وہ مظاہرہ کر سکتا ہے، ایک نظر میں نہ بچے کا مطالعہ ہو سکتا ہے اور نہ آدمی کا، کہاں ہیں وہ مشاہدہ کرنے والے جو کسی بچے کی خاصیت ایک نظر میں فوراً بھانپ سکتے ہیں؟ اس قسم کے لوگ ہوتے ضرور ہیں لیکن خال خال اور معدودے چند ہزار باپوں میں بمشکل آپ کو شاید ایک آدھ ہی ایسا باپ ملے گا۔

سوال و جواب کی بوچھاڑ سے بہت سے لوگ اور بالخصوص بچے تو بہت ہی تنگ اور متنفر ہو جاتے ہیں چند ہی منٹ میں ان کی توجہ فوراً منتقل ہو جاتی ہے اور دھیان بھٹک جاتا ہے، اور بچہ آپ کے متواتر سوالات کو

سننا بھی چھوڑ دیتا ہے اور اٹکل پچو جواب دینے لگتا ہے، اس کی آزمائش کا یہ طریقہ فی الواقعی خود تسائشی کا ایک مظاہرہ ہوتا ہے جو بالکل غیر مفید ہے، زیادہ گفتگو کی نسبت صرف ایک اتفاقیہ لفظ یا جملہ ہی ان کی عقل و فہم کو بعض اوقات اچھی طرح ظاہر کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے لیکن خیال یہ رکھنا چاہئے کہ بچے کا جواب دنو اتفاقیہ فقرہ ہو اور نہ کوئی حفظ کیا ہوا جملہ کسی بچے کے فہم و ادراک کا اندازہ لگانے کے لئے ممتحن کو بھی نہایت اچھی فہم و ذکاوت والا ہونا ضروری ہے۔

میں نے آنجہانی لارڈ ہانڈ کو اپنے دوست کے متعلق مندرجہ ذیل کہانی بیان کرتے ہوئے سنا، وہ اٹلی میں تین سال رہنے کے بعد واپس آیا تو اپنے نو دس سالہ بچے کی تعلیمی ترقی کا امتحان لینے کے لئے بہت بے قرار تھا۔ ایک روز شام کے وقت اپنے بچے اور اس کے اتالیق کو ساتھ لے کر ایک مسطح میدان میں جہاں بہت سی پتنگیں اڑ رہی تھیں ٹہل رہا تھا، چلتے چلتے باپ نے بیٹے سے سوال کیا جس پتنگ کا یہ سایہ پڑ رہا ہے۔ وہ کہاں ہے، اوپر دیکھے بلا تامل بچے نے جواب دیا۔ اعلیٰ شاہراہ پر۔ لارڈ ہانڈ کہتے ہیں کہ بلا شک یہ شاہراہ ہمارے اور سورج کے مابین واقع ہو گی، پس اس جملہ پر باپ نے بیٹے کو بوسہ دیا، اور امتحان ختم کر کے واپس چلا گیا، دوسرے دن باپ نے اتالیق کو تنخواہ کے علاوہ سالانہ گذارہ مقرر کرنے کے احکام بھیج دیئے۔

کیا باپ تھا اور کیا ہوشیار بیٹا۔ سوال بھی اس عمر کے بچے کے لئے موزوں تھا اور جواب بھی اتنا ہی سادہ۔ لیکن یہ ملاحظہ فرمائیے کہ اس بچے کے فیصلے میں کس قدر تناسبت کا پتہ چلتا ہے۔ ارسطو کے شاگرد نے اس مشہور گھوڑے کو جسے کوئی بہادر بھی مانوس نہ کر سکا تھا اسی طرح زیر کر کے قابو کیا۔

آغاز شباب۔ پندرہ سال سے بیس سال تک

اس دنیائے اسفل میں ہماری زندگی کس قدر جلد ہوا ہو جاتی ہے۔ اس زندگی کا پہلا چوتھائی دور تو اس کے استعمال سے واقف ہونے کے قبل ہی گذر چکتا ہے اور آخر چوتھائی ہمیں اس سے لطف حاصل کرنے کے لائق ہی نہیں چھوڑتا ہے۔ پہلے پہل تو ہمیں زندگی بسر کرنی ہی نہیں آتی ہے۔ اور جب ہم کسی قابل ہوتے ہیں تو وقت ہی گذر چکتا ہے۔ ان دونا حاصل حدود کے درمیانی نصف کا تین چوتھائی حصہ کام کاج کرتے، سوتے رنج والم سہنے اور ہر قسم کی قیود اور مصیبتیں برداشت کرنے میں گذر جاتا ہے۔ الغرض یہ زندگی بڑی ہی مختصر ہے

اس وجہ سے نہیں کہ جلد ختم ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ہمیں اس کا لطف حاصل کرنے کا کوئی موقع بمشکل ہی حاصل ہوتا ہے۔ پیدائش اور موت کا یہ درمیانی وقفہ طویل محض بے کار دہ جاتا ہے۔ ہماری زندگی اور بھی مختصر ہو جائے اگر اس وقفہ کو بھی ہم اچھی طرح کام میں نہ لائیں۔

اس لحاظ سے ہم دو مرتبہ پیدا ہوتے ہیں یعنی ایک مرتبہ تو وجود میں آتے ہیں اور دوسری مرتبہ زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔ اولاً ایک انسانی ہستی کی حیثیت سے اور پھر ایک انسان کی حیثیت سے جو لوگ عورتوں کو ناقص خیال کرتے ہیں وہ گو غلطی پر ہیں لیکن بیرونی مشابہت ضرور ان کی تائید کرتی ہے۔ تا حصول سن بلوغ ہر دو اصناف میں آنکھ کو بہت ہی کم امتیاز نظر آتا ہے۔ چہرہ مہرہ۔ رنگ روپ آواز حتیٰ کہ ہر شئے بادی النظر میں یکساں معلوم ہوتی ہے۔ لڑکیاں بھی بچے اور لڑکے بھی بچے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے اس قدر مشابہت رکھنے والی ہر دو مخلوقات کے لئے ایک ہی نام کافی ہے۔ وہ مرد جن کی نشو نما رک جاتی ہے اس مشابہت کو تمام عمر ضائع نہیں کرتے ہیں، وہ مرتے دم تک بھی بڑے بڑے بچے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ عورتوں میں بہر نوع یہ تشابہت کبھی ضائع ہوتی ہی نہیں، اس لحاظ سے وہ کبھی بچوں سے زیادہ ہوتی ہی نہیں ہیں۔

لیکن ایک آدمی بالعموم بچہ ہی رہنے کے لئے ہرگز پیدا نہیں ہوتا ہے۔ قدرت کے مقررہ وقت پر بچپن کو خدا حافظ کہنا ہی پڑتا ہے اور یہ توڑ کا وقت جو بنسبت بہت قلیل ہوتا ہے۔ اپنے میں بے حد دور رس نتائج پوشیدہ رکھتا ہے۔

جس طرح سمندری لہروں کی گڑگڑاہٹ ایک طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ بالکل اسی کی مانند ابھرتے ہوئے جذبات کا ولولہ اس محشر انگیز تغیر کا اعلان کرتا ہے۔ اور ایک دبا ہوا جذبہ ہمیں آنے والے خطرات سے خبردار کر دیتا ہے۔ تلون مزاجی وقت بے وقت کی جھنجلاہٹ، ذہن کی مبہم حرکت بچے کو تقریباً بے قابو بنا دیتی ہے، بچہ جس آواز کا مافل فرماں بردار و مطیع تھا۔ اب اسے سنتا بھی نہیں۔ بلکہ اس سے بہرہ بن جاتا ہے۔ اس وقت وہ گھبرایا ہوا ایک ایسا شیر ببر ہوتا ہے جو اپنے پالنے والے پر بھی اعتبار نہیں کرتا۔ اور اس کی اطاعت سے بھی انکار کر دیتا ہے۔

تبدیلِ مزاج کی اخلاقی علامتوں کے نمودار ہونے کے ساتھ ہی ساتھ صورت و شکل میں بھی نمایاں تغیر پیدا ہونے لگتا ہے بچے کا چہرہ تپا ہوا اور بھرا ہوا معلوم ہونے لگتا ہے جس پر اس کے چلن اور خواص کی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ بچے کے رخساروں کے ننھے ننھے ملائم اور چھید رے روئیں سخت اور سیاہی مائل ہو جاتے ہیں۔ اس کی آواز بھاری یا بالکل ہی ضائع ہو جاتی ہے۔ الغرض نہ تو وہ بچوں ہی میں رہتا ہے اور نہ آدمیوں میں، اس لئے کہ وہ ان دونوں میں سے ایک کے مانند بھی گفتگو نہیں کر سکتا ہے۔ روح کا آلہ آنکھیں جو تا ایندم گونگی اور خاموش تھیں اب گویا اور پُر معنی ہو جاتی ہیں، جلتی ہوئی آگ انہیں منور کر دیتی ہے، بچے کی صدا روشن آنکھوں میں مقدس معصومیت اور بھولپن اب بھی چھلکتا ہے۔ گو پہلے کی سی لایعنی صورت کو اب وہ ضائع کر چکا ہے۔ یہ پہلے ہی سے وہ خوب جانتا ہے کہ آنکھیں بڑی چغلخور ہوتی ہیں۔ لہٰذا وہ نیچی نگاہ رکھنے اور شرمانے کی مشق شروع کر دیتا ہے۔ وہ ذکی الحس بن جاتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا محسوس کرتا ہے، وہ بے چین رہتا ہے لیکن اس بے چینی کے سبب سے لاعلم ہوتا ہے بس ممکن ہے کہ یہ سب باتیں کچھ رفتہ رفتہ پیدا ہوں اور آپ کو کافی وقت ہاتھ آجائے لیکن اگر بچے کا انتشار بے صبر ہو جائے۔ اس کا جذبہ دیوانگی کی شکل اختیار کرلے اور اگر وہ بیک وقت خفا بھی ہونے لگے اور افسوس بھی کھائے۔ اور اگر بلا وجہ رونے لگے اور ان چیزوں کو دیکھ کر جو اب خطرات کا ذریعہ بن رہی ہیں اس کی نبض اگر تیز حرکت کرنے اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ اور اگر صنف نازک کا ہاتھ لگ جانے پر وہ کانپنے اور لرزنے اور اس کے سامنے اضطراب و تذبذب میں پڑنے لگے تو اب اے دانش مند یولیسس (ULYSSES) خبردار ہوشیار! جن راہوں کو بمشقت بسیار آپ نے مسدود کیا تھا وہ سب بچے کے لئے کھل گئی ہیں اور ہوا چل پڑی ہے اپنی پگڑی دونوں ہاتھوں سے سنبھالئے ورنہ بس سب کچھ چلا۔

جس دوسرے جنم کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے وہ یہی ہے بس اس کے یہ معنی ہوئے کہ آدمی اپنی زندگی کی دہلیز میں قدم رکھ رہا ہے۔ لہٰذا کسی قسم کا انسانی جذبہ اس کے لئے اب اجنبی نہ ہوگا، اس وقت ہماری جملہ مساعی بچے کا کھیل تھیں، اب انھیں بے حد اہمیت حاصل ہو گئی ہے یہی وقت جبکہ تعلیم بالعموم ختم کر دی جاتی ہے دراصل وہ وقت ہے جبکہ تعلیم کی ابتدا ہونی چاہیئے لیکن اس جدید تدبیر کی مناسب توضیح اور تشریح کے لئے ہمیں اپنی کہانی وہیں سے شروع کرنی چاہیئے جہاں سے کہ ہم نے چھوڑا تھا۔

جذبات کی حفاظت

ہمارے جذبات حفاظت نفس کے خاص الخاص ذرائع ہوتے ہیں، لہذا انھیں برباد کردینا ایک نہایت ہی فضول اور عبث فعل ہوگا جس کے معنی محض خدا کی قدرت کو مغلوب کرنا اور اس کے بنائے ہوئے کام کو بگاڑنا ہے، اگر خالق یکتا آدمی سے ارشاد فرماتا کہ وہ اس کے عطا کردہ جذبات کو فنا کردے تو گویا وہ آدمی سے یہ فرماتا کہ وہ زندہ رہے یا مردہ رہے۔ یعنی وہ دو متضاد حکم دیتا، خدا کبھی ایسا فضول حکم نہیں دیتا ہے۔ ایسا کوئی حکم قلب انسانی پر منقوش نہیں ہے اور جو کام اللہ تعالیٰ کسی اپنے بندے سے کرانا چاہتا ہے وہ اس کے لئے کسی ماسوا کی زبان سے نہیں کہلواتا ہے۔ بلکہ وہ خود بالذات اپنے بندے سے متکلم ہوتا ہے اور اس کے پوشیدہ الفاظ دل پر کندہ رہتے ہیں۔

پس ان لوگوں کو جو جذبات کی پیدائش اور ترقی کو مسدود کرتے ہیں میں تو تقریباً اتنا ہی احمق خیال کرتا ہوں جتنا کہ اُن لوگوں کو بے وقوف جانتا ہوں جو ان جذبات کو فنا کر دیتے ہیں، اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اب تک میرا مقصد بھی یہی تھا وہ بڑی ہی غلطی پر ہیں۔

لیکن اس واقعہ سے کہ جذبات طبعی ہوتے ہیں ہمارا یہ اخذ کر لینا کیا صحیح اور بجا ہوگا کہ جملہ جذبات جنھیں ہم خود محسوس کرتے اور دوسروں میں دیکھتے ہیں فطری ہیں؛ ان جذبات کی جڑ بنیاد تو بے شک فطری ہی ہوتی ہے۔ لیکن ہزاروں مختلف رودوں کے مل جانے سے وہ بہت وسعت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی مثال ایک بہت بڑے دریا کی سی ہوتی ہے جو ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے اور جس میں اصلی چشمے کا ایک قطرہ بھی ہم بمشکل ہی تمیز کر سکتے ہیں۔ ہمارے فطری جذبات تو درحقیقت معدودے چند اور گنتی کے ہوتے ہیں اور وہی ہماری آزادی اور اپنے میں ہماری حفاظت نفس کا میلان رکھتے ہیں۔ ماسوا جملہ دیگر جذبات کا جو ہمیں غلام بناتے اور برباد کرتے ہیں منبع ہی دوسرا ہوتا ہے۔ وہ قدرتی دین نہیں ہوتے۔ بلکہ ہم خود ہی قدرت کی مخالفت میں انھیں اختیار کر لیتے ہیں۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

کم ترقی یافتہ ذہن

مدرس کو روزمرہ ایسے بچوں سے واسطہ پڑتا ہے جو ذہنی اعتبار سے پست سمجھے جاتے ہیں۔ اگست ۱۹۵۱ء میں نیوزی لینڈ کی وزارت معارف نے کم ترقی یافتہ بچوں کے متعلق ایک مشاورتی کمیٹی مقرر کی، اس کمیٹی نے بچوں کی ذہنی پس ماندگی کا جائزہ لیا اور حال ہی میں محکمہ تعلیمات ولنگٹن نے اس کے متعلق کمیٹی کی رپورٹ کو شائع کردیا ہے

کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ بچے ذہنی طور پر پس ماندہ کہلاتے ہیں جو عوامی مدرسوں کی مخصوص جماعتوں میں تعلیم و تدریس سے استفادہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں، اس رپورٹ کے دیباچے میں "ذہنی پس ماندگی" کی اصطلاح پر اچھی خاصی تنقید کی گئی ہے، یہ اصطلاح یو۔ایس۔اے میں مروج ہے اور حال ہی میں نیوزی لینڈ نے بھی اس کو رواج دینا شروع کیا ہے۔ لیکن طبی یا تعلیمی اعتبار سے اس کے لئے ہم کوئی جواز نہیں پیش کرسکتے جن بچوں کا مطالعہ اور جن کا جائزہ اس رپورٹ میں پیش کیا گیا ہے انھیں ضعیف العقل اور احمق کہا جا سکتا ہے۔

اگرچہ اس کمیٹی نے ذہنی طور پر پس ماندہ بچوں کے اعداد و شمار پیش کرنے کی سعی کی ہے لیکن اسے اس میں کامیابی نہیں ہوئی، یہ اعداد و شمار صحیح نہیں ہیں بلکہ محض تخمینہ ہیں۔ اس رپورٹ کی رو سے پورے ملک میں ضعیف العقل اور احمق بچوں کی تعداد چار ہزار بچوں پر مشتمل بتائی گئی ہے، پانچ سال سے اٹھارہ سال کی عمر کے ضعیف العقل اور احمق افراد کی تعداد کا اندازہ ۶۶۰۰ ہے اور زیادہ امکان یہ ہے کہ ان کی تعداد ۷۰۰ اور ۸۰۰ کے بین بین ہوگی۔

رپورٹ کے مندرجات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ولنگٹن میں پانچ چھ سال ہوئے ایک "کاروباری مدرسے" کو ترقی دینے کی کوششیں جاری ہیں: تاکہ مائیں اپنے ضعیف العقل اور کند ذہن بچوں کو اپنے گھروں پر ہی تربیت دے سکیں لیکن اس روداد میں اس امر کی وضاحت کردی گئی ہے کہ موری چلڈرن اسکول" کے علاوہ جو نسبتاً قدیم العقائد

سلسلے میں قائم ہے ۔بچوں کی ذہنی پس ماندگی کا علاج اچھے اور عمدہ رہائشی اداروں کے قیام میں مضمر ہے جن میں تعلیم وتدریس کا ضروری سامان موجود ہو اور جس کے اساتذہ تربیت یافتہ ذہین اور کام کرنے والے ہوں ۔اسی ایک صورت میں والدین اپنے ضعیف العقل اور کوتاہ فہم بچوں کو پانچ سال کی عمر میں ان اداروں میں چھوڑنے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں ۔ اس روداد میں بعض ایسے والدین کے واقعات بھی مندرج ہیں جو خود ذہین ہیں اور جنھوں نے اپنے ضعیف العقل بچے کی تربیت میں بہتر سے بہتر اور موثر سے موثر طریقے اختیار کئے لیکن وہ ان کی اصلاح میں کامیاب نہیں ہوئے اور بعد میں انھیں اس بات کا افسوس رہا کہ اے کاش وہ بچوں کو کسی عمدہ ادارے میں داخل کرادیتے ان کے خیال میں یہ ادارے بچے کی فلاح وبہبود کے سلسلے میں وہ کچھ کر سکتے ہیں جو والدین گھروں پر نہیں کر سکتے ۔

اس کمیٹی کی مخصوص سفارشات مندرجہ ذیل ہیں ۔

حکومت کو چاہیئے کہ ذہنی طور پر پس ماندہ بچوں کے لئے اچھے رہائشی مدرسے کھولے ، جو دماغی شفاخانوں سے بالکل علیحدہ اور آزاد ہوں اور یہ مدرسے بچوں اور بالغوں کی ذہنی تربیت کے لئے مخصوص ہوں ۔

اس قسم کے ہر ادارے میں ۴۰۰ سے ۵۰۰ ضعیف العقل افراد کی رہائش کا موزوں اور مناسب انتظام ہو اور ہر وا حد سے میں تیس افراد کے رہنے کا بندوبست ہو ۔ ہر ادارے میں ان ضعیف العقل اور کم فہم افراد کی جسمانی صحت کو قائم رکھنے کے لئے ضروری سازوسامان موجود ہو ۔ بچے کی استعداد اور اس کی لیاقت کے مطابق اسے ذہنی اور جسمانی مشاغل میں معروف رہنے کا موقع دیا جائے اور بچوں کو اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر کھیلنے کے سماجی مواقع بھی مہیا کئے جائیں ۔ جن کا ماحول ہم دردی اور محبت سے بھرا ہوا ہو ، اس کے علاوہ طبی امداد اور نرسنگ کا بھی لحاظ رکھا جائے ۔

جو بچے دور دراز مقامات پر رہتے ہیں اور ان رہائشی اداروں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے وہ کاروباری مدرسے میں بدستور پڑھتے رہیں ، اور ان بچوں کے لئے اس قسم کے مدارس کو حسب معمول جاری رکھا جائے ۔ بلکہ ان کی ترقی کی کوشش کی جائے ۔

جامعۂ لندن

لندن یونی ورسٹی کے پرنسپل ڈاکٹر لوکان نے اپنی رپورٹ برائے ۵۳-۱۹۵۲ء میں مقامی تعلیمی حکومتوں کے

یونی ورسٹی زرِامداد پر بھی بحث کی ہے۔ اس وقت لندن کاؤنٹی کونسل لندن یونی ورسٹی کو دو لاکھ پونڈ سالانہ بطور زرِامداد دیتی ہے۔ اور ایک لاکھ تینتیس ہزار نواحی مقامی تعلیمی حکومتیں امداد دیتی ہیں۔ ان میں بکنگھم شائر ایسکون کینٹ، مڈل سکیس اور سرے کاؤنٹی کونسل، اس کے علاوہ کرائے ڈن، ساؤتھ اینڈ اور ویسٹ ہم کاؤنٹی بورڈ شامل ہیں، دو سال ہوئے ہرٹ فورڈ شائر نے اپنے حصے کی ادائگی سے انکار کر دیا، یہ حصہ دس ہزار پونڈ پر مشتمل تھا۔ مجموعی طور پر یہ رقم ۰۰۰ ۳۳۳ پونڈ ہوتی ہے، جسے موجودہ کائنسلر اور یونی ورسٹی کے لئے مناسب اور موزوں زرِامداد سمجھتی ہیں۔

مقامی تعلیمی حکومتوں کا یہ زرِامداد دراصل ان کی تعلیمات کا ایک جزو ہے جو حکومت کے زرِامداد کے مقابلے میں ایک حقیر سی رقم ہے منظور شدہ اخراجات کا ۷۰ فی صدی حکومت خود ادا کرتی ہے، حالاں کہ دفعہ ۸۴ تعلیمی ایکٹ محررہ ۱۹۴۴ء کی رو سے اس قسم کی امداد دینے سے پہلے وزارت معارف سے اجازت لینی ضروری ہے اس کی توضیح یوں کی جاسکتی ہے کہ داہنا ہاتھ جو کچھ کرتا ہے اس کا علم بائیں ہاتھ کو ضرور ہونا چاہیئے یہ ایک واضح اور منطقی بات ہے، اس لئے جس یونی ورسٹی کو حکومت سے براہ راست زرِامداد ملتا ہو اسے چوری چھپے دوسرے ذرائع سے رقوم وصول نہیں کرنی چاہئیں تعلیمی اخراجات اور ضروریات کے پیش نظر مقامی حکومتوں کو نئے اس زرِامداد کا جائزہ لینا چاہئے جو وہ یونی ورسٹی کو دیتی ہیں۔ اس طرح لندن کاؤنٹی کونسل اور دوسری بورڈ کی مجموعی امدادی رقم پانچ لاکھ پونڈ سالانہ اور تین لاکھ تینتیس ہزار پونڈ سالانہ ہوتی ہے۔ اور ان دنوں چوں کہ ملک میں عام اقتصادی بحران ہے، اس لئے مقامی حکومتوں نے بھی اپنے اخراجات میں تخفیف کی اور اس لئے مجبوراً انھیں یونی ورسٹی کے زرِامداد میں بھی کمی کرنی پڑی۔ یونی ورسٹی ان کے اس جذبہ کا اخلاص کو نظرِ استحسان دیکھتی ہے کہ اس عہد میں انھوں نے یونی ورسٹی کے مشاغل میں اپنی دل چسپیوں کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا۔

قرض یا وظیفہ

مئی کے دوسرے ہفتہ میں سویڈلیش طلبہ کی پانچ سالہ پارلیمان لُنڈ یونی ورسٹی (LUND UNIVERSITY) میں منعقد ہوئی۔ اس پارلیمان کے انعقاد اور اس کی ترتیب و تنظیم کی ذمہ دار سویڈن کی انجمن طلبہ

......اس پارلیمان میں طلبہ کے زرِ امداد کے متعلق لمبی چوڑی بحثیں ہوتی رہیں۔
سویڈن میں طلبہ کو قرض دینے کا دستور پرانا ہے، لیکن اس اجلاس میں طلبہ کے مندوبین نے اس طریق کار کی مخالفت کی، اس کے برعکس انگریزی گرانٹ سسٹم کو ان میں سے ہر شخص نے سراہا، اور بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ وظیفوں میں معتدبہ اضافہ کیا جائے اور یونین جو اس سے پہلے بھی حکومت سے کافی مراعات حاصل کر چکی ہے کوشش کرے گی، بلکہ حکومت کو مجبور کرے گی کہ یونی ورسٹی میں نئے داخل ہونے والوں کی کل تعداد کے ۲۵ فی صدی کے لئے وظائف دیئے جائیں۔

اس اجلاس میں مختلف موضوعات پر کم وبیش تین سو قراردادیں پاس ہوئیں، ان میں بالخصوص نصاب کی اصلاح، زمانۂ تعلیم میں تخفیف اور مطالعۂ زیرِ نگرانی میں اضافہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس پارلیمان کے خیال میں ملک کی مختلف یونی ورسٹیوں کو جو زرِ امداد ملتا ہے وہ ناکافی ہوتا ہے، اس پارلیمان میں شمالی سویڈن میں ایک یونی ورسٹی کے قیام کا مسئلہ بھی پیش ہوا، مگر یہ تحریک اس بنا پر مسترد کر دی گئی کہ اس وقت موجودہ یونی ورسٹیوں کو زیادہ سے زیادہ منظم اور ساز و سامان سے آراستہ کرنا چاہیئے۔

اندرونی معاملات میں تو اس پارلیمان کے مندوبین بعض امور پر مختلف الخیال تھے لیکن بیرونی معاملات میں سب یک رائے اور یک زبان تھے، طلبہ کی اس پارلیمان نے لیڈن سیکرٹریٹ کو ہر قسم کی مدد بہم پہنچانے کا اور اس کے نظام کار سے مطابقت پیدا کرنے کا فیصلہ کیا، اور اسی اجلاس میں ان طلبہ نے یہ بھی طے کیا کہ ان کا اشتراکی بین الاقوامی انجمن سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، صدر انجمن نے لوگوں کو یاد دلایا کہ ہماری بعض یونی ورسٹیوں اور بعض طلبہ کی انجمنوں نے ۱۹۳۹ء سے پہلے نازی تحریک کے ذہنی پناہ گزینوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، آج ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم "تنہائی" کے نظریئے کو ختم کر کے بہت آگے نکل چکے ہیں اور ہماری تعلیمی زندگی میں امتیازِ عقائد نہیں ہے، اور نہ اس سلسلے میں کسی کو کسی مخصوص عقیدے کی پاداش میں سزا ہی ملتی ہے۔

سرکاری جریدے کے اعلانات

شعبۂ رجال

زیڈ/۲۲۴۵۶ گورنر پنجاب نے ڈاکٹر غلام حسین نیازی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی۔ پی۔ ای۔ ایس (دوم) نائب افسر ترقیات، دفتر ناظم تعلیمات پنجاب لاہور کو پی۔ ای۔ ایس (اول) میں بمشاہرہ ۳۵۰ - ۴۰ - ۴۵۰ - ۴۰ - ۹۵۰ - ۵۰ - ۱۲۰۰ ترقی مرحمت فرمائی۔ وہ م۔ سعادت علی خاں افسر ترقیات، دفتر ناظم تعلیمات پنجاب لاہور کی جگہ ۱۶ مئی ۱۹۵۳ء سے ۵ جون ۵۳ء تک کام کریں گے (دونوں دن شامل)

ڈاکٹر غلام حسین خاں نیازی اپنی جگہ پر واپس ہوئے اور ۶ جون ۵۳ء سے اپنے عہدے کا چارج بحیثیت نائب افسر ترقیات دفتر ناظم تعلیمات پنجاب لاہور سنبھال لیا۔

زیڈ/۲۴۴۴۲۹ گورنر پنجاب نے دفعہ ۸/۱۱۶ سول سروسز رول پنجاب جلد اول حصہ اول کے ماتحت م۔ منظور الٰہی ربانی۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ای۔ ایس (دوم) ناظر مدارس ضلع شیخوپورہ کو ۱۸ مارچ ۵۳ء سے ۴ اپریل ۵۳ء تک پوری تنخواہ پر رخصت مرحمت فرمائی، انھیں ۵ اپریل ۵۳ء کو بھی اپنی چھٹی میں بھی شامل کر لینے کی اجازت ہے۔ وہ ۶ اپریل ۵۳ء کو بعد از دوپہر اپنے فرائض سنبھال لیں گے۔

زیڈ/۲۱۵۰۶ گورنر پنجاب نے زیر دفعہ ۸/۷۵ سول سروسز رول پنجاب جلد اول حصہ اول مسٹر حمید الدین خاں سینئر لکچرر سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کو پاکستان سے باہر جانے کی غیر معمولی رخصت ۱۴ ستمبر ۵۳ء سے ۱۷ نومبر ۵۳ء تک مرحمت فرمائی انھیں ۱۶ جون ۵۳ء سے ۱۳ ستمبر ۵۳ء تک موسم گرما کی تعطیلات کو اپنی رخصت میں شامل کرنے کی اجازت ہے۔

زیڈ/۲۰۹۶۸ ایس شبیر حسین۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس (دوم) ناظر مدارس ضلع گجرات اور موجودہ قائم مقام افسر بکار خاص دفتر ناظم تعلیمات پنجاب لاہور م۔ ایم۔ اے۔ مخدومی کی جگہ یکم جولائی ۵۲ء سے مسمی وبیری

امداد کی ایک خالی آسامی پر افسر بکار خاص دفتر ناظم تعلیمات پنجاب لاہور (قائم مقام) بشاہرہ خود مقرر ہوئے۔ انھیں ۱۰۰ روپے ماہانہ مخصوص تنخواہ بھی ملے گی۔

نمبڈ/۶۰۷۰۳۰۲۲ م۔ نذیر احمد قریشی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس (دوم) ناظر مدارس ملتان ایک خالی آسامی پر ۲۳ جون ۵۳ء سے نائب ناظر مدارس حلقہ ملتان بشاہرہ خود مقرر ہوئے۔

م۔ مستنصر باللہ۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس (دوم) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان م۔ نذیر احمد قریشی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ۲۲ جون ۵۳ء سے بشاہرہ خود ناظر مدارس ضلع ملتان مقرر ہوئے۔

چودھری نبی بخش۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس (دوم) ناظر مدارس ضلع میانوالی۔ چودھری عبدالغفور ایم۔ اے پی۔ ای۔ ایس (دوم) کی جگہ جو اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں ۲۴ جون ۵۳ء سے بشاہرہ خود سینیر لکچرار ایمرسن کالج ملتان مقرر ہوئے۔

۲۷ جون ۵۳ء سے سینیر لکچرر گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خاں مقرر ہوئے (خود اپنی جگہ)

م۔ عبدالعزیز بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس (دوم) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ساہیوال (شاہپور) چودھری نبی بخش کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ۱۶ جون ۵۳ء سے بشاہرہ خود ناظر مدارس ضلع میانوالی مقرر ہوئے۔

م۔ محمد اکبر علی۔ بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی۔ پی۔ ای۔ ایس (دوم) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول عیسیٰ خیل م۔ غلام محمد خاں۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس (دوم) کی جگہ جن کا تقرر بحیثیت ناظر مدارس حلقہ راولپنڈی ہو چکا ہے ۱۰ جون ۵۳ء سے بشاہرہ خود نائب ناظر مدارس حلقہ راولپنڈی مقرر ہوئے۔

ای/۱۲۰۵۰۴۰۲۲ م۔ محمود خاں بھٹی لکچرر فارسی گورنمنٹ کالج راولپنڈی م۔ احمد علی۔ ایم۔ اے کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے بشاہرہ خود لکچرر فارسی گورنمنٹ کالج کیمبل پور مقرر ہوئے۔ م۔ احمد علی ایم اے لکچرر فارسی گورنمنٹ کالج کیمبل پور م۔ محمود خاں بھٹی۔ ایم۔ اے کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے لکچرر فارسی گورنمنٹ کالج راولپنڈی مقرر ہوئے۔

ای/۲/۲۲۱۹ م۔ محمد زمان خورشید بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (نمبر ۳۹ – ۲۵۰/ ۳۰۰) نائب ناظر مدارس ضلع جھنگ (رخصتی) شیخ کرامت علی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ نائب ناظر مدارس ضلع میاں والی مقرر ہوئے (یہ اپنے عہدے کا چارج اس دن لیں گے جس دن م۔ حبیب اللہ قریشی بحیثیت نائب ناظر مدارس ضلع جھنگ اپنے عہدے کا چارج لیں گے)

شیخ کرامت علی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۱۵ – ۲۵۰/ ۱۳۰) نائب ناظر مدارس ضلع میاں والی۔ قاضی محمد لطیف کی جگہ جن کا تقرر بحیثیت ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود نائب ناظر مدارس ضلع سیال کوٹ مقرر ہوئے۔

م۔ حبیب اللہ قریشی ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۴۴ ۲۵۰/ ۱۳۰) معلم انگریزی گورنمنٹ نارمل اسکول نارووال ضلع سیال کوٹ م محمد زمان خورشید کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود نائب ناظر مدارس ضلع جھنگ مقرر ہوئے۔

ای/۴۴/۲۱۳ م۔ منور الدین احمد بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۳۲۸ ۲۵۰/ ۱۳۰) نائب ناظر مدارس ضلع راول پنڈی کی جگہ (جن کا سیال کوٹ کے لیئے تبادلہ کا حکم ہو چکا ہے) م۔ ایس۔ ایم تقی جن کا تقرر بحیثیت ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول مری ہو چکا ہے، جولائی ۵۳ء بعد دوپہر سے بمشاہرہ خود نائب ناظر مدارس ضلع شیخو پورہ مقرر ہوئے۔

ای/۱۵/۲۳۵ م۔ محمود خاں بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۱۳۱ ۲۵۰/ ۱۳۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول سیال کوٹ ایک نئی آسامی پر جسے حکومت پنجاب نے بحوالہ چٹھی نمبر ۳۸۲۵ ڈی بنام محکمہ تعلیم، ا دسمبر ۵۲ء سے منظور کی تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود نائب ناظر مدارس ضلع سیال کوٹ مقرر ہوئے۔

م۔ علی محمد ایچ۔ پی۔ ایچ۔ یو۔ ایف۔ اے۔ او۔ ٹی (نمبر ۳۲۵، ۱۲۰/ ۶۰) معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول مٹھا ٹوانہ (ضلع شاہ پور) م۔ فلک شیر نمبر ۱۷ ۱۲۰/ ۶۰) کی جگہ جن کا تقرر منسوخ ہو چکا اپنے اسی عہدے پر تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود نائب ناظر مدارس ضلع کیمبل پور مقرر ہوئے۔

ایس۔ ولایت شاہ۔ ایس۔ وی۔ ایچ۔ پی۔ ایف۔ اے (نمبر ۱۰۸ ۱۲۰/ ۶۰) مدرس السنہ شرقیہ

گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم۔ ملک محمد صادق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰/۴۰۰) کی جگہ اپنے ہی عہدے پر
تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود نائب ناظر مدارس ضلع راولپنڈی مقرر ہوئے۔

م۔ معراج الدین۔ ایچ۔ پی۔ ایچ۔ پی۔ یو۔ او۔ ٹی۔ بی۔ اے (نمبر ۱۸۶ ۱۴۰/۷۰) معلم السنہ شرقیہ
گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری ایک خالی اسامی پر م۔ عبدالحمید مسلم کی جگہ جن کا تقرر بحیثیت ہیڈ ماسٹر
گورنمنٹ ہائی اسکول گکھڑ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود نائب ناظر مدارس ضلع ملتان مقرر ہوئے۔

ای/۳/۷۵۰ م۔ عبدالوحید ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۴۰۶ ۲۵۰/۱۳۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول شکانہ
شیخوپورہ۔ م۔ محمد افضل کی جگہ جن کے تبادلے کا حکم گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال سے گورنمنٹ
ہائی اسکول شیخوپورہ منسوخ ہو چکا ہے۔ بحوالہ چٹھی نمبر ۱۰۳۵۸/ای تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود
معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ مقرر ہوئے۔

ای/۱۱۹۷ م۔ نذیر احمد بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰/۱۳۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بوچھال کلاں۔
م۔ محمد خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی
اسکول میانوالی مقرر ہوئے

م۔ محمد خان بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰/۱۳۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی م۔ نذیر احمد کی جگہ جن کا

ای/۱۴۲۸۵ م۔ محمد خاں چودھری۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایف۔ ایس سی (۲۵۰/۱۳۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول
ٹھٹھاٹوانہ م۔ عبدالحکیم کی جگہ جن کی تقرری کے احکام صادر ہو چکے ہیں تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود معلم
سائنس گورنمنٹ ہائی اسکول کہوٹہ مقرر ہوئے۔

م۔ عبدالحکیم بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (امتحان میں شریک ہوئے) ایک امیدوار زیر حکم تقرری عارضی معلم انگریزی
گورنمنٹ ہائی اسکول کہوٹہ (۔۔/۱۳۰) مقرر) م۔ محمد خاں چودھری کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری
سے بمشاہرہ خود عارضی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ٹھٹھاٹوانہ مقرر ہوئے۔

تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بمشاہرہ خود معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بوچھال کلاں مقرر ہوئے۔

Regd. No. L. 3257

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ھے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین، کیلئے معاوضہ دیا جاتا ھے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھہ روپیہ (انگریزی) اور چھہ روپیہ (اردو) ھے - جو کہ مینجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل
اموزش
۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

آموزش

جلد ٦ شمارہ ٦] لاهور [ستمبر ۱۹۵۳ء

اس شمارہ میں

مدیر : بشیر هاشمی

معاونین : عبدالغفور چودھری
ایم - اے - عزیز

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

ستمبر ۱۹۵۳ء

جلد ــــــــــ ۶

شمارہ ــــــــــ ۶

سالانہ چندہ

پاکستان کے لئے ۶ روپے

غیر ممالک کے لئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشر

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں
طبع کرا کے زیبدہ شی تہذیب ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

بی ٹی اور سی ٹی کے داخلے

بی۔ٹی اور سی۔ٹی کے داخلے ابھی ابھی ختم ہوئے ہیں۔ اس سال کل ۰۵۷ درخواستیں موصول ہوئیں جن میں سے بالآخر ۱۱۲ امیدواروں کو داخل کیا گیا۔

ہمیں مدت سے شکایت رہی ہے کہ جو لوگ ٹریننگ کالج میں داخل ہونے آتے ہیں۔ ان میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جنھوں نے ایام کالج میں مدرسوں میں پڑھائے جانے والے مضامین کا مطالعہ ہی نہیں کیا ہوتا جس شخص نے ایف۔ اے یا بی۔ اے میں سائنس۔ ریاضی، جغرافیہ۔ تاریخ وغیرہ مضامین نہ پڑھے ہوں ٹریننگ کالج انھیں ان مضامین کے طریقہ ہائے تدریس کی تربیت کیوں کر دے سکتا ہے؟ زمانہ مابعد تقسیم کی ہنگامی مجبوریاں مدت سے ختم ہو چکی ہیں، مگر ہماری یہ پرانی شکایت ختم ہوتی نظر نہیں آتی، ہمارے نوجوانوں میں ابھی یہ احساس سرے سے پیدا ہوتا دکھائی نہیں دیتا کہ پیشہ کا انتخاب گریجویٹ ہونے کے بعد نہیں بلکہ اس سے کئی برس پہلے ہونا چاہئے اور اسی انتخاب کی مناسبت سے کالج میں مضامین۔ لیے جانے چاہئیں۔

ترقی یافتہ ملکوں میں مدرسے اور کالج اس بات کا خاص اہتمام کرتے ہیں کہ طلبہ تعلیمی زندگی کے خاصے ابتدائی مرحلے پر ہی اپنے مستقبل کے متعلق ایک واضح خاکہ ذہن میں قائم کر لیں انھیں نہ صرف اپنی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کے معلوم کرنے کے لئے ہر ممکن سہولت بہم پہونچائی جاتی ہے۔ بلکہ

مختلف پیشوں اور مضمونوں میں داخل ہونے کے مواقع اور اس کے لئے ضروری شرائط سے بھی اچھی طرح آگاہ کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عموماً ہر نوجوان کوئی ناخوش گوار جھٹکا محسوس کئے بغیر طالب علمی سے عملی زندگی میں قدم رکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے مدرسے تو درکنار کالج تک اس بات کا کچھ اہتمام نہیں کرتے جس کا ایک افسوسناک نتیجہ یہ ہے کہ اکثر طلبہ مضامین کے انتخاب میں کسی سوچے سمجھے منصوبے کو نگاہ میں نہیں رکھتے جو مضامین جی میں آئے لے لئے۔ کالج سے فارغ ہونے یا کچھ سال زندگی کی ٹھوکریں کھانے کے بعد پیشہ معلمی میں مقابلتاً سلامتی نظر آئی تو ٹریننگ کالج کا رُخ کیا۔ مگر اس کالج میں داخل ہونے کے لئے محض بی۔اے ہونا کافی نہیں، اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے۔ کہ بی۔اے میں ایسے مضامین پڑھے ہوں جو مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ ٹریننگ کالج ثانوی مدارس کے لئے انگریزی کے استاد تیار کرتا ہے۔ ایسے استاد جنھیں ثانوی مدارس میں انگریزی پڑھانے کے ساتھ ساتھ دو ایک اور مضامین بھی پڑھانے ہوں گے، اس لئے اس کالج نے داخلہ کی ایک ضروری شرط یہ قرار دے رکھی ہے کہ امیدوار نہ صرف انگریزی بلکہ مدرسہ کے دو اور مضامین میں بھی خاصی اچھی استعداد رکھتے ہوں، اس استعداد کی عدم موجودگی میں کالج طریقہائے تدریس میں تربیت کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔

یہاں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ بھی ہو جانا چاہئے۔ امیدواروں میں بہت سے لوگ ایسے تھے جنھوں نے مولوی فاضل یا منشی فاضل پاس کرنے کے بعد صرف انگریزی میں بی۔اے پاس کیا تھا۔ ان کی طرف سے یہ کہا گیا کہ چوں کہ ہم عموماً ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس کے حصے میں تعلیمی سہولتیں نسبتاً کم آئی ہیں، اس لئے ہمارے معاملہ میں نرمی برتی جانی چاہئے۔ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ ٹریننگ کالج اپنے فرض منصبی سے کوتاہی کئے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر زمانہ مابعد تقسیم کے ہنگامی حالات نے کالج کو کچھ عرصہ کے لئے اس پر مجبور کر دیا تھا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حالات کے معمول پر آجانے کے بعد بھی اس چیز کو جاری رکھا جائے۔ یونیورسٹی کے قوانین اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ اس کا ہر گریجویٹ جب جی چاہے کسی بھی زائد مضمون یا مضامین میں امتحان پاس کر لے، اس لئے کسی شخص کا صرف انگریزی میں بی۔اے

بی اے پاس کرنا خود اس کی اپنی پسند کی وجہ سے ہے۔ مواقع کی کمی کی وجہ سے نہیں، اس کے لئے ہر وقت یہ راستہ کھلا ہے کہ ریاضی، جغرافیہ، تاریخ وغیرہ مضامین میں بھی بی اے پاس کر لے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اسے کوئی حق نہیں کہ ثانوی مدرس بننے کے لئے بے معنی دوڑ دھوپ کرے۔ تاہم اس سال صرف انگریزی میں بی اے پاس کرنے والوں کا الگ امتحان لے کر ان میں سے ایسے لوگوں کو داخل کر لیا گیا جو انگریزی کے علاوہ کم از کم دو اور مضامین میں ایف اے کے معیار پر پورے اترتے تھے

ہر سال داخلہ کے موقع پر چند ایسے امیدوار بھی آجاتے ہیں جنھیں یونیورسٹی کی طرف سے فسادات یا سیلابوں میں کام کرنے کی بنا پر سندیں عطا کی گئی ہیں۔ ہمیں ان سندوں سے جھگڑا نہیں لیکن یہ اصحاب اور پیدی ہوئی وجوہ کی بنا پر ثانوی مدرس بننے کی پہلی شرط کو پورا نہیں کرتے، استاد کے لئے پہلی شرط علم مضامین پر قدرت ہے جو وہ پڑھائے گا۔ اگر کوئی شخص اس شرط کو پورا نہیں کرتا تو اس کی دوسری خوبیاں اس کمی کی تلافی نہیں کر سکتیں۔

ملک کے تعلیمی نظام میں بہت جلد کئی .... تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔ یہ تبدیلیاں از خود ہماری زندگی میں کوئی نئی روح نہیں پھونک دیں گی۔ بلکہ یہ کام زیادہ تر معلم کے ہاتھوں انجام پائے گا۔ مستقبل کی تعمیر میں مدرس ایک ایسا اہم کردار ہے کہ اس کی خوبی کے بارے میں ذرا سی غفلت بھی افسوسناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور ملک میں تربیت اساتذہ کے لئے چوٹی کا ادارہ ہے، اس پر یہ فرض بدرجہ اولیٰ عائد ہوتا ہے کہ پاکستانی معلم کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے کسی کوشش سے دریغ نہ کرے، ہمیں امید ہے کہ اس کوشش میں کالج کو ملک کے تمام سنجیدہ عناصر کی پوری تائید حاصل رہے گی۔

احادیث نبوی میں جسمانی تعلیم

عبدالغفور چودھری

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اسلامی نظام تعلیم کے تحت مکاتب میں جسمانی تعلیم اس کے روزانہ پروگرام میں کس حد تک دخیل تھی، البتہ علماء میں مردانہ ورزشیں اور فرصت کے مشاغل عام تھے، اس سلسلہ میں بھی آنحضرت ہی کی مثال ہے جو اپنے بعد کوئی نہ کوئی چیز ایسی ضرور چھوڑ گئے جو زندگی کی تمام سرگرمیوں کی اخلاقی اصلاح کرتی ہے۔ علماء اور ان کے شاگرد ایک جگہ جمع ہو کر اس موضوع پر احادیث کا جوش و خروش کے ساتھ مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اور ان پر عمل پیرا ہونے کی ہر ممکن کوشش کیا کرتے تھے۔

"بخاری" میں تیر اندازی کو مقبول عام بنانے کے بارے میں ایک باب ہے جس میں اس فن کی مشغولیت کا بیان ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح آں حضرت اپنے صحابیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا کرتے تھے، اور نشانہ بازی کی مشق کا مقابلہ کرنے میں حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے، اکثر آپ خود بھی ان مشاغل میں حصہ لیا کرتے تھے لیکن ان کا رویہ اس کھلاڑی کی طرح ہوتا تھا جو کسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ کھیل میں محض کھیل کے لئے حصہ لیتا ہے، جب ایک گروہ کے لوگ آپ کے مخالف ہونے میں شامل ہونے پر معترض ہوتے تھے تو آپ ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جو تمام بدگمانیاں دور کر دیتی ہے۔ کہتے کہ وہ سب کے ساتھ ہیں [1]

چند اساتذہ نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس شغل کو اختیار کیا تھا، اور امام شافعی نے اس فن میں کافی مہارت حاصل کر لی تھی، اور ایک مرتبہ جب انھوں نے ایک شخص کو تیر اندازی میں شاندار مہارت کا مظاہرہ کرتے دیکھا تو اپنا کیسہ نکال کر بجنسہٖ اس کو پیش کر دیا۔

---

[1] بخاری۔ باب تیر اندازی کو مقبول عام بنانے کے بارے میں۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں رام پور کے ذخیرہ (COLLECTION) میں تیر اندازی پر ایک قلمی کتابچہ ہے جو اس ذیل میں آنحضرتؐ کی احادیث سے شروع ہوتا ہے، ان احادیث کے مطالعہ سے اس اہمیت کا پتہ چلتا ہے جو آنحضرتؐ مردانہ ورزش کو دیا کرتے تھے۔ تیر اندازی کی مشق صرف جنگ میں حصہ لینے والوں کی تربیت کے لئے نہیں کی جاتی تھی بلکہ یہ ایک طرح کا صحت بخش مشغلہ تھا جس سے صحت مقابلہ اور مہارت کے مظاہرے کا موقع ملتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر قرآن کی ایک آیت کی تلاوت کی "ان کے خلاف اپنی پوری طاقت کے ساتھ جنگ کرو" اور تین بار اس امر پر زور دیا کہ یہاں طاقت کا مطلب تیر اندازی سے ہے۔ ان احادیث کی شہادت پر چند ماہرین فقہ نے تیر اندازی سیکھنے کو ایک مذہبی فرض قرار دے دیا تھا [1]

یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آپؐ نے ایک مرتبہ ایک مشہور تیر انداز کو ایسے الفاظ میں دعا دی جو آپؐ نے کسی دوسرے کے لئے کبھی استعمال نہیں کئے تھے، یہ وہ اعزاز تھا جس سے آپ نے سعد بن ابی وقاص کو سرفراز کیا۔ جنگ احد کے میدان میں ان کے لئے اپنا ترکش خالی کر دیا اور دشمن پر تیر چلانے میں ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا "میرے ماں باپ تجھ پر قربان اے سعد"

ایک دوسری حدیث میں کہا گیا ہے کہ جو شخص خدا کی راہ پر ایک تیر چلاتا ہے اس کو ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے۔

صحرائے عرب کی سرحدوں پر جو سلطنتیں واقع ۔۔۔ تھیں ان کے اعلان کی طرف سے مشکوک اور معاندانہ رویہ سے مجبور ہو کر مسلمانوں کو جنگی منصوبوں پر بڑی ہوشیاری سے نظر رکھنا پڑتی تھی، اور اس ملک کے لئے جس کے معاشی وسائل بہت قلیل اور کاریگروں کی تعداد معدودے چند تھی۔ سامان حرب کی فراہمی ایک دشوار مسئلہ بن گیا تھا، ایسے طبعی ماحول میں جہاں ہر فرد کو حالات سے مجبور ہو کر خود کفیل بننا پڑتا تھا، ہنرمند کاریگر پیدا کرنے کا کوئی امکان نہ تھا، چنانچہ ایک حدیث میں بیک وقت تیر بنانے، ان کو خریدنے اور ان کو چلانے والے تینوں کی تعریف کی گئی ہے۔

---

[1] فن تیر اندازی پر کتابچہ (نسخہ علی گڑھ)

اس زمانہ میں تیر کی بہت قیمت ہوتی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے ایک حدیث ہے کہ جو شخص تیر کو اس کے نشانہ سے واپس لائے گا اسے اس سمت میں ہر قدم چلنے پر ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملے گا۔[1] آنحضرتؐ نے ان تمام لوگوں کی زبردست مذمت کی ہے جو تیر اندازی سیکھنے کے بعد اس کی مشق بھول بیٹھتے تھے۔ فرمایا "جو تیر اندازی کو ایک مرتبہ سیکھنے کے بعد ترک کر دیتا ہے وہ میری سنت کو ترک کرتا ہے"

اسلامی ادب میں فن تیر اندازی، شاہین بازی، شہسواری، شطرنج اور دوسرے کھیلوں پر دلچسپ تصانیف پائی جاتی ہیں اور اس قسم کی تمام کتابوں کے پہلے باب میں آغاز اس موضوع سے متعلق احادیث سے ہوتا ہے۔ فقہ اور حدیث کی کتابوں میں کھیل کود اور تفریح کے باب ہوتے ہیں اور ان سب میں قانونی کھیلوں کے باضابطہ قواعد درج ہوتے ہیں۔

موخر الذکر قسم کی کتابوں میں تعلیم یافتہ طبقہ کو کھیل کود میں دلچسپی پیدا کرائی گئی ہے۔ جو اسے عوام الناس تک پہونچاتے ہیں اور اول الذکر قسم کی کتابوں کو امراء کے کتاب خانوں میں ممتاز جگہ حاصل تھی جن کو اس قسم کے مشاغل کے لئے نسبتاً زیادہ فرصت اور ذرائع حاصل تھے۔

احادیث کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں میں بلا استثناء ایک باب گھوڑے پالنے کی فضیلت پر ہوتا ہے جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ آنحضرت کو اس مشغلہ سے بہت دلچسپی تھی

اسپ رانی عربوں کا قومی مشغلہ تھا اور گھوڑ دوڑ بہت ہی مقبول عام تفریح تھی۔ ایک مرتبہ انھوں نے گھوڑ دوڑ کے لئے پانچ چھ میل لمبا میدان تیار کیا اور اس موقع پر حصہ لینے کے لئے گھوڑوں کو خاص طور پر سکھایا گیا تھا، عبداللہ بن عمرؓ اس دوڑ میں سب سے آگے تھے لیکن ریس (دوڑ) کے اختتام پر وہ گھوڑے کو قابو میں نہ رکھ سکے اور گھوڑا اُچک کر مسجد میں کود گیا۔[2] غالباً اس وقت مسجد نبوی میں احاطہ نہیں تھا۔

آنحضرتؐ نے رکانہ نامی ایک مشہور پہلوان کو دعوت مقابلہ دی اور اسے تین مختلف موقعوں پر پچھاڑا۔ مردانہ طاقت اور پیچ کے اس بامصرف استعمال نے علماء اور فضلاء کی ان گنت نسلوں کو اپیل

---

[1] فن تیر اندازی پر کتابچہ (نسخہ علی گڈھ) [2] مسلم۔ باب متعلق "گھوڑ دوڑ"

کیا ہوگا، اور انھوں نے کسی وقت جسمانی طاقت کے اس قسم کے مقابلوں میں ضرور حصہ لیا ہوگا، لیکن ہمارے پاس اس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت نہیں ہے۔

آنحضرتؐ اور ان کے صحابی جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے پورے طور پر ترقی یافتہ شخصیتوں کی عمدہ مثال پیش کرتے تھے، اور ان میں چند کو کامل کہا جاتا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں یہ خطاب اس شخص کو ملتا تھا جو بیک وقت شاعر، محاسب، خطاط، تیراک اور تیر انداز ہوا کرتا تھا۔ سوید بن صمت کو اسی سبب سے کامل کہا جاتا تھا۔[1]

بچوں کی تفریحیں

مدینہ کے بچوں کو کھیل کود اور سیر و تفریح کے لئے کافی وقت ملتا تھا، اور احادیث میں اکثر و بیشتر آنحضرت کی کھیلتے ہوئے بچوں کی ٹولی سے اتفاقیہ مڈبھیڑ ہو جانے کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ بچے آپ کو آتا دیکھ کر کبھی ڈر کر بھاگتے نہیں تھے، جیسا کہ وہ حضرت عمر کو دیکھ کر کیا کرتے تھے، وہ اپنے شغل کو جاری رکھتے تھے، اور جب آنحضرتؐ اور زیادہ قریب پہونچتے تھے تو ہمیشہ لطف و عنایت کے الفاظ سے ان کو مخاطب کرتے تھے۔

آپؐ میں بچوں کو گرویدہ کر لینے کے لئے بڑی ہم دردی تھی، اور آپؐ ان کی خوشی اور غم، دل چسپیوں اور کھیل کود میں شریک رہا کرتے تھے، آپؐ بچوں پر بہت مہربان ہوتے تھے جن کو کسی کام پر بھیجا جاتا تھا اور راستہ میں ان کو کھیلتے ہوئے بچوں کی کوئی ٹولی متوجہ کر لیتی تھی اور وہ بھی انھی دھما چوکڑیوں میں شامل ہو جاتے تھے

ایک مرتبہ آپؐ کے ایک ننھے سے دوست کی چڑیا کھو گئی جسے وہ پالے ہوئے تھا، آنحضرتؐ اکثر اس نقصان پر اظہار افسوس اور ہم دردی کیا کرتے تھے، ابراہیم کے قول کے مطابق صحابیوں نے بچوں کو ہر قسم کے کھیل کھیلنے اور کتے کے علاوہ ہر طرح کے جانور پالنے کی اجازت دی تھی، ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے مدینہ کے بچوں کے کھیلنے کے لئے آپ کی مسجد کے مینار سے بندھے ہوئے شیطان کی شکل میں ایک دل چسپ کھلونا پیش کرنے کا ارادہ کیا، اس قصہ سے طفولیت پر آنحضرتؐ کے مکمل اعتقاد کا انکشاف ہوتا ہے اور اس اعلیٰ اعتماد کا پتہ چلتا ہے جو آپ کو قدرت کی طرف سے ودیعت شدہ، انسانی فطرت کی معصومیت کی طاقت پر تھا۔ ہم بچہ پہ اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ شیطان سے نہ صرف مداخلت کر سکتا ہے، بلکہ اس سے چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق بھی کر سکتا ہے

---

[1] ملاحظہ ہو اصابہ مصنفہ ابن حجر آغانی جلد دوم صفحہ ۱۶۲ سد سے معنی اصطلاح "کامل"

اور اس کی فطرت اور معصومیت میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اس خیال کو عقل سے صحیح و سلامت نکال لائے۔ بچے عہدِ طفلی میں لڑکیاں اتنا ہی عجیب و غریب استعمال جب کھلونے رکھتی تھیں جتنا کسی دوسرے عہد میں حضرت عائشہ کے پاس .... کھلونوں کا ایک ڈھیر تھا اور بڑے ہونے پر جب آپ کی شادی ہوئی تو ان پیارے کھلونوں کو ایک پردے کے پیچھے چھپا دیا۔ ایک مرتبہ اتفاق سے آنحضرتؐ نے اس محبوب خزانہ کو معلوم کرلیا اور کھلونوں میں ایک گھوڑا پایا جس کے پر تھے۔ آپؐ نے پوچھا کیا گھوڑے کے پر ہوتے ہیں؟ حضرت عائشہ رض نے جواب دیا ہاں میں نے سنا ہے کہ حضرت سلیمان کے گھوڑے کے پر تھے اس پر آنحضرت قہقہہ لگا کر ہنسے [1] اس حدیث سے اسلامی نظامِ تعلیم میں تعلیمی مواد کی ترتیب پر روشنی پڑتی ہے۔

طریقِ تعلیم

زرنوجی جیسے مستند اصحاب کام اور کھیل کے درمیان ایک ہم آہنگ توازن قائم رکھنے اور ضرورت سے زیادہ محنت مشقت کو جس سے طالب علم کی صحت برباد ہو رد کرنے کی تاکید میں ایک مشہور حدیث نقل کرتے ہیں جو یوں ہے: "بلاشبہ ہمیں مذہبی امور میں مہربانی اور ضبط و صبر سے کام لینا چاہئے، اور ریاضت و عبادت کے دوران میں اپنے نفس کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ تمہارا نفس بوجھ اٹھانے والا جانور ہے جس پر دورانِ سفر میں اگر اتنا سوار ہوئے کہ وہ مر گیا تو پھر وہ سفر کے اختتام کو نہ پہونچ سکے گا۔" [2]

بخاری میں ایک حدیث ہے جس میں توجہ کے اصولوں اور کسی خاص قسم کے دماغی کام کے مسلسل کرنے کے بعد تنوعِ مشاغل کی ضرورت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ قرآن کو اتنی دیر تک پڑھو جب تک تمہارا دل اس کے پڑھنے میں لگے، جب تلاوت سے تھک جاؤ تو تمہیں چاہئے کہ اسے روک دو اور کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی کردو [3]

صحابہ کرام کی عادت تھی کہ جب کسی خاص موضوع پر مطالعہ کرتے کرتے تھک جاتے تو دوسرے موضوع کو لے لیتے اور اس طرح ذہنی مصروفیات میں تنوع رکھتے تھے۔ ابن عباس جب کلام پڑھتے پڑھتے تھک

---

[1] ابی داؤد جلد اول صفحہ ۳۱۹

[2] زرنوجی صفحہ ۱۳

[3] بخاری

تو شاعرانہ تصنیفات منگاتے تھے ۔ [1]

آنحضرت اس اصول کو مضامینِ مطالعہ کے معاملہ میں ہی نہیں برتتے تھے بلکہ اس کو اپنے خطبات اور تبلیغ کے پروگرام بناتے وقت بھی مدنظر رکھتے تھے۔ عبداللہ بن مسعود کے قول کے مطابق آپ منبر پر سنجیدہ صورت اور مرعوب کن نہیں دکھائی دیتے تھے، بلکہ بعض اوقات افادۂ اخلاق پر وعظ بیان کرنے کے دوران میں لطائف وظرائف بھی استعمال کرتے تھے اور لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتے تاکہ وہ تھکن نہ محسوس کریں اور اس موضوع سے ان کی دلچسپی ختم نہ ہو۔

اس مقصد کے لئے آپ نے ہفتہ کے مخصوص دن متعین کئے تھے جن میں آپ اجتماع کو خطاب کیا کرتے تھے اور ابن مسعود نے بھی آپ کی تقلید کی، وہ ہفتہ میں ایک بار وعظ کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ جب سامعین میں سے ایک شخص نے روزانہ ایک وعظ کرنے پر اصرار کیا تو ابن مسعود نے (اس تجویز پر) احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے مواعظ کو سامعین پر بار نہیں کرنا چاہتے اور یہ کہ وہ ایسا آنحضرت کی تقلید میں کرتے تھے ابن مسعود کے قول کے مطابق آنحضرتؐ وقت کے مسئلہ کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے، اور سامعین میں بے چینی پیدا ہونے کو ناپسند کرتے تھے۔

آپ ہمیشہ اس کا بہت خیال رکھتے تھے کہ سچائی کا جو بیج دور دور تک بو رہے تھے وہ زرخیز زمین پر گرے۔ جہاں اس کا پودا پوری آب وتاب کے ساتھ اُگ کر نکلے ، آپ ہدایت کرتے ہیں کہ استاد کو چاہیئے کہ اپنے شاگرد کی صلاحیتوں کو دریافت کریں اور معلوم کریں کہ وہ کس حد تک اخلاقی اور ذہنی اثرات قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے" جو شخص کسی ایسے علوم کو پیش کرتا ہے جو اس کا اہل نہیں ہے وہ گویا کسی خنزیر کی گردن میں ہیرے، موتی اور سونے کا بنا ہوا ہار ڈالتا ہے [2]

لیکن ایک بار جب آپ کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ کسی طالب علم میں حصول علم اور اخلاقی ترقی کا صحیح جذبہ اور ولولہ پایا جاتا ہے تو آپ اس کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہونچانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں

[1] بخاری حصہ اول صفحہ ۵۸

[2] ملاحظہ ہو مشکوٰۃ اور ابن ماجہ

ابتدائی منزل میں احادیث کی نقل کرنے کی ممانعت کردی گئی تھی۔ تاکہ متن قرآنی کی صحت کو کوئی صدمہ پہونچے، اور اس کے اور احادیث کے درمیان خلط مبحث پیدا نہ ہو۔ لیکن بعد کو اس سلسلہ میں کافی رعایات کی گئیں اور ایک مرتبہ ایک شخص آنحضرت سے ملنے آیا اور اپنی قوت حافظہ کی خرابی کی شکایت کی تو آپ نے اس کو اپنا داہنا ہاتھ استعمال کرنے کا مشورہ دیا اور ایک اشارہ کیا جس کا مطلب فن تحریر سے تھا۔[1]

تعلیم بذریعہ تقریر

آنحضرت نے مختلف موقعوں پر منبر پر یا اس سے الگ جو خطبات دیئے ہیں ان کی زبان سادہ غیر مبہم اور پر زور ہے، تخیلات اعلیٰ تصورات عالمگیر حقائق اور ٹھوس حالتوں کی واقفیت کا ایک خوش گوار مجموعہ ہیں، وہ خطابت کے پر تکلف لوازمات سے آراستہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں اول تا آخر دیئے ہوئے روحانی جوش و ضبط و صبر کی لہر دوڑی ہوئی ہے۔

جہاں تک تاثر اور افادہ روحانی کا تعلق ہے، کوئی شخص بھی اس طاقتور ہتھیار سے اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ آپ نے بذات خود اس امر کا دعویٰ کیا کہ آپ تمام عربوں میں سب سے زیادہ خوش بیان تھے اور یہ کہ آپ کی تقریر سب سے زیادہ جامع اور محیط تھی، آپ کا یہ دعویٰ بالکل حق بجانب تھا۔ آپ قبیلہ قریش کے رکن تھے اور ابتدائی تربیت بنو سعد کے درمیان پائی جو تمام ملک میں ماہرین زبان کی حیثیت سے مشہور تھے۔

آپ کے خطبات کے طرز بیان اور تکنیک (TECHNIQUE) کا بڑی ہوشیاری سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے، اس لئے نہیں کہ وہ ادبی شاہکار ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ آپ کے بعد اساتذہ اور مبلغین کی آنے والی پوری نسل کے طرز بیان کی اصلاح کے لئے ایک زبردست قوت کا کام کرتے ہیں، استاد اور مقرر کے لئے اہم ترین مسئلہ سامعین کی توجہ (اپنی طرف) مبذول کرنا ہے اور آنحضرت ان (سامعین) کو کوئی ندائیہ لفظ بول کر یا کوئی سوال پیش کرکے چونکا دیتے تھے، آپ کوہ صفا پر جب روح کو چونکا دینے والے خطبات دیتے تھے تو ان کا آغاز یا صباحنہ! کی ندا سے کرتے تھے، یہ فقرہ اس وقت استعمال کیا جاتا تھا جب علی الصباح کسی قبیلہ پر اچانک حملہ بول دیا جاتا تھا اور واقعتاً اس زمانہ میں پورا عرب بد نظمی اور جہالت کے

---

[1] ترمذی

جنگل میں پھنسا ہوا تھا اور یہ ایک ایسی مصیبت تھی جو لفیٹا کسی ہمسایہ قبیلہ کے حملہ سے زیادہ تباہ کن تھی جب سامعین میں استعجاب پیدا ہو جاتا تو آپ دریافت فرماتے کہ آیا وہ (آنحضرتؐ) ان (سامعین) کو بتائیں کہ کون سا دشمن ہے جو ہر صبح اور شام انھیں نقصان پہونچا تا رہتا ہے۔

بعض اوقات آپ کا خطبہ مقابلہ طلب (CHALLENG ING) سوال سے شروع ہوتا جنین کے میدان جنگ میں آپ نے جو خطبہ دیا تھا وہ سورہ والضحیٰ کے سوالات کے حسین مجموعہ سے ملتا جلتا ہے۔ آپ نے یوں شروع کیا۔ اے انصار کے لوگو! (بتاؤ) کیا میں نے تمہیں (خدا کی) راہ سے بھٹکتا ہوا نہیں پایا اور خدا نے میرے ذریعہ تم پر رحمت کی۔ اور سامعین نے جواب میں کہا" بلا شبہ رسول اللہ محافظ حق ہیں"۔ آپ نے خطبہ جاری رکھتے ہوئے اسی لہجہ میں مسلسل سوالات کئے اور ہر مرتبہ سامعین نے ایک "ہاں" کے ساتھ آپ کو مرحبا کہا، لیکن اس عروج کے بعد زوال آیا۔ اثباتی استفسارات کے بعد منفی سوالات کی باری آئی۔ سامعین کی اس قابل احترام خاموش اطاعت میں جوش و ولولہ پیدا کرتے ہوئے آپ نے پر جوش الفاظ میں کہا۔ لیکن یہ کیوں نہیں کہتے تم اپنے گھروں سے پناہ گیر کی حیثیت سے ہمارے پاس آئے اور ہم نے تمہیں پناہ دی۔ تم کو ضرورت تھی اور ہم تم پر مہربان ہوئے۔ تمہارا کوئی دوست نہ تھا۔ ہم نے تمہیں دوست بنایا"۔

اس عظیم الشان تقریر کو ختم کرتے ہوئے آپ نے سامعین سے جو زمین کی تقسیم سے غیر مطمئن تھے ایک اپیل کی اور ایک مرتبہ پھر ایک آخری سوال کیا جس نے پورے مسئلہ کو حل کر دیا، آپ کہتے ہیں" کیا تم اس کو ترجیح نہیں دوگے کہ دوسروں کے حصہ میں اونٹ اور بکریاں آئیں تمہارے حصے میں رسول خدا"۔

مقرر کے ہاتھ میں ایک ناقابل تسخیر ہتھیار اس کا چند الفاظ یا فقروں کو منصفانہ طور پر بار بار دہرانا ہوتا ہے۔ اور آنحضرتؐ اس ہتھیار کو بہت موثر طور سے استعمال کر سکتے تھے۔ آپ نے آخری صبح کے موقع پر جو خطبہ دیا تھا وہ اس طریقہ استفہام سے ہم آہنگ تکنیک کی ایک اعلیٰ مثال تھی۔ آپ کے خطبات تصنع اور ٹھونس ٹھانس کی نشانی پر مشتمل نہ ہوتے تھے، بلکہ خیال اور اظہار کی موزونیت کے داخلی تقاضے کی عملی شکل تھے، اور جن کا لب و لہجہ سامعین کے لب و لہجہ سے ہم آہنگ ہوتا تھا، اس تدریجی تکرار اور استفسار کا

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقرر اور سامعین تجربات میں برابر کے شریک ہو جاتے ہیں۔ ایک برمحل سوال اور سامعین کی طرف سے اس کا جواب جذباتی اور روحانی رشتوں کا برابر ایک جال سا بنتے رہتے ہیں جس سے ہم دردی اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا ماحول پیدا ہونے میں مدد ملتی ہے

آپ کے چند اقوال (REMARKS) خوبصورتی سے نبھائے ہوئے جذبات اور سادہ و پُر عظمت حسن و بیان میں آپ اپنی مثال ہیں۔ آپ کے بیٹے ابراہیم کی وفات پر امید کی جاتی تھی کہ آپ کوئی تعزیتی خطبہ دیں گے لیکن یہ غم اتنا زبردست تھا کہ آپ اس سے قاصر رہے جب ایک صحابی نے آپ کے زار و قطار آنسوؤں پر کچھ حاشیہ زنی کی تو آپ بولے "آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور دل رنج و غم سے بھرا ہوا ہے اور ہم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہتے کہ ہم نے مشیت ایزدی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ اور اے ابراہیم ہم یقیناً تیرے غم میں دل فگار ہیں"

اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں آپ نے نہ صرف الفاظ سے بلکہ اپنی پوری شخصیت سے کام لیا ہے، عبداللہ بن عمرؓ کے قول کے مطابق ایک مرتبہ آپ اپنے وعظ میں کہ کس طرح خدا زمین و آسمان کو اپنی جلیل القدر گرفت میں لئے ہوئے ہے آپ نے اپنی مٹھی بند کی اور پھر کھول دی اور اس اثنا میں آپ کا پورا جسم ایک طرف سے دوسری طرف جھوم گیا، اور آپ کے نیچے منبر تھرا اٹھا بعض اوقات آپ پڑھتے ہوئے روحانی جوش و خروش سے اتنا متاثر ہوتے کہ ایک ہی فقرے کو ایک سے زائد بار دہراتے اور دوران تقریر میں ایک فصیح و قفہ کرتے یہ محض ایک خطیبانہ انداز نہ ہوتا بلکہ اظہار ہوتا اس موزونیت کا جو آپؐ کی حیات داخلی کو منضبط کرتی ہے۔

آپ کے خلوت میں تبادلہ خیالات کرنے کا طریقہ اور راستے یا مسجد میں مل جانے والے اشخاص کے ساتھ روزمرہ کی گفتگو آپ کی رسمی تقریروں کے مقابلہ میں استاد کے لئے کہیں زیادہ تعلیمی قدر و قیمت کی حامل ہیں آپ کے ارشادات انتہائی لطیفہ دار ہوتے تھے۔ الفاظ اور فقروں کو خوش گوار اور شاندار طور پر جوڑنے میں آپ کو جو مہارت تھی اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، الفاظ اور فقروں کی قافیہ بندی، خیال اور تصور کی موزونیت اور موازنہ و مقابلہ کا استعمال چند باتیں ایسی تھیں جن سے الفاظ بار بار کانوں میں پڑنے والی

موسیقی کی طرح حافظہ میں محفوظ ہو جاتے تھے، اور آپ کا طریقہ اظہار حافظے پر ایک دائمی نقش چھوڑ دیتا تھا۔ آپ کے سالہا سال بعد بھی صحابہ اس انداز اور طرز کا صحیح تصور قائم کر سکتے تھے جس میں آنحضرت نے کوئی خاص حدیث بیان کی تھی۔

ایک مرتبہ آپ بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک قصہ بیان کر رہے تھے جس کے دوران میں آپ نے بتایا کہ کس طرح ایک ماں، اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی، ابوہریرہؓ نے بعد میں (اسی واقعہ سے متعلق) حدیث بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس وقت بھی آنحضرت کا تصور ذہن میں لا سکتے تھے، اس طرح کہ آپ اپنی انگلی چوس رہے ہوں: تکنیک (اصول فن) سکھانے کا آپ کو ایک وجدانی علم تھا۔

آپ غیر مرئی اور خیالی چیزوں کی تشریح ٹھوس چیزوں کی مدد سے کرتے تھے، پیچیدہ باتوں کو سادہ باتوں کی مدد سے سمجھاتے تھے، آپ کسی خیال کو سامعین کے دل نشین کرانے کے لئے اکثر ہاتھ اور انگلیاں کام میں لاتے تھے، یہ طریقہ مخصوص تشریح کا کام کرتا تھا، آپ کو جب بہت زیادہ قربت ظاہر کرنا ہوتی تو درمیانی انگلی اور انگوٹھے سے ملی ہوئی انگلی (شہادت کی انگلی) کی قربت کی مثال دیتے۔

ایک مرتبہ آپ نے مسلمانوں کو ایک عمارت کی بنیاد (نیو) کے پتھروں سے تشبیہ دی جو ایک دوسرے کو سہارا دے کر مضبوط بناتے ہیں۔ آپ نے اس چیز کو مثال سے واضح کرنے کے لئے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان رکھا۔

بعض اوقات آپ کسی نکتہ کو نقشہ یا شکل بنا کر واضح کرتے۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک چوکور شکل بنائی اور اس کے درمیان سے ہو کر ایک سیدھی لکیر کھینچی جو مربع کے باہر تک جاتی تھی، پھر آپ نے اس مربع کے اندر متعدد چھوٹی چھوٹی لکیریں کھینچیں اور ان کے درمیان سے ہو کر لکیریں۔ جیسا کہ آپ نے بتایا پورا نقشہ انسانی قسمت کو پیش کرتا تھا، مربع موت کی علامت تھا، مربع سے ہو کر جو لکیر کھینچی تھی، انسان کی امیدیں اور چھوٹی لکیریں مصائب کو پیش کرتی تھیں۔

اخلاقی تعلیم دینے کے لئے آپ کسی صورت حال کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ سادہ اور بلاواسطہ استدلال ٹھوس صورت حال سے ملا کر پورا کام کرتے تھے اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوتا تھا، ایک مرتبہ آپ بکری کے

نتیجہ یہ ہے کہ مقرر اور سامعین تجربات میں برابر کے شریک ہو جاتے ہیں۔ ایک برمحل سوال اور سامعین کی طرف سے اس کا جواب جذباتی اور روحانی رشتوں کا برابر ایک جال سا بنتے رہتے ہیں جس سے ہم دوری اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا ماحول پیدا ہونے میں مدد ملتی ہے

آپ کے چند اقوال (REMARKS) خوبصورتی سے نبھائے ہوئے جذبات اور سادہ دیگر عظمت حسن و بیان میں آپ اپنی مثال ہیں۔ آپ کے بیٹے ابراہیم کی وفات پر امید کی جاتی تھی کہ آپ کوئی تعزیتی خطبہ دیں گے لیکن یہ غم اتنا زبردست تھا کہ آپ اس سے قاصر رہے جب ایک صحابی نے آپ کے زار و قطار آنسوؤں پر کچھ حاشیہ زنی کی تو آپ بولے "آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور دل رنج و غم سے بھرا ہوا ہے اور ہم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہتے کہ ہم نے مشیت ایزدی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ اور اے ابراہیم ہم یقیناً تیرے غم میں دل فگار ہیں"

اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں آپ نے نہ صرف الفاظ سے بلکہ اپنی پوری شخصیت سے کام لیا ہے، عبداللہ بن عمرؓ کے قول کے مطابق ایک مرتبہ آپ اپنے وعظ میں کہ کس طرح خدا زمین و آسمان کو اپنی جلیل القدر گرفت میں لئے ہوئے ہے آپ نے اپنی مٹھی بند کی اور پھر کھول دی اور اس اثنا میں آپ کا پورا جسم ایک طرف سے دوسری طرف جھوم گیا، اور آپ کے نیچے منبر تھرا اٹھا بعض اوقات آپ پڑھتے ہوئے روحانی جوش و خروش سے اتنا متاثر ہوتے کہ ایک ہی فقرے کو ایک سے زائد بار دہراتے اور دوران تقریر میں ایک فصیح و فقرہ کہتے یہ محض ایک خطیبانہ انداز نہ ہوتا بلکہ اظہار ہوتا اس موزونیت کا جو آپ کی حیات داخلی کو منضبط کرتی ہے۔

آپ کے خلوت میں تبادلہ خیالات کرنے کا طریقہ اور راستے یا مسجد میں مل جانے والے اشخاص کے ساتھ روزمرہ کی گفتگو آپ کی رسمی تقریروں کے مقابلہ میں استاد کے لئے کہیں زیادہ تعلیمی قدر و قیمت کی حامل ہیں آپ کے ارشادات انتہائی لطیفہ دار ہوتے تھے۔ الفاظ اور فقروں کو خوش گوار اور نشاندار طور پر موڑنے میں آپ کو جو مہارت تھی اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، الفاظ اور فقروں کی قافیہ بندی، خیال اور تصور کی موزونیت اور موازنہ و مقابلہ کا استعمال چند باتیں ایسی تھیں جن سے الفاظ بار بار کانوں میں پڑنے والی

دوستی کی طرح حافظہ میں محفوظ ہو جاتے تھے، اور آپ کا طریقہ اظہار دماغ پر ایک دائمی نقش چھوڑتا تھا، آپ کے سالہا سال بعد بھی صحابہ اس انداز اور طرز کا صحیح تصور قائم کر سکتے تھے جس میں آنحضرت نے کوئی خاص حدیث بیان کی تھی۔

ایک مرتبہ آپ بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک قصہ بیان کر رہے تھے (جس کے دوران میں) آپ نے بتایا کہ کس طرح ایک ماں اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی، ابوہریرہؓ نے بعد میں (اسی واقعہ سے متعلق) حدیث بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس وقت بھی آنحضرت کا تصور ذہن میں لا سکتے تھے، اس طرح کہ آپ اپنی انگلی چوس رہے ہوں: تکنیک (اصول فن) سکھانے کا آپ کو ایک وجدانی علم تھا۔

آپ غیر مرئی اور خیالی چیزوں کی تشریح ٹھوس چیزوں کی مدد سے کرتے تھے، پیچیدہ باتوں کو سادہ باتوں کی مدد سے سمجھاتے تھے، آپ کسی خیال کو سامعین کے دل نشین کرانے کے لئے اکثر ہاتھ اور انگلیاں کام میں لاتے تھے، یہ طریقہ مخصوص تشریح کا کام کرتا تھا، آپ کو جب بہت زیادہ قربت ظاہر کرنا ہوتی تو درمیانی انگلی اور انگوٹھے سے ملی ہوئی انگلی (شہادت کی انگلی) کی قربت کی مثال دیتے۔

ایک مرتبہ آپ نے مسلمانوں کو ایک عمارت کی بنیاد (نیو) کے پتھروں سے تشبیہ دی جو ایک دوسرے کو سہارا دے کر مضبوط بناتے ہیں۔ آپ نے اس چیز کو مثال سے واضح کرنے کے لئے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان رکھا۔

بعض اوقات آپ کسی نکتہ کو نقشہ یا شکل بنا کر واضح کرتے، ایک مرتبہ آپ نے ایک چوکور شکل بنائی اور اس کے درمیان سے ہو کر ایک سیدھی لکیر کھینچی جو مربع کے باہر تک جاتی تھی، پھر آپ نے اس مربع کے متعدد چھوٹی چھوٹی لکیریں کھینچیں اور ان کے درمیان سے ہو کر لکیریں۔ جیسا کہ آپ نے بتایا پورا نقشہ انسانی قسمت کو پیش کرتا تھا، مربع موت کی علامت تھا، مربع سے ہو کر جو لکیر کھینچی تھی، انسان کی امیدوں اور چھوٹی لکیریں مصائب کو پیش کرتی تھیں۔

اخلاقی تعلیم دینے کے لئے آپ کسی صورت حال کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ سادہ اور براہ راست مثال ٹھوس صورت حال سے ملا کر پورا کام کرتے تھے اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوتا تھا، ایک مرتبہ آپ بکری کے

...کی لاش کے قریب سے گذرے اور دریافت کیا کہ آیا کوئی شخص اس کو کسی قیمت پر خرید سکتا تھا نفی میں جواب ملنے پر آپ نے کہا کہ خدا کی نگاہ میں دنیاوی مال و دولت اس بھیڑ کی لاش سے زیادہ قابل نفرت ہیں۔ ایک مرتبہ ایک قیدی عورت آپ کے حضور میں لائی گئی جس کی چھاتیاں دودھ سے بھری ہوئی تھیں اس نے اجتماع میں سے ایک بچے کو لے کر چھاتی سے لگا لیا اور اسے دودھ پلایا، آنحضرت اس نظارہ سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے صحابیوں سے پوچھا "آیا وہ عورت اپنے بچے کو آگ میں پھینک سکتی ہے " جواب ملا "کبھی نہیں" تب آنحضرت نے کہا بلا شبہ خدا اپنی مخلوق سے اس عورت کے مقابلہ میں زیادہ شفقت رکھتا ہے۔"

بعض اوقات آپ کسی سبق کو دل نشیں کرانے کے لئے جو طریقہ اختیار کرتے تھے، اسے نظریۂ نتائج فطری (DOCTRINE OF NATURAL CONSEQUENCES) کے عملی مظاہرہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے آنحضرت نے ایک سے زائد بار اس امر پر زور دیا تھا کہ رات کو سونے وقت روشنی یا آگ گل کر لینا چاہیئے ایک مرتبہ آپ ایک چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک چوہا چپکے سے آیا اور کمرے میں جلتے ہوئے چراغ کی بتی گھسیٹ لے گیا۔ نوکرانی نے شور و غل مچایا لیکن آپ نے اس کو ہدایت کی کہ خاموش رہے اور نتائج کا مشاہدہ کرے۔ چوہا جس چٹائی پر آپ بیٹھے ہوئے تھے اس پر بتی چھوڑ کر بھاگ گیا جس سے چٹائی کا ایک حصہ جل گیا، اس عملی مظاہرہ کے بعد ہی آپ نے مشورہ دیا کہ رات کو سونے سے قبل چراغ گل کر دینا چاہیئے۔

آپ جو تشبیہات اور صنائع استعمال کرتے تھے وہ خطابت سے تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ مطالب کو واضح کرنے کے لئے ایک لازمی آلہ کار کی حیثیت سے استعمال ہوتے تھے اور اس لئے سامعین کی ذہنی سطح کے مطابق رکھے جاتے تھے، شعراء ان تشبیہات اور صنائع کو اس بنا پر استعمال کرتے ہیں کہ ان میں تصورات اور جذبات کی فراوانی ہے، لیکن احادیث میں یہ ایک غیر مرئی صفت کی کبھی صفاتی اور کبھی مقداری نسبت کے تعین کی غرض سے استعمال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ آپ نے خود کو ایک عظیم الشان عمارت کے چوٹی کے پتھر سے تشبیہ دی جس کے بغیر پوری عمارت کا نقشہ مکمل نہیں ہوتا۔

ایک دوسرے موقع پر آپ نے عوام کے چار طبقات کو چار قسم کے پھلوں سے تشبیہ دی۔ وہ صاحبِ ایمان جو قرآن کو پڑھتا ہے اور پھر اس پر عمل کرتا ہے نارنگی سے مشابہ ہے جو سونگھنے میں خوشبودار اور ذائقے میں خوشگوار ہوتی ہے۔ وہ صاحبِ ایمان جو قرآن کی باتوں پر عمل کرتا ہے لیکن اس کو پڑھتا نہیں، کھجور کی طرح ہے جو ذائقہ میں تو لذیذ ہوتی ہے لیکن اس میں کوئی خوشبو نہیں ہوتی۔ وہ ریاکار جو قرآن پڑھتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا، میٹھے بلسان کے پھل کی طرح ہے جس کی خوشبو تو اچھی ہوتی ہے لیکن ذائقہ میں کڑوا ہوتا ہے۔ اور وہ ریاکار جو قرآن کو نہ تو پڑھتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے، خیار تلخ ہے جس کا ذائقہ تلخ ہوتا ہے اور خوشبو اس سے بھی بدتر۔

آپؐ سے اکثر غیر متعلق سوالات کئے جاتے تھے لیکن آپ ان کا جواب بہت صبر و تحمل کے ساتھ دیتے تھے۔ بعض اوقات لوگ آپ کے احساسِ ظرافت کو ابھار دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک بدو اونٹ پر سوار ہو کر آیا اور آپ سے ایک غیر متعلق سوال کیا۔ آنحضرت نے صبر کے ساتھ اس کو سنا اور جب وہ چلا گیا تو کہا میں نہیں جانتا تھا کہ سوار اور سواری میں کون سا زیادہ بھدا ہوا تھا۔

ترکیہ میں تعلیم

فضل احمد

تاریخی پس منظر

پاکستانی مسلمانوں کو یوں تو تمام اسلامی ملکوں کے ساتھ گہری ہم دردی ہے لیکن ترکوں کے ساتھ انھیں بہت کچھ جذباتی لگاؤ بھی ہے، کیوں کہ ہماری تحریک آزادی میں خلافت کی تحریک کو سنگ میل کا درجہ حاصل ہے، ہمارے بہت سے قومی رہ نماؤں نے اس تحریک میں پہلی بار سیاسی جدوجہد کا تجربہ حاصل کیا اور یہ پہلا موقع تھا، جب ہندی مسلمانوں نے عہد انگریزی میں ایک مشترکہ مقصد کے لیے عوامی جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔ تاریخ کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ہندی مسلمانوں نے خلافت کا بوجھ جن کندھوں پر رکھنا چاہا تھا انھوں نے اپنی معذوری کا اظہار کیا اور اس طرح گو خلافت تو زندہ نہ رہ سکی تاہم ہندی مسلمانوں کے سیاسی شعور میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا اور انھیں عالم اسلام کے ساتھ زیادہ دل چسپی پیدا ہو گئی۔

ایشیائے کوچک دنیا کے ان خطوں میں سے ہے جہاں بے شمار انسانی تہذیبوں نے جنم لیا، اناطولیہ آج جن انمول تاریخی آثار کا مدفن ہے، ان میں سے بعض چھ ہزار سال پرانے ہیں، عثمانی ترکوں نے چودھویں صدی عیسوی میں عباسی حکومت کے کھنڈروں پر اپنی حکمرانی کی بنیاد رکھی۔ ۱۳۴۰ء تک سارا اناطولیہ ان کے قبضے میں آ چکا تھا اور اس صدی کے خاتمے سے پہلے بلقان میں پیش قدمی شروع ہو چکی تھی۔ امیر تیمور نے اناطولیہ کو فتح کر کے اس پیش قدمی کو وقتی طور پر روک دیا، مگر اس کے مرنے کی دیر تھی کہ عثمانی ترکوں نے سلطنت کی توسیع کے کام کو پھر سے جاری کر دیا۔ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر ہلالی پرچم لہرانے لگا اور عثمانی سلطنت کی حدود وسطی ہنگری تک پھیل گئیں، ایشیا اور افریقہ کے وسیع خطے بھی اس

قلمرو میں شامل تھے حتیٰ کہ سولھویں صدی میں سلطان سلیمان اعظم کے زمانے میں عثمانی سلطنت اپنے انتہائی عروج کو پہونچ گئی۔ پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں کئی بار آسٹریا کے ساتھ لڑائیاں ہوئیں اور دو دفعہ اس کے پایۂ تخت وائنا کا محاصرہ کیا گیا۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں اس عظیم الشان سلطنت میں کمزوری کی علامتیں پیدا ہونے لگیں۔ انیسویں صدی میں یہ ضعف اس قدر نمایاں ہو گیا کہ یورپی حریفوں کو اپنی پرانی آرزوئیں پوری کرنے کا موقع ملا، روس اور آسٹریا نے کئی علاقے دبا لئے۔ سربیا۔ یونان اور رومانیا خود مختار ہو گئے، الجیریا فرانس نے ہتھیا لیا اور قبرص برطانیہ نے اور اسلام کا یہ بازوئے شمشیر زن یورپ کا مرد بیمار بن کر رہ گیا۔ ملک کی انتظامی اور مالی حالت تباہ ہو رہی تھی اور ملک کے اندر اور باہر چاروں طرف دشمنوں کی سازشوں کے جال بچھے تھے، نوجوان وطن پرست ترکوں نے ہر چند کوشش کی کہ آئینی اصلاحات کی مدد سے ملک کی بگڑی کو سنواریں مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔

پہلی جنگ عظیم میں ترکیہ نے جرمنی کا ساتھ دیا اور جب شکست کھائی تو یورپ کے اس مرد بیمار کی موت کا اعلان کر دیا گیا اور اس کی قبر کھودنے کے لئے یونانی یورپ کے اس مرد بیمار کی موت کا اعلان کر دیا گیا اور اس کی قبر کھودنے کے لئے یونانی گورکنوں کو مقرر کیا گیا۔ لیکن اس مردے کی خاک سے ایک نئی ترکیہ نے جنم لیا جس نے نہ صرف یونانیوں کو مار بھگایا بلکہ ۱۹۲۳ء میں دوست و دشمن سب سے اپنے وجود کا اعتراف کروا لیا۔ ۱۹۳۰ء تک جمہوریہ ترکیہ کو ایک مستقل ملت کا مقام حاصل ہو چکا تھا، اس کی آزاد خود مختار ہستی کا سب سے بڑا ثبوت غالباً یہ ہے کہ گو یہ ملت درہ دانیال جیسے اہم فوجی مقام کی امین ہے تاہم دوسری عالمگیر جنگ میں متحارب فریقوں میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ اس کی غیر جانب داری پر جارحانہ حملہ کرے

جمہوریہ ترکیہ اناطولیہ اور تھریس پر مشتمل ہے، اول الذکر ایشیا میں ہے اور موخر الذکر یورپ میں۔ تھریس کا رقبہ ۲۳۴۸۵ مربع کیلومیٹر ہے اور اناطولیہ کا ۷۴۳۶۳۴ مربع کیلومیٹر ہے ۱۹۲۸ء کے اندازے کے مطابق ملک کی کل آبادی ایک کروڑ پچانوے لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔ انقرہ اگرچہ دار الخلافہ ہے۔ مگر اس کی

آبادی کوئی سوا دو لاکھ ہے، جب کہ استنبول کی آبادی تقریباً ساڑھے آٹھ لاکھ ہے۔

تعلیمی ترقی

جمہوریہ ترکیہ کا سب سے اہم کارنامہ ملک کی تعلیمی ترقی ہے، عثمانی سلطنت کے زمانے میں تعلیمی سہولتیں بالکل برائے نام تھیں۔ جدید تعلیم کے لئے خاص طور پر کوئی منظم سرکاری نظام موجود نہ تھا۔ آج ترکیہ کی قصباتی آبادی میں نوے فی صدی لوگ پڑھے لکھے ہیں، دیہات میں یہ تناسب گو ابھی بہت کم ہے۔ تاہم ناخواندگی کو دور کرنے کے لئے سرتوڑ کوششیں جاری ہیں۔ سات سے بارہ برس کی درمیانی عمر کے تمام بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم مفت اور جبری ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ملک بھر میں کوئی پچیس لاکھ بچے ایسے تھے جنھیں مدرسے میں ہونا چاہئے تھا۔ ان میں سے صرف ۱۷ لاکھ ۲۱ ہزار بچے مدرسوں میں پڑھ رہے تھے۔

اشاعت تعلیم کے بارے میں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جمہوریہ کے پہلے صدر مصطفےٰ کمال نے اس معاملے میں ذاتی دلچسپی لی تھی، چناں چہ ۱۹۲۸ء میں موصوف کی خواہش پر عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم الخط کو لازمی قرار دیا گیا۔ ترکی زبان گو ایک مشرقی زبان ہے اور اس کا سارا ادبی ذخیرہ عربی رسم الخط میں محفوظ ہے۔ تاہم آج حکومت اور تعلیم بلکہ ملک کی ساری زندگی میں لاطینی رسم الخط سے ہی کام لیا جا رہا ہے، اس رسم الخط کے بارے میں خواہ اور کچھ ہی کہا جائے بہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ اس سے مبتدی کا کام بہت کچھ سہل ہو جاتا ہے۔ مصطفےٰ کمال کو اس تبدیلی کی اس قدر دھن تھی کہ خود چاک اور تختۂ سیاہ کی مدد سے جگہ جگہ اس کے نا مکرے لوگوں کو سمجھاتے، اس ضمن میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ گو ترکیہ نے لاطینی رسم الخط کو اپنایا ہے، اس نے اپنی قومی زبان کو نہیں چھوڑا۔ سرکاری اور تعلیمی زبان ترکی ہی ہے، اور اعلیٰ تعلیمی اور ٹیکنیکل اداروں میں جہاں موزوں علمی قابلیت کے ترک استاد نہیں ملتے وہاں ایسے غیر ملکی اساتذہ کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جو ترکی زبان میں پڑھا سکیں اگر کسی خاص صورت میں یہ بھی ممکن نہ ہو تو ایسے غیر ملکی استاد کے ساتھ ایک ترجمان مقرر کر دیا جاتا ہے جو اس کا مطلب طلبہ کو سمجھاتا جاتا ہے، یہ نہیں کہ بچارے طلبہ کو اس کی زبان سیکھنے پر مجبور کیا جائے ترکیہ کا یہ طریق کار پاکستان کے لئے بہت بڑا سبق رکھتا ہے، اس عام تمہید کے بعد اب ہم نظام تعلیم کے

مختلف مدارج پر نگاہ ڈالیں گے۔

ابتدائی تعلیم جمہوریہ کے سامنے سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ قصباتی اور دیہاتی علاقوں میں جلد از جلد ابتدائی مدرسے قائم کرے، ان مدرسوں کے لئے عمارتیں۔ سامان اور استاد فراہم کرنا ضروری تھا استادوں کی مناسب تربیت کا بندوبست بھی کرنا تھا۔ دیہاتیوں کو اس قابل بنانا تھا کہ وہ مہیا کردہ تعلیم سے اپنے روزمرہ کے کام کاج میں مدد دے سکیں جن لوگوں کو چھوٹی عمر میں تعلیم نہ مل سکی تھی۔ انھیں بھی علم حاصل کرنے کے لئے مواقع بہم پہونچانے ضروری تھے، اسی طرح ان میانے بالغوں کے لئے مرکز قائم کرنا جو تعلیم سے بالکل کورے تھے، ان اغراض کو حاصل کرنے کے لئے دو قسم کے ابتدائی مدرسے جاری کئے گئے۔

(ا) ایسے مدرسے جہاں تربیت یافتہ استاد پڑھاتے ہیں۔

(ب) ایسے مدرسے جہاں دیہاتی معلم کام کرتے ہیں۔

ابتدائی مدرسے کا معلم بننے کے لئے ضروری ہے کہ مڈل درجے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد تین سالہ تربیت حاصل کی جائے، گویا ترکیہ اس معاملے میں ہماری نسبت زیادہ محتاط ہے۔ ہمارے ہاں مڈل پاس کرنے کے بعد صرف ایک سال کی تربیت کافی سمجھی جاتی ہے

چوں کہ دیہاتی اور قصباتی زندگی کا ماحول بالکل الگ الگ ہے۔ اس لئے دونوں قسموں کے مدرسوں کے لئے جداگانہ طریقہائے کار اور جداگانہ نصاب مقرر ہیں، یہ اختلاف نہ صرف نصاب مطالعہ میں ہی نظر آتا ہے بلکہ نظام مدرسہ میں بھی۔

قصباتی مدرسے تمام کے تمام ایسے ہیں جہاں تربیت یافتہ استاد کام کرتے ہیں۔ یہ مدرسے سرکاری بھی ہیں اور غیر سرکاری بھی، آخری صورت میں ان کے چلانے والے بعض افراد یا جماعتیں ہیں۔ مڈل اسکولوں اور تربیتی درس گاہوں کے ساتھ ملحقہ مدرسوں کو چھوڑ کر باقی تمام ابتدائی مدرسے صوبائی وزارت تعلیم کے براہ راست ماتحت ہیں۔ اساتذہ کی تربیت اور ان کی تقرری وزارت تعلیم کے ہاتھ میں ہے۔

دیہاتی مدرسوں کی تعداد چالیس ہزار تک پہونچتی ہے، چوں کہ اتنے مدرسوں کے لئے تھوڑے

عرصے میں تربیت یافتہ استادوں کا مہیا کرنا ممکن نہیں تھا، وزارت تعلیم نے دیہاتی معلموں کے لئے ایک سالہ ہنگامی تربیت کا بندوبست کردیا۔ ایسے کسان جو خود اپنی زمین کے مالک تھے فوجی خدمت انجام دے چکے تھے اور کچھ تعلیم بھی رکھتے تھے، ان میں سے موزوں لوگوں کو اس ہنگامی تربیت کے لئے چنا گیا، یہ دیہاتی مدرس چوں کہ عملی زراعت کا بہترین تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ نہ صرف بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتے اور انھیں شہریت کی تعلیم دیتے ہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ سائنسی زراعت کے عملی تجربے بھی کرتے ہیں۔ اور اس طرح دیہاتی زندگی کی بہترین خدمت بجالاتے ہیں، شام کے وقت یہی استاد بالغوں کو پڑھاتے ہیں اور قومی دل چسپی کے مسائل پر بحث بھی کرتے ہیں۔

دیہاتی مدرسوں کے علاوہ ترکیہ کے زرعی اضلاع میں مختلف مقامات پر ۱۷ دیہاتی مرکز کھولے گئے ہیں، ان مرکزوں کا نصاب پانچ سال ہے اور یہاں ابتدائی دیہاتی مدرسوں کے چیدہ چیدہ طلبہ کو داخل کیا جاتا ہے انھیں نہ صرف سائنسی زراعت کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے، بلکہ اس ضلع کی دست کاریوں کی بھی۔ لڑکوں کو کھیتی باڑی، فن تعمیر، بڑھئی کا کام اور دھاتوں کا کام سکھایا جاتا ہے۔ جب کہ لڑکیوں کو بچوں کی غور و پرداخت۔ سلائی۔ تیمار داری اور گھریلو کام۔ ان مرکزوں کے فارغ التحصیل طلبہ اپنے اپنے اضلاع میں سائنسی علوم کی روشنی کو پھیلانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

متذکرہ صدر دیہاتی اداروں کے علاوہ بہت سے دیہات میں عوامی مدرسے بھی ہیں۔ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ ۱۹۲۸ء کا سال ترکیہ کی تعلیمی زندگی میں ایک انقلابی موڑ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس سال عربی رسم الخط کی بجائے لاطینی رسم الخط رائج کیا گیا تھا، عوام کو نئے رسم الخط سے واقف کرانے کے لئے بہت سے عوامی مدرسے کھولے گئے جہاں لوگوں کو لاطینی حروف ابجد میں پڑھنا لکھنا سکھایا جانے لگا۔ بعد ازاں حساب، شہریت اور حفظان صحت کے مضمون بھی نصاب میں بڑھا دیئے گئے۔ ۱۹۴۲ء تک کوئی بیس لاکھ شہری ان عوامی مدرسوں سے فیض حاصل کرچکے تھے۔

ثانوی تعلیم

ترکیہ میں ثانوی تعلیم کا مقصد طلبہ کو اعلیٰ مخصوص تعلیم کے لئے تیار کرنا ہے، یعنی ثانوی مدرسوں میں عموماً وہ طلبہ داخل ہوتے ہیں، جنھیں بعد میں علم کی کسی مخصوص شاخ مثلاً

ملب، انجینئرنگ وغیرہ میں کوئی اعلیٰ ڈگری حاصل کرنی ہو۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کی میعاد پانچ سال تھی۔ ثانوی تعلیم کا کل عرصہ چھ سال ہے۔ ثانوی تعلیم کی بڑی بڑی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ثانوی مدرسہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، حصہ مڈل اور ثانوی حصہ۔ جو طلبہ اعلیٰ تعلیم کا ارادہ رکھتے ہوں انھیں ان دونوں حصوں میں سے گذرنا پڑتا ہے، وہ تین سال حصہ مڈل میں صرف کرتے ہیں اور چار سال ثانوی حصہ میں۔

(ب) مڈل حصہ اگرچہ ثانوی حصے کے ساتھ وابستہ ہے تاہم یہ بذات خود ایک انفرادیت کا حامل ہے تاکہ جو طلبہ اسے ختم کرنے کے بعد براہ راست کسی کام میں لگ جانا چاہتے ہوں ان کی تعلیم ایک لحاظ سے پوری ہو جائے۔ مڈل اسکولوں کے گریجویٹ یا تو معمولی کام کاج اختیار کر لیتے ہیں، یا پیشہ ورانہ مدرسوں میں داخل ہو جاتے ہیں، اسی طرح ثانوی حصہ میں کامیاب ہونے کے بعد طلبہ یا تو کوئی کام اختیار کر لیتے ہیں یا کسی ٹیکنیکل کالج میں داخل ہو جاتے ہیں۔

(ج) ثانوی مدرسہ کے نصاب کو کامیابی کے ساتھ ختم کرنے کے بعد جو طلبہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھائی جاری رکھنا چاہیں انھیں حکومت کا امتحان میٹرک پاس کرنا ہوتا ہے۔

ثانوی تعلیم کی مروجہ صورت کو سنہ ۱۹۲۰ء میں ترقی ملنے لگی تھی، اس سے پہلے ثانوی مدرسے دو قسموں کے ہوا کرتے تھے۔ ایک تو وہ ثانوی مدرسے تھے جن کے اخراجات حکومت کے عام خزانے سے ادا ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض صرف موجودہ مڈل درجہ کے برابر تعلیم دینے پر بس کر دیتے تھے اور بعض کے ہاں مڈل درجہ کے بعد ثانوی درجہ بھی موجود تھا، دوسری قسم کے مدرسے مقامی مدرسے کہلاتے تھے اور مقامی اداروں کے ماتحت تھے، یہ سب کے سب مڈل درجہ تک تعلیم دیتے تھے، ان کی کل تعداد اکاون تھی، جن میں سے اکیس سرکاری مڈل اسکول تھے اور ۳۰ لوکل یا ڈی کے مدرسے۔

اصلاح کی طرف پہلا قدم یہ تھا کہ ان مدرسوں کی تعداد بڑھائی جائے چناں چہ ایک ہی سال کے بعد یعنی ۱۹۲۱ء میں ان کی تعداد ۷۴ تک جا پہنچی، ان مڈل اسکولوں کے ساتھ ہی ساتھ مڈل اور ثانوی درجوں والے مدرسوں کی تعداد بھی بڑھائی گئی، چناں چہ ایسے ۱۹ مدرسے جاری کئے گئے جن میں سے

۱۴ لڑکوں کے لیے تھے اور ۷ لڑکیوں کے لیے، ان تمام مدرسوں کی تعداد طلبہ ۳۵۸۱ تھی بسنہ ۱۹۲۳ء تک اسکولوں کی تعداد میں بھی کچھ خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ مگر تعداد طلبہ اب دوچند تھی بسنہ ۱۹۲۴ء میں یہ ضروری خیال کیا گیا کہ ثانوی تعلیم کو ایک یکساں نظام کے ماتحت لایا جائے، چنانچہ اس سال ایک قانون منظور ہوا جس کا منشا تعلیم کو سراسر غیر مذہبی بنانا تھا، مذہبی تعلیم دینے والے مدرسے یا تو بند ہو گئے اور یا دینی درس گاہوں میں تبدیل ہو گئے۔ بسنہ ۱۹۲۶ء میں مڈل اسکولوں تک مخلوط تعلیم مروج کر دی گئی تاکہ لڑکیوں کو ان مقامات پر بھی تعلیم کی سہولتیں مل جائیں، جہاں ان کے لئے الگ مدرسے قائم نہ ہو سکے تھے۔

جمہوریہ کے قیام تک ثانوی مدارس کے استادوں کو کوئی فنی مقام حاصل نہ تھا۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں ایک قانون منظور کیا گیا جس کی رو سے اساتذہ کی تقرری ترقی اور علیحدگی کے لئے واضح قوانین بنائے گئے، آج ثانوی مدرسوں کے اکثر مدرس نہ صرف اپنے مخصوص مضامین میں خاص علمی قابلیت کے مالک ہیں، بلکہ فنی تربیت بھی حاصل کیے ہوئے ہیں۔

مڈل اور ثانوی درجوں کے طلبہ کے لئے انگریزی فرانسیسی یا جرمنی میں سے کسی ایک جدید زبان کا سیکھنا لازمی ہے بسنہ ۱۹۴۱ء میں تین ثانوی مدرسوں میں لاطینی کا مطالعہ بھی شروع کیا گیا تھا۔ اعلیٰ جماعتوں میں یونانی بھی سکھائی جاتی ہے۔

ذیل میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا ایک نقشہ دیا جاتا ہے۔

مدرسہ کی قسم	کل تعداد	ڈگری یافتہ اساتذہ کی تعداد: مرد	عورتیں	غیر ڈگری یافتہ اساتذہ کی تعداد: مرد	عورتیں	طلبہ کی تعداد: مرد	عورتیں
سرکاری ابتدائی	۱۶۲۸۵	۱۵۲	۲۲	۲۴۱۰۷	۱۹۳۱	۹۳۱۱۵۵	۵۲۳۴۹۱
غیر سرکاری ابتدائی	۱۲۰	۳۷	۴۲	۱۹۶	۶۸۰	۷۴۱۹	۶۴۳۶
سرکاری ثانوی (مڈل)	۲۶۸	۱۰۶۸	۹۵۲	۸۵۱	۵۸۵	۳۹۵۷۹	۱۴۹۶۷
غیر سرکاری ثانوی (مڈل)	۲۹	۲۰۵	۲۱۷	۲۶۷	۲۷۳	۴۰۰۲	۲۶۹۳
سرکاری ثانوی	۵۶	۶۳۷	۵۲۶	۷۰	۴۴	۱۲۹۶۳	۳۴۸۲
غیر سرکاری ثانوی	۳۲	۳۰۹	۱۶۶	۷۹	۳۵	۲۶۷۲	۹۸۳

مدرسہ کی قسم	کل تعداد	ڈگری یافتہ اساتذہ کی تعداد		غیر ڈگری یافتہ اساتذہ کی تعداد		طلبہ کی تعداد	
		مرد	عورتیں	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں
ٹیکنیکل مدرسے	۱۹۰	۴۳۱	۳۰۸	۱۳۸۷	۵۸۴	۲۲۲۷۸	۸۳۹۱
زراعتی اور جنگلاتی	۱۵	۱۳۸	۱۷	۷۸	۷	۲۳۷۳	۵۴
تیمار داری سکھلانے والے	۱۱	۴۸	۲۴	۶	۱۷	۹۰۶	۵۳۶
سرکاری تجارتی	۲۲	۶۸	۴۱	۲۶	۸	۲۱۲۷	۲۱۱
غیر سرکاری تجارتی	۲	—	—	—	—	۲۹	۳۲
سرکاری تجارتی (زنانوی)	۱۸	۱۴۹	۷۹	۷	۳	۱۷۸۲	۱۳۹
غیر سرکاری تجارتی (زنانوی)	۱	—	—	—	—	۳۰	۱۷
سرکاری ٹیکنیکل	۱	۲۷	—	۳	—	۲۳۶	—
غیر سرکاری ٹیکنیکل	۱	۲۰	—	—	—	۲۲۵	—
اساتذہ کی تربیت گاہیں	۲۸	۳۰۳	۱۲۷	۲۷۲	۸۵	۱۱۷۹۴	۱۷۲۹
دوسرے پیشہ ورانہ مدرسے	۱۱	۱۸۰	۷	۳۸	۸	۱۳۰۰	۱۱۴
اعلیٰ تعلیمی مدارس	۱۷	۳۷۹	۴۴	۷۵	۱۹	۷۵۹۳	۱۰۵۸
فیکلٹی	۱۶	۹۵۲	۲۷۵	۶	۲	۱۵۷۹۳	۳۶۳۲

اعلیٰ تعلیم ترکیہ میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کی بنیاد خود حکومت نے ہی رکھی اور وہی ان کے نظم و نسق کی ذمہ دار ہے۔ ان اداروں میں انقرہ کی یونیورسٹی۔ استنبول کی یونیورسٹی اور استنبول کی ٹیکنیکل یونیورسٹی کے علاوہ اعلیٰ پیشہ ورانہ اور فنی مدرسے شامل ہیں۔

ٹیکنیکل تعلیم عہد حاضر کی ضروریات نے یہ بات اچھی طرح ثابت کر دی ہے کہ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے بغیر قومی زندگی کی تعمیر نو اور اس کی ترقی ہرگز ممکن نہیں، چنانچہ ۱۹۳۱ء میں ترکیہ نے تجارتی اور فنی تعلیم کی اشاعت کے لئے ایک واضح منصوبہ تیار کیا۔ ٹیکنیکل تعلیم کے سوال پر ۱۹۲۶ء سے ہی

سنجیدگی کے ساتھ غور شروع ہو گیا تھا، یورپ اور امریکہ سے ماہرین کو مشورہ کے لیے بلایا گیا، اور بالآخر ملک کے مختلف حصوں کی معاشی ضرورتوں کے پیش نظر ایک منصوبہ بنایا گیا جس کے ماتحت موجودہ فنی اداروں کی تکمیل اور نئے اداروں کے کھولنے کا انتظام کیا گیا۔ ان باقاعدہ ٹیکنیکل مدرسوں کے علاوہ یہ بندوبست بھی کیا گیا۔ کہ شبینہ مدرسے جاری کیے جائیں، جہاں مختلف دست کاریاں سکھائی جائیں، اس طرح استادوں کے لیے تربیت گاہیں کھولی گئیں بسنہ ۱۹۲۷ء میں ۳۰۰ طلبہ کو یورپ کے مختلف ملکوں میں معلمی کی تربیت حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا: تاکہ مجوزہ فنی اور ٹیکنیکل اداروں میں استادوں کی جگہ پُر ہو سکے، اس کے ساتھ ہی مغربی ملکوں سے ۵۳ ماہرین کو اس غرض سے بلایا گیا کہ خود ترکیہ میں بھی کچھ لوگوں کو ضروری تربیت مل جائے، ۱۹۲۶ء کے ایک قانون کی رو سے ان تمام فنی اور ٹیکنیکل اداروں کا بندوبست وزارت تعلیم کے ہاتھوں میں سونپ دیا گیا۔

فنون لطیفہ

ترکیہ اور مغربی دنیا کے درمیان زیادہ گہرے ثقافتی روابط انیسویں صدی میں قائم ہوئے۔ اس سے پہلے مصوری اور سنگ تراشی بالکل شجر ممنوعہ تھے۔ تاہم ترکی فنون لطیفہ کی روح سامان آرائش اور خطاطی و کشیدہ کاری میں جلوہ گر ہوتی تھی، اس کے علاوہ عہد عثمانی میں فن تعمیر کے بڑے بڑے شاہکار بھی پیدا ہوئے۔ ترکی فن تعمیر کو اس میدان میں ایک مخصوص مقام حاصل ہے۔

نئی جمہوریہ نے پہلے دن سے ہی ترکوں کی تخلیقی قوتوں کے بروئے کار آنے کے لئے تمام میدانوں کے راستے کھول دیئے، آج فنون لطیفہ کے ہر شعبہ یعنی مجسمہ سازی، موسیقی، ڈراما وغیرہ میں ترک بڑی آزادی سے حصہ لیتے ہیں، وہ ان تمام شعبوں میں مغرب کے بہترین اجزاء کو اپنی قومی میراث کے ساتھ اس طرح ملاتے ہیں کہ ایک نیا روپ پیدا ہو جاتا ہے، اس سمت میں سب سے پہلا سرکاری قدم فنون لطیفہ کے مدرسے کا اجرا تھا جس میں مغربی نمونہ کی مجسمہ سازی، مصوری اور فن تعمیر کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا، یہ مدرسہ ۱۸۸۶ء میں وزارت تجارت نے شروع کیا اور ۱۸۸۷ء میں وزارت معارف کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اور بالآخر ۱۹۲۶ء میں اسے مغربی نمونے پر فنون لطیفہ کی اکاڈمی میں تبدیل کر دیا گیا۔

فنون لطیفہ کی اکاڈمی دراصل ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ ہے۔ طلبہ سے کوئی فیس وصول نہیں کی جاتی تاہم باقاعدہ حاضری لازمی ہے۔ اکاڈمی چار شعبوں میں بٹی ہوئی ہے۔ یعنی فن تعمیر، مصوری، فن آرائش

عدہ تر کی فن آرائش۔ فن تعمیر کا شعبہ آرٹ کا نصاب ہے۔ اور ایسے ماہرین پیدا کر رہا ہے جن کی آج ترکیہ کو سخت ضرورت ہے ۔ سلطنت عثمانیہ کے آخری دور میں جو عمارتیں بھی تعمیر ہوئیں ان کے بنانے والے علم اور ذوق سلیم دونوں سے خالی تھے۔ آج ملک میں کئی نوجوان ماہرین فن تعمیر موجود ہیں۔ گویا فنون لطیفہ کی اکاڈمی تحقیقاتی کام اور تخلیقی قوتوں کی نشو ونما ہر دو کے لئے ایک اہم مرکز ہے۔ آج اکاڈمی میں طلبہ کی تعداد موجودہ تمام ماہرین فن تعمیر کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہے، گویا وہ دن زیادہ دور نہیں جب اس ملک میں ماہرین تعمیر کی کمی باقی نہیں رہے گی ۔

غیر ملکی مدرسے ۱۹۴۳ء میں ترکیہ میں کل ۶ امریکی پرائیویٹ مدرسے تھے جن میں سے ۳ استنبول میں کام کر رہے تھے ملک کے اس سب سے بڑے شہر میں اس سال ۸ فرانسیسی ۱ بلغاری ۲ برطانوی ۱۔ ایرانی اور ۵۔ المانوی مدرسے بھی تھے۔ ان کے علاوہ ۲ اور ۱ المانوی مدرسے دوسرے شہروں میں موجود تھے۔

خاتمہ کلام ترکیہ کو عالم اسلام میں آج ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے، آج اسلامی دنیا کے ہر حصے میں ایک بہت ٹیڑھا سوال یہ ہے کہ اسلامی اقدار کو ہاتھ سے دیئے بغیر جدید میکانکی تہذیب کو کس طرح اپنایا جائے۔ بیرحم حقائق نے ترکیہ کو باقی اسلامی ملکوں سے بہت پہلے اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس ضمن میں کوئی دوٹوک فیصلہ کرے، اس فیصلے میں تاخیر کرنا گویا قومی زندگی کو خطرے میں ڈالنا تھا، ترکوں نے اس بارے میں جو فیصلہ کیا ہے اس کی کچھ تشریح اوپر کی سطروں میں پیش کی جا چکی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہمیں ترکوں کے فیصلے سے پورا پورا اتفاق ہو، جیسا کہا جا چکا ہے، اس فیصلے کے محرک نہایت قوی) اور خوفناک اسباب تھے تاہم اس بات کو ماننا پڑے گا کہ ترکیہ نے جو کچھ کیا بڑے عزم اور یقین کے ساتھ کیا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اپنے منصوبوں میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ جدید ترکیہ کی قومی زندگی کا یہ پہلو ایسا ہے جو سارے اسلامی ملکوں کے لئے نمونہ ہونا چاہیئے ۔

ترکیہ کی تعلیمی زندگی کا ایک اور بہت نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہ ساری تعمیر نو براہ راست حکومت کے ہاتھوں ہوئی ہے، یہ بجا ہے کہ ملت کے پورے تعاون کے بغیر کوئی حکومت کچھ نہیں کر سکتی لیکن ترکیہ کی مثال سے یہ بات واضح ہو جانی چاہیئے کہ وہ پس ماندہ ممالک جو محدود عرصے میں ترقی کی بہت سی

منزلیں طے کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ حکومت منصوبہ بندی اور عملی تعمیر کا سارا کام اپنے ہاتھوں میں لے۔ اس معاملہ میں نجی کوششوں پر بھروسہ کرنا سراسر بے کار ہے۔ یہ درست ہے کہ برطانیہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں نجی کوششوں نے اکثر اوقات حکومت سے زیادہ تعمیری کام کیا ہے، مگر ان ملکوں کا تاریخی اور ثقافتی پس منظر بالکل الگ نوعیت کا ہے، پھر ان کے ہاں یہ سارا کام بہت سے تدریجی دوروں میں سے گذرا ہے۔ ہمارے ہاں ان شرطوں میں سے کوئی موجود نہیں۔ مغربی ملکوں کی کیفیت خواہ کچھ بھی ہو مشرقی ملکوں میں افراد کی آزادانہ مساعی پر زیادہ بھروسہ کرنا اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ ترکیہ کی مثال میں ہمارے لئے اور بھی بہت سے سبق موجود ہیں جن میں عورتوں کی تعلیم غالباً بہت اہم ہے۔ ہمارے ہاں پرانی وضع کے بہت سے بزرگ ہر مغربی جدت کو غیر اسلامی کہہ دینے کے خوگر ہیں۔ انھیں چاہئے کہ ذرا ان ترکوں کی موجودہ زندگی کو ملاحظہ فرمائیں جنھیں وہ آج سے تیس برس پہلے خلافت کا مقدس بوجھ اٹھانے کے لئے مجبور کر رہے تھے۔

مدرسین کا تجزیہ

محمد عبد العزیز

(برٹرنڈ رسل کے مضمون "THE EDUCATORS EXAMINED" کا ترجمہ)

ہمارے پیش نظر تعلیم کے تین مقصد ہیں — فنی، ذہنی اور اخلاقی۔ اور چونکہ تعلیم ہی کی بدولت فن میں مہارت پیدا ہوتی ہے، اس لئے اگرچہ قراءت، تحریر اور حساب کو علم کے مبادیات میں سے کیا جاتا ہے، پھر بھی ہماری روزمرہ زندگی میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تینوں ناگزیر مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس تربیت میں دماغ کی اصلاح شامل نہیں ہے۔

آخر اس ذہنی تعلیم سے کیا مراد ہے، اور اس کا طلبہ کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے، دراصل ذ ایک مقصد تو مشکل مقامات کے سمجھنے اور پیچیدہ مسائل کے سلجھانے میں طلبہ کی امداد کرنا ہوتا ہے، اور دوسرا مقصد طلبہ کی نجی زندگی کو بیرونی زندگی سے مربوط کرنا ہوتا ہے۔ پہلا مقصد بھی بجائے خود وقیع ہے میں اس کی اہمیت کو کم یا اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہتا، لیکن اس وقت میں دوسرے مقصد کی با وضاحت کروں گا۔

انسانی ذہن کی مثال اندھیری رات میں روشن چراغ کی سی ہے، جو چیزیں اس کے نزدیک ہیں وہ زیادہ روشن اور نمایاں ہوتی ہیں لیکن فاصلے کی زیادتی کے ساتھ ساتھ روشنی بھی مدھم ہوتی جاتی حتیٰ کہ ایک مخصوص دائرے کے باہر تاریکی ہی تاریکی ہوتی ہے، ذہنی تعلیم کا مقصد اسی چراغ کو بڑھانا اور اس کے دائرہ نور کو اور پھیلانا ہوتا ہے۔

تعلیم سے جو اخلاقی مفاد وابستہ ہے یہ ایک مشکل اور بحث طلب مسئلہ ہے، اگر اس کے

منزلیں طے کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ حکومت منصوبہ بندی اور عملی تعمیر کا سارا کام اپنے ہاتھوں میں لے۔ اس معاملہ میں نجی کوششوں پر بھروسہ کرنا سراسر بے کار ہے، یہ درست ہے کہ برطانیہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں نجی کوششوں نے اکثر اوقات حکومت سے زیادہ تعمیری کام کیا ہے، مگر ان ملکوں کا تاریخی اور ثقافتی پس منظر بالکل الگ نوعیت کا ہے، پھر ان کے ہاں یہ سارا کام بہت سے تدریجی دوروں میں سے گذرا ہے۔ ہمارے ہاں ان مرحلوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔ مغربی ملکوں کی کیفیت خواہ کچھ بھی ہو مشرقی ملکوں میں افراد کی آزادانہ مساعی پر زیادہ بھروسہ کرنا اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ ترکیہ کی مثال میں ہمارے لئے اور بھی بہت سے سبق موجود ہیں جن میں عورتوں کی تعلیم غالباً بہت اہم ہے۔ ہمارے ہاں پرانی وضع کے بہت سے بزرگ ہر مغربی جدت کو غیر اسلامی کہہ دینے کے خوگر ہیں۔ انھیں چاہئے کہ ذرا ان ترکوں کی موجودہ زندگی کو ملاحظہ فرمائیں جنھیں وہ آج سے تیس برس پہلے خلافت کا مقدس بوجھ اٹھانے کے لئے مجبور کر رہے تھے۔

مدرسین کا تجزیہ

محمد عبد العزیز

(برٹرنڈ رسل کے مضمون "THE EDUCATORS EXAMINED" کا ترجمہ)

ہمارے پیش نظر تعلیم کے تین مقصد ہیں — فنی، ذہنی اور اخلاقی۔ اور چوں کہ تعلیم ہی کی بدولت کسی فن میں مہارت پیدا ہوتی ہے، اس لئے اگرچہ قراءت، تحریر اور حساب کو علم کے مبادیات میں سے تصور کیا جاتا ہے، پھر بھی ہماری روزمرہ زندگی میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تینوں ناگزیر ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس تربیت میں دماغ کی اصلاح شامل نہیں ہے۔

آخر اس ذہنی تعلیم سے کیا مراد ہے، اور اس کا طلبہ کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے، دراصل ذہنی تعلیم کا ایک مقصد تو مشکل مقامات کے سمجھنے اور پیچیدہ مسائل کے سلجھانے میں طلبہ کی امداد کرنا ہوتا ہے، اور اس کا دوسرا مقصد طلبہ کی نجی زندگی کو بیرونی زندگی سے مربوط کرنا ہوتا ہے۔ پہلا مقصد بھی بجائے خود وقیع ہے اور میں اس کی اہمیت کو کم یا اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہتا، لیکن اس وقت میں دوسرے مقصد کی بالخصوص وضاحت کروں گا۔

انسانی ذہن کی مثال اندھیری رات میں روشن چراغ کی سی ہے، جو چیزیں اس کے نزدیک ہوتی ہیں وہ زیادہ روشن اور نمایاں ہوتی ہیں، لیکن فاصلے کی زیادتی کے ساتھ ساتھ روشنی بھی مدھم ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک مخصوص دائرے کے باہر تاریکی ہی تاریکی ہوتی ہے، ذہنی تعلیم کا مقصد اسی چراغ کی روشنی کو بڑھانا اور اس کے دائرہ نور کو اور پھیلانا ہوتا ہے۔

تعلیم سے جو اخلاقی مفاد وابستہ ہے یہ ایک مشکل اور بحث طلب مسئلہ ہے، اگر اس کے قدم

ذہنی غلامی اور بد نظمی کے بین بین جم گئے تو اس سے انسانی حرکات کو پابند نظم و آئین کیا جا سکتا ہے لیکن پابندئی نظم سے کسی شخص کی فطری امنگوں کو دبانا مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ تعلیمی پابندی ہی سے اخلاقی قدروں کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے۔

آج کل تعلیم کا انتظام و انصرام ریاست کے ہاتھوں میں ہے، اور جب سے اسے ہر بچے کے لئے قانوناً لازمی قرار دے دیا گیا ہے تعلیم نے تھوڑی بہت ترقی ضرور کی ہے اور اپنے متعین نصب العین میں اسے کامیابی بھی ہوئی لیکن یہ مقصد ہنوز تشنۂ تکمیل ہے تعلیم کی ہمہ گیری اور اس کی آفاقیت پر اعتماد رکھنے والوں کو جو امیدیں اس کی امکانی قوتوں سے وابستہ تھیں پوری نہ ہو سکیں تعلیم کے ارباب حل و عقد بعض معین چیزوں کو بہت زیادہ اہمیت دے دیتے ہیں۔ مثلاً از منۂ قدیم میں انھیں لاطینی زبان پسند تھی۔ اگر متعلم سے کوئی غلطی ہوتی تو اس کے غلط ہونے میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی، دور جدید میں ما ہی اسباب کی بنا پر انھیں حساب سے لگاؤ ہے مجھے معلوم نہیں کہ امریکہ کے ابتدائی مدارس کا کیا حال ہے لیکن انگلستان میں تو اس پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں حساب کی ضرورت محض حساب کتاب رکھنے میں پڑتی ہے۔ اور ایک معمولی انسان کے لئے اس کا علم بقدر ضرورت کافی ہوتا ہے میرے خیال میں پیچیدہ سوالات حل کرنے میں فی نفسہٖ کوئی خوبی نہیں لیکن اس سے میری مراد صحت کار کی تربیت کو بے وقیع قرار دینا نہیں ہے غلطی بہر صورت غلطی ہے۔ اور اس کا احساس بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ وسعت نگاہ اور گہری ہم دردی کا نام لے کر کسی غلطی کو معاف نہیں کیا جا سکتا

تعلیمی مسائل میں ایک نازک صورت حال یہ بھی ہے کہ جوانی مختصر ہوتی ہے اور جب جوانی ختم ہو جاتی ہے تو انسان کے بس کا پڑھنا لکھنا نہیں رہتا۔ اس لئے اس نے جو کچھ سیکھا کسی اور چیز کے بل بوتے پر سیکھا۔ اگر آپ بچے کو کچھ سکھانا چاہتے ہیں اور اس کی اہمیت کے جواز میں اپنا پورا زور صرف کر دیتے ہیں تو فنی نقطۂ نگاہ سے یہی کافی نہیں کہ اس کا علم ضروری ہے، بلکہ آپ کو یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ نصاب کے اور دوسرے مندرجات سے اس کا علم زیادہ ضروری ہے، میں مانتا ہوں کہ "لاطینی" کی تحصیل مفید ہے لیکن اگر آپ رسمی تعلیم کو ۱۴ سال کی عمر میں

ختم کر دیتے ہیں تو اس قلیل مدت میں بچوں کو سیکھنے کے لئے اس سے بھی اہم چیزیں ہوتی ہیں۔

رواجی تعلیم کے نقائص

رواجی نظام تعلیم فرسودہ اور قدیم ہو چکا تھا۔ اور اس میں اتنی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، کہ اس کی جگہ کسی نئے نظام کا آنا ضروری تھا، چناں چہ ترقی پسند تعلیمی تحریک کی بنیاد پڑنے کی وجہ فی الواقع رواجی تعلیم کی یہی خرابیاں تھیں، میرے خیال میں اس نظام تعلیم میں سب سے نمایاں خرابی نظم و ضبط کی بے جا پابندی تھی، از منہ قدیم میں بچوں کو کچھ کام دے دیا جاتا تھا اگر انھوں نے اس کی تکمیل میں کوتاہی کی یا مقررہ سبق یاد نہ کیا تو انھیں بہت سخت بدنی سزا ملتی۔ اور بعض حالات میں تو انھیں قمچیوں سے نوازا جاتا، اس طریق کار سے مدرس بہت سی مصیبتوں سے بچ جاتا اسے ماحول کو دل چسپ بنانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی، بچے کی الجھنوں میں اس کی امداد کا مسئلہ ہی پیش نہیں ہوتا تھا، مدرسین کی ان سخت گیریوں کی وجہ سے طلبہ مجبوراً پڑھتے، ورنہ عدم تکمیل کی صورت میں انھیں بدنی سزاؤں کے عذاب میں مبتلا ہونا پڑتا۔ اس لئے بچوں کی اکثریت پڑھنے اور کام کرنے کو ترجیح دیتی تھی۔

تعلیم کے مختلف مصلحین نے روسو سے لے کر اس وقت تک بعض انوکھے مفروضے اختیار کئے۔ ان کے خیال میں کچھ بچے ایسے منفرد ہوتے ہیں کہ وہ ان علوم میں بھی دل چسپی لینے لگیں جن کا پڑھنا ان کے لئے ضروری قرار دے دیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی مدرسین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ اسباق کو دل چسپ بنانا غیر پسندیدہ بلکہ ناممکن ہے۔ فی الحقیقت یہ بھی بڑی بھول ہے، ہم میں سے ہر شخص محسوس کر سکتا ہے اور خود اپنا معاملہ اس احساس کے لئے کافی ہوتا ہے۔ علم کا وہ پہلو جو دل چسپ اور مرغوب خاطر ہوتا ہے، اس کے سیکھنے میں اور اسے اپنی معلومات کا ایک جزو بنانے میں کوئی قباحت نہیں ہوتی، بلکہ نہایت تیزی سے ہم اسے اپنا لیتے ہیں، لیکن جن چیزوں کو بجبر و اکراہ محض آمر کی خوشنودی کے لئے سیکھنا پڑتا ہے، وہ بھلا ذہن میں تا دیر کیسے محفوظ رہ سکتی ہیں، اس لئے انھیں تیزی سے سکھایا یا اپنایا نہیں جا سکتا۔

بچوں میں سوچ بچار کی عادت ڈالنا

رواجی تعلیم کا دوسرا نقص یہ ہے کہ اس نظام تعلیم میں طلبہ کو تفکر و تدبر کا موقع ہی نہیں دیا جاتا، اور غالباً اس کا سبب

بڑا نقصان یہی ہے، طلبہ میں سوچ بچار کی عادت ڈالنے کی کوشش بھی نہیں کی جاتی۔ سوچنا ایک انفرادی شغل ہے۔ اور تعلیم کو موثر بنانے کے لئے اس سے زیادہ کارگر اور کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس کے علاوہ جب متعلم خود سوچے گا تو یقیناً اس کی راہ فکر اور اس کا انداز فکر مدرس سے بالکل مختلف ہوگا، اور یہی طریق عمل مدرس کے لئے ناخوشگوار ہوتا ہے، وہ جھنجھلا جاتا ہے اور طلبا کی آزادی فکر کو آئین نظم و ضبط کی خلاف ورزی سمجھتا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کثیر تعداد میں جماعت کے مدرس ذہنی اپج اور انفرادی سوچ بچار کے سلسلے میں طلبہ کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے۔

رواجی تعلیم کا دوسرا نقص یہ جانفنع ہے، جسے ترقی پسند تعلیم نے دور کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ایک ہی قسم کی واردات اور ایک ہی قسم کے واقعات میں بڑے بوڑھوں اور نوجوانوں سے دو قسم کے سلوک روا رکھے جاتے ہیں، جو بات بڑے بوڑھوں کے سلسلے میں قابل تحسین ہوتی ہے، یا کم سے کم قابل مواخذ نہیں ہوتی، نوجوان اسی سلسلے میں قابل گرفت سمجھے جاتے ہیں، بلکہ ان کی اس حرکت کو مذموم قرار دے کر ان سے اس کا محاسبہ کیا جاتا ہے، اگر کسی بچے کی زبان پر کوئی حرف بد آجائے تو رواجی تعلیم کے حامی والدین کو اس سے بہت زیادہ دکھ ہوتا ہے، اندریں حالات اگر وہی بچہ اپنے چھوٹے بھائی کو تنگ کرتا ہو یا دو چار دھول دھپے رسید کر رہا ہو تو انھیں اس سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی، اس کے علاوہ ایک رواج یہ بھی ہے کہ بچوں کو عملاً حقائق زندگی سے روشناس نہ کیا جائے، اس سے تو یہی مفہوم مراد لیا جاسکتا ہے کہ بچے ان حقائق کو سنجیدگی اور متانت کے ساتھ بزرگوں سے نہ سیکھیں، بلکہ دوسرے بچوں کی صحبت میں بھونڈے اور ناقص طریقے سے سیکھیں، یہ بات نامناسب ہے۔ اور اس سلسلے میں ترقی پسند تعلیم جو قدم اٹھا رہی ہے وہی مستحسن ہے۔

ترقی پسند تعلیم کی برائیاں

ترقی پسند تعلیم کی اس تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے، بغاوت کی ہر تحریک بالعموم اپنی حدود سے بہت آگے بڑھ جایا کرتی ہے، اور جہاں اسے رواجی تعلیم کی بعض خامیوں کو دور کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس میں ان نقائص کی بجائے کچھ اور برائیاں پیدا ہوگئی ہیں، اگر پرانے نظام تعلیم میں پابندی نظم و ضبط پر اتنا زور دیا جاتا ہے تو ترقی پسند تعلیم میں اس کی

طرف بالکل توجہ نہیں دی جاتی، اس سلسلے میں کم سے کم میں تو یہی محسوس کرتا ہوں۔

علم جب ایک مخصوص مقام پر پہونچ جاتا ہے تو اس میں چاشنی پیدا ہو جاتی ہے لیکن ابتدائی مدارج میں دل بستگی کا کوئی سامان نہیں ہوتا ہے۔ میرا اپنا ذاتی تجربہ بھی یہی ہے۔ تاریخ کے کسی زمانے کو لے لیجئے اگر اس کے متعلق آپ کو کافی معلومات ہیں تو وہی آپ کے لئے دلچسپ بن جاتا ہے، خواہ اس سے پہلے وہ آپ کے لئے بار خاطر ہی کیوں نہ ہوا ہو۔ میرے خیال میں تحصیل علم کا یہ گر طلبا کو ضرور بتایا جائے، اور انھیں اس سے واقف ہونا چاہیئے لیکن اگر انھیں اپنی من مانی کرنے کا موقع دے دیا گیا تو وہ اس سے کبھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

ترقی پسند تعلیم میں جذبہ خودکاری کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، میرے خیال میں موجودہ ترقی پسند مدارس اس سلسلے میں اپنی حدود سے متجاوز کر رہے ہیں اور اس جذبہ خودکاری میں بچوں کی بے جا حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ بچوں میں کام کرنے کا فطری جذبہ ہوتا ہے اور اس جذبے کو مرتعش کرنے کے لئے کسی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اگر کسی نقصان کا احتمال نہ ہو تو بچے کو اپنی اس فطری صلاحیت کو بروئے کار لانے کا موقع دینا چاہیئے۔

لیکن بعض بچے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ انھیں ایک معین راہ اور ایک مقررہ طریق کار کی ضرورت ہوتی ہے، اگر انھیں روزمرہ زندگی کی بہت سی بندشوں سے آزاد کر دیا جائے تو وہ خوش وخرم اور شادماں نظر آنے لگتے ہیں۔ میں کچھ ایسے بالغوں کو بھی جانتا ہوں جن کی تعلیم انھیں ترقی یافتہ مدارس میں ہوئی ہے اور جو بیرونی پابندیوں کے خوگر بھی ہیں، لیکن دراصل انھیں ان اداروں میں ایسی تعلیم ہی نہیں ملی کہ وہ ان پابندیوں کے آگے سر جھکا سکیں۔

اس جذبہ خودکاری سے آتنی عقیدت مندی کا اثر اور بھی برا پڑے گا۔ اور اگر اسے یوں ہی بڑھنے کا موقع ملا تو یہ بھی اپنی حدود سے متجاوز کر جائے گا، اس سے میری مراد صنعت کارانہ تخلیق کی ہمت افزائی ہے، اس میں شک نہیں بلکہ یہ چیز کسی حد تک مستحسن کہی جا سکتی ہے کہ بچوں کو تھوڑا بہت مصوری، موسیقی اور ڈرامہ نویسی کا موقع ملنا چاہیئے، وہ چھوٹی چھوٹی تصویریں بھی بنا سکیں، کبھی کبھی دو ایک نغمے بھی

چھیڑ سکیں اور ڈرامے بھی لکھ سکیں لیکن اس سلسلے میں ان کی زیادہ ہمت افزائی نہیں کرنی چاہیئے کہ ان کی یہ کوشش صنعت کارانہ تخلیق کے شاہ کار ہیں۔ یا یہ کہ بغیر کسی مہارت یا تربیت کے وہ اس فن میں کمال حاصل کر سکتے ہیں۔

برے اطوار مستحسن نہیں ہوتے

آداب و اطوار کے سلسلے میں مجھے ایک قدامت پسند ہونے کا اعتراف ہے برے اطوار برے ہی ہوتے ہیں میں نے کبھی انہیں مستحسن اور قابل توصیف نہ سمجھا اور جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں توازن کی ضرورت ہوتی، یہاں بھی توازن قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ میرے خیال میں گھریلو اور سماجی زندگی کو بطریق احسن بسر کرنے کے لئے اچھے آداب و اطوار کا ایک معیار قائم کرنا ضروری ہے۔ مجھے عہد جدید کے معلمین سے پورا پورا اتفاق ہے کہ والدین کا اپنے بچوں سے برتاؤ نرم اور شگفتہ ہونا چاہیئے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بچہ اپنے والدین سے برا برتاؤ کرے یا کج خلقی سے پیش آئے۔ ماہرین نفسیات بچے کی فطری صلاحیتوں پر کسی قسم کی پابندی لگانا قرین مصلحت نہیں جانتے۔ بچوں کی اس بے راہ روی سے جو معذوریاں پیدا ہو جاتی ہیں بہر صورت ہمارے سامنے ہیں۔

ترقی پسند تعلیم کے خلاف بالعموم یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جو مدارس اس نظام تعلیم کے زیر اثر چل رہے ہیں ان کے فارغ التحصیل مدرسے یا کالج کی فضا سے نکل کر اس دنیا کے کاروبار میں حصہ نہیں لے سکتے، یہ دنیا ان تعلیم گاہوں کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے، فی الواقع یہ پوری دلیل کا ایک جزو ہے جس کا انحصار اس امر پر ہے کہ ترقی پسند اسکول ابھی تک اس سے مستثنیٰ ہیں، اگر ان مدرسوں کو یہی معیار تسلیم کر لیا جائے تو اس طرح ان اداروں میں تربیت پانے والوں کو دوسروں کے ساتھ اشتراک و تعاون میں ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔ اور اس میں ان کے لئے کوئی انوکھی یا حیرت میں ڈالنے والی بات نہیں ہوگی، لیکن یہ جواب ہنوز غیر مکمل ہے۔

ان ترقی پسند مدارس کا ماحول بہت خوش گوار ہوتا ہے اور اس میں بچوں کے لئے اتنی آسانیاں ہوتی ہیں کہ اسے موجودہ سماجی زندگی کی پیچیدہ اور مناسب تربیت کے لئے کسی طرح موزوں نہیں کہا جا سکتا لیکن پھر بھی اسے کلی طور پر مضرت رساں قرار دینا بھی درست نہیں ہے، موجودہ معاشری زندگی میں جو چیزیں زیادہ تکلیف دہ ہیں ان کا بآسانی سد باب کیا جا سکتا ہے، اور اس نظام حیات میں ان لوگوں کا شامل رہنا بھی مفید ہے، جو بالعموم اس نظام حیات کے باغی ہوتے ہیں، کیوں کہ جو لوگ غیر مطمئن اور آسودہ خاطر نہیں ہوتے، در اصل

عنانِ ترقی بھی انھیں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، اور جو لوگ موجودہ سماجی نظام میں آسودہ حال اور مطمئن ہیں ان سے اس قسم کی توقع رکھنا بہت بڑی بھول ہے لیکن جہاں تک جدید اور ترقی پسند تعلیم کے تربیت یافتوں کا میں نے مشاہدہ کیا ہے، ان کی بے اطمینانی کبھی مفید مطلب نہیں ہوئی، ان کے خیال میں تعلیم کا اس قدر غیر رواجی ہونا ٹھیک نہیں، اس لئے بالعموم وہ اس نظام کو ہی ساری خرابیوں کی جڑ بتانے کے عادی ہو گئے ہیں۔

اگر ترقی پسند تعلیم کی میری اس تنقید کو رواجی مدارس کی حمایت کا اعادہ سمجھا گیا تو اس کا مجھے افسوس ہوگا موجودہ تہذیب پر جو تباہی کے بادل چھا رہے ہیں یہ فی الواقع رواجی مدارس کے آوردہ ہیں اس لئے میری رائے میں آج تعلیم کا بنیادی مسئلہ انفرادیت اور شہریت کو یکجا کرنے کی راہ تلاش کرنا ہے۔

رواجی مدارس انفرادیت کو قربان کر دیتے ہیں اور ترقی پسند مدارس شہریت کو کچلنے کے درپے ہیں وہ غیر ارادی طور پر ہی اس کے مرتکب ہوتے ہیں، اور شہریت کو باقاعدہ شعوری طور پر ایک محسوس اصول کے طور پر پڑھاتے ہیں، وہ الٹے فتہ رفتہ طلبا کی زندگی کا جزو بنانے کی کوشش کرتے ہیں یا ایسی غیر شعوری تعلیم نہیں دیتے جو حقیقت میں اس کے کام آسکے۔

ایک اہم مسئلہ

ان متنازع فیہ حالات میں کسی صحیح نظریئے اور کسی درست نظام کار کا قیاس بظاہر بہت مشکل نظر آتا ہے، اور بالخصوص جب انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا اس سے براہ راست تعلق ہو لیکن اگر ہم انسانی تمدن کو بچانا چاہتے ہیں، اور مقصد تہذیب و تمدن کو انتشار کی تنگ نظری سے ماورا لے جانا ہے تو ہمارے لئے اس مسئلے کا حل تلاش کرنا ضروری ہے۔

مزید براں اگر اس خطرے کے رخ کو موڑنا ہے تو تعلیم کے ارباب حل و عقد کو اپنے موجودہ نظریات میں ترمیم کرنی ہوگی، اور مدرسین کو زیادہ سے زیادہ آزادی کار کا موقع دینا ہوگا، اس کے ساتھ ساتھ مدرسین کو بھی اپنے موجودہ نظریات کو وسیع سے وسیع تر وجہ بیت آشنا بنانا ہوگا، بچوں کی ذہانت، آزاد منشی اور آزاد خیالی سے کبیدہ خاطر ہونے کی بجائے ان کی تکریم لازم ہوگی لیکن بعض ترقی پسند مدرسین کی طرح اس سلسلے میں اپنی حدود سے آگے بڑھنا دانشمندی نہیں ہے، اس کے علاوہ مثبت صفت پابند نظم و ضبط عمل کی بجائے انھیں انسانی گروہوں کو ترجیح دینا چاہیئے، بیشتر ممالک میں تعلیمی ترقی کے یہ طریقے اکثر ناظمین تعلیم کو پسند نہیں آتے اور وہ انھیں رد قرار دیتے ہیں لیکن شاید وہ وقت بھی قریب ہے، جب اس عمل سے حمایت اور وابستگی کا دور دورہ ختم

ہائی کلاسز کے لئے کیمیا کا گھریلو معمل

پروفیسر عبدالغفور ایم۔ ایس سی لکچرر پنجاب یونیورسٹی

کیمیاوی گھریلو معمل کے لئے چند ایک چیزیں ایسی ہیں جو ہر وقت استعمال میں آتی ہیں۔ ان کے بنانے کا طریقہ ہم پہلے بیان کرتے ہیں۔ معمل میں ایک میز۔ دو عدد لکڑی کی کارنسیں ہونی چاہئیں۔ ایک ٹونٹی والا پانی کا برتن جس میں سے صاف پانی لیا جا سکے اور ایک بالٹی جس میں استعمال شدہ پانی یا محلول وغیرہ گرائے جا سکیں۔ ٹونٹی والا برتن ایک کنستر کا بن سکتا ہے جس کے نیچے ایک ٹین کی نالی جھال کرائی جائے اس نالی میں ایک کارک لگاؤ تاکہ کارک کھولنے سے پانی نکل آئے اور کارک بند کرنے سے پانی بند ہو جائے بالٹی کے بجائے ایک کنستر کام دے سکتا ہے۔ کنستر یا بالٹی کے اندر تارکول یا روغن کر دیں تاکہ پانی سے زنگ نہ لگ سکے۔ کارنس پر شیشیاں وغیرہ اور ضرورت کا سامان رکھا جا سکتا ہے، میز پر ٹسٹ ٹیوب اسٹینڈ اسپرٹ لیمپ وغیرہ رکھا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ سینڈ باتھ وغیرہ بھی ہونے چاہئیں جن کے بنانے کا طریقہ آموزش کے سابقہ شماروں میں دیا جا چکا ہے۔ شیشے کے سامان میں ٹسٹ ٹیوب۔ ڈلف بوتل شیشے کی نالی وغیرہ ہونی ضروری ہیں، ان کے بنانے کا طریقہ بھی بتایا جا چکا ہے۔

دوائیاں وغیرہ جو درکار ہیں | مقطر پانی (جس کے بنانے کا طریقہ پہلے دیا جا چکا ہے) گندھک کا تیزاب۔ کاسٹک سوڈے کا محلول۔ سلور نائٹریٹ کا محلول۔ بیریم کلورائیڈ کا محلول امونیا کا محلول۔ لائم واٹر۔ لیمس کاغذ۔ ٹرمیرک کاغذ۔ گندھک۔ سنگ مرمر کے ٹکڑے۔ لوہے کی آدھ انچ کی

گیلیں، تانبے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، موم بتی، نوشادر۔ بے بجھا چونا نیلا تھوتھا۔ پھٹکری شورہ۔ کھانے کا نمک، کپڑے دھونے کا سوڈا۔ لوہے کی جالی کا ٹکڑا۔ لوہے کی جالی کے تار، سپرٹ۔ کھانے کا سوڈا چیڑ کی لکڑی کے تنکے۔ موچنا یا چمٹی جست کے ٹکڑے ٹاٹمری۔

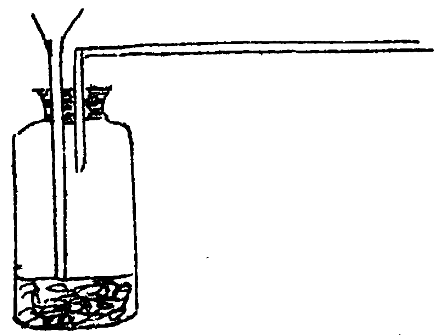
اب ان چیزوں کو ہم ایک ایک کر کے لیتے ہیں۔ مقطر پانی کی بجائے بارش کا پانی استعمال کریں جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ گندھک کا تیزاب پاکستان میں بنتا ہے، کراچی اور راولپنڈی میں اچھا بنتا ہے اور کافی سستا ہے، آٹھ دس آنے کا کافی مل جائے گا۔

احتیاط کبھی بھی گندھک کے تیزاب میں پانی نہ ڈالیں بلکہ پانی میں گندھک کا تیزاب ڈالیں آہستہ آہستہ شیشے کی نالی سے ہلاتے رہیں، گندھک کے تیزاب کی شیشی کا کارک شیشے کا ہو ورنہ معمولی کارک میں پگھلا ہوا موم لگادیں، کاسٹک سوڈا بازار سے لے لیں، سلور نائیٹریٹ کسی ڈاکٹر سے لے لیں وہ اسے کاسٹک کہتے ہیں، اس کو ہمیشہ نیلی یا خاکی رنگ کی شیشی میں رکھیں بیریم کلورائیڈ کا سفوف بازار سے خریدنا پڑے گا اور اس کو مقطر پانی میں حل کر لیں، امونیا کا محلول بنانے کے لئے امونیا گیس کو پانی میں گذارنا ہوگا گیس پانی میں گھل جائے گی اور امونیا کا محلول بن جائے گا لائم واٹر، ٹرمرک کا غذ لیمس کا غذ بنانے کا طریقہ پہلے دیا جا چکا ہے، باقی چیزیں مثلاً گندھک یا سنگ مرمر کے ٹکڑے وغیرہ سستی چیزیں ہیں سب بازار سے مل جائیں گی، ان سب کے کیمیاوی نام پہلے دیئے جا چکے ہیں، ان کے علاوہ اگر ہو سکے تو تنگرف۔ سیندھور، پوٹاشیم کلوریٹ۔ مینگنیز ڈائی آکسائڈ بھی خرید لیں۔ شورے اور نمک کا تیزاب بھی چار چار آنے کا خرید کر شیشے کی کارک والی شیشی میں رکھ لیں، پوٹاشیم کلورائیٹ کا بازاری نام (پوٹاس) ہے جو آتش بازی کے کام آتا ہے۔

ہائی کلاس کے کیمیاوی عمل نصاب کے تجربے اب ہم ان تجربوں کو ایک ایک کر کے لیتے ہیں۔ جن میں پہلے گیسوں کا ذکر ہے۔

آکسیجن گیس تھوڑی مقدار میں اس گیس کو بنانے کے لئے تنگرف کو ٹسٹ ٹیوب یا (امتحانی نالی) میں ڈال کر سپرٹ لیمپ پر گرم کریں، تھوڑی دیر میں ایک سلگتی ہوئی لکڑی کی چپٹی اندر

لے جائیں۔ تو وہ جب بھڑک کر جل اٹھے تو سمجھ لیں کہ آکسیجن نکل رہی ہے۔ اب موچنے یعنی چمٹی سے لوہے کا تار پکڑ کر سپرٹ لیمپ کے شعلے میں گرم کر کے سرخ کر لیں اور فوراً ٹسٹ ٹیوب کے اندر لے جائیں تو تار پھلجھڑی کی طرح جلے گا۔ اسی طرح دو دو تجربے کریں جو کہ آکسیجن کے خواص ظاہر کرتے ہیں۔ شنگرف کی بجائے سندھور بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ مگر شنگرف بہتر ہے۔ اگر بالکل مفت ہی اور تھوڑی مقدار میں آکسیجن گیس بنانی ہو تو ایک ٹرف کو پانی سے بھر لیں اور اس میں وہ تین شیشے کی قیف الٹی کر کے رکھ دیں۔ قیف میں ایک ٹہنی سبز پتوں کی ڈال دیں۔ ٹہنی۔ امرود۔ بیر نیم کسی بھی درخت کی ہو، اب قیف کے منہ کے اوپر ایک امتحانی نلی پانی کی بھر کر الٹی کر کے رکھ دیں: تاکہ اس کا منہ پانی میں ڈوبا رہے، اور اس میں سے پانی نہ گرے، اس سادے اپریٹس کو کئی روز تک دھوپ میں رکھیں، تم دیکھو گے کہ ہر روز امتحانی نلی میں تھوڑی تھوڑی گیس بھرتی جائے گی، یہ آکسیجن گیس ہے، بڑے پیمانے پر آکسیجن گیس بنانے کے لئے پوٹاشیم کلوریٹ اور مینگنیز ڈائی اکسائڈ والا طریقہ استعمال کریں جو کہ نصاب کی کتاب میں درج ہے۔





ہائیڈروجن گیس

اس کے لئے وُلف بوتل (جس کے بنانے کا طریقہ دیا جا چکا ہے) میں کچھ لوہے کی کیلیں ڈالیں، یا جست کے سرمچہ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈال دیں اور ان پر اتنا پانی ڈالیں کہ پانی سے ڈھک جائیں، اب گندھک کے تیزاب کے دس بارہ قطرے ڈالیں تو گیس نکلے گی،

اگر وُلف بوتل نہ ہو تو ایک امتحانی نلی میں تین چار کیل ڈال کر اس کے منہ میں ایک کارک فٹ کریں، اس کارک کے منہ میں سے ایک مڑی ہوئی شیشے کی نالی گذاریں جس کے منہ پر جٹ (JET) ہو اور نالی تقریباً ایک فٹ لمبی ہو، جٹ کے سرے پر آگ لگائیں۔ آگ دکھانے کا یہ طریقہ ہے کہ ایک لوہے کی سلاخ لو۔ جو

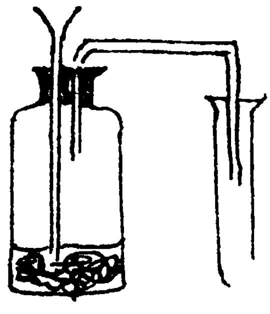
کو بھر کے قریب لمبی ہو۔ اس سلاخ کے سرے پر ایک چیڑ کی لکڑی کا تنکا باندھو اور تنکے کو جلا کر جٹ کے قریب لے جاؤ اور خود دور رہو۔

ضروری احتیاط

ہائیڈروجن گیس بناتے وقت انتہائی احتیاط سے کام لیں، اس کے اپریٹس کے نزدیک کوئی شعلہ یا لیمپ یا موم بتی وغیرہ جلتی نہ ہو، دوسرے ہر ایک کارک پر گاڑھی ملتانی مٹی کا لیپ کر دیں تاکہ گیس کہیں سے باہر نہ نکلے۔

کاربانک ایسڈ گیس

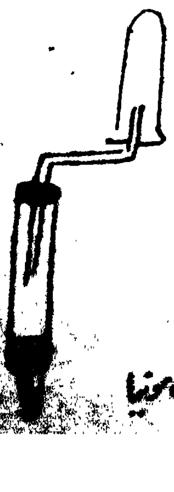
اس کے لئے وُلف بوتل میں سنگ مرمر کے ٹکڑے ڈال کر اوپر پانی ڈالیں اور اس میں نمک کا تیزاب دس بیس بوند ڈالیں۔ امتحانی نلی میں اس گیس کا تیار کرنا بالکل آسان ہے، کھانے کا سوڈا امتحانی نلی میں ڈال کر پانی ڈال کر گھولیں اور اس کے اوپر ٹاٹری کا محلول ڈالیں بس گیس نکلنا شروع ہو گی۔



یہی دو چیزیں وُلف بوتل میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ کھانے کے سوڈے کا محلول الگ برتن میں تیار کریں۔ اور ٹاٹری کا محلول الگ برتن میں اگر ٹاٹری نہ ہو تو لیموں کے عرق سے بھی کام چل سکے گا۔

امونیا گیس بنانا

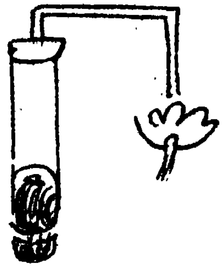
ایک بالکل خشک امتحانی نلی میں پسا ہوا نوشادر اور بجھا ہوا چونا ڈالیں اور اس کے منہ میں ایک کارک لگائیں اور کارک میں سے ایک شیشے کی نالی گذاریں۔ امتحانی نلی کو سیدھا کھڑا کر دیں اور گرم کریں اور نالی کے اوپر ایک امتحانی نلی سیدھی کر کے لگائیں تھوڑی دیر میں امونیا گیس کی تیز بُو آئے گی۔ اب امتحانی نلی کو ہٹالیں اور اسی طرح کئی نلیاں گیس سے بھر لیں۔ امونیا پانی میں بے حد گھلتی ہے۔ امتحانی نلی جس میں یہ بھری جائے بالکل خشک ہو جب امونیا



پانی میں گھلتی ہے۔ تو امونیم ہائیڈرا کسائیڈ یا لکوڈ امونیا (LIQUIR AMMONIA) بن جاتا ہے۔

سلفر ڈائی آکسائیڈ

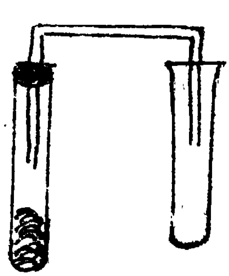
تانبے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایک امتحانی نلی میں ڈالیں، بوقت ضرورت اگر تانبے کے ٹکڑے نہ ملیں تو کسی تانبے کے پرانے برتن میں سے چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ لیں۔ یا



بجلی کے تار کے اندر کا تار نکال کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں۔ امتحانی نلی کے منہ میں ایک کارک لگائیں اور کارک میں سے ایک دو قائموں پہ مڑی ہوئی نالی گذاریں۔ امتحانی نلی میں تیز گندھک کی تیزاب (STRONG SULPHURE ACID) ڈالیں اور گرم کریں۔ یہ گیس پھولوں کے رنگوں کو اڑا دیتی ہے۔ لال دوائی (POTASSIUM PERMANGANATE SOLUTION) کے محلول کو بے رنگ کر دیتی ہے سستی گیس بنانے کے لئے گندھک کی ڈلی کو دیا سلائی دکھا کر جلائیں۔ گندھک سے جو دھواں نکلے گا وہ سلفر ڈائی آکسائیڈ ہو گی۔ اس دھوئیں کے اوپر رنگ دار پھول رکھیں سفید ہو جائے گا

ہائیڈرو کلورک ایسڈ گیس

ایک امتحانی نلی میں پسا ہوا کھانے کا نمک ڈالیں اور اس کے اوپر تیز گندھک کا تیزاب ڈالیں اور پھر گرم کریں تو تیز بو والی گیس نکلے گی، یہی ہائیڈرو کلورک



ایسڈ گیس ہے۔ امتحانی نلی کے منہ میں کارک لگا کر جس میں شیشے کی دو قائموں پہ مڑی ہوئی نلی گذرتی ہے۔ اس گیس کو پانی میں گھول سکتے ہیں۔ پانی میں گھلنے سے ہلکا نمک کا تیزاب بن جائے گا

کرسٹل یعنی قلمیں بنانا

کرسٹل (CRYSTELLISATION) یعنی قلمیں بنانے کا عمل۔ اس کے لئے پھٹکڑی یا نیلا تھوتھا، شورہ یعنی جس چیز کے قلم (CRYSTAL) بنانے ہوں۔ اس کو پانی میں گھول لو۔ پانی ذرا گرم ہو۔ چیز کو پانی میں ڈالتے جاؤ اور گھولتے جاؤ حتیٰ کہ وہ وقت آجائے جبکہ چیز بجائے پانی میں گھلنے کے برتن کے پیندے پہ بیٹھنے لگے۔ اس محلول کو شیشہ

محلول (SATURATED SOLUTION) کہتے ہیں۔ اب اس محلول کو کسی چینی کی پیالی میں ڈالیں اور سینڈ باتھ پر گرم کریں۔ وقتاً فوقتاً محلول میں شیشے کی راڈ یا نالی ڈال کر باہر نکالیں اور دیکھیں کہ تھوڑی دیر بعد شیشے کی نالی میں کچھ ٹھوس چیز جمتی ہے یا نہیں۔ جب دیکھیں کہ جمتی ہے تو محلول کو نیچے اتار کر ایسی جگہ رکھیں جہاں یہ بالکل نہ ہلے۔ محلول میں ایک چھوٹا سا ٹکڑا یا (CRYSTAL) اسی چیز کا ڈال دیں جس کو قلمانا ہے۔ پیالی کو ٹھنڈی جگہ رکھیں۔ ایک آدھ گھنٹے میں خوبصورت قلمیں بن جائیں گی۔

موم بتی کے حصے

اس کے لئے بہت موٹی موم بتی استعمال کریں جس کی بتی بھی موٹی ہو۔ اس کو جلا کر تھوڑی دیر جلنے رکھیں، جب شعلہ بڑا ہو جائے تو اس کے حصوں پر تجربے کریں، اگر ایک انچ قطر کی موم بتی مل جائے تو بہتر ہے ورنہ جو بھی موٹی سے موٹی موم بتی ملے۔ موم بتی کے شعلے کے حصوں کے سب تجربے گھر ہی میں ہو سکتے ہیں۔

جلنے اور سانس لینے کے عمل کا مقابلہ

یہ تجربہ گھر میں ہو سکتا ہے، موم بتی نیلی ہو۔ اس کو ایک مڑے ہوئے تار کے سرے پر لگالیں۔ اگر تار آسانی سے کنڈی وار نہ مڑ سکے تو مڑے ہوئے سرے کو گرم کر کے موم بتی میں چبھو دیں۔ بس موم بتی تار میں لگ جائے گی، برتن جس میں موم بتی جلائی جائے ایک چوڑے منہ کی بوتل ہو سکتی ہے۔ ڈھکنے کے لئے گتے کا گول ٹکڑا استعمال کریں۔ لائم واٹر یعنی چونے کا پانی بنانے کا طریقہ پہلے دیا جا چکا ہے۔

ہلکے اور بھاری پانی کا مقابلہ

یہ تجربہ بھی گھر میں ہو سکتا ہے۔ صابن سلائٹ استعمال کریں۔ سوڈیم بائی کاربونیٹ کو کھانے کا سوڈا کہتے ہیں۔ سوڈیم کاربونیٹ کو کپڑے دھونے کا سوڈا کہتے ہیں۔ کشید کے عمل کو گھر میں کرنے کا طریقہ پہلے دیا جا چکا ہے۔

تیزابوں کی پہچان

یہ تجربہ گھر میں ہو سکتا ہے، بازاری تیزاب کام دے سکتے ہیں۔ تیزابوں کی شیشیوں کے کارک شیشے کے ہونے چاہئیں۔ لکڑی کے تنکے چیڑ کی لکڑی کے ہونے چاہئیں دیا سلائی کی تیلی سے ذرا موٹے اور کوئی چھ سات انچ لمبے۔ تانبے کے ٹکڑے (COPPER TURNING) بنانے کا طریقہ بھی اوپر دیا گیا ہے (FERROUS SULPHATE) کو ہیرا کسیس کہتے ہیں۔ بازار سے

ل سکتا ہے۔ مگر سبزی مائل رنگ کا لیں۔ جو ہیرا کسیس سفید ہو گیا ہو وہ نہ لیں، وہ خراب ہو چکا ہوتا ہے

آمیزے کے حصے علیحدہ علیحدہ کرنا لوہے کا برادہ علیحدہ کرنے کے لئے آمیزے میں مقناطیس ہلائیں اور جو لوہا مقناطیس کو چمٹا رہے اس کو علیحدہ کرتے رہیں حتی کہ مقناطیس کو اور کوئی لوہے کے ٹکڑے نہ چمٹیں اور ریت علیحدہ کرنے کے لئے آمیزے کو پانی میں گھول لیں اور فلٹر کریں، فلٹر کرنے کے لئے ٹین کی بازاری قیف استعمال کریں اور فلٹر پیپر کی بجائے سفید بلاٹنگ پیپر استعمال ہو سکتا ہے۔ بیکر (BEAKER) کی بجائے گلاس استعمال کریں۔ اگر آمیزے میں کوئی اڑنے والی ٹھوس چیز مثلاً نوشادر یا کافور ہے تو آمیزے کو چینی کی پیالی میں ڈالیں اور اس چینی کی پیالی کے اوپر دوسری چینی کی پیالی ڈھک دیں اور آمیزے والی پیالی کو سینڈ باتھ میں رکھ کر گرم کریں تو نوشادر یا دیگر اڑنے والی چیز اڑ کر اوپر والی پیالی میں جم جائے گی، یہ سب تجربہ گھر میں ہو سکتا ہے۔

کسی چیز کا کیمیاوی خالص نمونہ (CHEMICALLY PURE SAMPLE) بنانا۔ دی ہوئی چیز کو پانی میں حل کر کے فلٹر کر لیں۔ جو فلٹر شدہ محلول ہو اس کو قلمائیں۔ قلمانے کا طریقہ اوپر درج ہو چکا ہے۔ یہ قلمیں بالکل خالص کیمیاوی شے کی ہوں گی۔ اس طریقے سے پھٹکری، نیلے تھوتھے وغیرہ کے کیمیاوی خالص نمونے تیار ہو سکتے ہیں۔

کیمیاوی اجزا (RADICALS) کا تجربہ۔ کیمیاوی اجزا کی تھوڑی بہت سدھ بدھ میٹرک سے ہی ہونی چاہئے کیوں کہ کیمیا میں اس عمل کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اسپرٹ لیمپ کے شعلے میں لپٹا ہوا سفوف ڈالنے سے کافی عناصر کا پتہ چل سکتا ہے، اگر شعلہ کے رنگ کو غور سے دیکھیں اور مندرجہ ذیل جدول استعمال کریں۔

عنصر		شعلے کا رنگ
(BARIUM)	بیریم	زردی مائل سبز
(CALCIUM)	کیلشیم	زردی مائل سرخ

گہرا سرخ — اسٹرونشیم (STRONTIUM)

اودا — پوٹاشیم (POTASSIUM)

پیلا — سوڈیم (SODIUM)

دوسرا طریقہ گیلا ٹیسٹ (WET TEST) سفوف کو پانی میں حل کریں اور امتحانی نلی میں تھوڑا سا ڈالیں۔ اور پانچ دس بوند سلور نائٹریٹ سلوشن کے ڈالیں۔ اگر سفید رنگ کا گاڑھا سفوف ہے تو کلورائیڈ ہے۔ اگر پیلے رنگ کا سفوف ہو تو برومائیڈ ہے، اور اگر نارنجی رنگ کا سفوف ہے تو آیوڈائیڈ ہے، اگر سلور نائیٹریٹ کا محلول ڈالنے سے سفوف نہ بنے تو سفوف کے محلول میں بیریم کلورائیڈ کا محلول ڈالیں اگر سفید رنگ کا سفوف ہے تو سالٹ سلفیٹ ہے۔ اگر سالٹ نائیٹریٹ ہو تو اس کے لئے RING TEST کریں جو نصاب کی کتاب میں درج ہے ⁂

ایمیل

یا

رُوسو کی تعلیم

توقیر مرزا رزقی

مسلسل ۲۵

ہمارا جذبہ حُبِّ نفس جو انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے اور مرتے دم تک اس سے کبھی جدا نہیں ہوتا ہمارے جملہ جذبات کی جڑ بنیاد ہوتا ہے۔ یہ جذبہ ابتدائی طبعی اور جملہ ماسبق پر جو ایک محافظ ہے محض اسی کی ترمیمات میں مقدم ہے اس اعتبار سے اگر آپ فرمائیں تو جملہ جذبات فطری ہی ہوتے ہیں۔ لیکن ان ترمیمات کی کثرت ان بیرونی اثرات کا نتیجہ ہوتی ہے جن کے بغیر وہ کبھی وجود میں ہی نہیں آسکتی ہیں۔ اور ایسی ترمیمات ہمارے لئے مفید تو درکنار ضرررساں ہی ہوتی ہیں، وہ اصلی مقصد کو بدل کر اس کے خلاف ہی کام کرنے لگتی ہیں، پھر اسوقت انسان خود کو فطرت کے باہر اور اپنے نفس سے برسرِپیکار پاتا ہے۔

حُبِّ نفس ہمیشہ اچھی اور قوانین قدرت کی پابند ہوتی ہے۔ زندگی کی حفاظت ہم میں سے ہر ایک پر بطورِ خاص لازم ہے پس اس کی خبرگیری ہماری اولین فکر ہوتی ہے اور ہونی چاہیئے، پس اس کی حفاظت میں اگر ہم انتہائی دلچسپی سے کام نہ لیں تو پھر اس کی مسلسل نگہداشت اور خبرگیری ہم کیوں کر کر سکتے ہیں؟

لہٰذا حفاظتِ نفس کا یہ تقاضہ ہے کہ ہم اپنی ذات اور نفس سے محبت کریں۔ پس اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اپنی ذات سے ہم سب سے زیادہ محبت رکھیں اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم اس شئے سے بھی محبت رکھیں جو ہماری ذاتی حفاظت میں ممد اور معاون ہو۔ ہر بچہ اپنی انّا کا دلدادہ ہوتا ہے۔ رومیولس (ROMULUS) یقیناً اس مادہ بھیڑیئے سے محبت کرتا ہوگا جس نے کہ اسے اپنی چھاتیوں کا دودھ چوسایا تھا۔ ابتداءً یہ اُنس بالکل نادانستہ ہوتا ہے۔ انفرادی طور پر ہر شخص اس کام کی طرف مائل ہوتا ہے جس میں اسے اپنی بہبودی نظر آتی ہے

اور وہ اس کام سے اعراض کرتا ہے جس میں کہ اسے نقصان معلوم ہوتا ہے، یہ محض ایک اندھی فطرت ہوتی ہے لیکن جو چیز اس اندھی فطرت کو احساس اور اس میلان کو محبت میں تبدیل کر دیتی ہے، وہ اپنی ذات کو فائدہ یا نقصان پہونچانے کا یہی ارادہ ہوتا ہے، اس احساس کے بغیر جو شخص وہی راہ اختیار کرتا ہے جو اسے نظر آتی ہے ہم کسی چیز سے فریفتگی کے ساتھ وابستہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ بلکہ ہم صرف انھی اشیاء سے وابستہ ہوتے ہیں جن کی اندرونی کیفیت یا ارادے سے ہمیں نفع یا نقصان پہونچنے کی توقع ہوتی ہے، جن اشیاء کو آزادی کے ساتھ اپنے موافق یا مخالف عمل کرتا ہوا دیکھتے ہیں، وہ ہم میں اپنے ہی مانند ایسے احساسات پیدا کر دیتی ہیں۔ جن کا وہ ہمارے سامنے مظاہرہ کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اگر کوئی چیز ہمیں فائدہ پہونچاتی ہے تو اسے ہم پسند کرنے لگتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص ہمارے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے تو اس سے ہم محبت کرنے لگتے ہیں۔ اور کوئی چیز ہمیں اگر نقصان پہونچاتی ہے تو اس سے ہم پرہیز کرتے ہیں۔ لیکن کوئی اگر ہمیں زیاں پہونچانے کی کوشش کرتا ہے تو اس سے ہم نفرت کرنے لگتے ہیں۔

بچے کا اولین خیال حب نفس اور دوسرا خیال جو پہلے ہی کی تخلیق ہوتا ہے اپنے متعلقین سے محبت کرنا ہوتا ہے، اس لئے کہ اپنی بے چارگی اور ناتوانی کے باعث وہ لوگوں سے اس امداد اور خبر گیری ہی کی وجہ سے واقفیت حاصل کرتا ہے، جو کہ وہ ان لوگوں سے حاصل کرتا ہے۔ انّا اور آیا کی محبت ابتداءً اس کو عادت کی بنا پر ہوتی ہے ایک بچہ ان کا اس لئے متلاشی رہتا ہے کہ اسے ان کی ضرورت رہتی ہے، اور اس لئے کہ جب وہ اس کے نزدیک رہتی ہیں تو اسے آرام و چین ملتا ہے اور خوش رہتا ہے پس محبانہ احساس کی نسبت زیادہ تر محض شناسائی کا ہی احساس ہوتا ہے، یہ معلوم کرنے میں ایک بچے کو کافی مدت لگ جاتی ہے کہ وہ نہ صرف اس کے لئے کارآمد ہی ہوتی ہیں بلکہ وہ اسے آرام اور فائدہ پہونچانے کی خواہاں بھی رہتی ہیں، پس جس وقت وہ یہ محسوس کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ پھر اس وقت سے وہ ان سے محبت کرنے لگتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بچہ محبانہ اور کریمانہ احساس کا فطرتاً حامل ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے ارد گرد ہر شخص اس کی امداد کرنے کا میلان رکھتا ہے، پس اپنے اس تجربے کے باعث اپنے ہم جنسوں کے لئے وہ ایک مخلصانہ اور محبانہ احساس رکھنے کا عادی ہو جاتا ہے، لیکن تعلقات کی

ایمیل یا روسو کی تعلیم

توقیر مرزا رزقی

مسلسل ۲۵

ہمارا جذبہ حُبِّ نفس جو انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے اور مرتے دم تک اس سے کبھی جدا نہیں ہوتا ہمارے جملہ جذبات کی جڑ بنیاد ہوتا ہے۔ یہ جذبہ ابتدائی طبعی اور جملہ مابقی پر جو ایک محافظ ہے محض اسی کی ترمیمات میں مقدم ہے، اس اعتبار سے اگر آپ فرمائیں تو جملہ جذبات فطری ہی ہوتے ہیں۔ لیکن ان ترمیمات کی کثرت ان بیرونی اثرات کا نتیجہ ہوتی ہے جن کے بغیر وہ کبھی وجود میں ہی نہیں آسکتی ہیں۔ اور ایسی ترمیمات ہمارے لئے مفید تو در کنار ضرر رساں ہی ہوتی ہیں، وہ اصلی مقصد کو بدل کر اس کے خلاف ہی کام کرنے لگتی ہیں، پھر اسوقت انسان خود کو فطرت کے باہر اور اپنے نفس سے برسرپیکار پاتا ہے۔

حُبِّ نفس ہمیشہ اچھی اور قوانین قدرت کی پابند ہوتی ہے۔ زندگی کی حفاظت ہم میں سے ہر ایک پر بطور خاص لازم ہے پس اس کی خبر گیری ہماری اولین فکر ہوتی ہے اور ہونی چاہیئے، پس اس کی حفاظت میں اگر ہم انتہائی دلچسپی سے کام نہ لیں تو پھر اس کی مسلسل نگہداشت اور خبر گیری ہم کیوں کر کر سکتے ہیں؟

لہذا حفاظتِ نفس کا یہ تقاضہ ہے کہ ہم اپنی ذات اور نفس سے محبت کریں پس اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اپنی ذات سے ہم سب سے زیادہ محبت رکھیں اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم اس شئے سے بھی محبت رکھیں جو ہماری ذاتی حفاظت میں ممد اور معاون ہو۔ ہر بچہ اپنی انّا کا دلدادہ ہوتا ہے۔ رومیولس (ROMULUS) یقیناً اس، مادہ بھیڑیے سے محبت کرتا ہوگا جس نے کہ اسے اپنی چھاتیوں کا دودھ چوسایا تھا۔ ابتداءً یہ اُنس بالکل نادانستہ ہوتا ہے۔ انفرادی طور پر ہر شخص اس کام کی طرف مائل ہوتا ہے جس میں اسے اپنی بہبودی نظر آتی ہے

اور وہ اس کام سے اعراض کرتا ہے جس میں کہ اسے نقصان معلوم ہوتا ہے، یہ محض ایک اندھی فطرت ہوتی ہے پس جو چیز اس اندھی فطرت کو احساس اور اس میلان کو محبت میں تبدیل کر دیتی ہے، وہ اپنی ذات کو فائدہ یا نقصان پہونچانے کا بین ارادہ ہوتا ہے، اس احساس کے بغیر جو محض وہی راہ اختیار کرتا ہے جو اسے نظر آتی ہے ہم کسی چیز سے ذہنیت کے ساتھ وابستہ نہیں ہو سکتے ہیں. بلکہ ہم صرف انھی اشیاء سے وابستہ ہوتے ہیں جن کی اندرونی کیفیت یا ارادے سے ہمیں نفع یا نقصان پہونچنے کی توقع ہوتی ہے، جن اشیاء کو آزادی کے ساتھ اپنے موافق یا مخالف عمل کرتا ہوا دیکھتے ہیں، وہ ہم میں اپنے ہی مانند ایسے احساسات پیدا کر دیتی ہیں. جن کا وہ ہمارے سامنے مظاہرہ کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں. اگر کوئی چیز ہمیں فائدہ پہونچاتی ہے تو اسے ہم پسند کرنے لگتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص ہمارے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے تو اس سے ہم محبت کرنے لگتے ہیں. اور کوئی چیز ہمیں اگر نقصان پہونچاتی ہے تو اس سے ہم پرہیز کرتے ہیں لیکن کوئی اگر ہمیں زیاں پہونچانے کی کوشش کرتا ہے تو اس سے ہم نفرت کرنے لگتے ہیں.

بچے کا اولین خیال حب نفس اور دوسرا خیال جو پہلے ہی کی تخلیق ہوتا ہے اپنے متعلقین سے محبت کرنا ہوتا ہے، اس لئے کہ اپنی بے چارگی اور ناتوانی کے باعث وہ لوگوں سے اس امداد اور خبرگیری ہی کی وجہ سے واقفیت حاصل کرتا ہے، جو کہ وہ ان لوگوں سے حاصل کرتا ہے. انا اور آیا کی محبت ابتداً اس کو عادت کی بنا پر ہوتی ہے ایک بچہ ان کا اس لئے متلاشی رہتا ہے کہ اسے ان کی ضرورت رہتی ہے، اور اس لئے کہ جب وہ اس کے نزدیک رہتی ہیں تو اسے آرام وچین ملتا ہے اور خوش رہتا ہے پس محبانہ احساس کی نسبت زیادہ تر محض شناسائی کا ہی احساس ہوتا ہے، یہ معلوم کرنے میں ایک بچے کو کافی مدت لگ جاتی ہے کہ وہ نہ صرف اس کے لئے کارآمد ہی ہوتی ہیں بلکہ وہ اسے آرام اور فائدہ پہونچانے کی خواہاں بھی رہتی ہیں، پس جس وقت وہ یہ محسوس کرنے کے قابل ہو جاتا ہے. پھر اس وقت سے وہ ان سے محبت کرنے لگتا ہے.

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بچہ محبانہ اور کریمانہ احساس کا فطرتاً حامل ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے اردگرد ہر شخص اس کی امداد کرنے کا میلان رکھتا ہے، پس اپنے اس تجربے کے باعث اپنے ہم جنسوں کے لئے وہ ایک مخلصانہ اور محبانہ احساس رکھنے کا عادی ہو جاتا ہے لیکن تعلقات کی

وسعت کے ساتھ ہی بچے کی ضروریات معروف یا مجہول احتیاج اور دوسروں کے ساتھ اس کے تعلقات کی تیز بیداری ہو جاتی ہے، اور احساسات اس کے فرائض اور ان کی تقویم کی رہبری کرنے لگتے ہیں۔ اس وقت بچہ خود بین، تلشکی المزاج، حیلہ ساز اور کینہ پرور بن جاتا ہے، جب کبھی کوئی کام اسے کرنے کو دیا جاتا ہے اگر اس میں کوئی فائدہ نہیں دیکھتا اور اس کی انجام دہی کے لئے اسے مجبور بھی نہیں کیا جاتا ہے تو وہ اس کام کو توہم پرستی اور اس کے تکلیف پہونچانے کا ایک ارادہ تصور کر کے بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر لوگ اسے ڈھیل دے دیتے ہیں تو جب کبھی کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف ہوتی ہے، اسے وہ اپنی بغاوت اور بالارادہ مخالفت سے تعبیر کر کے اس نافرمانی کے باعث کرسی یا میز کو دھڑ دھڑانے لگتا ہے۔

حب نفس جو محض ہماری ذات ہی سے تعلق رکھتی ہے، ہماری ذاتی ضرورتوں کے پورا ہو جانے پر قانع ہو جاتی ہے لیکن خود غرضی یا طبع جو سدا اپنی ذات کا دوسروں سے مقابلہ کرتی رہتی ہے کبھی مطمئن نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے، اس لئے کہ یہ احساس جو ہماری ذات کو دوسروں پر ترجیح دلاتا ہے اس امر کا خواہاں رہتا ہے کہ دوسرے بھی ہماری ذات کو اپنے اوپر ترجیح دیں جو محض ایک غیر ممکن چیز ہے، لہذا لطیف اور معصوم جذبات تو حب نفس ہی سے پیدا ہوتے ہیں لیکن ذلیل اور تند جذبات محض خود غرضی ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں، پس اس سے معلوم ہوا کہ حاجتوں کی قلت اور اس دائرے کی تنگی جس میں کہ اپنی ذات کا دوسروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے، ایک آدمی کو حقیقتاً نیک اور افضل بنا دیتی ہے اور ایک انسان کو جو چیز فی الواقعی ذلیل اور بدکردار بناتی ہے وہ ان حاجتوں کی کثرت اور دوسروں کی رائے کی احتیاج ہے، یہ معلوم کرنا بہت آسان ہے کہ بچوں اور آدمیوں کے ہر جذبہ کی نیکی یا بدی کی طرف وہ نمائی کرنے کے لئے اس اصول کو کیوں کر روبہ عمل لایا جا سکتا ہے، انسان حقیقتاً ہمیشہ تنہا نہیں رہ سکتا، اس لئے اس کا نیک بخت اور صالح رہنا بڑا دشوار ہے اور جب آدمی کے تعلقات دوسروں سے بڑھنے لگتے ہیں تو اس معیت میں فرضاً اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ لہذا سماجی زندگی کے خطرات کا یہ مطالبہ مقدم ہے کہ جدید ضرورتوں کے باعث پیدا شدہ خرابیوں کے خلاف قلب انسانی کی حفاظت کے فرض کو لازماً بڑی ہی ہنرمندی اور ہوشیاری سے کام میں لایا جائے۔

ایک انسان کے حقیقی مطالعہ کی چیز اس کے ماحولی تعلقات ہوتے ہیں، جس وقت تک کہ وہ اپنے ماحول کو محض اپنی طبعی فطرت کے ذریعہ ہی جان سکتا ہو اس وقت تک اپنی ذات کا مطالعہ اس کو اشیائے مادی کے تعلق سے ہی کرنا چاہیئے، یہ کام انسان کے بچپن کا ہے، لیکن جب وہ اپنی اخلاقی فطرت کو بھی سمجھنے لگے تو اس وقت اپنی ذات کا مطالعہ اپنے ہم جنسوں کے تعلقات کے ساتھ کرنا چاہیئے، یہ کام انسان کی زندگی بھر کا ہے پس اب ہم اس دور میں پہونچ گئے ہیں جب کہ یہ مطالعہ شروع ہو جانا چاہیئے۔

انسان کو جوں ہی صحبت کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے پھر وہ منقطع مخلوق نہیں رہتا ہے اور اس کا دل بھی تنہا نہیں رہ سکتا ہے۔ ہم جنسوں کے تعلقات اور اس کے دل کا سارا پریم وجود میں آجاتی ہے۔ اس کا جذبہ اولی ہی جبلہ ما بقی کو فوراً بیدار کر دیتا ہے۔

طبیعت کا رخ مذبذب ہو جاتا ہے۔ ایک صنف دوسری کی جانب کھینچنے لگتی ہے اور یہ حرکت خداداد ہوتی ہے، پسند، تقدیم اور انفرادی شیفتگی عقل، تاثرات اور عادت کے کام ہیں، پس ہمیں محبت کرنے کے قابل بنانے کے لئے وقت اور علم کی ضرورت ہوتی ہے، ہم کسی چیز سے بلا سبب محبت اور کسی چیز کو بلا تفاعل دوسری چیز پر مقدم نہیں کرتے ہیں، یہ فیصلے گو نادانستہ ہیں لیکن حقیقی ہونے سے یہ کسی حال میں بھی کم نہیں ہوتے ہیں، آپ جو چاہیں فرمائیں حقیقی محبت بنی نوع انسان میں ہمیشہ احترام ہی کی نظر سے دیکھی جائے گی، اس لئے کہ گو اس کی تحریکات ہمیں گمراہ کر دیتی ہیں، تاہم اس میں بعض ایسے قابل قدر خصائل ما قبل ہی تصور کر لئے جاتے ہیں کہ ان کے بغیر ہم محبت کرنے کے لائق ہو ہی نہیں سکتے ہیں، یہ انتخاب یا تقدیم جو خلاف عقل تصور کر لی جاتی ہے، فی الواقع عقل ہی کی تخلیق ہوتی ہے، ہم کہتے ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے، اس لئے کہ اس کی نظر ہم سے بہتر ہوتی ہے اور وہ ان تعلقات تک کو کھو دیتی ہے جنھیں ہم معلوم بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ ایک ایسے آدمی کے لئے جسے کہ عفت یا حسن کا کوئی تخیل ہی نہ ہو، ساری عورتیں مساوی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور اسے پہلے نظر آنے والی عورت ہی ہمیشہ دل فریب ترین معلوم ہوتی ہے، محبت قدرت کی مخلوق نہیں ہے بلکہ اس سے بہت بعید ہوتی ہے، کیوں کہ یہ تو قدرتی خواہشات کی ایک نظام اور قانون ہوتی ہے، یہ محبت ہی تو ہے جو باستثنے معشوق ایک صنف کو دوسری صنف سے مستغنی اور بے پروا بنا دیتی ہے۔

اپنی محسوس کردہ تقدیم یا ترجیح کو ہم الہامی بنانے کے خواہاں رہتے ہیں عشق دو طرفہ ہونا چاہیے محبوب بننے کے لیے ہمیں پہلے محبت کا اصل ہونا ضروری ہے اور تقدیم و ترجیح حاصل کرنے کے لیے ہمیں کم از کم اپنی معشوقہ کی نگاہوں میں ماتقی سب سے زیادہ باوصف صاحب کمال اور صاحب احترام ہونا چاہیے، لہٰذا ہم چاروں طرف اپنے ساتھیوں کو دیکھتے اور ان سے اپنا مقابلہ کرنا شروع کر دیتے ہیں تو پھر ہم میں ہمسری رقابت اور حسد نمودار ہو جاتے ہیں - ایک محبت آلود دل اظہار محبت کا دل دادہ رہتا ہے، ایک معشوق کی ضرورت جلد ہی ایک دوست اور حبیب کی ضرورت پیدا کر دیتی ہے جو یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ محبوب بننے میں کس قدر حلاوت ہے وہ محبوب عالم بننے کا آرزومند رہتا ہے، اگر دنیا میں بہت سے لوگ ایسے نہ ہوتے۔ جو اطمینان حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں تو فضائل کا ذکر بھی نہ ہوتا، محبت اور دوستی سے نا اتفاقی عداوت اور کینہ کی ابتدا ہوتی ہے، ہمیں ان تمام مختلف جذبات میں دوسرے لوگوں کے خیالات کا احترام جلوہ فگن پاتا ہوں اور بے وقوف نانی انسان نوران کی قوتوں کے غلام بن کر اپنے وجود کو محض دوسروں کی خاطر ذلیل و خوار کرتے ہیں۔

ان تخیلات کو آپ وسعت دیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس خود غرضی کو جسے ہم فطری کہتے ہیں ہم کہاں سے حاصل کرتے ہیں اور وہ سادہ احساس کیوں نہیں رہتی ہے یہ کہ وہ بڑے دل میں غرور اور چھوٹے دل میں تصنع اور ریاکاری کس طرح بن جاتی اور ہر دو صورتوں میں ہمارے پڑوسی ہی کی جان پر ایک مستقل وبال بنی رہتی ہے، اس قسم کے جذبات کا بچے کے دل میں کوئی تخم نہ ہونے کی وجہ سے اس کے دل میں وہ از خود کبھی پیدا نہیں ہو سکتے ہیں، ہم ہی ان کی تخم ریزی کرتے ہیں اور وہ ہمارے قصور بغیر کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتے ہیں، نوجوان آدمی کے ساتھ معاشرہ دوسرا ہوتا ہے، یہ جذبات ہمارے باوجود اس کے دل میں داخلہ حاصل کر لیتے ہیں۔ لہٰذا اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنا طریق کار تبدیل کر دیں۔

ہمیں زیر بحث نازک دور کے اعتبار سے چند اہم امور کا لحاظ رکھ کر ابتدا کرنی چاہیے۔ قدرت نے نابالغ کے بلوغ کا یقین طور پر کوئی وقت مقرر نہیں کیا ہے، بلکہ وہ وقت انفرادی مزاج اور معاشی حالت کے مطابق مختلف ہوتا ہے، گرم اور سرد ممالک میں اس معاملہ کے متعلق جو فرق مشاہدہ کیا گیا ہے اس سے ہر کس و ناکس

واقف ہے، اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ گرم مزاج لوگ اوروں کی نسبت زیادہ جلد بلوغ حاصل کر لیتے ہیں، لیکن وجوہات اور اسباب کے متعلق ہم دھوکہ کھا سکتے ہیں، اور ہم اکثر حقیقتاً اخلاقی اسباب کے نتائج کو طبعی اسباب پر محمول کر سکتے ہیں۔ ہمارے زمانے کے فلسفے کی یہ ایک ادنیٰ ترین غلطی ہے، قدرت کی تعلیم آہستہ آہستہ ہوتی ہے، آدمی کا سبق اکثر و بیشتر قبل از وقت ہوتا ہے۔ اول الذکر میں حواس تصور کو سلگاتے ہیں اور آخر الذکر میں تصور حواس کو بھڑکاتا ہے اور قبل از وقت مستعدی پیدا کر دیتا ہے، جو افراد کو ضعیف و ناتواں بنانے میں کبھی نہیں چوکتی اور بالآخر ساری قوم کو ہی کمزور بنا دیتی ہے، یہ واقعہ آب و ہوا کے اثرات سے بھی زیادہ عام اور قابل وثوق ہے کہ بلوغت اور صنفی خواہش (شہوت) تعلیم یافتہ اور متمدن اقوام میں جاہل اور وحشی[1] اقوام کی نسبت زیادہ قبل از وقت نمودار ہو جاتی ہے۔

بچے شائستگی کے لباس میں پوشیدہ فحش عادتوں کو معلوم کر لیتے ہیں، خلاف فطرت بہت تیز ہوتے ہیں، بلیغ تقریر جو انہیں تاکیداً سنائی جاتی ہے، اچھے چلن کے سبق اور وہ پردہ راز جو آپ ان کی آنکھوں پر ڈال دینا بیان فرماتے ہیں محض ان کی جستجو کو بھڑکانے کی خدمت انجام دیتے ہیں، آپ کے اختیار کردہ طریقے سے

---

[1] مسٹر بفون کہتے ہیں کہ شہروں اور مرفع الحال جماعتوں کے بچے جو مقوی اور زائد مقدار غذاؤں کے عادی ہوتے ہیں اس حالت کو جلد پہونچ جاتے ہیں، دیہاتیوں اور ناداروں میں بچے زیادہ پست ہوتے ہیں، کیونکہ ان کی غذا کم مقدار اور کم قوت ہوتی ہے۔" میں اس دافع کو تسلیم کرتا ہوں لیکن وجوہات سے متفق نہیں ہوں، اس لئے کہ جن اضلاع میں دیہاتیوں کو بافراط اور عمدہ غذا میسر ہے، مثلاً ویلاس (VALAIS) میں اور جیسی کہ اٹلی کے بعض پہاڑی اضلاع مثلاً فرولی (FRULI) میں بھی ہر دو اصناف بالکل اسی قدر تاخیر سے بلوغت کو پہونچتے ہیں، جتنی تاخیر سے شہروں کے بیچ میں رہنے والے وہ لوگ جو اپنی نمود کو مطمئن کرنے کی غرض سے غذا کے معاملہ میں اشد کنجوسی سے کام لیتے ہیں اور جہاں کے اکثر رہنے والے سفید پوش فاقہ مست ہوتے ہیں، ان پہاڑی علاقوں میں بڑے بڑے لڑکوں کو جو ایک پورے آدمی کی مانند طاقتور ہوتے ہیں۔ میٹھی آوازیں اور چکنی ٹھوڑیاں اور بلند قامت لڑکیوں کو جو دوسرے لحاظ سے اچھی نشو و نما پائی ہوتی ہیں صنفی ماہواری فعل کے کسی آثار کی نمود بغیر دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا ہے، میرے خیال میں اس فرق کی ساری کی ساری وجہ یہ واقعہ ہے کہ ان کی سادہ زندگی کے باعث ان کا تصور ساکت اور پرامن رہتا ہے اور دیر تک خون میں حدت نہیں پیدا ہونے دیتا ہے اس لئے ان کا مزاج بھی کم پیش قدمی کرتا ہے۔

یہ بالکل عیاں ہے کہ جس چیز کو آپ مخفی رکھنے کے مدعی ہیں وہ اسے سیکھنے ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں، اور آپ کی سادی تعلیم میں یہی سب سے زیادہ میل کھاتی ہے۔

تجربے سے مشورہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ احمقانہ طریقہ قدرت کے کام میں کس حد تک جلدی پیدا کرکے چال چلن کو برباد کر دیتا ہے۔ ہمارے شہروں کے طبعی تنزل کے اسباب میں سب سے بڑا ایک سبب یہ بھی ہے کہ نوجوانان قبل از وقت ہی ٹھنڈے پڑ جانے کی وجہ سے نحیف سینہ قد ناتوان اور بدشکل رہ جاتے ہیں، قوی بننے کی بجائے ضعیف اور بوڑھے بن جاتے ہیں اور اس انگور کی بیل کے مانند ہو جاتے ہیں جو موسم بہار میں پھل دینے پر مجبور ہو کر خزاں کے قبل ہی مرجھا کر فنا ہو جاتی ہے۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ نادانی بچوں کی معصومیت کو کتنی مدت تک طوالت میں ڈال سکتی ہے، آپ کو سیدھے سادے دیہاتیوں میں جا کر رہنا چاہئے۔ مرد و زن دونوں اصناف کا عین حسن و شباب کے دور میں اپنے دلوں کو قابو میں رکھ کر بچپن کے کھیلوں میں مشغول رہنا اور اپنی تفریحات کی پاکی اور خلوص کا اس میل جول اور اختلاط کے ذریعہ ظاہر کرنا ایک عجیب دل کش اور بہار آفرین منظر معلوم ہوتا ہے اور بالآخر یہ نوجوان شادی کے رشتے میں پیوست ہو کر اپنا اولین ذاتی پھل ایک دوسرے کو بخشتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو اور بھی زیادہ عزیز ہو جاتے ہیں قوی ہیکل اور تندرست بچوں کے گروہ کے گروہ ان کے اس اتحاد کا جسے کوئی چیز بدل نہیں سکتی ایک تمغہ اور ان کی ابتدائی عمر کی پارسائی کا ایک ثمرہ ہوتے ہیں۔

وہ عمر جس میں کہ ایک آدمی کو اپنی صنفی تمیز حاصل ہوتی ہے، اگر تعلیمی اثرات کے ذریعہ اتنی ہی تعویق میں ڈالی جا سکتی ہے جتنی کہ قدرتی عمل کے ذریعہ۔ تو اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ بچے کی طرز رہائش اور پرورش کے ذریعہ حسب ضرورت، اس سن میں تعویق اور تعجیل ہو سکتی ہے، اور اگر جسمانی قوت یا کمزوری کا انحصار جسم کی نمو یا جسمی نشو نما کے تناسب پر ہوتا ہے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہم اس اٹھان کو جس قدر تعویق میں ڈالیں گے ایک نوجوان اتنا ہی زیادہ طاقت ور اور تندرست بن جائے گا، میں اب بھی خالص طبعی نتائج کا ذکر کر رہا ہوں، آپ کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ یہی سب کچھ نہیں ہے۔

ان امور کا لحاظ کرنے کرنے میں اس مسئلے کے حل کو پہنچ گیا ہوں۔ جو اکثر زیر بحث رہتا ہے کہ کیا ہم بچوں کے

ابتدائی دور ہی میں ان کی جستجو طلب شے پر روشنی ڈال دیں، یا شائستہ تصنعات کے ذریعے انہیں ٹالتے رہیں؛ میری رائے میں ان میں سے ہمیں ایک بات بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر یہ جستجو اس وقت تک پیدا نہ ہوگی جب تک کہ ہم اس کا موقع نہ دیں، اس لئے ہمیں اس بات کی احتیاط لازم ہے کہ ایسا موقع نہ دیا جائے ایسے سوالات جن کا جواب دینے پر ہم مجبور نہ ہوں۔ ہمیں ان لوگوں کو جو سوال کرتے ہیں دھوکہ یا فریب دینے کے لئے مجبور نہیں کرتے جھوٹ بولنے کی بجائے یہ بہتر ہوگا کہ بچے سے خاموش رہنے کو کہہ دیا جائے۔ اگر آپ نے بچے کو فضول امور کے متعلق ایسے جواب کا پہلے ہی سے عادی کر رکھا ہوگا تو بچے کو آپ کے اس سلوک سے کوئی زیادہ حیرت نہ ہوگی۔ ثانیاً، یہ کہ اگر آپ بچے کو جواب دینے کا فیصلہ کریں تو آپ کا جواب سادہ ترین بلا کسی ابہام یا اخفا اور بغیر تلبیہ کے ہونا چاہیئے۔ بچے کی جستجو کو بھڑکانے کی بہ نسبت اس کو مطمئن کر دینے میں بہت کم خطرہ ہوتا ہے

آپ کے جوابات کو ہمیشہ سنجیدہ، مختصر، قطعی اور غیر متزلزل ہونا چاہیئے، اور مجھے یہ اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان کا صحیح ہونا بھی ضروری ہے۔ ہم بچوں کے لوگوں سے جھوٹ بولنے کے خطرات کو آدمی کی طرف سے بچوں سے جھوٹ بولنے کے خطرات کو تسلیم کئے بغیر نہیں ظاہر کر سکتے ہیں۔ استاد کا ایک جھوٹ اس کی تعلیم کے جملہ نتائج کو برباد کر دیتا ہے۔

بعض امور کے متعلق بچوں کی قطعی لاعلمی شاید اعلیٰ ترین چیز ہے، لیکن جس چیز کا مستقلاً ان سے پوشیدہ رکھنا ناممکن ہو اسے بچوں کی صغر سنی ہی میں انہیں سکھا دینا چاہیئے۔ اس سے یا تو ان کی جستجو پھر کبھی برافروختہ ہی نہ ہوگی یا اس عمر کو پہنچنے کے قبل ہی وہ مطمئن ہو جائے گی، جب کہ وہ خدشات کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ اس معاملہ میں شاگرد کے ساتھ آپ کے رویے کا انحصار زیادہ تر اس کے ذاتی حالات، اس کی صحبت اور اس کی اس کیفیت پر ہوگا جس میں کہ وہ ہو کسی شے کو اتفاقات پر نہ چھوڑنا چاہیئے۔ پس اگر آپ بچے کو سولہ سال کی عمر تک صنفی اختلافات کے علم سے انجان نہیں رکھ سکتے ہیں تو یاد رکھئے کہ آپ اس بچے کو دس سالہ عمر کے قبل ہی ان اختلافات سے واقف کرا دیں۔

میں بچوں کے ساتھ گفتگو کرنے میں لوگوں کا زیادہ باریک بین ہونا پسند نہیں کرتا اور نہ ہی لوگوں کو دن کو دن اور رات کو رات کہنے سے بچنے کے لئے اپنے راستے سے بھٹکنا چاہیئے۔ اگر وہ کبھی ایسا کرتے ہیں تو

ہمیشہ پکڑے جاتے ہیں، اس لحاظ سے اچھے اور اعلیٰ اطوار یا اخلاق ہمیشہ کاملاً سادہ ہی ہوتے ہیں لیکن بدی کا بگاڑا ہوا تصور کانوں کو تمشکی بنا دیتا ہے اور ہمیں مجبور کرتا ہے کہ اپنے طہارت کی ہمیشہ اصلاح کرتے رہیں سیدھے سادھے الفاظ میں کوئی ہرج نہیں ہے وہ تو شہوانی تخیلات ہیں جن سے بچنا ضروری ہے۔

گو حیا آدمی میں فطرتاً موجود ہوتی ہے لیکن بچوں کے لئے یہ فطری نہیں ہوتی ہے، حجاب کی ابتدا محض بدی کے علم کے ساتھ ہوتی ہے تو پھر بدی کے علم کے بغیر بچے ان احساسوں کو جو بدی ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں کیوں کر محسوس کر سکتے ہیں؛ بچوں کو شرم و حیا اور نیک چلنی کا سبق دینا گویا انھیں یہ سکھانا ہے کہ دنیا میں بے حیائی اور بدچلنی جیسی چیزیں بھی موجود ہیں، اور یہ کہ ان میں ان چیزوں کو جاننے کی خفیہ خواہش پیدا کرنا ہے۔ دیر سویر وہ انھیں معلوم کر ہی لیں گے اور پھر پہلا ہی شرارہ جو تصوّر کو متاثر کرے گا یقیناً حواسوں کی بیداری میں سرعت پیدا کر دے گا۔ ندامت تصوّر کی علامت ہے حقیقی بے گناہی کسی چیز سے نہیں شرماتی ہے۔

بچوں میں وہی خواہشات نہیں ہوتیں جو بڑوں میں ہوتی ہیں، لیکن بچے بڑوں کی مانند ویسی ہی ناگوار ضرورتوں کے تابع ہوتے ہیں جو حواسوں کو برانگیختہ کرتی ہیں، بس انہی ضرورتوں کے ذریعہ بچے شائستگی اور اصلاح کے سبق بڑوں جیسے ہی حاصل کر سکتے ہیں، قدرت کی منشا پر چلیے جس نے کہ پوشیدہ لطائف اور ناگوار حاجتوں کے اعضا ایک ہی جگہ قائم کر دیئے ہیں، قدرت مختلف عمروں میں کبھی ایک تخیل کے ذریعہ کبھی دوسرے تخیل کے ذریعہ ہمیں ایک ہی قسم کی احتیاط سکھاتی ہے۔ بڑوں کو حیا حجاب کے ذریعہ اور بچے کو طہارت و صفائی کے ذریعے۔

بچے کی معصومیت کو برقرار رکھنے کا مجھے تو صرف ایک ہی قابل اطمینان طریقہ نظر آتا ہے کہ بچے کو ایسے لوگوں سے گھیرے رکھا جائے جو اس سے محبت کرتے اور اس کو عزیز رکھتے ہوں۔ اس کے بغیر بچے کو انجان رکھنے کی ہماری جملہ کوششیں دیر سویر ناکام ہو جاتی ہیں۔ ایک تبسم آنکھ کا اشارہ یا ایک بے محل حرکت بچے پر وہ تمام باتیں آشکارا کر دیتی ہے جنھیں کہ ہم اس سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں؛ بچے کو یہ محسوس کرانے کے لئے کہ کوئی ایسی چیز ہے جو ہم اس سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ بس اتنا ہی کافی ہے، نرم مزاج لوگ

جس شیریں کلامی اور نفاست سے کام لیتے ہیں وہ ایسے علم کا تصور قائم کراتی ہے جو بچوں کو ہرگز نہ حاصل ہونا چاہئے، اور بچے اس سے بے تعلق بھی ہوتے ہیں، لیکن بچے کی معصومیت کا جب ہم فی الواقع احترام کرتے ہیں تو اس سے گفتگو کرنے کے لئے ہمیں بآسانی موزوں اور سادہ جملے مل جاتے ہیں۔ ایک طریقہ راست مخالفت کا ہے جو معصومیت کے لئے موزوں اور پسندیدہ ہوتا ہے، بچے کو خطرناک جستجو سے پلٹانے کے لئے یہی لہجہ اختیار کرنا صحیح اور درست ہے، ہر معاملہ کے متعلق سیدھی سادھی گفتگو کرنے سے آپ بچے کو اس شک میں مبتلا ہونے سے بچا لیتے ہیں کہ کوئی بات اُن کہی رہ گئی ہے۔ ناگوار تخیلات کے ساتھ ایسے عجیب و غریب الفاظ کو متعلق کر دینے سے جن سے کہ وہ تخیلات ظاہر ہوتے ہوں، آپ تصور کے اولین شرارے کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں، آپ ان الفاظ کے استعمال یا ان تخیلات کے قائم کرنے سے بچے کو منع نہیں کرتے ہیں لیکن ناشائستہ ان کے دھیان تک سے آپ اسے بیزار کر دیتے ہیں، وہ لوگ جو ہمیشہ نیک نیتی کے ساتھ حق گو ہوتے ہیں اور زبان سے صرف وہی بات نکالتے ہیں جسے کہ وہ خود محسوس کرتے ہیں کہ کس قدر پریشانی اور پراگندگی سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

"ننھے بچے کہاں سے آتے ہیں"؟ یہ ایک نہایت ہی پریشان کن مسئلہ ہے جو بچوں کے دل میں عموماً پیدا ہوتا ہے، اور اس سوال کا ناشائستہ یا احمقانہ جواب ہی بچے کی زندگی بھر کی صحت یا اخلاق کے لئے فیصلہ کن ہوتا ہے۔ ایک ماں کے لئے کوئی بہانہ بنائے بغیر اس سوال کے جواب سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ بچے کو خاموش رہنے کے لئے کہہ دے۔ پس بچہ اگر بے ضرورت معاملات میں ہمیشہ ایسا جواب پانے کا عادی ہو گا اور اس جدید طرزِ عمل سے بچے کو کسی قسم کے اخفا راز کا شک و شبہ نہ گذرے گا تو بس اسی جواب سے مطلب حاصل ہو جائے گا۔ لیکن مائیں شاید و باید ہی ایسے جواب پر اکتفا کرتی ہیں، وہ عموماً کہہ دیتی ہیں۔ "یہ شادی شدہ لوگوں کا راز ہے، ننھے بچوں کو اس کی چھان بین اور کرید کی ضرورت نہیں ہے"۔ ماں کی حد تک یہ جواب بہت اچھا ہے، لیکن اسے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ چھوٹا سا بچہ اس پر حقارت طرزِ جواب کی خلش دل میں رکھ کر اس وقت تک ہرگز چین نہیں لے گا جس وقت تک کہ وہ شادی شدہ لوگوں کا بھید دریافت کرلے اور یہ بھید اس کو بہت جلد معلوم ہو ہی جاتا ہے۔

میں اسی سوال کا آپ سے ایک بالکل ہی مختلف جواب بیان کرتا ہوں، جسے میں ایک ایسی پاک گفتار اور نیک اطوار عورت کی زبان سے سن کر بے حد متاثر ہوا تھا جو اپنے بچے کی بہی خواہی اور تقوے کی خاطر ہر وقت بے وقوفوں کے بے ہودہ تمسخر اور التزام کے باطل خوف کو نظر انداز کر سکنے کے قابل تھی۔ بچہ اس چھوٹے سے پتھر تک بھی نہ پہونچا تھا جو راستے میں پڑا تھا کہ اس کی پریشانی جاتی رہی اور فراموش ہو گئی۔ پڑوسنیوں نے بچے سے دریافت کیا: "امی جان ننھے بچے کہاں سے آتے ہیں" ماں نے بے دریغ فوراً ہی جواب دیا۔ بیٹا انھیں عورتیں بڑی تکلیف سے جنتی ہیں، جس میں اکثر ان کی جان بھی قربان ہو جاتی ہے"، نادانوں کو ہنسنے دیجیے اور احمقوں کو ششدر رہنے دیجیے، لیکن اگر اس سے زیادہ معقول اور اپنے مقصد کو پورا کرنے والا کوئی جواب ممکن ہو سکتا ہے تو عقل مندوں کو دریافت کرنے دیجیے۔

ابتداءً قدرت کی ضرورت کا خیال جس سے کہ بچہ واقف ہے ایک مخفی کارروائی کے تخیل سے بچے کے خیالات کو پلٹا دیتا ہے، درد اور موت کے متعلقہ تخیلات اس پر اداسی کی نقاب ڈال دیتے ہیں جو تصوّر کو مردہ کر دیتی ہے اور تجسس کو دبا دیتی ہے، ہر بات بچے کی پیدائش کے اسباب کی نہیں بلکہ نتائج کی رہ نمائی کرتی ہے، یہی اطلاع ہے جس کی اس جواب سے رہ نمائی ہوتی ہے، اگر اس جواب سے پیدا شدہ کراہیت بچے کو مزید تفصیلات دریافت کرنے کی اجازت دے تو بچے کے خیالات انسانی فطرت کی بے ثباتی۔ حقارت انگیز اشیا۔ اور دردوں کی تصاویر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ایسی گفتگو میں خواہشات نفسانیہ کے بھڑکنے کا کیا موقع حاصل ہو سکتا ہے اور پھر آپ یہ بھی ملاحظہ فرماتے ہیں کہ حق نظر انداز نہ ہوا اور طالب علم کو تعلیم دینے کے لئے کسی قسم کا دھوکہ دینے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

آپ کے بچے پڑھتے ہیں، ان کی پڑھائی کے دوران میں انھیں ایسی ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جنھیں بغیر پڑھے وہ کبھی معلوم ہی نہیں کر سکتے، کیا یہ طالب علم ہیں یا ان کا تصور خاموش مطالعہ ہی میں بیدار کیا اٹھتا اور تیز ہو جاتا ہے کیا وہ سماجی دنیا میں میل جول رکھتے ہیں، وہ اس میں ایک عجیب و غریب مبہم آواز سنتے اور ایسے طریق و طور دیکھتے ہیں جو ان پر ایک پُر اثر ڈالتے ہیں، ان بچوں کو ہمیشہ اس قدر شد و مد کے ساتھ بتایا جاتا ہے کہ وہ آدمی ہیں کہ لوگ جو کچھ بھی ان کے سامنے کرتے ہیں اس کے متعلق وہ فوراً یہ معلوم کرنے کی کوشش میں

لگ جاتے ہیں کہ وہ بات ان کے لئے کیوں کر مفید ہو سکتی ہے، دوسروں کے افعال ان کے لئے لازماً نمونہ ہونے چاہئیں. بالخصوص جب کہ دوسروں کے خیالات ان کا قانون ہوتے ہیں. نوکر چاکر بچوں کے محتاج ہوتے ہیں، اس لئے بچوں کو خوش کرنے کے لئے وہ ان کی خوشامد کرکے ان کے اخلاق برباد کردیتے ہیں. کھلاتی ہوئی دایہ چار سال کی عمر کے بچے سے ایسی باتیں کرتی ہے جو ایک بے حیا سے بے حیا عورت بھی ایک پندرہ سالہ عمر کے بچے کے روبرو زبان پر لانے کی جرات نہیں کرسکتی. دایہ تو اپنی کہی ہوئی بات فوراً ہی بھول جاتی ہے. لیکن بچہ اپنی سنی ہوئی کبھی نہیں بھولتا. فحش گفتگو نفسانی شہوت کا راستہ تیار کردیتی ہے: بچہ چالاک ملازم کی بدولت حرام کار بن جاتا ہے. اور ایک کا راز دوسرے کے بھید کی ضمانت ہوجاتی ہے.

جس بچے کی تربیت اس کی عمر کے مطابق ہوتی ہے وہ تنہا ہوتا ہے، اور وہ عادت کے سوا کسی اور چیز سے مانوس نہیں ہوتا، وہ اپنی بہن سے اپنے محافظ اور اپنے دوستوں سے ایک کتے کی مانند محبت کرتا ہے وہ بچہ اپنی صنف اور اس کی اقسام سے بے خبر ہوتا ہے، مرد عورت دونوں سے ناآشنا ہوتا ہے، اس لئے ان کے افعال اور اقوال کو وہ اپنی ذات سے متعلق نہیں کرسکتا ہے، وہ نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے، بلکہ وہ ان کی طرف دھیان بھی نہیں کرتا ہے، بچہ کو نہ ان کے کسی قول سے کوئی تعلق ہے نہ ان کے کسی فعل سے اس لئے کہ وہ اس کے کسی کام ہی کے نہیں ہوتے ہیں. یہ کوئی مصنوعی نقص نہیں ہے جو ہمارے اس طریقۂ تعلیم سے رونما ہوا ہو بلکہ یہ تو فطری نادانی ہے، اب وقت آگیا ہے جب کہ یہی فطرت اپنے چیلے کو منور کرنے کی فکر کرے گی اور پھر صرف اس مقررہ وقت پر ہی بلاخوف خطر اسے اپنے سبق سے مستفید ہونے کے قابل بنادے گی میرا یہی ایک اصول ہے اس کے قواعد کی تفصیل سے مضمون سے غیر متعلق ہے، پس جو ذرائع میں دیگر معاملات کے متعلق تجویز کروں گا وہی اس کی تشریح کا بھی کام دے سکتے ہیں.

اگر آپ ابھرتے ہوئے جذبات کے متعلق کوئی قانون اور قاعدہ بنانا چاہتے ہیں تو آپ ان کی نشوونما کے دور کو طویل کردیجئے تاکہ جب وہ پیدا ہوں تو انھیں اپنا صحیح مقام معلوم کرنے کے لئے کافی وقت مل سکے. پھر اس وقت انہیں آدمی نہیں بلکہ فطرت ہی قابو میں رکھے گی. آپ کا کام محض اس معاملہ کو فطرت کے سپرد کردینا ہے. اگر آپ کے شاگرد تنہا ہوتے تو آپ کو کچھ بھی نہ کرنا پڑتا. لیکن ان کے اطراف کی ہر چیز اُن کے

تصور کو شعلہ زن کرتی ہے، وہ روایاتی تخیلات کی رَو میں بہ جاتے ہیں۔ پس ان سے نجات دلانے کے لئے آپ کو انہیں مخالف سمت کی ترغیب دینی ضروری ہے۔ تصور کو احساس کی لگام سے روکنا اور روایت کی آواز کو عقل کے ذریعہ خاموش کرنا ضروری ہے جس تمام جذبات کا سرچشمہ ہوتی ہے اور تصور ان جذبات کا راستہ معین کرتا ہے۔ ہر ذی روح جو اپنے تعلقات سے واقف ہوتا ہے، ان تعلقات میں تغیرات پیدا ہو جانے سے لازماً بیکل ہو جاتا ہے، بالخصوص جب کہ وہ دوسروں کو اپنی فطرت سے زیادہ بہتر مطابقت کرتے ہوئے تصور کرتا ہے۔ یہ تصور ہی کا قصور ہوتا ہے جو فانی ہستیوں بلکہ فرشتوں تک کے جذبات کو بشرطیکہ وہ جذبات رکھتے ہوں بدیوں کا روپ دیتا ہے، اس لئے کہ ہر ذی روح کی فطرت کو ان جذبات سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ ان تعلقات کو پہچان سکے جو اس کے لئے موافق ترین ہوں۔

جذبات کے استعمال کے متعلق انسانی عقل کی کل جمع حاصل یہی ہے کہ اولاً جنسی نوعیت اور انفرادیت دونوں کے حقیقی تعلقات سے آدمی باخبر ہو اور ثانیاً ان تعلقات کی مطابقت میں تمام الفتوں کو قابو میں رکھے لیکن کیا آدمی اس یا اُس قسم کے تعلقات کے مطابق اپنی الفتوں کو قابو میں رکھنے کی قدرت رکھتا ہے؛ بے شک وہ قدرت رکھتا ہے۔ بشرطیکہ اپنے تصور کو وہ اس یا اُس شے پر جانے کے لائق ہو یا یہ بلا دہ عادت ڈال لینے کے قابل ہو۔ علاوہ بریں ہمیں اس واقعہ سے اتنا تعلق نہیں ہے کہ ایک آدمی اپنے لئے کیا کر سکتا ہے، جتنا کہ ہمیں اس واقعہ سے تعلق ہے کہ ہم اپنے شاگرد کے لئے ان حالات کے ذریعہ جن میں کہ وہ رکھا جائے گا گویا صریحاً اسے یہ دکھانا ہے کہ وہ اس راہ سے کیوں کر بھٹک سکتا ہے۔

جب تک بچے کا شعور محض اس کی ذات تک محدود رہتا ہے، اس وقت تک اس کے افعال کو اخلاق سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہوتا ہے لیکن جب یہ شعور بچے کی ذاتی حدود سے باہر ہو کر وسعت اختیار کرتا ہے محض اس وقت حس اور نیکی و بدی کے تخیل پہلی مرتبہ نمودار ہوتے ہیں، جو دراصل بچے کو آدمی اور اس کی صنف کا مکمل جزو بنا دیتے ہیں۔ پس ابتداً ہمیں اپنا مشاہدہ اسی حد تک محدود رکھنا چاہیے۔

یہ مشاہدات بڑے دشوار ہوتے ہیں اس لئے کہ ہمیں ان مثالوں کو جو ہمارے روبرو پیش آتی ہیں ترک کر کے ان مثالوں کی تلاش کرنی ضروری ہوتی ہے، جن میں مسلسل حالتوں نے فطری نظام کی اقتدا کی ہو۔

ایک منطقی شائستہ اور متمدن بچہ جو اپنی قبل از وقت حاصل شدہ ہدایتوں کو عملی جامہ پہنانے کی قوت کے محض انتظار میں رہتا ہے، اس قوت کے حصول کی گھڑی کو پہچاننے میں کبھی نہیں چوکتا ہے۔ انتظار کرنا تو بہت بعید وہ اس میں اور بھی سرعت سے کام لیتا ہے اور قبل از وقت اٹھے ہوئے خمیر میں اس کی ملونی کر دیتا ہے۔ خواہشات نفسانیہ کا تجربہ حاصل کرنے کے بہت قبل وہ ان کے مقصود سے واقف ہوتا ہے، یہ جوش اس میں قدرت نہیں پیدا کرتی ہے۔ بلکہ وہ شخص پیدا کرتا ہے جو قدرت کو مجبور کر دیتا ہے جب وہ بچہ ایک آدمی بن جاتا ہے تو قدرت کے پاس اسے کچھ بھی سکھانے کو نہیں ہوتا ہے، فی الواقع آدمی بننے کے بہت قبل ہی وہ بچہ اپنے خیالات کے لحاظ سے آدمی بن چکا ہے۔

قدرت کا حقیقی طریقہ زیادہ دھیما اور تدریجی بھی ہوتا ہے، خون میں حدت رفتہ رفتہ پیدا ہوتی ہے۔ قوتیں آہستہ آہستہ وسعت اختیار کرتی ہیں اور خاصیت تشکیل پا جاتی ہے، عقلمند کاریگر جو اس کام کا مہتمم ہوتا ہے اپنے ہر ایک اوزار کو اس سے کام لینے کے قبل ہی لیس کر لیتا ہے، اولین خواہش کے نمودار ہونے کے قبل بے چینی اور اضطرار کا ایک طویل دور نمودار ہوتا ہے۔ بچے اپنی طویل جہالت اور لاعلمی کے باعث دھوکہ کھا جاتے ہیں ان کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ خون جوش کھاتا اور ابلتا ہے امنڈتی ہوئی قوت اپنا دائرہ عمل وسیع کرنے کی تلاش میں رہتی ہے۔ آنکھیں زیادہ چمک دار ہو جاتی ہیں اور دوسروں کو بھانپنے لگتی ہیں، ہم اپنے آس پاس والوں میں دلچسپی لینی شروع کر دیتے ہیں اور یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم تنہا زندہ رہنے کے لئے پیدا نہیں ہوئے ہیں، پس ہمارا دل انسانی الفت کے لئے کھل جاتا ہے، اور ہم محبت اور اُنس کرنے کے قابل بن جاتے ہیں۔

جذبہ اولی جس کا کہ ایک عمدہ تربیت یافتہ نوجوان اہل ہوتا ہے محبت نہیں دوستی کا ہوتا ہے اس نوجوان کے تصور کا پہلا کام اس کے ساتھیوں سے اس کا تعارف کرانا ہوتا ہے، اسے ضعف کے قبل خلقیت متاثر کرتی ہے، طویل معصومیت سے ایک مزید فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آپ اس کے نوخیز احساس سے فائدہ اٹھا کر اس سبزہ آغاز نوجوان کے دل میں انسانیت کا پہلا بیج بو سکتے ہیں، یہ فائدہ اس لئے اور بھی زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی میں صرف یہی ایک ایسا وقت ہوتا ہے، جب کہ اس قسم کی کوشش

حقیقتاً کامیاب ہو سکتی ہیں۔

میں نے ہمیشہ مشاہدہ کیا ہے کہ وہ نوجوان جو ابتدائی عمر میں بگڑ کر عورتوں کے گرویدہ اور حرام کاری میں مبتلا ہو جاتے ہیں عموماً وحشی اور بے رحم ہوتے ہیں، ان کی شہوت پرست طبیعت انھیں بے صبر، پُر انتقام اور غضب آلود بنا دیتی ہے، ان کا تصور محض ایک ہی مقصد پر قائم رہنے کی وجہ سے کسی اور بات کو قبول نہیں کرتا، رحم اور ترس دونوں ان کے پاس مساویانہ طور پر معدوم ہوتے ہیں وہ اپنی ذرا سی خواہش کے لئے ماں باپ بلکہ تمام جہان کو قربان کر دینے کو تیار رہتے ہیں، اس کے برعکس ایک ایسا نوجوان جس کی پرورش پُر سرور معصومیت اور بھولپن میں ہوتی ہے، قدرت کی پہلی ہی تحریک پر ہمدردانہ اور مشفقانہ جذبات کی طرف مائل ہو جاتا ہے، اس کا پُر خلوص اور محبت بھرا دل اپنے ہم جنسوں کی مصیبتوں کو دیکھ کر غم سے لبریز ہو جاتا ہے، اپنے ساتھی کو دیکھ کر وہ خوشی کے مارے اچھل پڑتا ہے اور محبت و خلوص کے ساتھ بغل گیر ہو جاتا ہے اس کی آنکھیں رحم اور ہمدردی کے آنسو بہانے لگتی ہیں اور اس شرمندگی اور ندامت کے ذریعہ جو کسی کو تکلیف پہونچانے کے بعد محسوس ہوتی ہے وہ دوسروں کو ناراض کرنے پر افسوس کا اظہار کرنا سیکھ جاتا ہے، اس نوجوان کے خون کی پرجوش حدت اگر کسی وقت اسے تند مزاج، جلد باز اور نفس پرست بنا دیتی ہے تو گھڑی بھر بعد ہی اس کے دل کی قدرتی شرافت خلوص و ندامت کی صورت میں ہویدا ہونے لگتی ہے اپنے ہی مجروح زخم کو دیکھ کر وہ روتا اور کراہتا ہے، جو خون وہ بہاتا ہے اس کا اپنے خون سے کفارہ ادا کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے، اپنے کسی ناجائز فعل کے علم پر اس کا غصہ فنا اور تکبر سرنگوں ہو جاتا ہے۔ اگر وہ خود ہی فریق متضرر ہوتا ہے تو انتہائے غیظ و غضب کے عالم میں بھی عذر و معذرت کا محض ایک لفظ ہی اسے ٹھنڈا اور غیر مسلح کر دیتا ہے، دوسروں کی خطاؤں کو وہ اسی خلوص نیتی کے ساتھ معاف کرتا ہے جس خلوص کے ساتھ اپنے ذاتی قصوروں کی تلافی کرتا ہے۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

مدرسوں کی عمارتیں اور ان کی مرمت

انگلستان میں آج کل نئے مدرسوں کی تعمیر اور پرانی عمارتوں کی مرمت میں جو تقدیم اور تاخیر کی شرائط ہیں ان میں دیہاتی علاقوں کو نقصان پہونچنے کا احتمال ہے، وزارت کی طرف سے ریڈ نورشائر کی تعلیمی کمیٹی کو اطلاع ملی ہے کہ ۱۹۵۴-۵۵ء کے ملکی سال میں کسی نئی عمارت کی تعمیر نہ ہو سکے گی، اس کے معنی یہ ہوئے کہ لینڈ ریننڈ ووڈ کے ایک نئے ثانوی اور چار ابتدائی مدرسوں کے قیام کو ملتوی کرنا پڑے گا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ صنعتی علاقوں میں مدارس کی ضرورت ہی اتنی زیادہ ہے کہ دوسرے علاقوں کو پس پشت ڈال دیا جائے ریڈ نورشائر کا علاقہ دیہاتی ہے اور اس علاقے کے مدارس کو اگر از سر نو تعمیر نہ کیا جائے تو ان کی مسلسل مرمت نہایت ضروری ہے معمولی قسم کی مرمت کے لئے رقم کی حد ۵۰۰ پونڈ تک مقرر کی گئی ہے، اور یہ رقم ان مدارس کی ضروریات کے لئے قطعی ناکافی ہے۔

اس کاؤنٹی میں مقامی حکومتوں کے تحت پانچ ثانوی مدارس طلبہ کی تعداد ۱۱۱۴ ہے۔ اور ان مدارس کی از سر نو تنظیم کے لئے نئے مدرسوں کا قیام ضروری ہے۔

اس سے قبل یہ رپورٹ پہونچ چکی ہے کہ ثانوی مدارس میں پہونچنے سے پہلے بچوں کو بارہ سال کی عمر تک مدرسوں میں رہنے کے لئے حکام مجبور کرتے ہیں، چناں چہ اس شکایت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ طلبہ کو تعلیم کا وہ مناسب حصہ نہیں ملتا جس کے لئے مالی آسانیاں موجود ہیں، کاؤنٹی کے حکام کے لئے مزید ضروری ہے کہ ۱۲ سے ۱۵ سال کے طلبہ پر خاص توجہ دیں۔ بچوں کے والدین انھیں اکثر اپنے کھیتوں پر کام کرنے کے لئے لے جاتے ہیں، اور چوں کہ غیر حاضری کے جرمانے اور مزدوری کی اجرت میں نمایاں فرق ہے، ان کے نزدیک بچوں کا کھیتوں پر کام کرنا زیادہ مفید ہے۔ اگر طلبہ کے لئے آمد و رفت کی

آسانیاں بھی فراہم ہوں تو کاؤنٹی کے حکام کو کافی اخراجات کی ضرورت پڑتی ہے۔

کارڈی گن شائر بھی ایک دیہاتی علاقہ ہے اس میں ۱۰۳ ابتدائی مدرسے ہیں جن میں اکثر کی حالت نہایت افسوسناک ہے، انجمن مدرسین کی دیہاتی شاخ نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ قبل جنگ تعمیر شدہ مدرسوں کا ایک جائزہ لیا جائے، کیوں کہ ان میں سے اکثر کی مرمت ضروری ہے، کاؤنٹی تعلیمی کمیٹی بھی اس پر غور و خوض کرنے والی ہے، اس جائزے کی تکمیل کے بعد یہ واضح ہو جائے گا کہ کاؤنٹی کے ان مدرسوں کی عمارتیں کس حالت میں ہیں۔ نیز یہ کہ وزارت کو ان کی مرمت کے لئے کتنی مزید امداد دینی چاہئے۔

لین لی میں اکثر خاندان قصبے کی سکونت کو ترک کر چکے ہیں تاکہ پرانی آبادی کے باہر مکانات تعمیر کریں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے چھوٹے چھوٹے مدرسوں میں تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور اندرون آبادی کے کچھ مدرسوں میں اس طرح کمی واقع ہو گئی ہے۔

نوٹنگھم شائر میں مدرسین کی فراہمی

مدرسوں کی مجلس انتظامیہ نے پچھلے دنوں تعلیمی کمیٹی کے سامنے کاؤنٹی مدارس میں مدرسین کی فراہمی کے متعلق ایک رپورٹ پیش کی ہے۔ آئندہ کے لئے ان مدارس میں جو تقرریاں ہوئی ہیں۔ ان کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں۔

"۴ مرد اور ۷ عورتیں۔ ۱۱۲ مستعفی اور پنشن یافتگان کی تعداد ۲۹ مرد اور ۱۱۲ عورتیں (۱۴۱)"

اس طرح مدرسین کی تعداد میں ۲۹ کی کمی واقع ہو گئی ہے۔

اسی اثنا میں بنیادی عملے کی تقرری کی تعداد ۸۳ (۱۸ مرد اور ۶۵ عورتیں) ہے جو ان مزید مدرسوں کے علاوہ ہے۔ جن کی ضرورت مشکل حالات پر قابو پانے کے لئے ہوئی۔ مثلاً کمائے کے کمرے بطور جماعتی کمرے استعمال ہوئے، اس میں ۱۱ آسامیاں تربیت جسمانی کے مخصوص اساتذہ اور ۶ موسیقی کے اساتذہ کی بھی شامل ہیں۔ ان آسامیوں پر تفصیلی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰ جدید ثانوی مدارس کی ۴۶ جونیر جماعتوں اور ۲۷ ابتدائی جماعتوں کی ہیں۔

مدرسین کی فراہمی وقتی طور پر ہو رہی ہے۔ مگر ۳۸ آسامیاں تو وہ ہیں جن کے لئے اساتذہ ہی دستیاب

نہیں ہوتے۔ ان اعداد و شمار میں دوران سال میں مدرسے کی بڑھی ہوئی تعداد کا کوئی تذکرہ ہی نہیں خصوصًا ابتدائی حصوں میں۔ چناں چہ ان مدرسوں کے حالات خراب ہونے کا امکان ہے۔

مصلحتی فیصلے

تعلیمی کمیٹی کو یہ اطلاع فراہم کی گئی کہ مدارس کی ذیلی مجلس انتظامیہ نے مدرسین کی فراہمی کے اس مسئلے پر کافی غور و خوض کیا، چناں چہ تعلیمی کمیٹی کی منظوری کے ساتھ یہ طے کیا گیا کہ اس رپورٹ کی ایک نقل وزارت معارف کو بھی بھیج دی جائے۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ ڈنگلعم شمائرکے خصوصی حوالے کے ساتھ مدرسین کی اس کمیٹی کے مسئلے کو مشترکہ مجلس مشاورت کو بھیجا جائے، ناظم تعلیمات کو مدرسین کی ملازمت کی شرائط میں ردوبدل کا حق دیا گیا، بالخصوص جہاں دو مدرس ۲۰ یا کم طلبہ کے مدارس میں ہیں، لیکن ہر صورت میں اس کی رپورٹ ناظم تک پہونچانی ہوگی، ذیلی کمیٹی کے ممبروں نے اوائل ستمبر کی میٹنگ میں گذشتہ تین سال کے پنشن یافتگان اور مستعفی اساتذہ کے اعداد و شمار طلب کئے۔ ایک تجویز یہ بھی تھی کہ مناسب قسم کے پنشن یافتہ مدرسین کی ہمت افزائی کی جائے کہ وہ پھر اس کانونٹی کی ملازمت کو اختیار کریں۔

وزیر معارف نے گریجویٹ اساتذہ کے سلسلے میں ایک چٹھی بھیجی ہے اس کے مطابق کمیٹی نے یہ طے کیا کہ اساتذہ کی اس فراہمی کے علاوہ گریجویٹ اساتذہ کا تقرر کیا جائے، بالخصوص چند بڑے ثانوی مدارس میں لیکن اس کی شرط یہ ہو کہ ایسے اساتذہ کو وقتی ضروریات کے مطابق دوسرے مدارس میں بھی تبدیل کیا جاسکے گا۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

ای/۱۴۸۳۱ م شاہ نواز خاں بی۔ ایس سی۔ بی ٹی۔ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بھکر (آزمائشی) م محمد نواز خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بشاہرہ خود معلم انگریزی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول میاں والی (آزمائشی) مقرر ہوئے۔

م۔ محمد نواز خاں۔ بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی۔ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول میاں والی (آزمائشی) م۔ شاہ نواز کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بشاہرۂ خود معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بھکر مقرر ہوئے۔

ای/۲۰۰۴ م منظور حسین بھٹی بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی۔ ایک امیدوار جن کی تقرری کے احکام بحوالہ چٹھی نمبر ۔ بکار دفتر ناظر تعلیمات حلقہ لاہور۔ گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ کے لئے ہو چکے ہیں۔ م غلام مصطفےٰ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شرق پور بشاہرہ ۱۳۰ ــ ۱۰ ـــ ۲۰۰/۱۰ ـــ ۲۵۰ ایس۔ ای۔ ایس (شعبۂ رجال) مقرر ہوئے۔

م۔ غلام مصطفےٰ۔ بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی (۱۳۰/۲۵۰) قائم مقام سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شرق پور۔ م منظور حسین بھٹی کی جگہ تاریخ حاضری سے بشاہرہ خود قائم مقام سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ مقرر ہوئے۔

ای/۳۹۸۱ م۔ محمد اکرم بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال۔ قاضی نور احمد جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بشاہرۂ خود معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول سیالکوٹ مقرر ہوئے۔

ای/۵۲۴۵ م۔ عمر حیات بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی (نمبر ۲۔ ۱ــــ ۱۳۰ ـــ ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں (گوجرانوالہ) م محمد کاظم حسین زیدی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے

بشاہرہ خود معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ مقرر ہوئے۔

م۔محمد کاظم حسین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۴۰ ۔ ۱۳۰/۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ (شیخوپورہ) م۔ عمر حیات کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بشاہرہ خود معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں مقرر ہوئے۔

ای/۵۲۵۷ م۔ظفر علی ملک بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۱۳۰/۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں (لاہور) آزمائشی جن کے تبادلے کے احکام بحوالہ چٹھی نمبر ۱۵/۵۷، ۱۱ دفتر ناظم تعلیمات پنجاب لاہور۔گورنمنٹ ہائی اسکول شرق پور کے لئے ہو چکے ہیں۔ م۔عبدالمجید خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے بشاہرۂ خود معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول باغبانپورہ (لاہور) مقرر ہوئے۔

م۔عبدالمجید خاں بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۳۳۱ ۔ ۱۳۰/۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول باغبانپورہ (لاہور) ایس بشیر حسین کی جگہ جو اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں: تاریخ حاضری سے بشاہرہ خود معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول شرق پور مقرر ہوئے۔

ای/۲۷۴۰۷ م۔عبدالغنی جمیل بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایچ۔ پی۔ او۔ ٹی (نمبر ۲۶۹ ۔ ۱۳۰/۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول اکال گڑھ۔ ضلع گوجرانوالہ۔ م۔محمد خاں کی جگہ جو نائب ناظم مدارس ضلع سیالکوٹ مقرر ہو چکے ہیں۔ تاریخ حاضری سے بشاہرۂ خود معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول سیالکوٹ مقرر ہوئے۔

م۔محمد سرور بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (نمبر ۲۱ ـــ ۱۳۰/۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ۔ م۔عبدالغنی جمیل کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بشاہرۂ خود معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول اکال گڑھ (ضلع گوجرانوالہ) مقرر ہوئے۔

م۔محمد احمد قریشی بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (نمبر ۲۴۴ ۱۳۰/۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب (ضلع شاہ پور) م۔محمد سرور کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بشاہرہ خود معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ مقرر ہوئے۔

ای/۲۹۲۲ م۔محمد اسمٰعیل بی۔ اے۔ منشی فاضل۔ او۔ ٹی (نمبر ۲۴ ـــ ۱۵۰/۲۵۰) معلم السنۂ شرقیہ گورنمنٹ

ہائی اسکول گوجرانوالہ۔ م۔عبدالحکیم خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بشاہرۂ خود معلم السنۂ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں (لاہور) مقرر ہوئے۔

م۔عبدالحکیم خاں۔ ایچ۔پی۔ایچ۔ اے۔او۔ٹی۔(نمبر ۵۷۲ ۔ ۔ ۱۴۰/۱۰۰) معلم السنۂ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں (لاہور) م۔محمد اسمٰعیل کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے معلم السنۂ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ مقرر ہوئے۔

ای/۱۱ ۵ م۔عبدالغنی۔منشی فاضل۔مولوی فاضل، ایف، اے۔او۔ٹی (نمبر ۸۹ ۱۰۵ ۱۴۰/ موجودہ ۷۰ /۱۴۰) معلم السنۂ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ م۔عبدالحق شیدا کی جگہ جنھوں نے ملازمت اختیار نہیں کی تاریخ حاضری سے بشاہرۂ خود معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول اکال گڑھ (گوجرانوالہ) مقرر کئے گئے۔

م۔سردار علی تبسم۔ ایس۔وی۔ ایچ۔یو۔(نمبر ۳۲۱ ۔ ۷۰/۱۴۰) مدرس اردو گورنمنٹ ہائی اسکول اکال گڑھ (گوجرانوالہ) م۔ظفر الاسلام کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ بشاہرۂ خود۔ تاریخ حاضری سے۔ مدرس اردو گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور (سیالکوٹ) مقرر ہوئے۔

م۔ظفر الاسلام۔ ایس۔وی (نمبر ۱۱۶ ۔ ۔ ۷۰/۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور (سیالکوٹ) م۔نذیر احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بشاہرۂ خود معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں (لاہور) مقرر ہوئے۔

ای/۲۴۳ ۵ م۔محمد حسین ایس۔وی۔ایچ۔پی۔ اگری کلچر (ٹرینڈ) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور جن کی تقرری کے احکام بحوالہ چٹھی نمبر ۱۷۵۰/ای دفتر ناظم تعلیمات پنجاب لاہور گورنمنٹ ہائی اسکول باغبان پورہ کے لئے صادر ہو چکے ہیں م۔عبدالحمید خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بشاہرۂ خود مدرس اردو گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں مقرر ہوئے۔

م۔عبدالحمید خاں۔مولوی فاضل۔منشی فاضل۔او۔ٹی۔میٹرک (اول ڈویژن) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں (گوجرانوالہ) م محمد ادریس خاں کی جگہ جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے بشاہرۂ خود مدرس اردو گورنمنٹ ہائی اسکول باغبان پورہ مقرر ہوئے۔

Regd. No. L. 3257

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یه دوھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ھے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضه دیا جاتا ھے -

۴ - یه رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفته میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھه روپیه (انگریزی) اور چھه روپیه (اردو) ھے - جو که منیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر

پنجاب ایجوکیشنل جرنل
اموزش
۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

آموزش

جلد ۶ شمارہ ۷]　　لاہور　　[اکتوبر ۱۹۵۳ء

اس شمارہ میں

مدیر : بشیر ہاشمی

معاونین : عبدالغفور چودھری
ایم - اے - عزیز

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

اکتوبر ۱۹۵۳ء

جلد ۶

شمارہ ۷

سالانہ چندہ

پاکستان کے لئے ۶ روپے

غیر ممالک کے لئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

یورسٹی
ا پرچہ
ماک اسراف
ے جس قدر
خرچ
یں
التعلیم
ا گے
لئے مہیا

ایچ۔ ڈی۔ خالد پرنٹر و پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

ہمارے تعلیمی معیار

پچھلے مہینے میاں افضل حسین سابق صدر پبلک سروس کمیشن اور سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے لاہور روٹری کلب کو خطاب کرتے ہوئے ملک کے دن بدن گرتے ہوئے تعلیمی معیاروں پر جو تبصرہ فرمایا اس میں بہت سی باتیں قابلِ غور ہیں۔ میاں صاحب موصوف نے کہا!

پاکستان کا تعلیمی نظام دو خطرناک امراض کا شکار ہے، یعنی ہر سطح پر پست معیار اور خوفناک اسراف
اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونی ورسٹی کے امتحانات میں ناکامیوں سے جس قدر روپیہ ضائع ہوا وہ اس رقم کے برابر ہے جو صوبائی حکومت ہر سال ثانوی اور اعلیٰ تعلیم پر خرچ کرتی ہے۔

اس کا علاج یہ ہے کہ ثانوی درجہ پر طلبہ کی صلاحیتوں کا جائزہ لیا جائے اور کوئی ان میں فی صدی طلبہ کو کالج میں جانے کی اجازت ملے جو اعلیٰ تعلیم کے اہل ہوں، باقی کو پیشہ ورانہ تعلیم ملنی چاہیئے۔ اس طرح جب اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے منتخب طلبہ یونی ورسٹی میں جانے لگیں گے تو موجودہ مفلوج کن اسراف ختم ہو جائے گا اور اچھی قابلیت کے لوگ ملک کی خدمت کے لئے مہیا ہو سکیں گے۔

ایک سوال کے جواب میں میاں صاحب نے فرمایا کہ یہ تجاویز حکومت کے سامنے رکھی گئی تھیں لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ کن وجوہ کی بنا پر ان پر عمل نہیں ہو سکا۔

ہمیں میاں صاحب کے خیالات کا بہت احترام ہے، وہ ساری عمر ملک کی تعلیمی زندگی سے وابستہ رہے ہیں، اور پچھلے چند سالوں میں انھیں ہمارے تعلیمی اداروں کی پیداوار کو بہت قریب سے جانچنے کا موقع ملا ہے، انھوں نے مرض کی جو علامات بیان کی ہیں وہ بڑی حد تک درست ہیں لیکن اسباب کی تشخیص اور مجوزہ علاج کے بارے میں ہمیں ان سے اختلاف ہے، جسے ہم بڑے ادب کے ساتھ بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

بہت سے بزرگوار جب تعلیمی معیاروں کے گرنے کی شکایت کرتے ہیں تو ان کے ذہنی پس منظر میں عموماً بعض ترقی یافتہ ممالک کے تعلیمی معیار ہوتے ہیں، ایسا موازنہ بالکل بے کار ہے، پہلی وجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں بچے عموماً چھ سال کی عمر میں مدرسے میں داخل کئے جاتے ہیں، جبکہ ہمارے یہاں یہ عمر اکثر حالتوں میں پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوتی، پھر ان ملکوں میں ثانوی تعلیم بارھویں درجے پر ختم ہوتی ہے، اور ہم اسے دسویں درجے پر ختم کر دیتے ہیں، اس طرح ان ممالک کے طلبہ ثانوی تعلیم کے خاتمہ پر ذہنی اور علمی پختگی کے جس درجے پر ہوتے ہیں وہ ہمارے طلبہ کو انٹرمیڈیٹ پاس کرنے سے پہلے حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس شکایت میں کافی صحت موجود ہے کہ پچھلے چند سالوں میں ہمارے عام تعلیمی معیار نمایاں طور پر نیچے چلے گئے ہیں، کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ کالجوں میں بھیڑ بہت بڑھ گئی ہے؟ اگر دوسرے ملکوں میں بارہ سالہ ثانوی نصاب بہتر ذہنی پختگی پیدا کر سکتا ہے تو بظاہر کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے نوجوان میٹرک کی بجائے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کرنے سے بلند تر علمی اور ذہنی سطح پر نہ آ سکیں۔ اگر ایسا نہیں تو کیا اس کی یہ وجہ تو نہیں کہ کالج اپنے فرائض کو اچھی طرح پورا نہیں کر رہے ہیں؟ ہماری یہ دیانتدارانہ رائے ہے کہ اگر کالجوں کے لکچرار معیاری قابلیت کے لوگ ہوں اور وہ اپنے کام کو ذمہ داری سے انجام دیں تو زیادہ طلبہ کا کالجوں میں جانا معیاروں کو پستی کی طرف لے جانے کی بجائے بلندی کی طرف لے جائے گا۔

مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ ملک میں بے کاری بڑھ رہی ہے۔ ہماری متزلزل زرعی معیشت کا تو ذکر ہی کیا ہے، کئی ایک مضبوط صنعتی معیشتیں بھی اپنے نوجوانوں کو صرف اس لئے زیادہ عرصہ تک کالجوں میں رکھنے کی فکر میں ہیں کہ قومی اجرتوں کی سطح گرنے نہ پائے، اگر آج کالجوں کے دروازے ہمارے بہت سے نوجوان طلبہ اور طالبات پر بند ہو جائیں تو لامحالہ یہ سب لوگ ملازمت حاصل کرنے کی دوڑ میں آن شامل ہوں گے اور پہلے سے موجودہ بیکاری خراب تر صورت اختیار کر جائے گی۔

جہاں تک پیشہ ورانہ تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کا تعلق ہے اس سے کسی صاحبِ فہم شخص کو اختلاف نہیں ہو سکتا، ہم جس قدر جلد اس تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست کر سکیں اسی قدر اچھا ہے لیکن ہمارے سامنے فوری سوال یہ ہے کہ جب تک فنی اور صنعتی تعلیم کی کافی سہولتیں میسر نہیں آ جائیں اس وقت تک ہمارے نوجوان کیا کریں؟ میاں افضل حسین صاحب نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان سہولتوں کے مہیا کرنے کے لئے حکومت کے سامنے تجاویز رکھی گئی تھیں۔ مگر بعض وجوہ کی بنا پر ان پر عمل نہیں ہو سکا معلوم نہیں یہ تاخیر کس قدر طول کھینچے گی، اس لئے صنعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم کتنی ہی پسندیدہ کیوں نہ ہو، جب تک ہم اس کا بندوبست نہیں کر سکتے اس وقت تک ہمیں موجودہ وسائل سے ہی زیادہ سے زیادہ کام لینا ہوگا، یونیورسٹی اور کالجوں کو زیادہ مفید بنانے کی صرف یہی صورت نہیں کہ ان میں منتخب طلبہ کو داخل کیا جائے، اس کی دوسری صورت یہ بھی ہے کہ انھیں زیادہ مؤثر اور پُرعمل بنایا جائے۔

میاں صاحب نے اپنے خطاب میں بجا طور پر اس بھاری اسراف پر افسوس کیا ہے جو تعلیم کے نام پر جاری ہے، لیکن یہ اسراف فقط اسی وقت تک اسراف رہے گا جب تک ہمارے نوجوانوں کا وقت اور ان کے والدین کی کمائی خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کرتی، ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے ہم پھر اسی نکتہ پر زور دیں گے جس کی طرف اوپر توجہ دلائی گئی ہے یعنی ہمارے کالجوں میں پڑھانے والے لوگوں کو اپنا کام بہتر طور پر انجام دینا چاہئے، اب جبکہ ان کی تنخواہ اور حیثیت دونوں میں ان کی حسبِ منشا اضافہ ہو چکا ہے یہ بات اور بھی زیادہ ضروری ہو گئی ہے کہ ہمارے کالج ایسی تربیت دیں جو کردار اور

ذہنی تربیت کے لحاظ سے طلبہ کی ضروریات پوری کریں

امریکہ میں ثانوی تعلیم

فضل احمد

نظامِ تعلیم اور فلسفۂ زندگی

آخری تجزیہ میں کسی قوم کا نظامِ تعلیم اس کے فلسفۂ حیات کا عکس ہوا کرتا ہے، یہ درست ہے کہ قومی معیشت کو تعلیمی نظام کے بنیادی خدوخال معین کرنے میں بڑا دخل ہے۔ مثلاً ایک زرعی معیشت جس میں پیداوار کی سطح بہت نیچی ہو مفت تعلیم مہیا کرنے سے بڑی حد تک قاصر رہے گی، اس کے برعکس ایک صنعتی معیشت مفت تعلیم کا اہتمام آسانی سے کر سکے گی۔ مگر معاشی قوتیں ہی سب کچھ نہیں، کم از کم اسی قدر اہم فلسفۂ حیات ہے۔ کم و بیش ایک صدی تک انگلستان دنیا کی معاشی زندگی پر چھایا رہا۔ مگر اس کے باوجود انگریزی عوام کو مفت ابتدائی تعلیم کا حق حاصل کرنے کے لیے سالہا سال تک جدوجہد کرنا پڑی، اور جب بالآخر انھیں یہ حق مل بھی گیا تو بھی تعلیمی سہولتوں کے بارے میں وہ امرا اور خواص کی گرد کو نہ پہونچ سکے۔ تعلیمی سہولتوں کی یہ عدمِ مساوات عملاً ۱۹۴۴ء کا قانونِ تعلیم بھی ختم نہیں کر سکا۔ گو دو عالمگیر جنگوں نے انگلستان کی اقتصادی حالت کو سخت صدمہ پہونچایا ہے، اور دوسری جنگ کے بعد سے بالخصوص اس ملک کی زندگی کو مسلسل معاشی بحران کا سامنا رہا ہے، تاہم جب موجودہ معاشی مصائب کا وجود نہ تھا اس وقت بھی انگلستان میں عوام اور خواص کے لیے تعلیمی سہولتوں کی برابری کا اصول تسلیم نہیں کیا گیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی زندگی کی بنیاد ہی طبقاتی تقسیم پر تھی۔ اس لیے تعلیم کے معاملے میں مواقع کی برابری خارج از بحث تھی۔

امریکی فلسفۂ زندگی

امریکہ میں تعلیم ثانوی درجہ تک مفت اور لازمی ہے۔ اکثر ریاستوں کا قانون ہر لڑکے اور لڑکی کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اٹھارہ برس تک مدرسے

میں رہے، کچھ ریاستوں میں عمر کی یہ حد سولہ برس ہے۔ مدرسے میں داخلے کی عمر عموماً چھ سال ہے۔ اور ثانوی تعلیم بارھویں درجے پر ختم ہوتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر لڑکے اور لڑکیاں لازمی تعلیم کی قانونی حد تک پہونچتے پہونچتے ثانوی تعلیم بھی ختم کر لیتے ہیں۔ ثانوی مدارس میں نہ صرف یہ کہ کوئی فیس نہیں لی جاتی بلکہ اکثر اوقات کتابیں بھی مدرسے کی طرف سے مفت فراہم کی جاتی ہیں۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ چوں کہ امریکی قوم دولت مندی کے اعتبار سے تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس لئے تعلیمی سہولتوں کی یہ مساوات اور فراوانی محض معاشی اسباب کی پیداوار ہے۔ یہ دیکھا جا چکا ہے کہ اس قول میں سچائی موجود ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی دیکھا جا چکا ہے کہ معاشی اسباب ہی سب کچھ نہیں جن لوگوں کو امریکی مدارس کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، انھیں اس بات کا قوی احساس ہوتا ہے کہ تاریخ کی اس سب سے بڑی تعلیمی مہم کے پیچھے صرف معاشی قوت ہی نہیں بلکہ کچھ پاکیزہ تر محرکات بھی کام کر رہے ہیں، یہ محرکات امریکی قوم کے فلسفۂ حیات پر مشتمل ہیں۔ شاید بعض لوگوں کو یہ بات ایک معمہ دکھائی دے، مگر سچ یہ ہے کہ دولت کی بے حد غیر مساوی تقسیم کے باوجود قومی اور انسانی سطح پر امریکی قوم کے افراد جس حد تک ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ اس کی نظیر عہد حاضر کی کوئی دوسری قوم پیش نہیں کرتی، قومی زندگی کی یہ بنیادی خصوصیت نظام تعلیم میں بھی منعکس ہے، اور ثانوی تعلیم کا سارا خاکہ اسی چیز کو سامنے رکھ کر وضع کیا گیا ہے۔ امریکی ثانوی تعلیم اس اصول کو عملاً تسلیم کرتی ہے کہ قوم کا ہر فرد اپنے ساتھ یگانہ صلاحتیں لے کر آتا ہے جن کے بڑھنے پھولنے کی سہولتیں بہم پہونچانا معاشرے کا فرض ہے، فرد کے اس بنیادی حق کا احترام اس حد تک کیا جاتا ہے کہ نہ صرف افلاس ہی اسے اس حق سے محروم نہیں کر سکتا، بلکہ بعض پیدائشی محرومیاں بھی اس کا راستہ نہیں روک پاتیں۔ ہر ریاست میں اپاہج، اندھے، بہرے، گونگے اور ضعیف العقل بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی بالکل اسی اہتمام کے ساتھ موجود ہے جس طرح دوسرے بچوں کی تعلیم کے لئے۔

غیر ملکیوں کے لئے اچنبھا

دوسرے ملکوں میں جہاں تعلیم کا چرچا بہت عام ہے وہاں عموماً مفت اور لازمی تعلیم کو پرائمری درجہ تک ہی ضروری خیال کیا جاتا ہے ثانوی تعلیم

عموماً چیدہ چیدہ بچوں کے لئے موزوں سمجھا جاتا ہے، موزونیت کا فیصلہ بڑی حد تک تو بچے کے مالی حالات کر دیتے ہیں کیوں کہ ثانوی تعلیم کے لئے دام ادا کرنے پڑتے ہیں، دوسرے فیصلہ کئی عناصر بچے کی ذہانت اور اس کی دلچسپیاں ہیں۔ اگر وہ روایتی نصاب کے ساتھ ساتھ قدم نہیں رکھ سکتا تو بار بار فیل ہونے لگے گا اور عین ممکن ہے کہ یہ ناکامیاں اسے مدرسہ چھوڑ دینے پر مجبور کر دیں، کم از کم ہمارے ملک میں یہی حال ہے، بچے کو ثانوی تعلیم دلانے کے لئے نہ صرف والدین میں اس تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کی ہمت ہونی چاہئے، بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ بچہ سال بسال اگلی جماعت میں ترقی پاتا رہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ ثانوی تعلیم کو پورا نہیں کر سکے گا۔

یہ دیکھا جا چکا ہے کہ امریکی ثانوی تعلیم نے انتخاب اور موزونیت کا سوال ہی اڑا دیا ہے۔ یہ تعلیم ہر ایک کے لئے لازمی ہے، اس بنیادی مفروضے کے بعض نتائج غیر ملکیوں کو بہت عجیب دکھائی دیتے ہیں۔ ہتلائیں نے امریکہ میں سب سے پہلے جو ثانوی مدرسہ دیکھا وہ اس ملک کے دارالسلطنت واشنگٹن کا مشہور جیفرسن ہائی اسکول تھا، میرے ساتھ کوئی دو درجن اور غیر ملکی اساتذہ تھے، اسکول دیکھ چکنے کے بعد جب ہم پرنسپل سے سوال پوچھنے لگے تو ایک بات جو ہم میں سے اکثر کی سمجھ میں نہیں آتی تھی یہ تھی کہ جب طلبہ کی استعدادوں میں فرق تسلیم کیا جاتا ہے تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ سال کے خاتمہ پہ ہر جماعت کے سب کے سب طالب علم اگلی جماعت میں ترقی پا جائیں۔ اور اگر کسی وجہ سے اس اصول کو مان بھی لیا جائے تو کوئی استاد کسی ایسی جماعت کو کیوں کر پڑھا سکتا ہے جس کے بعض طلبہ تو چوٹی پر ہوں اور بعض بیچارے مضمون کی مبادیات پہ بھی اچھی طرح حاوی نہ ہوں، پرنسپل صاحب بے چارے یہ اعتراضات سن کر مسکراتے رہے، آخر کہنے لگے ہم اپنے طلبہ کو کسی امتحان کے لئے تیار نہیں کرتے، جو طالب علم ہمارے نصاب کی مدت پوری کر لیتا ہے۔ اسے مدرسے کی طرف سے اس امر کی سند دے دی جاتی ہے کہ اس نے کامیابی کے ساتھ ہمارے یہاں اتنا عرصہ بطور طالب علم کے گذارا یہ سند اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر خوش اسلوبی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے قابل ہے۔ باقی رہا علمی استعداد کا تعلق۔ تو یہ کیا ضروری ہے کہ زندگی میں ہر شخص کو علمی کام

ہی کرنا پڑے۔ جو طالب علم لکھائی پڑھائی میں زیادہ تاک نہیں وہ کم از کم جائے یا قہوہ تو اچھی طرح تیار کر سکے گا، اور کوئی وجہ نہیں کہ زندگی میں داخل ہونے پر یہی کام اس کے سپرد نہ کیا جائے۔ مدرسے کا کام اسی پر ختم نہیں ہو جاتا کہ طالب علم کو کچھ علم اور چند ایک مہارتیں سکھا دے، بلکہ یہ کام بھی اسی کے ذمے ہے کہ طلبہ کو اپنی زندگی میں موزوں مقام تلاش کرنے اور اسے حاصل کرنے میں مدد دے۔

جدید ثانوی مدرسے

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ امریکہ میں ایسے مدرسوں کی کثرت تھی جن کی کل عمارت صرف ایک کمرے پر مشتمل تھی اور پڑھانے والا عملہ صرف ایک استاد پر۔ ان مدرسوں میں یہ اکیلا مدرس بعض اوقات پہلی سے آٹھویں جماعت تک کے تمام طلبہ کو پڑھاتا تھا۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے جہاں قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں انقلاب پیدا کیا وہاں اس نے مدرسوں کی کایا بھی پلٹ دی۔ موٹروں اور بسوں کی فراوانی نے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ ایک بڑے مرکزی مدرسہ میں پندرہ بیس میل فاصلہ پر رہنے والے بچے بالکل اسی آسانی سے آ سکیں جس طرح وہ اپنے گاؤں یا قصبہ کے مدرسہ میں جایا کرتے تھے، غرض آمد و رفت کی سہولت اور بہت سی دیہاتی آبادی کے شہروں میں آ بسنے سے امریکہ کے جدید ثانوی مدرسے نے جنم لیا ہے جسے عموماً "ہمہ گیر" ثانوی مدرسہ کہا جاتا ہے۔

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ امریکی قانون ہر شہری کو مفت ثانوی تعلیم کا حق دیتا ہے، عملاً مفت ثانوی تعلیم کا بندوبست کرنے کی ذمہ داری خود ہر آبادی پر عائد ہوتی ہے، اس مطلب کے لئے ہر ریاست چھوٹے چھوٹے تعلیمی اضلاع میں بٹی ہوئی ہے، ان اضلاع میں بسنے والے لوگ اپنی تعلیمی ذمہ داریوں کو سر انجام دینے کے لئے ایک تعلیمی بورڈ کا انتخاب کرتے ہیں۔ اراکین ایک خاص عرصہ کے لئے چنے جاتے ہیں۔ ضلع میں خواہ ایک مدرسہ ہو یا ایک سے زائد ان سب کی نگرانی سکول بورڈ ہی کرے گا، عمارتوں کی تعمیر، توسیع، تجدید۔ روپے کی فراہمی، اساتذہ کی تقرری، ترقی، غرضیکہ ضلع کے مدارس سے متعلق تمام امور اسی بورڈ کو طے کرنے ہوتے ہیں، تعلیمی مسائل پر مشورہ اور رہنمائی کے لئے ہر بورڈ ایک سپرنٹنڈنٹ

مقرر کرتا ہے، اسکول بورڈ صرف اپنے ضلع کی تعلیمی ضرورتوں کو ہی پورا نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو ان ضرورتوں اور ان کی اہمیت سے آگاہ رکھے، روپیہ فراہم کرنے کے لئے بورڈ عموماً نئے ٹیکس لگانے کا مجاز ہوتا ہے، لیکن اس کے لئے لوگوں کی منظوری لازمی ہے، عموماً یوں ہوتا ہے کہ بورڈ نئے مدرسے کی تعمیر یا پرانے مدرسے کی توسیع کی ضرورت لوگوں پر واضح کرتا ہے اور ساتھ ہی اس کے اخراجات کا تخمینہ بھی شائع کر دیتا ہے، اگر ضلع کے لوگوں کی اکثریت اس کے حق میں رائے دے دے تو پھر بورڈ مجوزہ رقم کی فراہمی کے لئے ذرائع ڈھونڈ لیتا ہے۔

اگر کوئی تعلیمی ضلع اس قابل نہ ہو کہ اپنے بچوں کے لئے خود مدرسہ تعمیر کر سکے تو وہ انھیں کسی قریب کے مدرسے میں بھیج دیتا ہے، جہاں اسے اس پڑھائی کے لئے فیس ادا کرنی پڑتی ہے، لیکن یہ فیس طلبہ یا ان کے والدین ادا نہیں کرتے بلکہ ان کے ضلع کا تعلیمی بورڈ ادا کرتا ہے۔

ذرائع آمد و رفت کی غیر معمولی ترقی نے کئی ایک چھوٹے چھوٹے تعلیمی ضلعوں کو بیکار بنا دیا ہے، کئی حالتوں میں ان کے مالی ذرائع اتنے وسیع نہیں ہوتے کہ جدید طرز کا "ہمہ گیر" ثانوی مدرسہ تعمیر کر سکیں اس مطلب کے لئے عموماً دو تین اضلاع باہم مل کر کسی مرکزی مقام پر ایک "مشترکہ" ثانوی مدرسہ تعمیر کر لیتے ہیں۔

"ہمہ گیر" ثانوی مدرسے کا ذکر اوپر کئی بار گذر چکا ہے، لیکن ابھی اس کا مفصل بیان نہیں کیا گیا عام بیان کی بجائے غالباً یہ بہتر ہوگا کہ ایک خاص "ہمہ گیر" ثانوی مدرسے کی مخصوص تفصیلات بیان کر دی جائیں۔

پچھلے سال ستمبر کے اواخر میں میں نے ریاست مشی گن میں این آربر سینئر ہائی اسکول کو دیکھا، جو صرف دسویں گیارھویں اور بارھویں جماعتوں پر مشتمل ہے، اس وقت ان تین جماعتوں میں تعداد طلبہ ۱۲۵۰ تھی اس بھاری تعداد کے باوجود کسی کمرۂ جماعت میں پچیس تیس سے زیادہ طالب علم دیکھنے میں نہیں آئے سائنس اور بعض دوسرے مضامین کی جماعتوں میں تعداد اس سے بھی کم تھی، صرف ورزش جسمانی کے لئے بہت سے طلبہ بیک وقت استاد کے پاس آتے تھے۔

ایک جماعت میں مجھے ایک ادھیڑ عمر طالب علم کو دیکھ کر حیرت ہوئی جس پر پرنسپل نے کہا۔ یہ مدرسہ این آربر کے باشندوں کے روپے سے چل رہا ہے، اس لئے ان میں سے ہر ایک کو حق ہے کہ جب چاہے یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آ جائے، ہم کسی کو محض اس بنا پر داخل کرنے سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ کند ذہن ہے یا اس کی عمر زیادہ ہے۔

مدرسہ میں موٹر ڈرائیوروں کی جماعت دیکھ کر بھی کچھ حیرانی ہوئی، اس پر جواب ملا کہ اسکول بورڈ یا مدرسہ کے اساتذہ اکیلے یہ فیصلہ نہیں کرتے کہ یہاں کیا کچھ پڑھایا یا سکھایا جائے، اس بات کے طے کرنے میں لوگوں کی پسند کو بہت دخل ہے، یہ مدرسہ لوگوں ہی کے روپے سے بنا اور انھیں کے روپے سے چلتا ہے، انھی کے بچے یہاں پڑھنے آتے ہیں، اس لئے انہیں یہ حق ہے کہ اس بات کا فیصلہ بھی کریں کہ مدرسے میں کیا کچھ پڑھایا جائے، موٹر ڈرائیوری کی جماعت لوگوں کے مطالبہ پر ہی جاری کی گئی ہے، اور اسی طرح خانہ سازی کی جماعت۔ موخر الذکر نصاب میں میاں بیوی کے گوناگوں تعلقات فرائض اور ذمہ داریاں شامل ہیں، جماعت میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تقریباً یکساں تعداد میں موجود تھے، "کورٹ شپ" کا موضوع زیر بحث تھا۔ اور طلبہ اور طالبات بڑی آزادی سے بحث میں حصہ لے رہے تھے۔

موٹر ڈرائیوری اور خانہ سازی کا ذکر خاص طور پر محض اس لئے کیا گیا ۔۔۔ کہ امریکی "ہمہ گیر" ثانوی مدرسے کے نصاب کی وسعت کا کچھ اندازہ ہو سکے، اس نصاب کا مقصد نوجوانوں کو عملی زندگی کے لئے تیار کرنا اور انھیں خوش اسلوبی کے ساتھ مل جل کر رہنے کا طریقہ سکھانا ہے، چوں کہ زندگی کی ضروریات بہت وسیع ہیں، اس لئے "ہمہ گیر" مدرسے کا نصاب بھی اسی نسبت سے وسیع ہے، روائتی مضامین پر بس کر دینا اس کے بنیادی فلسفہ کے منافی ہے، روائتی مضامین نے بھی اس نصاب میں جو شکل اختیار کر رکھی ہے وہ حد درجہ سبق آموز ہے۔ مثلاً انگریزی کی تدریس کے تحت ایک مضمون کاروباری انگریزی تھا۔ اسی طرح ریاضی کے تحت پرچون فروشی اور ذاتی حساب کتاب کے مضامین تھے، ذاتی حساب کتاب کی جو جماعت میں نے دیکھی اس میں صرف سترہ (۱۷) طلبہ تھے۔ ایک دن پہلے این آربر میں فٹ بال کا

بیچ ہوا تھا، تماشائیوں کی کاروں کی دیکھ بھال کا کام ان طلبہ کے سپرد تھا، اس طرح جو رقم بطور فیس وصول کی گئی وہ کوئی ۲۰۰۰۰ ڈالر کو پہونچتی تھی اور اب جماعت میں اس رقم کی جانچ پڑتال ہو رہی تھی۔

ان علمی اور کاروباری نصابوں کے علاوہ مدرسے میں بڑھئی، لوہار، مکینک وغیرہ کی ورک شاپیں بھی تھیں، اکثر ثانوی مدرسوں میں یہ ورک شاپیں اس قدر بڑی اور جدید ترین سازوسامان سے اس طرح لیس ہیں کہ ان پر کسی کارخانہ کی ورک شاپ کا دھوکہ ہوتا ہے، بیشتر ثانوی مدارس میں زراعت کی عملی تعلیم کا نہایت اعلیٰ انتظام ہے، نظری تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کو عملی کاشتکاری کے جدید ترین طریقوں کی تربیت دی جاتی ہے، یہ عملی تربیت صرف مدرسہ کے تجرباتی فارم تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ ہر طالب علم خود اپنی زمین میں ان طریقوں کو وسیع تر پیمانے پر آزماتا ہے، مدرسے کا زراعت ماسٹر بعد از اسکول اوقات میں طالب علموں کے کھیتوں میں جاتا اور ان کا ملاحظہ کرتا ہے، مدرسے میں عموماً زرعی آلات کی مرمت کے لئے ایک اعلیٰ پیمانہ کی ورک شاپ بھی ہوتی ہے، جہاں نہ صرف مدرسہ خود اپنے آلات کی مرمت کر لیتا ہے۔ بلکہ طلبہ اپنے مرمت طلب ذاتی آلات کو بھی مرمت کے لئے یہاں لے آتے ہیں۔

غیر درسی مشاغل ہمہ گیر ثانوی مدرسے کے نصاب کا جو خاکہ اوپر کی سطروں میں پیش کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ تقریباً تقریباً ہر استعداد کا طالب علم اپنے مذاق کے مطابق کچھ مضامین کا انتخاب کر سکے گا۔ لیکن نصاب کی یہ ہمہ گیری اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتی۔ ہر مدرسے میں غیر درسی مشاغل کی بہتات کا یہ حال ہے کہ غیر ملکیوں کو تعجب ہوتا ہے، مختلف کھیلوں کے کلب، ڈرامہ کے کلب علمی، ادبی مباحثوں اور مذاکروں کے لئے طلبہ کی انجمنیں، غرض ہر مدرسہ میں غیر درسی مشاغل کی تعداد درجنوں کو پہونچتی ہے، اور کوئی طالب علم ایسا نہیں جو ان میں سے ایک سے زیادہ میں حصہ نہ لیتا ہو ہمہ گیر نصاب اور وسیع غیر درسی مشاغل باہم مل کر اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ عملی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیا جائے تاکہ مدرسہ ہر طالب علم کو اس کے حسب حال کچھ نہ کچھ عملی تربیت ضرور پیش کر سکے۔

طلبہ کی حکومت

زندگی میں کامیابی کی ایک ضروری شرط ذمہ داری سنبھالنے کی صلاحیت ہے۔ غیر درسی مشاغل اور مدرسہ کا حد درجہ جمہوری ماحول اس صلاحیت کے پیدا کرنے میں بہت کارگر عوامل ہیں، امریکی مدارس نے تعلیم کی فضا کو جس کامیابی کے ساتھ ختم کیا ہے، وہ حد درجہ سبق آموز ہے، عموماً ہر مدرسے میں طلبہ کی ایک نمائندہ مجلس موجود ہوتی ہے، اس کے اراکین باقاعدہ منتخب ہوتے ہیں، مجلس مدرسہ کے نظم ونسق اور دیگر متعلقہ امور پر سوچ وچار کرتی اور منتظمین کو مشورے دیتی ہے، اس کے فیصلوں اور مشوروں کو کافی وزن دیا جاتا ہے، کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اس مجلس نے کوئی مطالبہ کیا۔ مگر پرنسپل نے اول اول اس کو قابل عمل نہ سمجھا اور بالآخر مجلس کے پیہم اصرار پر اسے اپنے پہلے فیصلے پر نظر ثانی کرنا پڑی۔

این آر برسٹیر ہائی اسکول جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، اس کی مجلس طلبہ کے ایک اجلاس کو دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا، اجلاس میں کوئی بیس کے قریب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شرکت کر رہے تھے، مدرسے کا کوئی استاد اس میں شامل نہ تھا، اس وقت مجلس ایک بڑے پر لطف مسئلہ پر بحث کر رہی تھی۔ پچھلے سال مجلس نے پرنسپل کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ سال رواں کے لئے "مدرسے کی ملکہ" کا انتخاب کیا جائے مگر انہوں نے یہ تجویز اس لئے نہ مانی کہ اول تو ایک جمہوری ملک میں بادشاہ اور ملکہ کا تصور ہی غلط ہے، دوسرے یہ کہ جو لڑکی ملکہ چنی جائے گی اس کی آئندہ زندگی پر اس کا کیا اثر ہوگا، اور جو بیچاری اس مقابلہ میں ہار جائے گی اس کی زندگی پر یہ ناکامی کیا اثر ڈالے گی، پرنسپل صاحب کی منطق نے اس وقت تو مجلس طلبہ کو خاموش کر دیا۔ مگر اس سال یہ مطالبہ نئی شدت کے ساتھ پھر پیش ہونے والا تھا، مجلس طلبہ کے اراکین اس کے جواز میں یہ دلیل دے رہے تھے کہ ملکہ کو اس کی ظاہری خوبصورتی کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے اخلاقی محاسن اور ذہنی کمالات کی بنا پر چنا جائے گا، اور یہ چیز کسی طرح قابل اعتراض نہیں

طلبہ کی حکومت کا وجود ثانوی سکولوں میں یوں تو عام ہے، لیکن یہ ادارہ ہر مدرسہ میں ایک سا موثر نہیں۔ ابھی پرانی وضع کے تحکم پسند صدر معلم بالکل ختم نہیں ہوئے۔ کہیں کہیں اس قماش کے بزرگوار بھی مل جاتے ہیں جو اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ ان کا ہر لفظ مدرسے کی زندگی کے لئے قانون کا درجہ

اس قسم کے مدرسوں میں طلبہ کی حکومت نمائش سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، لیکن اس وضع کے مدرسے معدوم بڑی تیزی سے ختم ہو رہے ہیں، اور صحیح جمہوری اقدار تعلیمی زندگی میں مضبوط جڑیں پکڑ رہی ہیں۔

رنگ کا مسئلہ

اضلاع متحدہ امریکہ میں حبشی کل آبادی کا دس فی صدی ہیں، یہ بات تاریخ کے عجیب ترین اتفاقات میں سے ہے کہ نئی دنیا کے سفید فام آبادکاروں نے اس سرزمین کے اصلی باشندوں کو اس طرح مٹا دیا کہ آج خود اپنے ملک میں ان کا وجود عجائب گھر کے نوادر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا لیکن وہ کالے کلوٹے حبشی غلام جنہیں ان سفید فام آقاؤں کی خدمت کے لئے افریقہ کے ظلمت کدہ سے گھسیٹ کر لایا گیا تھا، آج ان کی اولاد انہی آقاؤں کی اولاد کے لئے ایک حقیقی درد سر بن رہی ہے۔ امریکی دستور تمام شہریوں کو ایک سے حقوق دیتا ہے، مفت ثانوی تعلیم ہر شہری کا پیدائشی حق ہے، اس میں کالے گورے کی تمیز نہیں۔ لیکن جنوبی ریاستیں جہاں حبشی آبادی کے بڑے بڑے مرکز ہیں ابھی اس بات پر آمادہ نہیں ہو سکیں کہ کالے اور گورے بچے ایک ساتھ تعلیم پائیں۔ تعلیم کے مساوی مواقع کی توجیہہ وہ اس طرح کرتی ہیں کہ کالے اور گورے بچوں کی تعلیم پر یکساں روپیہ خرچ کر دیا جائے اور بس، ان کے مدارس بہرصورت الگ ہوں۔

شمالی ریاستوں میں کالے اور گورے بچے اکٹھے پڑھتے ہیں لیکن ان ریاستوں میں حبشیوں کی آبادی زیادہ نہیں۔ اینن آربر سینئر ہائی سکول کی اکثر جماعتوں میں میں نے دو دو چار چار حبشی طالب علم دیکھے، انھیں بظاہر دوسرے طلبہ کی سی سہولتیں حاصل تھیں۔ مگر اس پر بھی ان میں سے اکثر کچھ دبے دبے نظر آتے تھے جس کی وجہ غالباً زیادہ تر نفسیاتی تھی۔ مدرسہ کے پرنسپل نے رنگ کے سوال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہم انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ رنگ کی تفریق کی لعنت ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے، ابھی پچھلے دنوں فٹ بال میچ کے موقعہ پر کوکا کولا کمپنی نے سکول سے کچھ لڑکیوں کی خدمات کے لئے درخواست کی تھی جو تماشائیوں کے ہاتھ کوکا کولا کی بوتلیں فروخت کر سکیں، ہم نے جو فہرست بھیجی اس میں دو حبشی لڑکیاں بھی شامل تھیں، کمپنی نے اس پر اعتراض کیا اور ہم نے لڑکیاں بھیجنے سے انکار کر دیا۔ ہم نے یہ گوارہ کیا کہ مدرسے کی کچھ لڑکیاں تھوڑی سی آمدنی سے محروم رہیں۔ مگر ہم نے یہ

گوارا نہیں کیا کہ بعض لڑکیوں کی خدمات محض اس لیئے ٹھکرا دی جائیں کہ ان کا رنگ کالا ہے ۔

طلبہ اور ملازمت

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بعض ریاستوں میں سولہ برس کی عمر تک اور بعض میں اٹھارہ برس کی عمر تک مدرسہ میں جانا لازمی ہے ، اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اس عمر کو پہونچنے سے پہلے کوئی نوجوان کسی جگہ ملازمت نہیں کر سکتا، اس عمر سے پہلے کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی کو پورے وقت کے لیئے ملازم رکھنا قانوناً منع ہے ۔ تاہم ثانوی مدرسہ کے آخری مدارج پر جز دی وقت کے لیئے کام کرنے کی اجازت مل جاتی ہے ، اور یہ کام عموماً مدرسے کی معرفت ہی انجام پاتا ہے بعض بچے اتنے نادار ہوتے ہیں کہ دوپہر کے کھانے کے اخراجات ادا نہیں کر سکتے (دوپہر کے کھانے کا وقت مدرسہ میں ہی آجاتا ہے ، اور یہ کھانا مدرسے کے کافے ٹیریا کی طرف سے مہیا کیا جاتا ہے) ایسے بچوں کو خواہ وہ کسی عمر کے ہوں ۔ کافے ٹیریا میں تھوڑا بہت کام دے دیا جاتا ہے ۔ تاکہ انھیں یہ احساس نہ ہونے پائے کہ انھیں کھانا خیرات کے طور پر مل رہا ہے ۔ بلکہ یہ احساس ہو کہ وہ خود کما کھا رہے ہیں ۔ بڑی جماعتوں میں مدرسے کے باہر بھی کام فراہم کر دیا جاتا ہے ، یہ کام عموماً مدرسہ کے ایک خاص مدرس کے سپرد ہوتا ہے ، جو طلبہ کی استعداد و دلچسپیوں اور ان کے دیگر کوائف کا پورا ریکارڈ رکھتا ہے اور مدرسہ سے باہر کی دنیا سے بھی اچھی طرح باخبر رہتا ہے ، قرب و جوار میں جن لوگوں کو خدمات کی ضرورت ہوتی ہے وہ مدرسہ کو اطلاع دیتے ہیں اور یہ مدرس موزوں طلبہ کو ان خدمات پر مامور کر دیتا ہے ۔

قارئین میں سے اکثر کو شاید یہ بات بہت انوکھی معلوم دے ۔ ہمارے یہاں کام کرنا ایک گھٹیا چیز سمجھی جاتی ہے ، جو چھوٹے طبقے کے ان پڑھ لوگوں کا حصہ ہے ، امریکہ میں یہ غلط تصور سرے سے مفقود ہے ، مدرسہ تو مدرسہ یونی ورسٹی تک کے طلبہ ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ رہتے ہیں ، مجھے ذاتی طور پر ایک خوش پوش نوجوان کا علم ہے ، ایک شام میں نے اسے قریب کے جنگل میں کلہاڑا پکڑے درخت کاٹتے دیکھا اس کی کار قریب کھڑی تھی اور وہ پسینہ میں شرابور مزدوروں کے کپڑے پہنے تھا ، قریب ہی ایک نیا مکان بن رہا تھا ، دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ مالک مکان کو یہ قطعہ زمین صاف کروانا ہے ، اور میں

روزانہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ یہاں کام کرتا ہوں، اسی طرح ایک سینئر ہائی سکول کی بارھویں جماعت کے طلبہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دو تین کے سوا باقی تمام جزوی ملازمت کر رہے ہیں، یہاں یہ وضاحت بھی ہو جانی چاہیئے کہ کام کرنے کے معاملے میں امیر غریب کی کوئی تمیز نہیں، امیروں کے لڑکے لڑکیاں بھی اسی طرح کام کرتے ہیں جس طرح غریبوں کے، مثلاً میں نے یونی ورسٹی کے اکثر پروفیسروں کے لڑکے لڑکیوں کو کام کرتے پایا۔

جزوی ملازمت کے مالی پہلو سے قطع نظر اس کی عملی افادیت ناقابل انکار ہے، اس کی بدولت مدرسہ چھوڑنے اور ہمہ وقت ملازمت اختیار کرنے سے بہت پہلے نوجوان زندگی کے عملی تقاضوں، مجبوریوں، ذمہ داریوں اور مواقع کو سمجھنے لگتے ہیں، اس سے ایک ایسی عملی تربیت کا سامان ہو جاتا ہے جس کی تلافی کوئی نظری تعلیم نہیں کر سکتی۔

مادی اقدار کی فوقیت

بعض لوگ امریکی طرز زندگی کے متعلق یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ اس میں مادی اقدار کو غیر معمولی فوقیت حاصل ہے۔ ثانوی تعلیم کا جو مختصر سا خاکہ اوپر کی سطروں میں پیش کیا گیا ہے، شاید اس سے بھی اس خیال کی تھوڑی بہت تائید ہو، اس ضمن میں ہمیں یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ صرف امریکی طرز زندگی ہی نہیں بلکہ ساری مغربی تہذیب کی بنیاد مادی اقدار پر ہے، اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ صحت مند مادی زندگی کی تعمیر کے بغیر پاکیزہ تر اقدار کے بڑھنے پھولنے کا ماحول پیدا کرنا ممکن نہیں، مادی اقدار کی نمایاں فوقیت کے باوجود امریکی زندگی پاکیزہ تر اقدار سے خالی نہیں، اس ضمن میں پھر ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر مناسب ہوگا، میں اور ایک چینی دوست ایک دن ایک پبلک لائبریری میں بیٹھے کتب خانہ کے مہتمم سے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں دو سکاؤٹ لڑکے جن کی عمریں تیرہ، چودہ برس سے زیادہ نہ تھیں کتب خانہ میں آئے، ایک کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جس نے میرے چینی دوست کی نگاہ کو کھینچا، اس نے لڑکے سے کتاب دیکھنے کو لی، اور چند منٹ دیکھنے کے بعد پوچھا میاں صاحب زادے یہ کتاب کس دکان سے ملے گی؟ لڑکے نے کہا آپ کو یہ کتاب درکار ہے تو اسے ہی رکھ لیجئے۔ میرے

دوست نے معاندت کرتے ہوئے کہا بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ میں ایک مدرسہ کے طالب علم کی کتاب رکھ لوں اور اسے بعد میں یہ کتاب دوبارہ خریدنی پڑے، اس پر طالب علم نے نہایت محبت کے لہجہ میں جواب دیا کہ میں کام کرتا ہوں اور پیسے کماتا ہوں، اس لئے کتاب کا دوبارہ خریدنا نہ مجھ پر بوجھ ہوگا نہ میرے والدین پر غرض لڑکے نے اصرار کر کے یہ کتاب میرے دوست کے حوالے کر دی۔

اس واقعہ سے کوئی عام نتیجہ اخذ کرنا مقصود نہیں، لیکن اس سے کم از کم اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ جو قوم مادی اقدار سے آنکھیں بند نہیں کرتی وہ معمولی توجہ سے بلند تر اقدار کی ترقی کا سامان بھی کر سکتی ہے، اس کے برعکس جن لوگوں نے زندگی کی مادی بنیادوں سے لگاتار لاپرواہی برتی ہو ان کے لیے چوڑے دعوے انھیں اعلیٰ قدروں کا مالک نہیں بنا سکتے۔

خاتمہ کلام مضمون کے آغاز میں کہا گیا تھا کہ نظام تعلیم اور فلسفۂ حیات ایک ہی تصویر کے دو رخ ہوا کرتے ہیں، امریکہ کا ہمہ گیر ثانوی مدرسہ جس زندگی کی تصویر پیش کرتا ہے، اس کے بہت سے عناصر بے حد پسندیدہ ہیں لیکن یہ زندگی مخصوص امریکی حالات کی پیداوار ہے۔ "ہمہ گیر" ثانوی مدرسہ ہمارے ہاں ممکن نہیں، وجہ ظاہر ہے۔ ہمارے معاشی وسائل سر دست بہت محدود ہیں۔ بہت غنیمت ہوگا اگر ہماری معیشت مفت اور لازمی ابتدائی تعلیم کا ہی پورا اہتمام کر سکے۔ ثانوی تعلیم ابھی کافی دیر تک چیدہ چیدہ طلبہ کے لئے مخصوص رہے گی۔ ہمارے نقطۂ نگاہ سے اس وقت اہم سوال یہ نہیں کہ سب نوجوانوں کو مفت ثانوی تعلیم کس طرح مہیا کی جائے، بلکہ یہ کہ ثانوی تعلیم کے لئے صحیح طور پر موزوں طلبہ کو کس طرح چنا جائے اور غیر موزوں طلبہ کو اس تعلیم سے کس طرح باز رکھا جائے۔ تعلیمی معیاروں کے گرنے کی شکایت آجکل بہت عام ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے بیشتر ایسے طلبہ داخل ہو رہے ہیں، جن کی موزونیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کے پاس اخراجات ادا کرنے کے ذرائع ہیں، یہ غیر موزوں طلبہ جو آج ثانوی تلمذ کئے بیٹھے ہیں کل تدریس کی کرسی پر جا بیٹھتے ہیں اور اس طرح پست تعلیمی معیاروں کے ایک چکر نے قوم کو چنگل میں لے لیا ہے اس کے علاج کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، اول یہ کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے دروازے ہر شہری پر

برابر کھل جائیں۔ تاکہ قابل جوہر ناداری کے بوجھ تلے پس کر ہی نہ رہ جائیں، یہ صورت قابل عمل نہیں کیونکہ ہمارے معاشی وسائل کم از کم اس وقت اس بھاری تعلیمی بوجھ کے متحمل نہیں ہو سکتے، دوسری صورت یہ ہے کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی موزونیت کا انحصار مالی ذرائع پر نہ ہو۔ بلکہ علمی اور ذہنی استعداد پر۔ گویا نا اہل طلبہ پر اس تعلیم کے دروازے بند ہوں۔ خواہ وہ طلبہ امیر ہوں یا غریب۔

آہ مرزا عبدالحکیم

ہم دلی رنج کے ساتھ اپنے محترم رفیق کار مرزا عبدالحکیم کی افسوس ناک موت کا اعلان کرتے ہیں، مرزا صاحب موصوف سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ اور تعلیم جسمانی کے ڈائرکٹر تھے، آپ کی موت ۲۳ اور ۲۴ اکتوبر کی درمیانی شب کو حرکت قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

مرزا عبدالحکیم ۱۵ جون ۱۹۰۰ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور جون ۱۹۲۳ء میں محکمہ تعلیم کی ملازمت میں آئے۔ ایک لمبے عرصے تک آپ نے اے، ڈی، آئی۔ برائے تربیت جسمانی کے طور پر کام کیا اور کئی سالوں تک لاہور کارپوریشن میں مدارس کے سپرنٹنڈنٹ رہے۔

تقسیم ملک کے فوراً بعد آپ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں آ گئے، جہاں آپ نے آخری دم تک نہایت فرض شناسی سے کام کیا۔ مرحوم کی وفات سے کالج ایک ایسے خاموش کارکن سے محروم ہو گیا ہے۔ جو اپنے کام کی انجام دہی میں کسی کوشش سے دریغ کرنا نہیں جانتا تھا۔

معلم کامل صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق تدریس

عبدالغفور چودھری

طریقہ سوال کا مفہوم استاد کے درجہ میں (طالب علموں سے) جرح کرنے کے محدود معنوں میں نہ لینا چاہیئے اس کو ایک ایسا آلہ کار سمجھنا چاہیئے جو بچوں میں تجسس کی اندرونی تحریک کو اور بالغوں میں اعلیٰ تر شکل کے شوق جستجو کو آسودہ کرتا ہے، جو خیال کے ایک مکمل تر حلقہ اور علم کے بہتر طور پر تکمیل یافتہ نظام کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے۔ لفظ "مسئلہ" کی جو مذہبی احکامات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اصل اس بات کی مظہر ہے کہ اسلامی تعلیم کے نظام میں طریقہ سوال کو علم کا بنیادی جز سمجھا جاتا تھا۔ آنحضرتؐ نے مسائل زندگی پر سوالات اور بحث و مباحثہ کرنے کی بذات خود حوصلہ افزائی کی تھی۔ آپ کے صاف گو اور دعوتِ فکر دینے والے رویہ کی تقلید مذہبی علما، اور اساتذہ نے کی اور مکتب کی جماعتوں اور مذہبی مجلسوں میں سوال و جواب کے طریقے کو بہت اہمیت دی جانے لگی۔

آنحضرتؐ اپنے ایک اہم مقولہ میں فرماتے ہیں "علم ایک خزانہ ہے۔ اور سوال وجواب اس کی کنجی" اکثر و بیشتر آپ کی اس حدیث کو بھی حوالہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ سوال کرنے میں بیمار کا علاج مضمر ہے، اور جس صورت حال کے نتیجے میں یہ حدیث معرض وجود میں آئی ہے اس کے پیچھے ایک الم ناک قصہ ہے۔ معتقدین کا ایک گروہ ایک مرتبہ ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا کہ راستہ میں ان میں سے ایک شخص پھسلتی ہوئی چٹان سے زخمی ہو گیا۔ نماز کا وقت قریب آنے پر اس نے غسل طہارت کیا جس کے نتیجے میں زخم میں فساد ہو گیا اور وہ اسی جگہ مر گیا۔ آنحضرتؐ اس موت سے بہت متاثر ہوئے۔ اور اس بنا پر کہ ان حالات میں

غسل کرنے کے مذہبی فرض کو آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ آپ کو اور بھی زیادہ صدمہ تھا۔ بدقسمتی سے اس مسئلہ پر آنحضرتؐ کا فیصلہ نہیں لیا جا سکا اور وہ بے چارہ اس حادثہ کی نذر ہو گیا، جسے استفسار کے ذریعہ دور کیا جا سکتا تھا۔ یہی اس حدیث کی شان نزول ہے جس میں لفظ بیماری وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے، اور اس میں اخلاقی، معاشرتی یا ذہنی فطرت کی بے ترتیبی بھی شامل ہے۔

استاد اور تعلیم بالغاں کے سلسلے میں کام کرنے والے کو جو سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ درپیش ہوتا ہے وہ یہ کہ طالب علموں میں جھجک اور ذہنی کم تری کا احساس پایا جاتا ہے جس سے وہ سوالات کرنے سے ڈرتا ہے، سن رسیدہ اور تجربہ کار صحابیوں کے گروہ میں حضرت علیؓ ایک نوجوان تھے اور آپ عمر میں اپنے سے بڑوں کے درمیان سوالات کرنے میں حجاب محسوس کرتے ہوں گے، اس موضوع پر آپکے اقوال اس شخص کا تصور دلاتے ہیں جس کے دل میں اکثر سوال کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہو، اور خواہش کے دبانے اور اس کو دوسرے وقت کے ملتوی کرنے میں بڑی جدوجہد کرنا پڑی ہو، آپ کے قول کے مطابق " (دوسروں سے پوچھنے کا) خوف ہم کو بدنصیبی کی طرف لے جاتا ہے اور (اس سلسلہ میں) شرم و حجاب محرومی کی طرف" ایک دوسرے قول میں آپ نے پانچ چیزیں گنائی ہیں جنھیں بڑی ہوشیاری سے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ خواہ کوئی شخص اونٹ پر سوار ڈاک لے جانے والی رفتار اور عجلت ہی سے کیوں نہ جا رہا ہو (خواہ وہ کتنا ہی عجلت میں کیوں نہ ہو) ان (پانچ چیزوں) میں آپ مندرجہ ذیل کو بھی شامل کرتے ہیں: " لاعلم شخص (IGNORANT) کو سوال کرنے اور یا علم کو لاعلمیت سے جھجک نہ محسوس کرتی چاہیئے "۔

حسنؓ کے قول کے مطابق " جو شخص شرم کے باعث تلاش علم سے باز رہا اس نے گویا خود کو جہالت کے پردہ سے ڈھک لیا۔ تلاش علم میں تمام شرم و حجاب کو دور کر کے جہالت کے اس پردہ کو نوچ کر پھینک دو۔ اس لئے کہ جس نے بھی سوال کرنے سے جی چرایا اس نے بلاشبہ علم کے منہ پہ نقاب ڈال دی (اپنے لئے اور دوسروں کے لئے)" ابراہیم بن مہدی کا ایک چبھتا ہوا مقولہ ہے " احمقوں کے سوالات پر جرح (QUESTION) کرو۔ اور دولت کے صندوقچہ کو برقرار رکھو"۔

ہر ذہین استاد واقف ہے کہ کس طرح ایک عمدہ سوال نہ صرف سوال کرنے والے کی لاعلمیت کا انکشاف کرتا ہے، بلکہ اس طریقہ کو بھی ظاہر کرتا ہے جو اس مسئلہ کو حل کرنے میں رہنمائی کرتا ہے۔ درحقیقت اس سے سوال و جواب دعوت مقابلہ کی سطح سے بلند ہو کر ایک تعاونی عمل بن جاتا ہے جس میں سوال کرنے والا اور جواب دینے والا دونوں حقیقت کی تلاش میں شریک کار بن جاتے ہیں حسن رضؓ کے قول کے مطابق "عمدہ سوال و جواب نصف علم کے برابر ہیں"۔ مطلب یہ کہ جو شخص ایک عمدہ سوال کرتا ہے وہ اس شخص کو جس سے وہ سوال کرتا ہے مدد دیتا ہے اور کسی چیز کے دریافت کرنے کا نصف کام بٹا لیتا ہے۔ یہ الفاظ ایک مبتدی LEARNER میں اعتماد کی کیسی صحت مند روح پھر دیں گے جو ذہانت سے بھرے ہوئے سوال و جواب کی قدر و قیمت کا اندازہ کر لیتا ہے۔

بسا اوقات سوال و جواب چھان بین کرنے کا ایک آلہ ثابت ہوتے ہیں، اور بجلی کی ایک چمک کا کام کرتے ہیں، جس کی روشنی میں استاد پر خود اس کی چھپی ہوئی لاعلمیت آشکار ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے سوال و جواب سے اکثر خیالات کا ایک تازہ تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔ یا علم کے لئے ایک نئی جستجو پیدا ہو جاتی ہے اور اس سے خود استاد میں علم کے ایک مکمل نظام (کا احساس) پیدا ہونے میں مدد ملتی ہے۔ ایک مشہور عالم خلیل کا قول ہے اگر تم لوگوں کو اچھی طرح تعلیم نہیں دے سکتے تو ان کو اپنے طریقہ کے مطابق اپنا علم سکھاؤ۔ اور اگر وہ سوالات کی بوچھاڑ کر کے تم کو پریشان کر دیں تو صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دو کیونکہ اس سے تم کو یہ جاننے میں مدد ملے گی کہ تم کیا نہیں جانتے"

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص ابن المبارک سے ایسے وقت ملنے گیا جب ان کے گرد محدث جمع تھے۔ اس کو سوال کرتے حجاب محسوس ہوا۔ اور محدثین برابر سوال کرتے رہے جب ابن المبارک کی نظر اس پر پڑی تو انھوں نے ایک پرزہ لکھ کر اس کے پاس بھیجا جس میں انھوں نے لکھا تھا اے بندۂ خدا اگر تم سوال کرنے سے باز رہے تو دوسرے روز تم بہت ہی ناامید ہو کر جاؤ گے۔ شیخ سے اپنے سوالات کرو اور تم اسے خوش بیان پاؤ گے۔ تم کو اس طرح) دوہرا اطمینان نصیب ہوگا۔ لیکن اگر تم ایک غم زدہ ماتمی کی طرح ان (سوالات کی آہ و زاری (WALL)کو ضبط نہیں کر سکتے تو دور کھڑے ہو جاؤ۔

لیکن اُس صورت میں تم خالی ہاتھ رہ گئے"۔ خلیل کے قول کے مطابق فنون کا سیکھنا گویا تالے ہیں۔ اور جواب طلب باتیں (QUERIES) ان تالوں کی کنجیاں"۔ ایک مرتبہ معاویہ ابن سفیان نے دیبال نامی ماہر نسبیات کو علم نسب اور نجوم سیکھنے کے لئے طلب کیا۔ ایک شخص نے دیبال سے دریافت کیا کہ وہ ان تمام چیزوں کو اپنے دماغ میں کیسے محفوظ رکھتا ہے، اس نے جواب دیا۔ ذہین دماغ اور سوال پوچھنے والی زبان کی مدد سے"۔ کسی شخص نے اسمٰعیل سے پوچھا "تم نے علم میں جو کچھ حاصل کیا ہے اسے کس طرح حاصل کیا ہے"؟ انھوں نے جواب دیا۔ بکثرت سوالات کرنے سے"۔

اس موضوع پر شعراء نے بڑی خوش بیانی سے کام لیا ہے وہ بلاشبہ سوال و جواب جہالت کے لئے قاتل کا حکم رکھتے ہیں اور جس وقت کوئی شخص کسی مسئلہ پر غور و خوض کرتا ہے اس وقت سوال و جواب سے اس کو اطمینان اور سکون ملتا ہے، بحث و مباحثہ کو فوقیت حاصل ہے اور سوال و جواب بھی نابینا (BLIND) کے لیے تسکین وہ ثابت ہوتے ہیں"۔ ایک عالم نے لکھا ہے:۔

"دیر تک سوال و جواب کرنا اندھے کے لئے باعث تسکین ہوتا ہے، اور دیر تک خاموش رہنے سے جہاں تک جہالت کا تعلق ہے اندھے پن کو تکمیل پر پہونچا دیتا ہے"۔ ایک دوسرے شخص کا قول ہے اگر تم نہیں جانتے ہو اور اس آدمی کی تقلید بھی نہیں کرتے جو اس شخص سے سوال کرتا ہے۔ جو جانتا ہے۔ تم کیسے جان سکتے ہو"؟

مذہبی تعلیم

فیض اللہ

مذہبی اقدار ہماری ثقافت کی بنیاد ہیں بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مذہب ترقی اور پیش قدمی کا راستہ روکے ہوئے ہے، ایسا خیال مذہب کی اصل روح سے بے خبری کا نتیجہ ہی ہو سکتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلام خالصتہً ایک مذہبی قوت تھی مگر اس قوت کے مظاہر اس قدر ہمہ گیر تھے کہ وہ اعلیٰ زندگی کے مادی اور غیر مادی تمام پہلوؤں پر پوری طرح حاوی تھے، اگر بعد میں نام نہاد مذہبی رسوم نے سکون اور جمود کی شکل اختیار کر لی تو اس میں مذہب کا قصور نہیں، یہ جرم ان کج فہم لوگوں کا ہے جنھوں نے اس سب سے بڑی تخلیقی قوت کو اوہام و روایات کے بھاری بھرکم پتھروں کے نیچے دبا کر اسے بالکل بے جان کر دیا، مذہب بشرطیکہ وہ صحیح روح کا حامل ہو ترقی اور پیش قدمی کی بہترین ضمانت ہے جہاں یہ قوتیں ناپید ہوں، سمجھ لینا چاہئے کہ وہاں مذہب اگر ہے تو محض ایک نام اور رسم کے طور پر بطور ایک زندہ قوت کے اس کا وہاں وجود نہیں۔

ہم اپنی زندگی کی تعمیر صحیح اسلامی اقدار پر کرنا چاہتے ہیں، یہ اقدار خالص مذہبی اور اخلاقی اقدار ہیں ان کو زندہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ اقدار ہماری تعلیم کا مرکزی نقطہ ہوں، یہ غایت ایک حد تک تو مذہبی تعلیم کے لازمی کر دینے سے پوری ہو جائے گی۔ مگر زیادہ موثر صورت یہ ہو گی کہ مدرسہ کا سارا ماحول ان اقدار سے بھرپور ہو۔ اس ماحول کا اہم ترین عنصر استاد ہے، اس لئے ہمارے اساتذہ کو چاہئے کہ اپنے آپ کو سچی اسلامی اقدار کے جیتے جاگتے پیکر بنائیں، مذہبی اقدار کو دوسروں کے دلوں میں جاگزیں کرنے کے لئے جبر بالکل بے کار بلکہ بے کار سے بھی بدتر ہے۔ وعظ و تلقین سے بھی کسی زیادہ پائیدار فائدے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اس مطلب کے لئے اگر کسی چیز پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے تو وہ ہے عملی مثال۔ کیا ہمارے اساتذہ اس اہم ذمہ داری کو پورا کریں گے؟ یہ ہے وہ سوال جس کے جواب پر اس بات کا انحصار ہے

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خاں

ناظر حسن سلیم

مرحوم دہلی کالج نے اپنے مختصر دورِ حیات میں جو درخشندہ جوہر پیدا کیے اور جو تابناک ستارے اس کے افق سے طلوع ہوئے ان کی نظیر بہت کم درس گاہوں نے پیش کی ہے، ازمنۂ وسطیٰ میں اس مردم خیزی کی مثال بغداد اور قرطبہ کے جامعوں میں ملتی ہے۔ اور اس کے بعد گوٹنجن، کیمرج اور آکسفورڈ کی جامعات کو یہ شرف حاصل ہوا کہ مشاہیر ملک۔ اور مختلف فنون کے کامل ان کے ایوانوں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ ماسٹر رام چندر، مولوی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، ماسٹر پیارے لال، ذکاء اللہ خاں۔ یہ وہ نام ہیں جو اردو ادب ہیں اور اردو ادب کے علاوہ تعلیمات میں ممتاز مقام رکھتے ہیں ان کا نام سنتے ہی ذہن دہلی کالج کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جہاں ان قابل جوہروں کی نشو و نما ہوئی، مولوی نذیر احمد اور شمس العلماء، آزاد سے ان کی ادبی تصنیفات کی بنا پر ہر شخص روشناس ہے، لیکن ذکاء اللہ خاں کا میدان عمل اپنے ہم عصروں سے مختلف تھا۔ ان کی تخلیقات کا دائرہ وسیع تر ہے۔ علاوہ ازیں ریاضیات۔ طبیعات تاریخ۔ سیاسیات مدن۔ اخلاق، معاشرہ یہ ایسے مضامین ہیں جو نسبتاً کم دل چسپ ہیں اور جن کی طرف ذی علم آدمیوں کی مختصر سی تعداد توجہ کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ذکاء اللہ خاں صاحب کی تصنیفات اور ان کی خدمات سے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ پورے طور پر روشناس نہیں، ورنہ کثرتِ تصانیف اور خدمتِ فن کے لحاظ سے مولوی ذکاء اللہ خاں کا نام سرِفہرست آتا ہے۔

خان بہادر شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب مرحوم دہلی کالج کے ان مایہ ناز فرزندوں میں سے تھے جن پر اردو ادب بالعموم اور صیغۂ تعلیم خصوصیت سے ناز کر سکتا ہے، آپ کوچہ بلاقی بیگم دہلی میں بتاریخ یکم اپریل ۱۸۳۲ء عالمِ وجود میں آئے، بچپن میں بہت شوخ تھے اور ان کی والدہ اکثر ان کے دادا سے

شکایت کیا کرتی تھیں لیکن بوڑھے دادا کو اپنے ذہین پوتے سے کمال الفت تھی۔ اکثر جواب دیتے کہ یہ گھر کو آگ بھی لگا رہے تو اسے کچھ نہ کہوں گا کیوں کہ بچہ نہایت ذہین ہے اور سبق خوب یاد کرتا ہے اس طرح انھوں نے بارہ سال کی عمر میں مکاتب کی نصابی تعلیم پوری کی اور پھر دہلی کالج میں داخل ہوئے جس کا ان دنوں بہت شہرہ تھا۔ ان کی طبیعت کا میلان ریاضی کی طرف خصوصیت سے تھا چوں کہ اس مضمون میں ان کی طبیعت نہایت رسا تھی۔ ان کے استاد ماسٹر رام چندر صاحب جو کالج کے استاد ریاضیات تھے انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ آخر وہ وقت آیا کہ یہ فارغ التحصیل ہو کر دہلی کالج میں ہی علم ریاضی کے عہدے پر سرفراز ہوئے، اور جس شعبے میں کبھی طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے، اس کی کرسی کو زینت بخشی، کچھ عرصہ بعد آگرہ کالج میں اردو ادبیات کے استاد مقرر ہو گئے اور یہاں ایک مختصر سے قیام کے بعد ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کی حیثیت سے سررشتۂ تعلیم سے متعلق ہو گئے گیارہ سال تک یہ خدمت انجام دینے کے بعد دہلی نارمل اسکول میں صدر مدرس کے عہدے پر فائز ہوئے اور اس کے بعد ۱۸۶۹ء میں میور کالج الٰہ آباد میں عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے، یہاں بارہ سال تک نہایت امتیاز کے ساتھ خدمات انجام دے کر ملازمت سے سبک دوش ہوئے، اور پنشن لے کر خانہ نشین ہو گئے، اس وقت سے لے کر مرتے دم تک (۷ نومبر ۱۹۱۰ء) کامل دل جمعی کے ساتھ تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول رہے، یہ ہے مختصر سا خاکہ ان کی زندگی کا جس سے نہ صرف ان کے اساتذہ اور کالج کا نام روشن ہوا، بلکہ ہمارے دائرۂ تعلیم میں بھی ایک بے مثال اور قابل تقلید مقام رکھتی ہے۔

دنیا کے دیگر کامیاب آدمیوں کی طرح مولوی ذکاء اللہ خاں کو مبدءِ فیاض سے ذہانت کے ساتھ ایک جفاکش اور محنت پسند طبیعت ملی تھی، اصول کے پابند اور فرض شناس تھے اور فرائض منصبی کے ادا کرنے میں اتنے مستعد تھے کہ چھتیس سال سے کچھ زیادہ ملازمت کے دوران میں، صرف سولہ دن رخصت پر رہے۔ انھیں اپنے فرض یعنی تعلیم و تدریس سے دل چسپی نہیں عشق تھا، یہ عشق انھیں اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملا تھا جو ایک مدت سے شاہی خاندان کے بچوں کے اتالیق

چلے آتے تھے۔

پادری اینڈریوز صاحب جو مولوی صاحب کے مخلص دوستوں میں سے تھے اکثر ان سے ملنے آتے تھے، مرنے سے چند روز پہلے جب مولوی صاحب مرض الموت میں گرفتار تھے تب بھی ایک مرتبہ آئے اور برسبیل تذکرہ ان سے بولے کیا آج بھی آپ کا عقیدہ تعلیم پر اتنا ہی مضبوط ہے جتنا پہلے تھا مولوی صاحب نے ان کی طرف غور سے دیکھا (اُن کی بجھی ہوئی آنکھوں میں اداسی تھی) پھر فرمایا "نہیں بلکہ وہ عقیدہ تو آج پہلے سے ہزار گنا طاقت ور ہے۔ اگر مجھے اپنی ساری زندگی ایک بار اور دے دی جائے تو میں اسے پھر تعلیم ہی کی نذر کر دوں گا۔[1] جفاکشی کی عادت اور تعب العین کی تکمیل کے عشق نے انھیں ہمیشہ مستعد اور محنت طلب دکھا، بچپن میں وہ اپنے ہم جماعتوں میں نہایت لائق گنے جاتے تھے، چناں چہ دہلی کالج میں جب تک تعلیم پائی وہاں کے وظائف کے مستحق قرار دیئے گئے جب ملازمت میں داخل ہوئے تو اپنے ہم چشموں میں ممتاز رہے، اور جب خانہ نشینی کے بعد اپنی تصنیفات اہل ملک کے سامنے پیش کیں تو قبول عام نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ حکومت کی طرف سے بھی موصوف کی ان مساعی کے اعتراف میں جو اُنہوں نے تعلیم میں بالعموم اور تعلیم نسواں کے سلسلے میں بالخصوص انجام دی تھیں، خلعت عنایت ہوا، تصنیفات کے سلسلے میں انعامات اور خان بہادر شمس العلماء کے خطابات ملے۔ ان کی کتابوں کے اقتباسات اور متعدد تالیفات الہ آباد اور پنجاب یونیورسٹیوں کے نصاب میں مدتوں شامل رہے۔

مولوی نذیر احمد خاں کی تصانیف کا آغاز ۱۸۵۳ء میں مضمون نگاری سے ہوا، یہ مشغلہ انھوں نے عمر بھر جاری رکھا۔ اور ان کی ضخیم و وقیع تصنیفات بھی انھیں مختصر مضمون نگاری سے مانع نہ آئیں۔ رسالہ جات حسن حیدر آباد۔ تہذیب الاخلاق، سائنٹیفک گزٹ، معارف۔ زمانہ، مخزن، سب ان کی تحریروں سے زینت پاتے رہے۔ ابتدائی چند سالوں میں گم نام مضمون نگاری کرتے تھے، لیکن بعد میں

---

[1] پادری سی الیف اینڈریوز اختلاف مذہب کے باوصف مولوی صاحب سے ارادت رکھتے تھے اور ان کے مرنے کے بعد انگریزی میں ان کی سوانح عمری لکھی جس کا نام "ذکا اللہ" ہے، یہ واقعہ اسی سے ماخوذ ہے۔

جب ان کے جوہر کو قبول عام ملنے لگا تو اپنا نام شائع کرنے سے گریز کی جو عادت تھی وہ ختم کر دی۔ عربی و فارسی اور اردو کے وہ منتہی تھے لیکن انگریزی کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ تاہم از خود مطالعہ کرتے کرتے اتنی استعداد بہم پہونچالی تھی کہ مشکل انگریزی عبارتوں کا مطلب بخوبی سمجھ لیتے تھے۔

ملازمت کے آخر میں اور زمانہ نشستی کے تمام دور میں جو کم و بیش چالیس سال کی ایک طویل مدت ہے ان کا یہ معمول تھا کہ صبح کو دو گھنٹے تصنیف و تالیف میں صرف کرتے تھے، دنیا کا کوئی کام۔ کوئی پریشانی انھیں اس معمول سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔ ان کے استقلال اور جم کر کام کرنے کی قابلیت کا اندازہ اس امر سے ہوگا کہ نشست گاہ میں جس جگہ وہ بیٹھتے اور کام کرتے تھے وہاں دیوار سے سر لگتے رہنے کے سبب دیوار میں گڑھا پڑ گیا تھا۔ ان کی کتابوں کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے اور ان کے مختلف موضوعات کا تنوع ہمیں حیرت استعجاب کر سکتا ہے لیکن اس پابندی اور محنت پر غور کیجئے تو تعجب باقی نہیں رہتا، فی الواقع ان کی تصنیفات، محنت و استقلال کے نتائج کی عمدہ مثال ہے، ان کی کتابیں اب تک مختلف مطبعوں میں چھپ چکی ہیں۔ یہ تفصیل ذیل ہیں[1] :-

مضمون	تعداد کتب مطبوعہ
سیاستِ مدن	۲
طبیعات و ہیئت	۷
اخلاق	۶
ادب	۱۶
تاریخ و جغرافیہ	۱۷
ریاضیات	۸۱

یہ وہ کتابیں ہیں جو طبع ہو گئیں، متعدد ایسی ہیں جن کا چھپوانا ممکن نہ ہو سکا۔ ایک تاریخ ہند ہی اٹھارہ حصوں اور چودہ جلدوں پر مشتمل ہے، سنا ہے تاریخ اسلام بھی لکھ رہے تھے جو تمام نہ ہوئی۔ اور

[1] سیر المصنفین جلد دوم صفحہ ۱۲۸

زیورِ طباعت سے محروم رہی۔

ان کی کثرتِ تصانیف کا اندازہ مولوی محمد یحییٰ تنہا کے اس لطیفے سے ہو سکتا ہے کہ ان کی کتابیں اگر اوپر تلے انبار کی جائیں تو ان کے قد سے اونچی ہو جائیں گی اور مصنّف کو اور تصنیفات کو ترازو کے پلڑوں میں رکھا جائے تو تصنیفات کا پلّہ بھاری رہے گا، یہ حقیقت ہے کہ ہمارے مصنفین اور مشاہیرِ ادب میں کوئی ہستی تنوع موضوعات میں ان کی ہم سر نہیں ہے۔ شبلی کثیر المضامین ضرور ہیں، لیکن ان کی جودتِ فکر معقولات ادبیات اور سوانح نگاری تک محدود ہے۔ کثرتِ فنون اور موضوعات کی رنگا رنگی میں وہ ذکاء اللہ خاں کو نہیں پہونچتے۔ اس سلسلے میں مولانا حالی کا یہ لطیفہ مشہور ہے کہ: ذکاء اللہ خاں کا دماغ بنیئے کی دکان ہے جس میں ضرورت کی ہر چیز اپنے خانے میں رکھی ہوئی ہے، جو چیز طلب کرو وہ اس کے خانے سے نکال کر دے دیں گے۔

ذکاء اللہ خاں کا اسلوبِ تحریر۔ مولوی صاحب کے اندازِ تحریر کے متعلق رائے قائم کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان نئے رجحانات کا جائزہ لیا جائے جو ان کے زمانے میں بروئے کار آرہے تھے، کسی اہلِ قلم کی تحریر میں اس کی ذہنی اور طبعی خصوصیات کے عکس کے علاوہ ان تمام تحریکوں کے نقوش قدم قدم پر ملتے ہیں جو اس کے زمانے میں پیدا ہوئیں۔ بالخصوص وہ تحریکیں جن سے اس کا بچپن اور عنفوانِ شباب متاثر ہوا ہو، عمر کی ان منزلوں میں دماغ کا ملکۂ اخذ استثنائی ہوتا ہے کہ اس دور کے نقوش ہمیشہ کے لئے ذہن پر مرتسم ہو جاتے ہیں، ذکاء اللہ خاں نے آنکھ کھولی تو دہلی کالج اپنے عروج پر تھا، ان کی پیدائش سے تیس سال پہلے فورٹ ولیم کالج کی کوششوں سے اردو میں سادہ نگاری کا میلان پیدا ہو چکا تھا، اگرچہ فورٹ ولیم کالج کی تالیفات صرف افسانوی یا زیادہ سے زیادہ نیم تاریخی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن اس لحاظ سے یقیناً اہم ہیں کہ اردو نثر میں ایک مدت سے تصنّع، آورد، صناعی اور مقفّیٰ و مسجّع نگاری کا جو غیر صحت مندانہ رجحان رائج ہو چلا تھا وہ اس کالج کی کوششوں سے ختم ہوا۔ سادہ نگاری بالعموم مقبول ہوئی، یہاں تک کہ مرزا غالب جیسی شخصیت نے بھی قیامِ کلکتہ کے دوران میں اس سے مستقل اثر قبول کیا، دہلی کالج اس تحریک کا نقشِ ثانی تھا اور بہ ہمہ وجوہ زیادہ جامع۔ زیادہ مفید اور دور رس نتائج کا حامل تھا۔ فورٹ ولیم کی بجائے جو

نوادر انگریزوں کو اس ملک کی زبان، معاشرت اور آداب و رسوم سکھانے کا ایک باقاعدہ ادارہ تھا۔ دہلی کالج میں علمی و فنی کتابیں ترجمہ ہو رہی تھیں، اور مفید مغربی علوم سرعت کے ساتھ اردو میں منتقل ہو رہے تھے۔ انیسویں صدی یوں بھی بجائے خود نہایت ہنگامہ خیز تھی، کامل سَو سوا سو سال کی بے حسی اور جمود کے بعد ہندوستان کا مسلمان خوابِ غفلت سے چونکا تھا، مختلف نیم مذہبی نیم سیاسی تحریکیں ملک کے طول و عرض میں پھیل رہی تھیں۔ اصلاح، تجدید، احیاء، مناظرہ، مباحثہ اور آویزش کا بازار گرم تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے دور میں بے جان اور تصنع آمیز ادب کا پنپنا مشکل ہے، اس دور کا تقاضہ ہی یہ تھا کہ سلیس اور سادہ اسلوب رواج پائے، ذکاء اللہ خاں، پیارے لال آشوب، محمد اسمٰعیل، حالی، شبلی، نذیر احمد اور سرسید، سب اس دور کی صحیح پیداوار ہیں، ان سب کی تصانیف میں صحت، قوت، متانت، استدلال اور سلامت کا امتزاج ہے، اور جہاں رنگینی و رعنائی ہے وہ بھی حقیقت نگاری سے زیادہ بعید نہیں ہے، شبلی اس گروہ سے کسی قدر علیحدہ ہیں، رہے محمد حسین آزاد، سو وہ اپنے اندازِ بیان کی شاعرانہ دل نشینی اور پرواز خیال کے سبب قطعی علیحدہ معلوم ہوتے ہیں، ان کی نثر میں فن کارانہ خصوصیات کی کثرت ہے اور شاعرانہ منظر نگاری کے پیچھے فن کی جزئیات اور واقعے کی چست بندی کا پورا اہتمام موجود ہے۔ آزاد کے انداز میں صحت و سلاست کی بجائے فن کاری کا چلتا جادو ہے، اردو ادب کا یہ جادو نگار اپنی شگفتہ، دلنشیں اور آراستہ فن کاری کے ساتھ قاری کے دماغ پر چھا جاتا ہے، غالباً زبان کی فطرت نے آزاد کے وجود میں اس عہد کی منطقیت اور سادہ نگاری کا فطری ردِ عمل دکھایا تھا۔

ذکاء اللہ خاں صاحب کی کتابوں کے متعلق فرداً فرداً معلوم نہیں کہ کس کس سال میں تصنیف ہوئیں اس لئے ان کے اسلوب تحریر میں تبدیلی یا ارتقا کا سراغ لگانا مشکل ہے، البتہ یہ معلوم ہے کہ ان کی سب سے پہلی کتاب شطرنج و گنجفہ کے موضوع پر ۱۸۵۰ء میں طبع ہوئی، قیاس کہتا ہے کہ سرسید کی آثار الصنادید (طبع اول) کی طرح اس میں بھی مقفیٰ و مسجع نگاری کا انداز ہوگا، یہ کتاب اب نایاب ہے، دوسری کتاب علم الحساب پر تھی جو طبع ہوتے ہی تین دن کے اندر اندر فروخت ہو گئی، اس کے بعد ان کے تراجم تصنیفات اور مضامین کا ایک انبار ہے جو ستر ہزار صفحات پر پھیلا پڑا ہے، ان کے اندازِ نگارش کے متعلق

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے وجود میں میر امن اور سرسید کی روحوں نے حلول کیا تھا۔ لیکن یہ کہنے کے ساتھ یہ اقرار بھی کرنا پڑے گا کہ جہاں تک اجزائے جملہ کے پس و پیش کرنے، مضاف و مضاف الیہ یا صفت و موصوف کی فارسی ترتیب اور سادہ نگاری کا تعلق ہے وہ بے شک میر امن کے پیرو ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ میر امن کی سادہ پُرکاری سے محروم ہیں۔ ان کی "تاریخ ہند" میں بے شمار مقام ایسے ہیں جہاں اگر وہ ذرا سی فن کاری سے کام لیتے تو دلچسپی اور تاثیر پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن اس قسم کی کوئی کوشش کہیں نہیں ملتی، واقعہ کی نوعیت ہی تاثیر پیدا کرنے تو کر دے ورنہ وہ خود فن کاری سے عاری اور شعوری کوشش سے بے پروا ہیں۔ "تاریخ ہند" ہی کے بعض واقعات پر داستان گوئی کے انداز میں مولانا آزاد نے "قصص ہند" میں فن کاری کے نمونے پیش کئے ہیں، نفسیاتی تمہید، مکان اور ماحول کے نقشوں اور جزئیات کی تفصیل سے بیانِ واقعہ میں عبارت کو اس قدر دل کش بنایا ہے اور منظر نگاری کا ایسا حق ادا کیا ہے کہ تمام واقعات کی تصویر صاف نظر کے نیچے آ جاتی ہے، "دربارِ اکبری" میں بھی اس جادو نگار کے قلم نے ایسے ہی لازوال مرقعے پیش کئے ہیں غرض ذکاء اللہ خاں کی سادگی میں میر امن یا آزاد کی سی فن کاری اور تاثیر نہیں ہے، دوسری طرف دیکھئے تو سرسید کی وہ سادگی ان کے ہاں بھی موجود ہے جو اپنی خشکی اور بے رنگی کے لئے اب تک ناپسندیدہ ہے۔ لیکن ان کے ہاں اس داخلی قوت کا پتہ نہیں جو سرسید کو اس دور کے دیگر سادہ نگاروں سے منفرد و ممتاز کرتی ہے، تاریخ نگاری میں استدلال و تحقیق کا بھی وہ رنگ نہیں جس کے لئے شبلی ممتاز ہیں نذیر احمد کی زبان کا چٹخارہ اور مکالمے کی بے ساختگی بھی نظر نہیں آتی، آزاد کی دل نشینی کا پرتو بہت کم ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذکاء اللہ خاں نے مصحفی کی طرح نہایت اخاذ طبیعت پائی تھی اور کوئی منفرد اور مستقل انداز رکھنے کی بجائے اپنے عہد کے مختلف ادیبوں کے اسلوب سے متاثر ہوئے تھے۔ بایں ہمہ ان کے سادہ طرزِ نگارش میں چند خصوصیتیں ہیں جن سے وہ اپنے ہم عصروں سے متمیز ہو سکتے ہیں، ان کا طرز سادہ، زیب و زینت سے عاری لیکن ایک حد تک دلآویز ہے، اور اس صحت و قطعیت سے مملو ہے جو ریاضی اور طبعیات کے عالم کی خصوصیت ہونا چاہئے، ان کی عبارت میں سرسید کا سا زور اور قوت اظہار نہیں ہے، لیکن وہ خشکی بھی نہیں جس کے لئے سرسید بدنام ہیں

حشو و زوائد کی بھی اتنی بھرمار نہیں، الفاظ حسبِ موقع کہیں سہل اور کہیں موثر اور پُرشکوہ ہوتے ہیں اگرچہ مجموعی تاثر اور قوت کی کمی ہے، تزئین اور صنعت سے وہ بیگانہ تھے۔ لیکن تشبیہ و استعارہ جن کے جادو سے کوئی ادیب نہیں بچ سکتا، ان کی تحریر میں جا بجا جلوہ دکھاتے ہیں۔ بلکہ جب تشبیہ پڑھ جاتی ہے تو اس کا دامن تمثیل سے جا ملتا ہے جو سر سید کی خصوصیت ہے۔ ان کا ذہن تفصیل و اطناب کی طرف مائل ہے اور وہ کسی واقعے یا کیفیت کی طرف اشارہ کرکے قانع ہو جانے کی بجائے توضیح و تشریح کو بہتر پسند کرتے ہیں، ذیل کے اقتباسات اس رجحان کو نمایاں کرتے ہیں اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک لفظ کی بجائے اس کے کئی کئی مترادف اور صفت و موصوف نیز مشبّہ اور مشبّہ بہ کے جوڑ بلکہ بعض اوقات ایسے تین تین الفاظ استعمال کر جاتے ہیں۔

جب شاہ جہان نے تختِ سلطنت پر جلوس کیا تو اس کو ملّتِ مصطفوی اور شریعت محمدی کا جس میں کچھ خلل پڑ گیا تھا ایسا پاس و لحاظ تھا کہ اول حکم اس نے یہ دیا کہ سجدہ کرنے کی تعظیم کا معبودِ حقیقی سزاوار ہے، اب آئندہ کوئی دوسرے کے لئے اپنی پیشانی کو خاکِ مذلت پر نہ رکھے یعنی اکبری عہد میں بادشاہ کو جو سجدہ کرنے کا دستور تھا وہ موقوف کیا سادات کو کہ تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں اور فضلاء صلاح آثار اور درویشانِ پرہیزگار، اور زاویہ نشینانِ عبادت گذار کو اس زمین بوسی سے معاف کیا۔"

سفلے کم ظرف ناشائستہ اپنی لیاقتوں کی شیخیاں بگھارا کرتے ہیں، سچے مہذب اور شائستہ اپنے عجز و ناتوانی کو ظاہر کیا کرتے ہیں۔ علم میں جو لوگ تھوڑی لیاقت رکھتے ہیں وہی اپنے عالم ہونے کے بڑے بڑے دعوے کیا کرتے ہیں۔ مگر حقیقت میں جو عالم علم دستگاہ اور حقیقت آگاہ ہوتے ہیں وہ اپنے آگے بہ نسبت پیچھے کے زیادہ دیکھتے ہیں، وہ سمندر کے تیراک ہوتے ہیں ایک عمق کے بعد دوسرا عمق ان کے آگے ہوتا ہے، اس کی تھاہ ان کو کبھی نہیں ملتی، یہ کم علم ندی نالوں کے تیراک ہوتے ہیں کہ جلدی تھاہ کو پاکر خوش ہو جاتے ہیں۔"

الفاظ کے پس و پیش کرنے اور اجزائے جملہ کے دروبست میں وہ دوسرے میرامن ہیں ۔سرسید کی طرح کئی جملوں کو باہم ربط دیتے چلے جانا اور سلسلۂ کلام کو لا متناہی کر دینا ان کا شعار ہے اور اردو نثر کے اس رجحان کو ظاہر کرتا ہے جب اظہارِ مطلب نثا پردازی کا مقصود ہو کر رہ گیا تھا ، بیانِ واقعہ اور ادائے مطلب کے لئے متعدد جملے لکھنے اور انھیں لفظِ 'اور' سے جوڑتے چلے جانے میں وہ بالکل سرسید ہیں ۔ شہزادہ خرم کے حال میں ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

" اکثر وہ (خرم) کہا کرتا تھا کہ مجھ پر تین بادشاہوں کے بڑے حقوق ہیں ، اول صاحبقران گیتی ستاں تیمور کا جس نے ممالکِ جہاں کو تسخیر کیا خصوصاً ہندوستان کو اور اپنی اولاد کے لئے قانون ملک گیری بنایا ، دوم حضرتِ بابر بادشاہ کا کہ ولایت سے ہندوستان آکر ضربِ شمشیر سے اس کو مسخر کیا ، سوم حضرتِ اکبر بادشاہ کا جس کی فرماں روائی کے عہد میں فتنہ کا غبار کشا اور امن و آرام کا باغ لگا ، اور دشوار گذار قلعے فتح ہوئے اور گردن کشوں نے غاشیۂ اطاعت کاندھے پر رکھا "

تیسری خصوصیت جس میں وہ سرسید سے مشابہ ہیں فارسی الفاظ و محاورات کا ترجمہ ہے ۔ سرسید اور میرامن کی تحریروں میں فارسی عبارتوں اور محاورات کا پرتو اکثر ملتا ہے ، یہی کیفیت ذکا ءاللہ خاں کے یہاں ہے بعض جگہ وہ متروک اور غیر مروج محاورے بے تکلف لکھ جاتے ہیں ، بلکہ بعض مقامات پر ابواب کے عنوان لکھنے میں یہ انداز روشن ہو جاتا ہے ، ذیل کی مثالوں سے اس میلان کا پتہ لگ سکتا ہے

رانا امر سنگھ سے لڑائی کرنے کے لئے سلطان خرم کا جانا " یہاں لڑائی کرنا یعنیہ جنگیدن یا بہ جنگِ رانا رفتن کا ترجمہ ہے ۔

" چابک دست معماروں نے نشیمن خاطر فریب دل کشا جو تال پر مشرف تھے بنائے " مشرف ہونا ۔ فارسی محاورہ ہے ۔

" دانا نے دیکھا کہ معمور خزانہ خالی ہوا ، سپاہ کشتہ و اسیر ہوئی خویشوں نے مع مشیروں کے اپنا سر پکڑا " یہ بھی سرِ خویش گرفتن کا ترجمہ ہے ۔

ذیل کے اقتباس میں میرامن کا خلوص اور وہ گھریلو زبان جس میں نام کو تکلف نہیں ہوتا جس پر خود میرامن ناز کرتے تھے، اور جیسے وہ موافق روزمرہ کہتے تھے، اچھی طرح نمایاں ہے۔

ہم نے بیان کیا ہے کہ خسرو کی مخالفت کے سبب دار الخلافہ آگرہ کے قلعے میں ہنگامہ برپا ہوا تھا اور راجہ مان سنگھ نے جہاں گیر سے جو قلعہ سے باہر تھا منازعت کر رکھی تھی جہانگیر نے شہزادہ کی ماں کو بلا بھیجا اور کہلا بھیجا کہ ایسے وقت میں وہاں تیرا رہنا مناسب نہیں ہے، جلد چلی آؤ، مگر دادا کی عنایت اس پوتے کے حال پر ایسی تھی کہ اس نے والدہ کو رخصت کیا اور کہا کہ جب تک دادا کے دم میں دم ہے میرا سر اس کے قدم پر لگا ہے۔"

معرکہ ہائے جنگ کے بیان میں وہ آزاد کی سطح تک نہیں پہونچتے، وہ لیتا ہنگامہ خیزی سے نفور تھے، مرقع کشی تو خیر بجائے خود فن کاری کی طالب ہے، وہ محض بیان واقعہ میں بھی اس کے مناسب جوش وخروش اور گرمیِ ہنگامہ پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں، تاریخ ہند میں ایسے مواقع بہت کم ہیں جہاں دربار اکبری کی مُرقّع کشی یا زور بیان کا پتا دُ پڑا ہو۔ ان کی معراج ایسے مواقع پر بس یہ ہے۔

اس سرزمین میں رائے سندر داس نے قتل وغارت اور اسیر کرنے اور منازل ہنود کے خراب کرنے میں کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی۔ بیت خانوں پر راجپوت پڑے دلیرانہ لڑے اور آخر جوہر کر کے مع اہل وعیال مرے۔"

البتہ سیرت نگاری میں وہ پورے اترتے ہیں، وارن ہیسٹنگز کے حال میں اس کی سیرت کے ایک ایک پہلو کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اُس کی فراست و ذہانت کے سب دوست دشمن قائل تھے، اس میں کوئی شبہ نہیں کرتا کہ وہ بیدار مغز اور ہوشیار دل ایسا تھا کہ امورِ خطیر اور معاملاتِ عظیم کے العزام اور سرانجام کرنے کی اس میں قابلیت اور لیاقت تھی۔ سوائے ذہین اور قابل ہونے کے وہ محنت شعار اور جفاکش پرلے درجے کا تھا، کاہلی اس سے کروڑوں کوس دور رہتی تھی، یہی وہ عالی دماغ تھا جس نے سوچا کہ انگریزی گورنمنٹ سب سے علیحدہ ہو کر قائم نہیں رہ سکتی، اس لئے

ضرورت ہے کہ وہ اور ہندوستانی رئیسوں سے آمیزش کی کوشش کرے، یہی باب فتح و نصرت کی کنجی ہے، یہی وہ روشن عقل تھا کہ اس شاہراہ پر آن کر انگریزی گورنمنٹ کو راستہ دکھا جس پر چل کر وہ اپنی منزل مقصود پر پہونچ گئی۔ گو یہ خیالات اس وقت انگلستان میں عام پسند نہ تھے۔ مگر بھلی بری طرح سے منظور ہو کر آخر کار وہی صحیح ثابت ہوئے۔"

جیساکہ بیان ہوا، مولوی صاحب کا ذہن توضیح و تفصیل کی طرف مائل تھا۔ وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے اور ان کی عبارتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کاوش، ترتیب یا فن کاری کی طرف انھوں نے کبھی توجہ نہیں کی، بایں ہمہ ان کی تصانیف کے انبار میں ایک طرح کی یکسانیت ہے، جو مصنف کی سخت کوشی کو پرسکون اور مطمئن طبیعت کا پتہ دیتی ہے، یہ ان کا مزاج تھا، اور ان کی تصانیف کے آئینے میں ہم ان کی شخصیت، خود اعتمادی اور دیگر مزاجی خصوصیات کو بالکل صاف دیکھ سکتے ہیں۔

مولوی ذکاء اللہ خاں طبعًا سادہ مزاج، سلیم الطبع، وسیع النظر، بے تعصب انسان تھے، ان کی وسعت نظر اور رواداری بعض تنگ دل معاصروں سے انھیں لامذہب اور بے دین بھی کہلا دیتی تھی، معاشرت میں وہ بہت سادہ اور مشرقی وضع کے سختی سے پابند تھے جس پر آخر عمر تک قائم رہے، بزرگانِ دین اور اولیا کا ادب و احترام انھیں اپنے آباء و اجداد سے ورثتًا ملا تھا۔ ذیل کے خط سے جو ان کی مراسلت کے نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے ان کے دلی خیالات اور خوش عقیدگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"ان کو (محبوب الٰہی نظام الدین اولیا) اپنے ساتھ انسانوں کے گرویدہ کر لینے کا ایسا ملکۂ خداداد تھا کہ اپنی حیات میں بے حساب آدمیوں کو اپنا مُرید بنایا اور بعدِ وفات جس پر چھ سو سال کا عرصہ گذر چکا ہے وہی کرامت ان کے مزار میں موجود ہے کہ وہ مسلمانوں ہی کے دلوں کو گرویدہ نہیں بناتا بلکہ غیر مسلموں کو بھی اپنا والہ و شیفتہ کرتا ہے، چناں چہ مسٹر کلارک صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی جب مزار شریف پر تشریف لائے تو ان کے دل پر مزار شریف کا یہ اثر ہوا کہ اس کی چھت کو شکستہ و فرسودہ و کہنہ دیکھ کر اپنی گرہ سے تین ہزار روپے خرچ کر کے ایسا ہی بنوایا جیساکہ پہلے بنا ہوا تھا اور خادموں کو منع کر دیا کہ وہ "ہمارا نام نہ لیں کہ ہم نے اسے بنوایا ہے"۔

امیل
یا
روسو کی تعلیم

توقیر مرزا رزقی

مسلسل نمبر ۲۶

آغازِ شباب کا زمانہ لوگوں سے نفرت کرنے یا انتقام لینے کا دور نہیں ہوتا ہے، بلکہ عمر کا یہ عہد خلوص، ہمدردی، رحمدلی اور بڑی دریا دلی کا زمانہ ہوتا ہے۔ بے شک میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ایک شریف و نجیب نوجوان جس نے اپنی عصمت کو بیس سال کی عمر تک محفوظ اور برقرار رکھا ہو وہ اس عہد شباب میں بہترین سخی، شفیق اور محبوب ترین لوگوں میں ہوگا۔ آپ نے شاید یہ بات کبھی نہ سنی ہوگی اور میں یہ خوب جانتا ہوں کہ آپ جیسے فیلسوف جن کی پرورش اور تعلیم عام مدارس (PUBLIC SCHOOLS) کی فضا میں ہوئی ہو اس چیز سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔

انسان کی کمزوری اسے ملنسار بناتی ہے۔ ہمارے عام مصائب ہمارے قلوب کو ہمارے بھائیوں کی طرف رجوع کراتے ہیں، پس اگر ہم انسان نہ ہوتے تو بنی نوع انسان کا ہم پر ایک بھی فرض عائد نہ ہوتا ہر قسم کی محبت یا الفت ایک قسم کی کمزوری یا نقص کی علامت ہوتی ہے۔ اگر ہم میں سے ہر ایک دوسرے کا محتاج نہ ہو تو دوسروں سے ملنے جلنے کا خیال ہمیں شاید بمشکل ہی کبھی آسکتا ہے۔ لہذا ہماری ضعیف خوشیوں کی جڑ اور بنیاد ہماری کمزوری ہوتی ہے۔ ایک فی الواقع خوش انسان محض ایک جوگی یا راہب ہو سکے گا۔ خوشیِ مطلق تو خدا ہی کا حق ہے، لیکن ہم میں اس کا تخیل بھلا کس کو ہے کہ خوشی کے معنی کیا ہیں؛ اگر کوئی ناقص مخلوق اپنی جملہ ضروریات کی بذاتِ خود تکمیل کر سکتی تو لطف حاصل کرنے کے لئے اس کے پاس ہوتی ہی کیا چیز؛ ہمارے خیال میں وہ ایک بدبخت اور تنہا ہستی ہوتی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جس کسی کو کوئی حاجت ہی نہ ہو تو وہ کسی چیز سے محبت کر ہی کیوں کر سکتا ہے، اور نہ یہ میری سمجھ میں آتا ہے کہ جو کسی سے محبت نہ کر سکتا ہو وہ خوش کیوں کر رہ سکتا ہے۔

پس اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہمارے قلوب ابنائے جنس کی خوشیوں کی نسبت ان کی مصیبتوں کے احساس سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں ہماری ہی فطرت کی مانند ہمیں ایک ایسی فطرت زیادہ واضح طور پر نظر آتی ہے جو ہمارے لئے ان کی محبت و الفت کی ضمانت ہوتی ہے، اگر ہماری عام حاجتیں ایک منفعت کا تعلق پیدا کرتی ہیں تو ہماری عام تکلیفیں ایک انسیت یا محبت کا رشتہ قائم کرتی ہیں۔ ایک خوش حال انسان کا دیدار لوگوں میں محبت کی بجائے حسد اور عداوت کی آگ بھڑکاتا ہے۔ ہم اس شخص کو ایک ایسا حق غصب کرکے تنہا اپنی ذات کے لئے خوشی تلاش کرنے کا مجرم قرار دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں جو اس کا نہیں ہوتا ہے اور ہماری خودستائی کو اس خیال سے اور بھی مزید زیاں پہنچتا ہے کہ اس شخص کو ہماری حاجت نہیں ہے۔ لیکن کسی بدنصیب اور آفت زدہ کی تکلیف کو دیکھ کر بھلا کون ہے جو ترس نہیں کھاتا اور ہمدردی نہیں کرتا؛ اگر محض دلی خواہش ہی سے کام چل جایا کرے تو وہ کون شخص ہے جو اس مظلوم کو پریشانیوں سے نجات دلانے کے لئے تیار نہ ہو جائے گا؟ تصور خوشحال آدمی کی بجائے ایک مصیبت زدہ آدمی کی جگہ ہمیں فوراً پہونچا دیتا ہے، اور ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ایک کیفیت دوسرے کی نسبت ہمیں زیادہ متاثر کرتی ہے۔ رحم اور غم گساری و ہمدردی بڑی شیریں چیزیں ہوتی ہیں، اس لئے کہ جب ہم کسی مصیبت زدہ سے اپنا تقابل کرتے ہیں تو ہمیں یہ جاننے کی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ ہم خود اس کی مانند مصیبت نہیں اٹھا رہے ہیں۔ حسد تلخ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ایک خوش حال آدمی کا دیدار حاسد کو اس سے مقابلہ کرنا تو درکنار یہ گھن لگا دیتا ہے کہ وہ خود اس خوش حال آدمی کی جگہ پر کیوں نہیں ہے۔ ایک حالت ان تکلیفوں سے نجات دلاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جن میں کہ ایک مصیبت زدہ مبتلا ہوتا ہے اور دوسری ہمیں ان عمدہ چیزوں سے محروم کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جن سے کہ ایک خوش حال آدمی لطف اٹھاتا ہے۔

کیا آپ ایک نوجوان آدمی کے جاگتے ہوئے دلی احساسوں کی ابتدائی حرکتوں کو جوش دلانے اور قوت پہونچانے کے خواہاں ہیں؛ کیا آپ اس کی طبیعت کو ہمدردانہ اور نیک اعمال و خیال کی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں؛ تو پھر آپ انسانی خوش حالی کی مغالطہ آمیز تصویر کے ذریعے اس آدمی میں تدبّر، تفاخر، تصنع اور حسد کی ہرگز تخم ریزی نہ ہونے دیں۔ ابتداً اُسے درباروں کی شان و شوکت محلوں کے تفاخر اور جشن و جلوس

مسرتوں کا درشن نہ کرائیں۔ آپ اسے سوسائٹی اور ترقی یافتہ محفلوں میں نہ لے جائیں۔ اور سوسائٹی کی بیرونی حالت اسے اس وقت تک مشاہدہ نہ کرائیں، جب تک کہ آپ اسے سوسائٹی کی صحیح قدر و منزلت کا اندازہ لگانے کے قابل نہ بنا دیں۔ لوگوں سے شناسائی کرانے کے قبل ایک نوجوان کو دنیا کا مشاہدہ کرا دینا اسے سدھارنا نہیں بلکہ بگاڑنا ہے۔ تعلیم دینا نہیں بلکہ گمراہ کر دینا ہے۔

فطرتاً لوگ نہ بادشاہ ہیں نہ امیر نہ درباری اور نہ کروڑپتی۔ ہر شخص برہنہ اور نادار پیدا ہوتا ہے۔ اور اسے زندگی کے رنج و الم۔ مایوسیاں۔ بیماریاں۔ ضرورتیں۔ اور ہر قسم کی پریشانیاں سب ہی کچھ جھیلنی ہوتی ہیں۔ اور بالآخر ایک نہ ایک دن مر بھی جانا ہوتا ہے۔ یہی ہے جس کے معنی آدمی ہونے کے ہیں اور یہی ہے وہ جس سے کسی فانی ہستی کو مفر نہیں ہے۔ لہذا آپ انسانیت کے لوازمات کے مطالعوں سے ابتدا فرمائیں جو حقیقتاً بنی نوع انسان کو مخصوص کرتے ہیں

ایک سبزہ آغاز (ADOLESCENCE) نوجوان سولہ سال کی عمر میں جانتا ہے کہ مصیبت و آلام میں مبتلا ہونا کیا چیز ہے، اس لئے کہ وہ خود مصیبتیں برداشت کر چکا ہے۔ لیکن وہ بمشکل ہی جان سکتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی مصائب و آلام میں گرفتار ہوتے ہیں۔ احساس بغیر دیکھنے سے کسی قسم کا بھی علم حاصل نہیں ہو سکتا ہے اور جیسا کہ میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ بچہ جو دوسروں کے احساسوں کا کوئی تصور نہیں باندھ سکتا ہے وہ اپنی تکلیف کے سوا کسی اور کی تکلیف سے واقف ہی نہیں ہوتا ہے، لیکن اس کا تصور جب ابھرتے ہوئے احساس کی پہلی ہی لہر سے گرماتا ہے تو وہ بچہ لوگوں کی آہ و فغاں سے متاثر اور ان کے مصائب میں شریک ہونے کے لئے اپنے ہم جنسوں میں اپنی ہی تصویر دیکھنے لگتا ہے۔ وہ بھی وقت ہوتا ہے جب کہ خلق اللہ کے مصائب و آلام کی اندوہ ناک تصویر۔ رحم اور خدا ترسی کی اس پہلی حس کے ذریعہ جس سے کہ وہ کبھی آشنا نہ ہوا تھا اس کے دل میں حرکت پیدا کر دیتی ہے

اگر آپ کے شاگردوں میں اس وقت کا پتہ چلنا آسان نہیں ہے تو یہ کس کا قصور ہے۔ آپ نے اس قدر جلد انہیں احساس سے کھیلنا اور اس قدر پہلے ان کی زبان سکھا دی ہے کہ ایک ہی سانس میں مسلسل باتیں کرتے ہوئے وہ آپ کے سبقوں یا تعلیم کو آپ ہی کے خلاف لوٹا دیتے ہیں، اور آپ کو یہ

معلوم کرنے کا موقع ہی نہیں دیتے ہیں کہ وہ جھوٹ بولنا بند کرتے ہیں اور اپنی بات کو محسوس کرنا کب شروع کرتے ہیں۔ لیکن ایمیل کو ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے اس عمر تک اس کی رہنمائی کی ہے۔ اس نے آج تک کچھ محسوس کیا ہے اور نہ محسوس کرنے کا کبھی کوئی بہانہ کیا ہے۔ اس نے اس وقت تک کبھی یہ الفاظ تک زبان سے نہیں نکالے ہیں۔ "میں آپ کو بلا غرض اور محبوب جانتا ہوں"۔ جب تک یہ نہ جان لیا ہو کہ محبت کرنا کیا چیز ہے ایمیل کو کبھی یہ تعلیم نہیں دی گئی کہ جب کبھی وہ اپنے ماں باپ یا بیمار اتالیق کے کمرے میں قدم رکھے تو کیسا چہرہ بنائے۔ اس نے کسی ایسے رنج والم کے اظہار کا فن نہیں سیکھا ہے جسے کہ وہ محسوس نہ کر سکتا ہو کبھی کسی کی وفات پر مصنوعی آنسوں بہانے کا بہانہ نہیں کیا۔ کردار اور اطوار میں نمایاں ہے ایمیل بھی ہر بچہ کی مانند اپنی ذات کے سوا ہر ایک سے مستغنی ہونے کی وجہ سے کسی شخص میں کوئی خاص دلچسپی میں رکھتا ہے۔ اس کی ایک خاص الخاص خصوصیت یہی ہے کہ اس قسم کی دلچسپی کا وہ کوئی بہانہ نہیں کرتا ہے اور دوسروں کی نسبت وہ مکار اور حیلہ ساز بہت کم ہے۔

ایمیل نے ذی حس مخلوقات کی طرف بہت ہی کم توجہ کی ہے۔ اس لئے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ درد اور موت سے کیا مراد ہے۔ اسے کافی مدت درکار ہوگی۔ کراہنا اور واویلا اس کے جذبہ خدا ترسی کو جنبش دینا شروع کر دیں گے۔ خون کو دیکھ کر وہ اپنا منہ پھیرے گا۔ مرتے ہوئے جانور کی سکرات موت دیکھ کر میں نہیں کہہ سکتا کہ ان اندرونی تاثرات کا ذریعہ معلوم کرنے کے قبل اس پر کیا تکلیف گذرے گی۔ اگر وہ اب بھی احمق اور وحشی ہوگا تو انھیں محسوس نہ کرے گا۔ اور اگر وہ زیادہ عالم ہوگا تو وہ ان تاثرات کی جڑ کو پہنچے گا۔ ایمیل نے سابق میں تخیلات کا اکثر اتنا مقابلہ کیا ہے کہ وہ بالکل ہی بےحس نہیں ہے۔ لیکن اتنا کافی نہیں کیا کہ یہ جان سکے کہ وہ کیا محسوس کر رہا ہے۔

بہر حال ایمیل میں خدا ترسی یا رحم دلی پیدا ہو گئی ہے، جو نظام قدرت کے مطابق وہ پہلا جذبہ متعلقہ ہے جو انسان کے دل کو متاثر کرتا ہے، ذی حس اور رحم دل بننے کے لئے بچے کو یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کے ابنائے جنس کو وہی تکلیف پہونچتی ہے جو اسے پہونچتی ہے، اور یہ کہ وہ ان دردوں کو محسوس کرتے ہیں جنھیں وہ محسوس کر چکا ہے اور دوسری مخلوقات بھی جن کا بچہ کچھ تخیل قائم کر سکتا ہو۔ ایسی ہی ہے جو معاشرہ آ

خود محسوس کرنے کے قابل ہے، بے شک جب تک ہم اپنی شخصیتوں سے علیحدہ ہو کر اپنی ذات کا مصیبت زدہ حیوانوں سے اپنی فطرت ترک اور خود اس کی اختیار کر کے مقابلہ نہ کریں۔ ہم اپنے آپ کو رحم اور خدا ترسی سے کیوں کر متاثر ہوتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ ہمیں صرف اتنی ہی تکلیف محسوس ہوتی ہے جتنی کہ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ متضرر کو ہو رہی ہوگی۔ تکلیف ہمیں نہیں ہوتی ہے بلکہ متضرر ہی کو ہوتی ہے۔ لہذا کوئی شخص بھی اس وقت تک ذی حس نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کا تصور بیدار نہ ہو جائے اور اس شخص کو اس کی شخصیت سے باہر نہ لے جا سکے۔

اس ابھرتی ہوئی حس کو جوش میں لانے اور قوت پہونچانے کے لئے کیا وطیرہ اختیار کرنا چاہیئے تاکہ اس کی رہنمائی کی جا سکے اور اس کے فطری میلان کی پیروی ہو سکے؟ کیا ہم نوجوان آدمی کے روبرو ایسی اشیا پیش نہ کریں جن کا کہ اس کے دل کی وسعت پذیر قوت اثر لے سکے اور جو ایسی ہوں کہ اس کو شگفتہ کر سکیں اور جو اسے دوسری مخلوقات تک وسعت دے سکیں اور جو اس نوجوان کو اس کی شخصیت سے باہر لے جا سکیں کیا ہم ہر ایسی چیز کو احتیاط کے ساتھ علیحدہ نہ کر دیں جو خود انسان کی قوت کو محدود، مرکوز اور مضبوط کرتی ہو؛ یعنی بالفاظ دیگر ہمیں نوجوان کے اندر شفقت و مہربانی، نیکی، خدا ترسی، دریا دلی اور جملہ رحیمانہ اور دل کش جذبات پیدا کر دینے چاہئیں جو آدمی کے لئے طبعاً پسندیدہ اور پُر لطف ہوتے ہیں۔ یہ جذبات حسد، رشک، حقارت و عداوت اور جملہ ان قبیح اور بے رحمانہ جذبات کی پیداوار کو روک دیتے ہیں جو ہماری حس کو نہ صرف صفر بلکہ منفی بنا دیتے ہیں اور جو ایسے جذبات ہوتے ہیں جو محسوس کرنے والوں کے لئے ایک قسم کی لعنت اور ٹھیکا ہوتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ میں جملہ متذکرہ بالا خیالات کو دو یا تین معینہ صاف اور سیدھے اور سہل الفہم اصولوں میں اکٹھا کر سکتا ہوں۔

پہلا اصول:۔ انسانی فطرت یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے آپ کو ان لوگوں کی جگہ تصور کریں جو ہم سے زیادہ خوش حال ہوں بلکہ ہم صرف انھی لوگوں کی جگہ اپنے آپ کو فرض کر سکتے ہیں جو ہماری ہمدردی اور رحم کے مستحق ہوتے ہیں۔

اگر آپ کو اس قاعدے کی کہیں استثنائی صورتیں نظر آئیں تو وہ حقیقی ہونے کی نسبت زیادہ تر نمائشی اور مصنوعی ہوں گی۔ پس جب ہم امراء اور اکابر کے دلدادہ یا گرویدہ ہو جاتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو ان کی جگہ تصور نہیں کرتے ہیں جب کہ ہمارا اُنس حقیقی ہوتا ہے تب بھی ہم ان کی بہی خواہی کا محض ایک جزو ہی اپنے ذمے لیتے ہیں بعض اوقات ہم دولت مند شخص سے اس کی مصیبتوں کے وقت محبت کرنے لگتے ہیں لیکن جب تک وہ خوش حال اور سرسبز رہتا ہے۔ ماسوا اس شخص کے جس نے اس دولت مند کی ظاہری حالت سے دھوکہ نہ کھایا ہو اور کوئی حقیقی دوست نہیں ہوتا ہے اور یہ شخص بھی اس کی دولت کے باوجود حسد کھانے کی جگہ اس پر زیادہ ترس ہی کھاتا ہے۔

زندگی کے بعض پیشوں کی خوش حالی ہمیں بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً دیہاتی گڈریئے کی زندگی لیجیے:۔ گڈریوں کی آزاد اور مگن زندگی کا سرور حسد سے زہر آلود نہیں ہوتا ہے۔ ہمیں ان کی زندگی سے حقیقی دلچسپی ہوتی ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم خود بھی اس پُرسکون اور معصوم زندگی کو اختیار کر سکتے ہیں اور ایسی آزاد اور مگن زندگی کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ یہ ایک چارہ کار مخالف ہے جس میں محض اس وقت تک پُربہار خیالات گذرتے رہے ہیں جس وقت تک کہ نیت بھی اتنی ہی خالص اور نیک رہتی ہے جتنا کہ فعل و عمل۔ اپنی دولت کا اندازہ لگانے کی غرض سے اپنے ذخائر کی جانچ کرنا حتیٰ کہ جب ہم اسے خرچ کرنے کی نیت بھی نہ رکھتے ہوں ہمیشہ پُربہار اور فرحت افزا ہوتا ہے۔

اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ایک نوجوان کو انسانیت کی طرف مائل کرنے کے لئے آپ اسے دوسروں کی اقبال مندیوں کا دلدادہ اور ثناخواں نہ بنائیں۔ بلکہ آپ اسے زندگی کے تاریک اور اداس پہلو دکھائیں اور اس نوجوان کے دل میں خوف پیدا کر دیں۔ پس اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نوجوان کو دوسروں کی خوش نمائیوں میں مداخلت کئے بغیر اپنی خوش بختی کا راستہ بذات خود نکالنا ضروری ہے۔

دوسرا اصول:۔ دوسروں کے رنج و غم اور دکھ درد پر ہم اس وقت تک ترس نہیں کھاتے جب تک کہ ہم یہ نہ جان لیں کہ ہم خود بھی انہی کی مانند مصیبتوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

بادشاہ اپنی رعایا پر ترس کیوں نہیں کھاتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ خود کبھی معمولی آدمی ہو جانے کی

توقع نہیں رکھتے، دولت مند مفلسوں پر کیوں اس قدر جبر و تشدد کرتے ہیں؟ اس لئے کہ انھیں مفلسی کا خوف نہیں ہوتا ہے، امراء عوام کو حقارت کی نگاہ سے کیوں دیکھتے ہیں؟ اس لئے کہ کوئی اعلیٰ نسب ادنیٰ درجے والا نہیں ہو سکتا ہے۔ ترک ہماری نسبت زیادہ شریف اور مہمان نواز کیوں ہیں؟ اس لئے کہ ان کا طرز حکومت بالکلیہ خود مختاری کا پابند ہونے کی وجہ سے ان کے انفرادی مراتب اور دولت ہمیشہ تذبذب اور خطرے میں رہتے ہیں، اس لئے ترک مفلسی اور تنزل کو اپنے سے غیر متعلق حالت میں خیال نہیں کرتا ہے، دوسرے ہی دن صبح وہ خود بھی انھیں کی حالت پر پہونچ سکتا ہے جنھیں کہ وہ آج خیرات دے رہا ہے۔ یہ خیال جو مشرقی داستانوں میں بار بار نمودار ہوتا ہے اہل مشرق میں ایک قسم کی رحم دلی پیدا کر دیتا ہے جو ہمارے تماشی اور بے رحم اخلاق میں مفقود ہے۔

لہٰذا آپ اپنے شاگرد کو اس کے معراج کمال میں بدنصیبوں کے مصائب اور دکھیاروں کی محنت اور مشقت کو حقارت سے دیکھنے کی تربیت نہ دیں اور نہ ہی آپ اسے ایسی حالت میں ترس کھانا سکھانے کی امید رکھیں جب کہ وہ ان لوگوں کو اپنے آپ سے بہت بعید خیال کرتا ہو۔ اس واقعے سے اسے خوب خبردار کر دیجئے کہ ان آفت زدہ لوگوں جیسی قسمت ایک روز اس کی بھی ہو سکتی ہے۔ اور یہ کہ وہ کھائی کے کنارے ہی پر کھڑا ہوا ہے جس کے اندر کسی گھڑی بھی ہزاروں غیر متوقع اور لاعلاج حادثات کے ذریعے اس کا پیر پھسل کر وہ غرق ہو سکتا ہے، اسے سکھائیے کہ وہ حسب نسب، تندرستی یا دولت پر کسی قسم کا بھروسہ نہ رکھے۔ تقدیر کے جملہ تغیرات کا اسے مشاہدہ کرا دیجئے، اس کے سامنے ایسی مثالیں جو بکثرت موجود ہیں پیش کیجئے کہ جن میں آپ کے شاگرد سے زیادہ بلند مرتبہ لوگ ان مصیبت زدہ اور دکھیاروں کی حیثیت سے بھی زیادہ نیچے گر چکے ہیں، فی الوقت ہمیں اس سے تعلق نہیں ہے کہ وہ اپنے ذاتی قصور سے گرے ہیں یا دوسروں کے قصور سے۔ کیا بچہ لفظ قصور کے معنوں سے حقیقتاً واقف بھی ہوتا ہے؟ اس قاعدے اور ترتیب میں کبھی دخل نہ دیجئے جس میں کہ وہ علم حاصل کرتا ہے اور اسے محض انھیں ذریعوں سے تعلیم دیجئے جو اس کی استطاعت کے اندر ہوں، یہ دیکھنے کے لئے کچھ زیادہ لیاقت کی ضرورت نہیں ہے کہ تمام دنیا کے عقل مند مجموعی طور پر بھی اس امر کی توثیق حاصل نہیں کر سکتے ہیں کہ آیا ایک بچہ گھنٹہ بھر کے

اندر زندہ رہے گا یا مر جائے گا، رات آنے کے قبل ہی گردوں کے درد کی تکلیف سے وہ اپنے دانت نہیں رہا ہوگا۔ یا ایک ماہ بعد وہ دولت مند ہوگا یا نادار یا سال بھر کے اندر ہی وہ بردہ فروشوں کے کوڑے کی اطاعت میں الجبرا میں کسی کی ناؤ یا کشتی نہ کھے رہا ہوگا۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آپ اسے یہ تعلیم رسمی سوال و جواب کی طرح مردہ دلی کے ساتھ نہ دیں، آدمی پر جو آفتیں نازل ہوتی ہیں اسے ان کو دیکھنے اور محسوس کرنے دیجیئے، ان خطرات سے جو آدمی کی راہیں پوشیدہ رہتے ہیں بچے کے تصور کو متحیر خوفزدہ اور چوکنا کیجیئے، اسے اس کے اطراف خندقیں اور کھائیاں دیکھنے دیجیئے اور جب وہ آپ کو ان کا ذکر کرتا ہوا اسے اس خوف کے مارے کہ کہیں وہ ان میں نہ گر پڑے اور بھی زیادہ مضبوطی سے اپنے آپ سے چمٹنے دیجیئے۔ آپ یہ کہتے ہیں "تم اسے بزدل اور ڈرپوک بنا دوگے"! اچھا ہم دیکھیں گے۔ ابتداً ہم اسے رحم دل اور مہربان تو بنالیں یعنی جس کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے یا جو اہم ترین معاملہ ہے۔

تیسرا اصول :۔ جو رحم اور ترس ہم دوسروں پر کھاتے ہیں وہ بدی کی مقدار کے تناسب سے نہیں ہوتا ہے بلکہ اس احساس کے تناسب سے ہوتا ہے جو ہم کسی مصیبت زدہ سے متعلق کرتے ہیں۔

ہم بدنصیبوں پر محض اسی حد تک ترس کھاتے ہیں جس حد تک کہ ہم اپنے خیال میں اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ہماری جسمانی یا بدنی تکلیفوں کا اثر جس قدر لوگ قیاس کرتے ہیں اس سے کم ہوتا ہے یہ تو حافظہ ہوتا ہے جو درد کو طوالت دیتا ہے اور تصور ہوتا ہے جو اس درد کو مستقبل پر وسعت دے دیتا ہے اور ہمیں فی الواقعی قابل رحم بنا دیتا ہے۔ میرے خیال میں ایک یہی وجہ ہے جو ہم کسی آدمی کی نسبت سے جانوروں کی تکلیف کے متعلق زیادہ سنگ دل ہوتے ہیں۔ حالاں کہ جنسی احساس کو چاہیئے تھا کہ ہمیں دونوں مساویانہ طور پر مطابقت کرنے کے لائق بناتا۔ گاڑی کے گھوڑے پر اصطبل میں ہم شاذ و نادر ہی ترس کھاتے اس لئے کہ جب وہ گھاس کھاتا ہوتا ہے اس وقت ہم قیاس نہیں کرتے کہ وہ ان ضربات کا جو کھا چکا ہے۔ اور اس محنت کا جو اس کے لئے محفوظ ہے خیال کر رہا ہے۔ نہ ہی ہم چراگاہوں میں چرنے والی بھیڑ دنبوں پر ترس کھاتے ہیں۔ گو ہم جانتے ہیں کہ وہ قربان ہونے والی ہیں اس لئے کہ ہم یہ باور کرتے ہیں کہ وہ اپنی تقدیر مستقبلہ کے متعلق خود کچھ نہیں جانتی ہیں۔ اسی طرح ہم ابنائے آدم کی تقدیر سے بھی بے حس

ہو جاتے ہیں، اور دولت مند غربا کو نقصان پہنچانے میں اس مفروضہ کے ساتھ خود کو تسلی دے لیتے ہیں کہ غربا اس قدر غبی اور کند ذہن ہوتے ہیں کہ وہ حس ہی نہیں رکھتے۔ میں اس قدر وقعت کا اندازہ جو ایک شخص اپنے ابنائے جنس کی بہبود اور خیر سگالی کے لئے رکھتا ہے، عموماً اس خیال سے لگاتا ہوں جو وہ اُن کے متعلق رکھتا ہوا معلوم ہوتا ہے، عموماً ہم ان لوگوں کی خوشیوں کا بہت ہی خفیف خیال رکھتے ہیں جنسے کہ ہم نفرت کرتے ہیں۔ اس واقع سے آپ کو حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ سیاست دان عوام کا ذکر اس قدر حقارت سے کیوں کرتے ہیں، اور فیلسوف بنی نوع انسان کو اس قدر بد کردار خیال کرنے کا کیوں اعلان کرتے ہیں۔

عوام الناس بنی نوع انسان ہیں اور جو عوام میں شامل نہیں ہیں وہ اس قدر قلیل التعداد ہیں کہ وہ شمار کے قابل نہیں ہیں۔ آدمی زندگی کے ہر درجے میں مساوی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو وہ طبقہ جس میں کہ سب سے زیادہ آدمی ہیں سب سے زیادہ احترام کا مستحق ہے۔ ایک سمجھدار آدمی کی نظر میں تمام امتیازات و مراتب صحیح ہیں وہ نجیب اور نالیاں صاف کرنے والے دونوں میں ایک ہی قسم کے جذبات اور ایک ہی قسم کے احساسات کارفرما دیکھتا ہے، محض بول چال میں خفیف سا فرق ہوتا ہے اور تھوڑا بہت لہجہ نیا دنی ہوتا ہے، اگر واقعی ان میں کوئی خصوصی فرق ہوتا ہے تو نقصان میں کلیتہً وہی فرق رہتا ہے جو زیادہ منطقی اور کٹ حجتی ہوتا ہے۔ عوام ظاہر یا باطن ایک رکھتے ہیں اور وہ زیادہ جاذب نہیں ہوتے، لیکن متمدن دنیا انہیں بدلنے پر مجبور ہوتی ہے، اگر ہم اسے اس کی اصلی حالت میں دیکھ لیں تو ہم مصیبت زدہ ہو جائیں۔

ہمارے لال بجھکڑ کہتے ہیں کہ زندگی کے ہر درجہ میں خوشی اور رنج کی مقدار مساوی ہے، یہ کہاوت اپنے اثرات میں اتنی ہی مہلک ہے جتنی کہ ناقابل ثبوت ہے، اگر سب کے سب مساویانہ طور پر خوش ہیں تو مجھے کسی کے لئے تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؛ جو جہاں ہے اسے وہیں قائم رہنے دیجئے۔ غلام کو بدسلوکی مصیبت۔ بیمار کو بیماری اور بدنصیب کو ہلاک ہونے کی حالت میں پڑا رہنے دیجئے، ان کی حالت کے بدلنے سے وہ کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکیں گے۔ دولت مند کی غم ناکیوں کو شمار کیجئے اور اس کی خالی خولی

خوشی کی نمائش کو ظاہر فرمائیے، یہ کیسی تنگی خلق ہے! ایک دولت مند کی پریشانیاں اس کے مرتبے کی وجہ سے لاحق نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ تنہا اس کی ذات کی بدولت جب کہ وہ اپنی دولت کا بے جا استعمال کرتا ہے لاحق ہوتی ہیں، اس پرترس کھانے کی ضرورت نہیں، چاہے وہ کسی غریب سے بھی زیادہ آفت زدہ کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ اس کی کلفتیں تو خود اسی کی عاید کردہ ہوتی ہیں اور وہ خوش رہ سکتا ہے بشرطیکہ وہ پسند کرے۔ لیکن غریب آدمی کی مصیبتیں بیرونی وجوہات کی بدولت ہوتی ہیں یعنی اس تنگی و افلاس کی بدولت جو تقدیر اس کے لئے مقدر کر دیتی ہے۔ شدید ترین عادت بھی اس کو تھکاوٹ۔ درماندگی اور بھوک کی جسمانی تکالیف کا خوگر نہیں بنا سکتی ہے، دل نہ دماغ ایک بھی غریب کو اس کی ماحولی مصیبتوں سے رہائی نہیں دلا سکتے۔ ایپکٹیٹس (EPICTETUS) کو اس قبل از وقت علم سے کون سا فائدہ پہونچ گیا تھا کہ اس کا آقا اپنے لئے اس کی ٹانگیں توڑنے والا ہے؟ کیا وہ اس میں کوئی کمی کر سکتا تھا؟ اسے نہ صرف بالذات درد ہی برداشت کرنا پڑا تھا بلکہ درد کے انتظار کی تکلیف بھی سہنی پڑی تھی، اگر عوام اتنے ہی دانش مند ہوتے جتنا کہ ہم ان کو بے وقوف فرض کر لیتے ہیں تو وہ جو اب ہیں اس کے سوا کیا ہو سکتے تھے؟ آپ اس طبقہ کے لوگوں کا مشاہدہ فرمائیے۔ آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ گفتگو کے مختلف طریقوں کے ساتھ وہ ذہانت میں آپ کے مساوی اور معمولی فہم میں آپ سے زیادہ ہوتے ہیں۔ پس آپ اپنی جنس کا احترام کریں اور یاد رکھیں کہ وہ لازماً عوام پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔ اور یہ کہ زمانے بھر کے بادشاہ اور فلسفہ دان دنیا سے معدوم ہو جائیں تو ان کی کمی بمشکل ہی محسوس کی جائے گی اور دنیا کے کسی کاروبار میں خامی نہ پیدا ہوگی۔ المختصر یہ کہ آپ اپنے شاگرد کو سب لوگوں سے حتیٰ کہ ان لوگوں تک سے محبت کرنا سکھائیں جو اس کو پسند کرنے سے قاصر ہوں، اس کا طرز عمل ایسا ہونا چاہئے کہ گویا وہ کسی طبقہ کا بھی رکن نہیں ہے۔ بلکہ وہ مساویانہ طور پر سب ہی میں شامل ہے اس کی سماعت میں نسل انسانی کا ذکر ہم دردانہ بلکہ رحیمانہ طور پر کیجیے، لیکن کبھی حقارت کے ساتھ نہ کیجیے۔ آپ بھی ایک آدمی ہی ہیں۔ بنی نوع انسان کی تذلیل اور توہین نہ فرمائیے۔

ان طریقوں اور انھیں کی مانند دیگر طریقوں سے۔ جو مروجہ طریقوں کسی قدر مختلف ہیں ہم سنِ آغاز

نوجوان کے دل تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اس کے اندر قدرت کی ابتدائی قوت کو جوش دلا سکتے ہیں ہمیں اس دل کی نشوونما کر کے اس کا دروازہ نوجوان کے ہم جنسوں کے لئے کھول دینا ضروری ہے۔ اور ان قوتوں کے ساتھ ذاتی مفاد کا اتنا ہی کم میل ہونا چاہیئے جتنا کہ ممکن ہو، اور سب سے بڑھ کر تصنع۔ حرص غرور اور ان جذبات میں سے ایک بھی پیدا نہ ہونا چاہیئے جو ہمیں دوسروں سے اپنا مقابلہ کرنے پہ مجبور کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ایسے مقابلے ان لوگوں کے خلاف جو ہماری تقدیم اور برتری کے حق سے جو گو ہمارے ذاتی انداز سے ہی کیوں نہ ہو انکار کرتے ہیں، ہمارے اندر تھوڑی بہت نفرت پیدا کئے بغیر نہیں کئے جا سکتے ہیں، پھر اس وقت ہم یا تو یقیناً اندھے ہو جائیں گے، یا غضب آلود اور ایک خراب آدمی بن جائیں گے یا بے وقوف، اس تذبذب سے ہمیں احتراز کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ خطرناک اور مہلک جذبات تو دیر سویر ہماری کوششوں کے باوجود بھی نمودار ہو کر ہی رہیں گے۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا۔ ہر کام کا ایک وقت اور موقع ہوتا ہے۔ میں صرف یہ عرض کر رہا ہوں۔ کہ ہمیں ان جذبات کے ابھارنے میں اعانت نہ کرنی چاہیئے۔

اس طریقۂ تعلیم کا جس کی کہ بنا رکھی گئی ہے، یہ اصول روح رواں ہے، اس معاملہ کے لئے مثالیں اور تشریحات لا حاصل ہیں، اس لئے کہ یہاں ہم لاتعداد مختلف طبیعتوں کی ابتدا، سے دو چار ہو رہے ہیں اور ہر ایک مثال جو میں نے دی ہے، شاید لاکھوں میں ایک ہی طبیعت سے میل کھائے گی وہ یہی عمر ہے جبکہ ایک ہنر مند اور ہوشیار استاد اپنا حقیقی کام ایک طالب علم اور فیلسوف کی مانند شروع کرتا ہے۔ اور جو یہ جانتا ہے کہ دل کا حال کیوں کر معلوم کرے اور اس کی صحیح رہنمائی کی سعی کس طرح کرے، جبکہ نوجوان آدمی نے بہانہ بنانا نہ سیکھا ہو اور جب کہ بہانہ کرنے کے معنوں سے بھی وہ لاعلم ہو، آپ اس کے چہرے اس کی طرز روش اور اس کی حرکات و سکنات میں ان نقوش کو دیکھ سکتے ہیں، جو وہ اس شے سے حاصل کرتا ہے جو اس کے سامنے لائی جاتی ہے، آپ اس کے دل کا حال اس کے چہرے سے معلوم کر سکتے ہیں، اور آپ اس کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنے سے اس کے دلی میلانات کی حفاظت کر نا اور انھیں حقیقتاً قابو میں رکھنا سیکھ سکتے ہیں۔

یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے، کہ خون ۔ زخم ۔ آہ و فغاں ۔ کرب و بے چینی، درد انگیز جراحی اعمال کی تیاریاں اور تمام وہ چیزیں جو تکلیف، اور اس کی متعلقہ اشیا کی طرف ہمارے حواسوں کی رہنمائی کرتی ہیں بالعموم ہر ایک کو سب سے پہلے متاثر کرتی ہیں۔ فنا کا تخیل جو ایک زیادہ پیچیدہ معاملہ ہوتا ہے، اس قدر زیادہ متاثر نہیں کرتا ہے موت کا خیال ہمیں مابعد اور نسبتاً کم شدت کے ساتھ متاثر کرتا ہے، اس لئے کہ کوئی شخص ذاتی تجربے کی بنا پر یہ نہیں جانتا ہے کہ موت کے کیا معنی ہیں، موت کی سکرات سے واقف ہونے کے لئے آپ کو پہلے نعشوں کا دیکھنا ضروری ہے۔ لیکن یہ تخیل جب ایک مرتبہ ہمارے ذہن نشین ہو جاتا ہے، تو ہماری نظر میں پھر اس سے زیادہ ہیبتناک نظارہ اور کوئی نہیں رہتا ہے، چاہے وہ اس کامل فنا کے تخیل کی وجہ سے ہو جو موت ہمارے حواسوں میں پیدا کر دیتی ہے یا چاہے وہ ہمارے اس علم کے باعث ہو کہ یہ وقت ہم میں سے ہر ایک کے لیئے آنا ضروری ہے، لہذا ایسی حالت میں جیسے کہ ہم جانتے ہیں کسی کو مفر نہیں ہے۔ ہم اپنے آپ کو اور بھی شدید طور پر متاثر پاتے ہیں۔

یہ مختلف الاقسام نقوش یا اثرات ہماری ہر ایک کی انفرادی طبیعت اور سابقہ عادت کے مطابق اپنی روش اور مقداریں مختلف ہوتے ہیں، لیکن یہ ہیں عالمگیر اور کوئی شخص ان سے بالکلیہ آزاد نہیں ہے۔ دیگر نقوش یا اثرات کم عالمگیر اور بعد کی پیداوار ہیں اور یہ ذی حس لوگوں کے لئے بے حد موزوں ہوتے ہیں، اس قسم کے نقوش ہمیں اخلاقی تکلیف۔ روحانی صدمے، ذہنی پریشانی۔ بیتنی اور اداسی کے ذریعے سے حاصل ہوتے ہیں۔ دنیا میں اکثر ایسے لوگ موجود ہیں جو گریہ وزاری کے سوا کسی اور چیز سے بالکل متاثر نہیں ہوتے ہیں غم زدہ دل کی سرد آہیں انھیں کبھی متوجہ نہیں کرتی ہیں۔ پژ مردہ ۔ مرجھائے ہوئے چہرے اور ان آنکھوں کا منظر جو روتے روتے خشک ہو جاتی ہیں ان کا کبھی ایک آنسو تک نہیں بہاتا روحانی تکلیفیں ان کے نزدیک کوئی اصلیت نہیں رکھتی ہیں، وہ ان کا اندازہ کرتے ہیں لیکن ان کا ذہن خود کچھ بھی نہیں محسوس کرتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں سے جور و جفا، تشدد اور ظلم زیادتی کے سوا کسی اور بات کی توقع نہ رکھنی چاہیئے، وہ صادق القول اور راست باز ہو سکتے ہیں، لیکن رحم دل مخیر اور خدا ترس کبھی نہیں ہو سکتے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ انصاف پسند ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ بغیر رحم دلی کے

کوئی شخص عادل ہو سکتا ہو۔

لیکن ان نوجوانوں اور بالخصوص ایسے لوگوں کے متعلق جنھوں نے صحیح تعلیم حاصل کی ہو اور جنھیں ایسی اخلاقی تکالیف کا جس کو انھوں نے خود برداشت نہ کیا ہو، کوئی تخیل نہ ہو، آپ اس معیار کے مطابق فیصلہ کرنے میں عجلت سے کام نہ لیں۔ اس لئے میں پھر عرض کرتا ہوں کہ وہ صرف اسی تکلیف کے ساتھ ہم دردی رکھ سکتے ہیں جسے وہ جانتے ہوں اور یہ ظاہری بے حسی فوراً اس وقت رحم دلی اور ہم دردی میں بدل جاتی ہے، جب کہ وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ انسانی زندگی ایسے ہزاروں رنج و محن سے پُر ہے جن کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں جانتے ہیں، اب رہا ایمیل کا معاملہ تو بچپن میں اگر وہ سادگی اور معقولیت میں ممتاز تھا تو نوجوانی میں وہ ایک غم خوار اور ہم درد دل کا مظاہرہ کرے گا۔ اس لئے کہ احساسات کی اصلیت کا انحصار ایک بڑی حد تک تخیلات کی صحت پر ہوتا ہے۔

لیکن ایمیل کو یہاں کیوں بلایا جائے؟ میرے قارئین میرے ابتدائی ارادے کو ترک اور اس دوامی خوشی کو فراموش کرنے پر جس کا کہ میں نے اپنے شاگرد کے لئے وعدہ کیا تھا یقیناً مجھے لعن طعن کریں گے غمی، موت اور اس قسم کے پُر درد اور الم انگیز مناظر بھلا ایک ایسے نوخیز دل کو جو دورِ حیات کی دہلیز میں قدم رکھ ہی رہا ہے، خوشی اور فرحت بخش سکتے ہیں، اس کا اداس اور افسردہ اتالیق جس نے کہ اس قدر خوش گوار تعلیم دینے کی تجویز پیش کی تھی، اسے آپ محض اس لئے زندگی میں داخل کر رہا ہے کہ وہ تکلیفیں جھیلے اور برداشت کرے، پس میرے قارئین بھی کچھ فرمائیں گے لیکن مجھے بھلا اس کی کیا پروا ہے؛ میں نے اپنے شاگرد کو خوش حال بنانے کا وعدہ کیا ہے، اس کے خوش حال دکھائی دینے کا وعدہ نہیں کیا ہے۔ پس اگر حسب معمول آپ کسی ظاہری صورت سے دھوکہ کھا کر اسے حقیقت خیال کر بیٹھیں تو کیا یہ میرا قصور ہے؟

آیئے ابتدائی تعلیم کے اختتام پر دو بچوں کو لیں اور انھیں دنیا میں دو مخالف دروازوں سے داخل کریں، ان میں سے ایک تو فوراً ہی اوج ثریا پر جا پہونچتا ہے، اور اعلیٰ ترین محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے لگتا ہے اسے درباروں میں لے جایا جاتا ہے۔ اکابر۔ امرا اور حسین عورتوں سے اس کا تعارف کرایا جاتا ہے

میں فرض کرلیتا ہوں کہ اسے ہر جگہ خوب ہی بنایا جاتا ہے اور اس خیر مقدم کے جو اثرات اس کی عقل پر پڑتے ہیں ان کے متعلق میں زیادہ غور و خوض نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ فرض کرلیتا ہوں کہ وہ ان سب کو برداشت کر سکتا ہے عیش و عشرت اس بچے کے ہر وقت ہم رکاب رہتے ہیں اور ہر دن اس کے لئے تازہ تفریحات مہیا کرتا رہتا ہے، اور ہر چیز میں وہ اپنی ذات کو اس قدر ذوق و شوق کے ساتھ منہمک رکھتا ہے کہ آپ بھی متاثر ہو جاتے ہیں، آپ اسے عدیم الفرصت۔ پُر اشتیاق اور متجسس پاتے ہیں، اس کا پہلا ہی کرشمہ آپ پر ایک زبردست سکہ بٹھا دیتا ہے، اور آپ اسے خوش خیال کرنے لگتے ہیں لیکن ذرا آپ اس کے دل سے پوچھیئے، آپ خیال کرتے ہیں کہ وہ خوشی منا رہا ہے لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ وہ مصیبت اٹھا رہا ہے۔

پہلے ہی پہل جب وہ آنکھ کھولتا ہے تو کیا دیکھتا ہے ؛ انواع اقسام کی نام نہاد خوشیاں اور دل لگیاں جو اب تک اس کے لئے غیر معلوم تھیں۔ ان میں سے اکثر تو اس کے قبضے میں محض پل بھر اور جلد ہی اپنے معدوم ہو جانے کا غم چھوڑ جانے کے لئے ہی اسے دلبرا نجشتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، کیا وہ کسی محل میں گشت لگاتا ہے، آپ اس کی بے قراری کو ملاحظہ فرمائیں کہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس کے باپ کا مکان اس محل کے مانند کیوں نہیں ہے، اس کے ہر سوال سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ تمام وقت اس شاندار مقام کے مالک سے اپنا مقابلہ کرتا رہا ہے، اور امور تعایل سے جو دل کو رنج پہونچتا ہے وہ فوراً مخالفت کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اور اس کی خود بینی اور خودنمائی کو گرما دیتا ہے، وہ اگر کسی ایسے نوجوان سے ملتا ہے جو اس سے بہتر پوشاک میں ملبوس ہوتا ہے تو دل ہی دل میں اپنے والدین کی ذلالت کی شکایت کرنے لگتا ہے، اور اگر خود دوسروں کی نسبت بہتر پوشاک پہنے ہوتا ہے تو اس وقت اسے یہ تکلیف ہوتی ہے کہ دوسرے اس سے حسب نسب اور ذہانت میں اعلیٰ کیوں ہیں اور یہ اس لئے کہ اس کی زری اور سنہری لیس والے کوٹ کو ایک معمولی اور سادہ کپڑے کے کوٹ کے مقابلے میں خفت اٹھانی پڑتی ہے۔ کسی مجمع میں اگر وہ یگانہ ہوتا ہے۔ یا خوب ٹھاٹ باٹ سے کھڑا ہوتا ہے کہ لوگوں کو اچھا دکھائی دے تو اس مجمع میں ایسا کون سا شخص ہوگا

جو اس نوعمر رنگیلے کے تکبر اور تصنع کو نیچا دکھانے کی خواہش نہ رکھتا ہو، اس کے خلاف ہر شخص سازش کر لیتا ہے۔ ایک سنجیدہ آدمی کی بے چین کرنے والی نظریں کسی عیب جو یا نقاد کے چبھتے ہوئے فقرے اس تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں، اور اگر وہاں صرف ایک ہی ایسا آدمی موجود ہو تو اس ایک ہی آدمی کی نفرت، جملہ مابر[1] دوستائش کو دم بھر میں مسموم بنا دیتی ہے۔

آئیے ہم اس نچے کے لئے ہر قسم کی رعائتیں منظور کر لیتے ہیں اور اس کے حُسن اور خوبیوں سے کسی قسم کی مخالفت نہیں رکھتے ہیں۔ بلکہ ہم اسے قوی الجثہ، ذہین و فہم اور جاذب نظر انسان تسلیم کر لیتے ہیں تو آپ اسے عورتیں گھیر لیں گی لیکن قبل اس کے کہ وہ ان عورتوں سے مانوس ہو سکے وہ عورتیں اس نچے میں محبت کی نسبت زیادہ تر غصہ پیدا کر دیں گی، اسے کامیابیاں تو حاصل ہوں گی لیکن عورتوں کی صحبت سے حظ اٹھانے کے لئے اسے نہ تو کسی قسم کا وجدان نصیب ہوگا اور نہ کوئی جذبہ، کیوں کہ اس کی خواہشات شہوانیہ ہمیشہ منتظر رہتی ہیں، اس لئے لطف اٹھانے کے وقت انھیں ابھرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ لہذا وہ ضبط و تحمل کی محض تھکان ہی محسوس کرتا ہے، بلکہ اس کے قبل کہ وہ اس حظ سے واقفیت حاصل کرے وہ اس صنف ہی سے بیزار اور سیر ہو چکتا ہے جو اسے لطف بخشنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور اگر وہ اس مشغلہ کو جاری بھی رکھتا ہے تو وہ محض دکھاوے اور نمود ہی کے لئے ہوتا ہے اور اگر فی الواقعی وہ زن پرست ہوتا ہی ہے تو وہ محض ایک نہ ہی دل کش اور گبھرو جوان نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی اپنی معشوقہ کو وہ ہمیشہ مہر و فا کی دیوی پاتا ہے۔

آزادئ تعلیم

(ماخوذ از سوشل ایجوکیشن جلد نمبر ۲۶)

اس وقت دنیا میں اشتراکیت اور جمہوریت میں جو اعصابی جنگ جاری ہے، اس سے انسانی اقدار کو فروغ حاصل نہیں ہو سکتا، انسان کو انسانیت کے اونچے مقام پر لانا آسان نہیں، اگرچہ جمہوری نظام میں انسانی مساوات اور آزادی فکر و نظر سے یہ ضرورت کسی حد تک پوری ہو جاتی ہے، دراصل جمہوریت کی بنیاد ہی عالمگیر انسانی اخوت پر رکھی گئی ہے، اس نظام میں ہر شخص اپنی زندگی، اپنے رجحانات اور عقاید کے مطابق بسر کر سکتا ہے، آزاد فضا میں سانس لینے کا حق کسی مخصوص گروہ کو نہیں ہوتا، ہر شخص آزاد پیدا ہوا ہے اور اسے آزاد رہنے کا پورا پورا حق حاصل ہے، یہی نہیں بلکہ اسے اپنی آسودہ حالی کے لئے بھی جد و جہد کرنے کی آزادی ہوتی ہے، اور ایک جمہوری نظام میں ان بنیادی حقوق کے تحفظ کے لئے پوری قوم کے تعاون سے ایک دستور مرتب کر لیا جاتا ہے جس کا مقصد انسان کو انسانی دست درازی سے بچانا ہوتا ہے، اس دستور کی رو سے ہر شہری کو تحریر و تقریر اور اجتماع کی آزادی ہوتی ہے، اس کے برعکس غیر جمہوری حکومتوں میں رائے عامہ کو کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور حکومت کی معمولی سی مخالفت پر بھی کسی شخص کو قید کیا جا سکتا ہے، اور جرم ثابت ہونے سے پہلے بھی اسے ایک غیر معین عرصے کے لئے قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں، جمہوریت میں نہ آپ بغیر اطلاع دیئے کسی کو گرفتار کر سکتے ہیں اور نہ اس کی تلاشی لے سکتے ہیں، اور اگر کوئی شخص کسی سنگین جرم میں ماخوذ ہو گیا ہے تو اسے فوری قانونی چارہ جوئی کا حق حاصل ہوتا ہے، اگر جرم ثابت ہو جائے تو اسے سزا ملتی ہے، ورنہ اسے بری کر دیا جاتا ہے۔

ان انسانی حقوق کے حصول کے لئے ایک دو دن نہیں صدیاں لگیں اور سیاسی مظالم کے خلاف جہاد آسان

ہزاروں سال کی جدوجہد کے بعد یہ حقوق حاصل ہوئے ہیں، انسان کی یہ کوشش قانون ساز مجالس کے ایوانوں اور عدل وانصاف کے اداروں کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں لیکن یہ حقوق خود بخود حاصل نہیں ہوئے، ان کے تحفظ کے لئے انسانی نسلوں کو عظیم الشان قربانیاں پیش کرنی پڑیں، جمہوریتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض اصحاب اقتدار اپنے اثرات کی وجہ سے جمہوری آئین و ضوابط کا احترام نہیں کرتے، اور اکثر جمہوریت کے تحفظ کا نام لے کر غیر جمہوری شعار اختیار کر لیتے ہیں۔

آج ہم اپنے قومی استحکام و بقا کے لئے اشتراکیت سے جنگ آزما ہیں، اس اشتراکیت سے جو ہمارے لئے مسلسل خطرہ بن چکی ہے اور جس سے ہمارے جمہوری احساسات کو ہر وقت ٹھیس لگنے کا اندیشہ رہتا ہے، اس لئے اس کے خلاف ہمارے دل میں شدید نفرت پیدا ہو رہی ہے اور اشتراکیت کو دبانے کے لئے بلکہ اسے مٹانے کے لئے ہم بعض اوقات مسودۂ حقوق کا بھی احترام نہیں کرتے اور حق یہ ہے کہ ہم اس قسم کی ترغیبات سے کسی حد تک پہلے شکست کھا چکے ہیں۔

ہماری تاریخ گواہ ہے کہ اس سے پہلے ہماری بنیادی آزادی پر اتنی پابندی کبھی نہیں لگائی گئی، ہم نے بڑی جدوجہد کے بعد اپنا نظام عدالت قائم کیا، آج تاریخ کے اس دور میں ہم ان اصولوں کو بھی فراموش کر رہے ہیں جن پر ہمارے نظام عدالت کا قیام ہے، اور فی الواقع اب تک ہماری عدلیہ کا اصول یہی رہا ہے کہ جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے کسی شخص کو مجرم تصور نہیں کیا جا سکتا لیکن آج ہم نے اس اصول سے بھی روگردانی شروع کر دی ہے اور اشتراکیت کو ختم کرنے کی دھن میں ایسے نظریات فروغ پانے لگے ہیں جن سے ہمیں بنیادی طور پر اختلاف ہے یعنی اب دوسرے نظریات اور عقائد سے ہمدردی یا وابستگی کی بنا پر کسی شخص کو ملعون یا قابل مواخذہ قرار دینا جائز سمجھا جانے لگا ہے "تعصب اشتراک" کے اس ادراک نے نظری اور فکری حدود کو پار کر کے عملی صورت اختیار کر لی، اگر آپ فلاح عامہ کے لئے کسی معاشی یا سماجی اصلاح کا مطالبہ پیش کرتے ہیں، یا کسی کم ترقی یافتہ جماعت کی تنظیم کے متعلق کچھ کہتے ہیں، اور اگر آپ مغرب و مشرق کے نظریاتی اختلاف کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو آپ کو قوم دشمن۔ اشتراکی یا کم سے کم ہمدرد اشتراکیت کا خطاب ضرور مل جائے گا۔

آزادی افکار و آزادی عقائد پر جو پابندیاں عائد کی جا رہی ہیں، ان کا سب سے برا اثر مدرسین پر پڑا ہے، اور معاشری علوم کے مدرسین تو بالخصوص اس کی لپیٹ میں آ گئے ہیں، جب ان اساتذہ کو مختلف عقائد و رجحانات پر آزادانہ بحث کے مواقع حاصل نہ ہوں گے تو وہ ان کے عیوب یا محاسن کے متعلق دوران درس میں کیا بحث کر سکتے ہیں، پچھلے دنوں بعض آئینی تبدیلیوں کے پیش نظر ان قیود میں کمی ہو گئی، لیکن مختلف انجمنوں اور تعلیمی اداروں کی جانب سے ایسے اساتذہ کو نکال دینے کا مطالبہ جاری ہے جن کے عقاید ارباب اقتدار کے الفاظ میں مشکوک یا کم سے کم ضعیف ہیں، اور امریکہ میں جو اس تشدد پسندی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، اسے امریکہ کا مخالف رجعت پسند ملحد یا اشتراکی کہا جاتا ہے۔

امریکی افکار و خیالات اور رجحانات میں کٹر پن پیدا ہوتا جا رہا ہے اور لطف یہ کہ زندگی کے ہر شعبے میں رجعت پسندی کا یہ جذبہ تیزی سے پرورش پا رہا ہے، اس سے ایک طرف تو نوجوانوں میں فکر و نظر کی بلندی نہیں پیدا ہوتی، اور انہیں آزادی کے ساتھ کھلی ہوئی فضا اور کھلے ہوئے ماحول میں کچھ لکھنے پڑھنے، سوچنے کا موقع بھی نہیں ملتا، کیا اس سے نوجوانوں میں امعان نظر اور بلند حوصلگی پیدا ہو سکے گی، یہ صحیح ہے کہ وہ زندگی کو محض امریکی پیمانوں سے ناپنا سیکھ جائیں گے، اور ہر اس چیز سے پرہیز کریں گے جو ان کے نقطۂ خیال میں غیر امریکی ہے، قطع نظر اس سے کہ اس سے عالم گیر انسانی مفاد وابستہ ہو۔

یہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی حدبندی اور یہ اقتصادی تنگ نظری امریکی نوجوانوں کے لیے کسی طرح مفید نہیں ہو سکتی، اکثر ان قیود کے اثرات ان درسی کتب پر پڑتے ہیں جو بچوں کے لئے تیار کی جاتی ہیں یعنی ان کتابوں میں ایسے مضامین کے انتخاب یا ایسے موضوعات کی بحث سے عمداً احتراز کیا جاتا ہے، جسے غیر جمہوری یا غیر امریکی تصور کیا جاتا ہے، اور اگر کسی درسی کتاب میں ان مباحث پر دو چار سطریں لکھ دی گئیں تو ان کتابوں کو مدرسے کے احاطے میں داخل ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ معاشری علوم کے متعلق جو درسی کتب مدارس میں رائج تھیں اور ایک دو دن سے نہیں بلکہ مہینوں

اور سالوں سے اور جن کی افادیت کے متعلق ماہرین تعلیم کی رائیں موجود ہیں، انہیں اب بعض مصالح کی بنا پر مدرسی نصاب سے خارج کیا جا رہا ہے، اور اس اخراج کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ اور کوئی نہ کوئی جواز تلاش کر لیا جاتا ہے، اور زیادہ تر واضح اور صاف الفاظ میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ان کتابوں میں جن عقائد اور خیالات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اس مدرسے یا ادارے یا تنظیم کے عقاید و رجحانات کے منافی ہیں، اس لئے ایسی کتب درسی کی تدریس سے اجتناب ضروری ہے۔

درسی کتب کی تنقید بلکہ تنقیص اب کوئی نئی بات نہیں رہ گئی، اس میں تو روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اس سے لکھنے والے اور درسی کتب مہیا کرنے والے ناشر بہت زیادہ پریشان ہیں، یعنی علمی اور تعلیمی تقاضے کچھ اور کہتے ہیں، عوام کے مطالبات انہیں دوسری ڈگر پر ڈال دیتے ہیں۔ ان حالات میں وہ علوم کی وسعت اور پنہائی میں نہیں جا سکتے، چند سطحی اور یوں ہی سی باتوں پر وہ اپنے سرمایۂ علم و ادب کو نچھاور کر دیتے ہیں، اگر ان کتابوں میں معاشرتی علوم کے بعض ان عقائد سے بھی بحث کی جائے جو معلوماتی اعتبار سے نہایت مفید اور ضروری ہیں، مگر امریکی نقطۂ نظر سے خطرناک ہیں تو ان کتابوں کی قدر و قیمت نہیں رہ جاتی، ان حالات میں مصنفین سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ درسی کتب میں ایسے متنازع مسائل کو نہ چھیڑا جائے جس میں امریکی عقاید کی مخالفت کا ہلکا سا پرتو بھی جھلکتا ہو، اور جب قلم اور ذہن کو پابند نظر بنا کر انہیں آپ کسی مخصوص سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں تو اس میں آپ کامیاب نہیں ہو سکتے اور اگر بالفرض موضوع کی قطع و برید کے بعد اسے بھی کیا گیا تو اس کی مسخ شدہ صورت کبھی پہچانی نہیں جا سکتی اور نہ اس سے طلبہ کے ذہنوں میں بالیدگی پیدا ہو سکتی ہے۔

طلبا پر اس امریکی طرز فکر کا اثر بہت برا پڑ رہا ہے، اگر اس نظریئے کے حالات و عواقب پر نگاہ رکھی جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ حکومت اور عوام کی یہ تنگ نظری نوجوانوں کے حق تعلیم پر صریحاً ڈاکہ ڈالنا ہوا، اس سے درسی کتب اور تعلیمی رسالے بے مزہ اور پھیکے سے معلوم ہوتے ہیں، ان میں رعنائی افکار و خیالات مفقود ہوتی ہے اور اس سے انتخاب میں بھی دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر کسی استاد نے بوجوہ حسن کسی ایسی کتاب کو منتخب کر لیا تو اس کی دشواریوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے،

وہ حکومت کی نگاہ میں مشکوک اور مشتبہ ہو سکتا ہے، اور کسی وقت ایسے خیالات وعقائد کی بنا پر ملازمت سے برطرف کیا جا سکتا ہے، اور غیر وفادار اور اشتراکی یا کچھ اور کہہ کر اس کی زندگی کو اجیرن بنایا جا سکتا ہے۔

محاسبے اور نگرانی کا یہ خطرہ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے، بالفرض ایک مدرس اپنی جماعت میں کسی دوسرے شخص کو کسی متنازع مسئلے پر بچوں سے گفتگو کرنے کے لئے بلاتا ہے یا نصاب کے متعلق چند امدادی کتابیں پڑھنے کی ہدایت کرتا ہے، یا وہ اپنے طلبا کو کسی تقریر یا مباحثے میں شرکت کی اجازت دیتا ہے تو اس سے اس کا محاسبہ کیا جا سکتا ہے، اور اگر خدانخواستہ مدرس طلبا کی کسی انجمن یا کسی ادارے کو کچھ مشورہ دیتا ہے یا انھیں کسی ضابطے میں لانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا محاسبہ اور سخت ہو جاتا ہے، اس وقت تحفظ تو خاموشی اور آزادیٔ فکر سے اجتناب میں ہے اگر مدرسین نے مقامی، قومی یا بین الاقوامی مسائل پر گفتگو شروع کر دی تو اس کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔

جمہوری طریقے

لیکن اس بے راہ روی کے باوجود اعلیٰ جمہوری نظام میں جان باقی ہے، اور ہمارے معاشرے میں ایسے مردان کار موجود ہیں جو جمہوری اقدار حیات کو فروغ دینے کے لئے ہمہ تن کوشاں رہتے ہیں، اگر انسان سے اس کی آزادی چھین لی جائے تو اس کے پاس رہتا کیا ہے اور جمہوریت تو تبادلۂ خیالات پر سب سے زیادہ زور دیتی ہے، دوسروں کی باتوں کو نہ سننا اور اپنی سناتے جانا کہاں کی انسانیت ہے، اپنی بات منوانے کے لئے نئے نئے طریقے اختیار کرنا کہاں کی جمہوریت ہے، جمہوری نظام حکومت میں ہی اتنی لچک اور رواداری ہوتی ہے کہ اس میں ہر فرقے ہر گروہ اور ہر عقیدے کے لوگ سما سکتے ہیں، اختلاف آرا کی گنجائش کسی اور نظام حکومت میں نہیں ہو سکتی۔ دنیا کے موجودہ سیاسی اور اقتصادی نظام میں سب سے زیادہ آزادیٔ فکر اور اختلاف دور کرنے کی اہلیت جمہوریت ہی میں ہے، امن و آشتی صلح و صفائی کے جتنے مواقع جمہوری نظام میں حاصل ہوتے ہیں کسی دوسرے نظام حکومت میں ممکن نہیں، لیکن جب تک لوگوں کو آزادی سے گفتگو کرنے کا اور متنازع امور کو سامنے رکھ کر حق و ناحق کے فیصلے کا حق نہیں ہوگا، انھیں اطمینان خاطر

نہیں ہو سکتا، مگر جب مباحث کے سارے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، اور صرف انھیں عقائد و خیالات کو پھیلنے کا موقع دیا جاتا ہے، جو بالعموم کسی مخصوص نقطۂ نظر سے موزوں اور مفید سمجھے جاتے ہیں، نئے خیالات و رجحانات پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے تو ایسے معاشرے کا تنگ نظر، پست خیال اور پست ہمت ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ اگر کسی جمہوری نظام میں یہ کج روی پیدا ہو جائے تو اسے جمہوریت کی شکست سمجھنا درست ہوگا۔

اگر نوجوانوں میں جمہوری اقدارِ حیات کو فروغ دینا ہے، اگر ان میں آزادی فکر و نظر پیدا کرنی ہے تو جمہوریت کو روزمرہ زندگی میں عملاً جاری کرنے کا موقع ملنا چاہیے، اور مدرسے میں اس کے مواقع سب سے زیادہ موجود ہیں۔ کیا ہم مدارس کو اتنی آزادی دے سکیں گے اور کیا ہم انھیں تعلیم و تعلم کے بنیادی حقوق یعنی بے لاگ نقد و تبصرہ کی اجازت بھی دے دیں گے اور بات یہ ہے کہ انسانی فلاح کا راستہ بھی یہی ہے ❊

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

روس کی جدید ترین یونی ورسٹی کا افتتاح

ماسکو کی نئی یونی ورسٹی میں جغرافیہ کے طلبہ دنیا کے طبعی خدوخال کے ابعاد ثلاثہ کو دیکھنے کے قابل ہیں۔ کیوں کہ ان کے کمروں میں سیٹر دسکوپک لینز نصب ہیں۔

مطالعہ جغرافیہ میں ابعاد ثلاثہ کے مشاہدہ کا اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ ماسکو کی یہ نئی یونی ورسٹی جدید ترین تعلیمی امدادوں اور ساز و سامان پر خاص زور دے رہی ہے۔ یونی ورسٹی ایک ۳۲ منزلہ فلک بوس عمارت پر مشتمل ہے اور عوام اسے "سائنس کا محل" پکارتے ہیں۔

یونی ورسٹی کی عمارت ماسکو کی سب سے اونچی عمارت ہے اور موجودہ سالوں میں روس کے سب سے بڑے تعمیری منصوبہ کی پیداوار ہے، اگرچہ اس کی لاگت سرکاری طور پر بتائی نہیں گئی۔ تاہم اس کی تعمیر اور اس کے ساز و سامان کی عمدگی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ سوویٹ حکومت ٹیکنیکل تعلیم کو کس قدر اہمیت دے رہی ہے۔

یکم ستمبر کو کریملن سے یونی ورسٹی کے افتتاح کے متعلق جو اعلان شائع ہوا اس میں بتایا گیا ہے کہ اس یونی ورسٹی نے قومی معیشت کی تعمیر کے لئے سائنس کی مزید ترقی اور بلند پایہ ماہرین کی تربیت کے لئے وسیع مواقع پیدا کر دیئے ہیں۔"

رسم افتتاح کے وقت جن مغربی نمائندوں نے یونیورسٹی کا ملاحظہ کیا وہ اس ساز و سامان کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے جو روسی ماہرین کی تربیت کے لئے فراہم کیا گیا ہے، ان کے خیال میں حکومت نے مطالعہ اور تحقیق کے لئے موزوں ماحول پیدا کرنے میں کسی خرچ سے دریغ نہیں کیا۔

سائنس پر جو زور دیا گیا ہے، اس کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ شہر کے مرکز میں واقع

پرانی یونی ورسٹی سے صرف شعبہ ہائے سائنس کو ہی اس نئی یونی ورسٹی میں منتقل کیا گیا ہے، معاشری علوم کے شعبے ابھی اسی پرانی عمارت میں ہیں جہاں وہ کئی سالوں سے چلے آرہے ہیں۔

یونی ورسٹی کی فلک بوس عمارت لینن کی پہاڑی پر سر اٹھائے ہوئے ہے اور ماسکو کا شہر اس کے دامن میں ہے، اس یونی ورسٹی میں، طبیعات۔ علم کیمیا۔ مکینکل ریاضی۔ علم الارض اور جغرافیہ کے شعبوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس وسیع عمارت کی تعمیر پر چار سال صرف ہوئے اور یقینی طور پر سوویٹ یونین میں یہ عمارت بہترین نقشہ کے مطابق تیار ہوئی ہے۔

یونی ورسٹی شہر کے مضافات میں جہاں تعمیر ہوئی ہے وہاں پہلے ایک معمولی گاؤں تھا بلکہ اب بھی اس سے صرف چند سو گز کے فاصلے پر دہقانوں کے چوبی مکان موجود ہیں۔ یونی ورسٹی میں ۸۳ الکچروں کے کمرے ہیں، ... الیبارٹیریاں ہیں، اس کے علاوہ ۵۷۵۴ کمرے طلبہ کے لئے ہیں اور ایک بہت بڑا کتب خانہ ہے جس میں بارہ لاکھ کتابیں ہیں، اس میں ایک تھیئٹر ہے۔ ایک مشترکہ کمرہ اور کئی ایک کھانے کے کمرے ہیں۔

عمارت سنگ سفید سے بنی ہے، اور ایک باغ کے وسط میں واقع ہے، اس کی بلندی ۷۸۰ فٹ ہے، سب سے اونچی برجی پر ایک بڑا ستارہ نصب ہے، اور رات کے وقت ... ۸ روشنی کے بلب اس کے ارد گرد ٹمٹماتے نظر آتے ہیں، عمارت میں کئی ایک بت نصب ہیں۔ اور سنگ مرمر کے بنے ہوئے کئی ہال ہیں۔

سب سے پہلے ہال میں دیواریں نقش و نگار سے مزین ہیں جن میں دنیا کے بڑے بڑے سائنس دانوں کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ اسحاق نیوٹن۔ لینارڈ ڈی ونسی۔ کوپرنیکس اور گلیلیو وغیرہ کی تصویریں ان میں نظر آتی ہیں۔

اسمبلی ہال میں ۱۵۰۰ نشستیں ہیں، اس کی دیواریں سرخ جھنڈوں سے مزین ہیں اور ان پر لینن اور سٹالن کے اقوال کندہ ہیں۔

ماسکو یونیورسٹی کے سترہ ہزار طلبہ میں سے تیرہ ہزار شعبہ ہائے سائنس میں داخل ہیں ان کو

پڑھانے والے ڈیڑھ ہزار پروفیسر اور اتالیق ہیں یعنی ہر نو طالب علموں کے لئے ایک استاد ہے، اس یونی ورسٹی میں تعلیم مخلوط ہے۔

مطالعہ کے لئے اس جگہ جو ساز و سامان موجود ہے وہ مغربی ممالک اور امریکہ کا ہم پلہ شمار کیا جاتا ہے، اس ساز و سامان میں الیکٹرونک۔ اوپٹیکل اور ایکس رے کے آلہ جات کے علاوہ اضطراری حرکات کے مطالعہ کے لئے مخصوص کمرے بھی موجود ہیں۔

جدید ساز و سامان سے لیس بعض لیباریٹریوں کو دیکھ کر ان پر کسی کارخانہ کی ورکشاپ کا دھوکہ ہوتا ہے، صرف جغرافیہ کے شعبہ میں ۲۰ لیبارٹریاں ہیں اور ۴۰ کمرے۔

ابعادِ ثلاثہ پر مشتمل منظر پیش کرنے والی مشینوں کی مدد سے طلبہ حفاظتی عینکیں پہن کر اپنے نقشوں پر طبعی خدوخال کے اتار چڑھاؤ کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، ایسی مشینیں بھی ہیں جو نقشوں کو بڑے پیمانے پر دکھا سکتی ہیں، یا انھیں چھوٹا کر کے دکھا سکتی ہیں۔ اور اہم مقامات کو نمایاں کر کے دکھا سکتی ہیں، اس شعبہ کی سب سے بڑی مشین ہوا سے لئے گئے فوٹوگرافوں کے تفصیلی مطالعہ کے لئے مخصوص ہے۔

مغربی نمائندوں کو اس بات میں خاص دلچسپی حاصل ہوئی کہ جغرافیہ کے کمروں میں جو اٹلس تھے ان میں کئی ایک انگریزی اور جرمن نقشوں کے چربے تھے، ان میں آکسفورڈ یونی ورسٹی کی شائع کردہ آکسفورڈ اٹلس بھی شامل تھی۔

روس کے دور دراز حصوں سے جو طلبہ یہاں پڑھنے آتے ہیں انھیں سب سے زیادہ تعجب اس امر پر ہوتا ہے کہ ان کی رہائش کے معاملے میں کس قدر آسائش کا خیال رکھا گیا ہے، ہر طالب علم کے لئے ایک چھوٹا سا مگر خوش ذوقی سے مزین کمرہ موجود ہے، اور ہر دو طالب علموں کے لئے ٹوائلٹ والا غسل خانہ۔ ایسے طالب علموں کے لئے جن کے یہاں مکانات کی کمی نے افراد کنبہ کے لئے رہائشی جگہ کو کم از کم حد تک پہونچا دیا ہے۔ ایک الگ کمرہ کا مل جانا ایک مسرت انگیز تجربہ بن جاتا ہے۔ کمروں میں آرام دہ بستر اور الماریاں بہم پہونچائی گئی ہیں۔ لڑکیوں کے لئے مشترکہ کمرے اس

غرض سے فراہم کیے گئے ہیں کہ یہاں وہ اپنے کپڑے دھو لیا کریں۔

ریڈ انڈین بچوں کی تعلیم

ریڈ انڈین بچوں کی تعلیم کے متعلق تازہ ترین اعداد و شمار جو دستیاب ہوئے ہیں ۱۹۴۵ء کے ہیں ان اعداد و شمار کے مطابق ۶ اور ۱۸ برس کی درمیانی عمر کے ریڈ انڈین بچوں کی کل تعداد ۹۶۲۹۹ ہے تعلیمی حالت کے اعتبار سے ان کی تفصیل یہ ہے :-

(۱) ۳۱۹۲۷ بچے اپنے گھروں کے قریب پبلک مدرسوں میں پڑھ رہے ہیں۔

(۲) ۷۸۱۳ بچے مشن اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں جن میں سے بعض بورڈنگ اسکول ہیں۔

(۳) ۲۹۷۶۷ بچے فیڈرل اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں جن میں سے بعض بورڈنگ اسکول ہیں۔

(۴) ۵۹۲۹ بچوں کی تعلیمی حالت کے متعلق کوئی واقفیت فراہم نہیں ہوئی ان کے والدین زمانہ جنگ میں اپنے مخصوص رقبوں سے جنگی صنعتوں میں کام کرنے چلے گئے تھے۔ غالباً یہ بچے پبلک سکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔

(۵) ۱۶۸۶۰ بچے کسی مدرسے میں نہیں جاتے، ان میں تقریباً ۱۲۰۰۰ ناواجو کے مخصوص رقبے میں رہتے ہیں اور حکومت نے ابھی ان کی تعلیم کے لئے کوئی مدرسے نہیں کھولے ہیں۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

ای/۲۹۸۰۶ م احمد علی ایف اے ایچ پی (۶۰ / ۱۴۰) قائم مقام معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول
۱۹ اکتوبر ۱۹۵۳ء شورکوٹ۔ م چمن خاں کی جگہ جو اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ہیں تاریخ حاضری سے بشاہرہ خود قائم مقام معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول وینا لخورد مقرر ہوئے۔

م۔ نذیر الحسنین۔ ایچ۔ پی۔ او۔ ٹی معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول شورکوٹ۔ اپنی سابقہ تنخواہ پر معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول شورکوٹ م امجد علی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے مقرر ہوئے۔

م۔ محمد سلیمان۔ ایس، وی، میٹرک۔ ایک امیدوار گورنمنٹ ہائی اسکول شورکوٹ میں م نذیر الحسنین کی جگہ تاریخ حاضری سے معلم اردو مقرر ہوئے۔

ای/۲۹۸۰۳ م۔ عبدالحمید خاں معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول باغبانپورہ لاہور کو م فضل الدین کی جگہ جنہیں
۱۹ اکتوبر ۱۹۵۳ء گورنمنٹ ہائی اسکول پاکپتن کا صدر معلم مقرر کیا گیا ہے، سنٹرل ماڈل اسکول لاہور میں معلم عربی مقرر کیا گیا۔

م۔ محمد حسین۔ ایچ۔ اے۔ ایک امیدوار کو م فیض احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے گورنمنٹ ہائی اسکول ساہیوال میں ۶۰ / ۱۴۰ کے گریڈ میں ۶۰ روپے ماہوار پر قائم مقام معلم عربی مقرر کیا گیا۔

ای/۲۹۷۸۸ م۔ محمد شریف۔ ایچ۔ اے، او، ٹی (۶۰ / ۱۴۰) معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری کو یکم نومبر ۱۹۵۳ء
۱۹ اکتوبر ۱۹۵۳ء سے اپنی آسامی پر مستقل کیا گیا۔

م۔ رسول بخش۔ ایچ پی۔ ایچ۔ یو، سی۔ ٹی (۶۰ / ۱۴۰) معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول جام پور کو ۲۵ نومبر ۱۹۵۳ء سے اپنی آسامی پر مستقل کیا گیا۔

ای/۲۹۷۹۷ م۔ محمد شریف فاروقی ایم اے، معاشیات ۱/۱۳۳ بی ٹی ایک امیدوار کو م مظفر حسین شاہ کی جگہ
۱۵ اکتوبر ۱۹۵۳ء

جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم میں ہو چکا ہے ۔ تاریخ حاضری سے ۱۳۰ / ۲۵۰ کے گریڈ میں ۱۷۰ روپے ماہوار پر گورنمنٹ ہائی اسکول فتح جنگ ضلع اٹک میں قائم مقام معلم انگریزی مقرر کیا گیا۔

ای/۲۹۶۸۱ م عبدالمجید خان بی۔ اے (آنرز) بی۔ ٹی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول باغبانپورہ کو م
۱۵ اکتوبر ۱۹۵۳ء بشیر احمد رضوانی کی جگہ جو مستعفی ہو چکے ہیں۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی شیخوپورہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۹۶۸۳ م عبدالرحیم خاں۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پاکپٹن کو م محمد خوشی محمد کی جگہ
۱۵ اکتوبر ۱۹۵۳ء جو لائل پور میں اے، ڈی، آئی مقرر ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر تاریخ حاضری سے گورنمنٹ ہائی اسکول جڑانوالہ میں معلم انگریزی مقرر کیا گیا۔

ای/۲۹۰۲۲ مسٹر غلام محمد خاں نیازی پی۔ ای۔ ایس، درجہ دوم، ڈپٹی انسپکٹر مدارس قسمت راولپنڈی
۱۰ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو پی۔ ای۔ ایس درجہ اول (۹۵۰ / ۱۷۰۰) میں ترقی دی گئی اور ۱۵ اپریل ۱۹۵۳ء سے چوہدری عبدالغنی قائم مقام انسپکٹر مدارس راولپنڈی کی جگہ جو سبک دوش ہو چکے ہیں اور مسٹر ایس، جی، خالق کی آسامی پر جو اس وقت امریکہ میں کام کر رہے ہیں قسمت راولپنڈی کا قائم مقام انسپکٹر مقرر کیا گیا۔

ای/۲۸۸۰۸ م شمشاد محمود دھمی ایم۔ اے (ریاضی) دوم، بی، ٹی (علیگ)، ایک امیدوار کو م محمد عبداللہ کی جگہ
۹ اکتوبر ۱۹۵۳ء جو سبک دوش ہو چکے ہیں ۱۸ مئی ۱۹۵۳ء سے ۱۳۰ / ۲۵۰ کے گریڈ میں ۱۷۰ روپے ماہوار مشاہرہ پر گورنمنٹ سنٹرل ماڈل اسکول لاہور میں معلم انگریزی مقرر کیا گیا۔

ای/۲۸۵۲۱ م۔ غلام رسول نثار، ایس، وی معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول بھوچال کلاں کو تاریخ حاضری سے
۷ اکتوبر ۱۹۵۳ء اپنی تنخواہ پر گورنمنٹ نارمل اسکول شاہ پور صدر میں معلم اردو مقرر کیا گیا، م غلام رسول نثار اپنی آسامی اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔

ای/۲۸۳۶۹ م محمد انور میٹرک ایس، وی ایک امیدوار کو م محمد ادریس خاں کی جگہ جو سبک دوش ہو چکے
۵ اکتوبر ۱۹۵۳ء ہیں تاریخ حاضری سے گورنمنٹ پرائمری اسکول چوہڑجی میں ۶۰ ـــ ۱۲۰ کے گریڈ میں ۶۰ ماہوار پر مقرر کیا گیا۔

۲۷۹۷ م۔ نیاز احمد طور، بی، اے، ایس۔ اے، وی، اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس راول پنڈی کو م۔ محمود علی ۵۳ء کی جگہ جو ملک سے باہر گئے ہیں اور م۔ مشتاق احمد خاں بی اے۔ بی۔ ای۔ ایس کی آسامی پر جو پاکستان سے باہر چھٹی پر ہیں تاریخ حاضری سے قائم مقام ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس جہلم مقرر کیا گیا۔

،، م۔ غلام حسین بی، اے، بی، ٹی صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی کو م۔ عبدالکریم ایم۔ اے بی، ای۔ ایس کی جگہ جو کیمبل پور میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس مقرر ہو چکے ہیں۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور میں صدر معلم مقرر کیا گیا۔

،، ،، م۔ فلک شیر خاں بی، اے۔ ایس۔ اے، وی، صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور صدر کو۔ م۔ غلام حسین کی جگہ جو تبدیل ہو چکے ہیں تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی میں صدر معلم مقرر کیا گیا۔

،، ،، م۔ عبداللطیف قریشی بی۔ اے، ایس۔ اے، وی صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں کو م۔ تاج الدین غوری کی جگہ جو گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور صدر میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اپنی تنخواہ پر تاریخ حاضری سے گورنمنٹ نارمل اسکول پسرور میں صدر معلم مقرر کیا گیا۔

،، ،، دین محمد فخری بی۔ اے، بی، ٹی سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور کو م۔ عبداللطیف قریشی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں میں صدر معلم مقرر کیا گیا۔

،، ،، چوہدری رحمت اللہ خاں ایم۔ اے۔ بی، ٹی سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ کو م۔ غلام رسول کی جگہ جو ۷ نمبر ۵۳ء سے سبکدوش ہو چکے ہیں، ۸ نمبر ۵۳ء قبل از دوپہر سے گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ میں صدر معلم مقرر کیا گیا۔

ای/۲۷۸۳۲ م۔ نور محمد ایچ۔ اے، او، ٹی ۶۰ ـ ۱۴۰ معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ کو ۳۰ ستمبر ۵۳ء ۳۰ ستمبر ۵۳ء سے اپنی آسامی پر مستقل کیا گیا۔ م۔ فضل احمد ایچ۔ پی۔ او۔ ٹی (۶۰ ـ ۱۴۰) معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں کو یکم جون ۵۲ء سے اپنی آسامی پر مستقل کیا گیا۔

ای/۲/۳۲ ۸ ۲۷ م۔عبداللطیف۔ایچ۔ اے۔او۔ٹی (۶۰ ۔۔ ۱۴۰) معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں کو یکم جون ۵۲ء
۱۳ ستمبر ۵۳ء سے اپنی آسامی پر مستقل کیا گیا۔

" " م۔محمد رفیق ایچ۔ اے۔او۔ٹی (۶۰ ۔۔ ۱۴۰) معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم کو ۱۱ جون ۵۲ء
سے اپنی آسامی پر مستقل کیا گیا۔

ای/۲/۴۰ ۲۷۷ ڈاکٹر غلام الیسین خاں نیازی۔ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی۔ایس۔ای۔ایس درجہ دوم ڈپٹی انسپکٹر مدارس
۹ ستمبر ۵۳ء قسمت لاہور کو ۱۲ اگست ۵۳ء سے م۔ثناء اللہ خاں کی جگہ جو سبک دوش ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ کے
علاوہ ۱۰۰/۔ روپے ماہوار خاص تنخواہ پر ڈائرکٹر تعلیمات کے دفتر میں تعلیم بالغاں کے لئے افسر
مقرر کیا گیا۔

" " چوہدری نذیر احمد بی۔اے۔بی۔ٹی۔پی۔ای۔ایس، درجہ دوم ڈپٹی انسپکٹر مدارس قسمت لاہور
کو اپنی تنخواہ پر ڈائرکٹر تعلیمات کے دفتر میں ۲۸ اگست ۵۳ء سے افسر بکار خاص مقرر کیا گیا۔

ای/۶۰ ۲۷۷ ملک عبدالمجید بی۔اے۔بی۔ٹی۔پی۔ای۔ایس درجہ دوم ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کیمبل پور کو
۸ ستمبر ۵۳ء مسٹر مشتاق احمد خاں کی جگہ جو رخصت پر ہیں یکم ستمبر ۵۳ء سے اپنی تنخواہ پر ڈسٹرکٹ انسپکٹر
مدارس گوجرانوالہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲/۷ ۲۷۳ م۔حفیظ الرحمان۔بی۔اے۔بی۔ٹی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری کو چوہدری بدرالدین
۲۴ ستمبر ۵۳ء کی جگہ جنھیں قسمت ملتان میں اے۔ڈی۔آئی مقرر کیا گیا اپنی تنخواہ پر تاریخ حاضری سے
اے۔ڈی۔آئی۔منٹگمری مقرر کیا گیا۔

" " چوہدری خوشی محمد ایم اے۔ایم۔او۔ایل۔بی۔ٹی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول جڑانوالہ کو
چوہدری محمد اکرم کی جگہ جو گورنمنٹ ہائی اسکول جڑانوالہ کے صدر معلم مقرر کئے جا چکے ہیں۔تاریخ
حاضری سے اپنی تنخواہ پر لائل پور میں اے۔ڈی۔آئی مقرر کیا گیا۔

م۔علی محمد بی اے، بی۔ٹی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ کو خواجہ محمود الحسن کی جگہ جو
ضلع گوجرانوالہ میں تبدیل ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر تاریخ حاضری سے اے ڈی۔آئی جھنگ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۷۲۴۶ م۔ محمد اقبال۔ بی۔ ایس سی ایک امیدوار کو ایک موجودہ آسامی پر تاریخ حاضری سے ۱۳۰۔۔۔۲۵۰
۱۵ر ستمبر ۵۳ء کے گریڈ میں ۱۳۰ روپے ماہوار پر قائم مقام زراعت ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول قصور مقرر کیا گیا۔

ای/۲۶۶۸۷ م۔ بدرالدین ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ اے۔ ڈی۔ آئی مدارس منٹگمری کو ایک موجودہ آسامی پر تاریخ
۱۱ر ستمبر ۵۳ء حاضری سے اپنی تنخواہ پر قسمت ملتان کا اسسٹنٹ انسپکٹر مقرر کیا گیا۔

ای/۲۶۶۸۹ م۔ محمد عالم قریشی بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی۔ اے، ڈی۔ آئی۔ میاں والی کو تاریخ حاضری سے
۲۱ر ستمبر ۵۳ء اپنی تنخواہ پر پیرزادہ محمد بخش کی جگہ جو مطالعہ کے دورے پر ہیں اور جن کی آسامی اب ضلع میانوالی
میں تبدیل کی جا رہی ہے شاہ پور میں اے۔ ڈی۔ آئی مقرر کیا گیا۔

ای/۲۶۶۸۵ م۔ نعیر محمد ایس۔ وی (۶۰۔۔۔۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ نارمل اسکول نارووال کو م محمد شفیع
۲۱ر ستمبر ۵۳ء کی جگہ جو تبدیل ہو چکے ہیں۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر گورنمنٹ نارمل اسکول چنیوٹ
میں معلم اردو مقرر کیا گیا۔

〃 〃 م۔ محمد شفیع ایس۔ وی (۶۰۔۔۔۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ نارمل اسکول چنیوٹ کو تاریخ حاضری سے
اپنی تنخواہ پر م علی محمد کی جگہ جو اے۔ ڈی۔ آئی مقرر ہو چکے ہیں گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری میں
معلم السنہ شرقیہ مقرر کیا جاتا ہے۔

ای/۲۶۶۷۲ م۔ مہر الٰہی قریشی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایک امیدوار کو م۔ محمد نذیر صدیقی کی جگہ جن کی خدمات
۱۸ر ستمبر ۵۳ء ختم کر دی گئی ہیں۔ تاریخ حاضری سے ۱۳۰۔۔۔۲۵۰ کے گریڈ میں ۱۳۰ روپے ماہوار پر
گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال میں قائم مقام معلم انگریزی مقرر کیا گیا۔

ای/۲۶۴۰۶ م۔ عبدالغنی جمیل بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایچ پی۔ او ٹی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول اکال گڑھ
۱۷ر ستمبر ۵۳ء کو م محمد خاں کی جگہ جو اے۔ ڈی۔ آئی سیالکوٹ مقرر ہو چکے ہیں۔ تاریخ حاضری سے اپنی
تنخواہ پر معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول سیالکوٹ مقرر کیا گیا۔

〃 〃 م۔ محمد سرور بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ کو م عبدالغنی
جمیل کی جگہ جو تبدیل ہو چکے ہیں۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول
اکال گڑھ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۷۲۴۶ م۔ محمد اقبال۔ بی۔ ایس سی ایک امیدوار کو ایک موجودہ آسامی پر تاریخ حاضری سے ۱۲۰ — ۲۵۰
۲۵ ستمبر ۱۹۵۳ء کے گریڈ میں ۱۲۰ روپے ماہوار پر قائم مقام زراعت ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول قصور مقرر کیا گیا۔

ای/۲۶۶۸۷ م۔ بدر الدین ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ اے۔ ڈی۔ آئی مدارس منٹگمری کو ایک موجودہ آسامی پر تاریخ
۱۷ ستمبر ۱۹۵۳ء حاضری سے اپنی تنخواہ پر قسمت ملتان کا اسسٹنٹ انسپکٹر مقرر کیا گیا۔

ای/۲۶۶۸۹ م۔ محمد عالم قریشی بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی۔ اے، ڈی۔ آئی۔ میانوالی کو تاریخ حاضری سے
۱۷ ستمبر ۱۹۵۳ء اپنی تنخواہ پر پیرزادہ محمد بخش کی جگہ جو مطالعہ کے دورے پر ہیں اور جن کی آسامی اب ضلع میانوالی
میں تبدیل کی جارہی ہے شاہ پور میں اے۔ ڈی۔ آئی مقرر کیا گیا۔

ای/۲۶۶۸۵ م۔ فقیر محمد ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ نارمل اسکول نارووال کو م محمد شفیع
۱۷ ستمبر ۱۹۵۳ء کی جگہ جو تبدیل ہو چکے ہیں۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر گورنمنٹ نارمل اسکول چنیوٹ
میں معلم اردو مقرر کیا گیا۔

〃 〃 م۔ محمد شفیع ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ نارمل اسکول چنیوٹ کو تاریخ حاضری سے
اپنی تنخواہ پر م علی محمد کی جگہ جو اے۔ ڈی۔ آئی مقرر ہو چکے ہیں گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری میں
معلم السنہ شرقیہ مقرر کیا جاتا ہے۔

ای/۲۶۶۷۲ م۔ مہر الٰہی قریشی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایک امیدوار کو م۔ محمد نذیر صدیقی کی جگہ جن کی خدمات
۱۸ ستمبر ۱۹۵۳ء ختم کر دی گئی ہیں تاریخ حاضری سے ۱۲۰ — ۲۵۰ کے گریڈ میں ۱۲۰ روپے ماہوار پر
گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال میں قائم مقام معلم انگریزی مقرر کیا گیا۔

ای/۲۶۴۰۶ م۔ عبدالغنی جمیل بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایچ پی۔ او ٹی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول اکال گڑھ
۱۷ ستمبر ۱۹۵۳ء کو م محمد خاں کی جگہ جو اے۔ ڈی۔ آئی سیالکوٹ مقرر ہو چکے ہیں۔ تاریخ حاضری سے اپنی
تنخواہ پر معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول سیالکوٹ مقرر کیا گیا۔

〃 〃 م۔ محمد سرور بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ کو م عبدالغنی
جمیل کی جگہ جو تبدیل ہو چکے ہیں۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول
اکال گڑھ مقرر کیا گیا۔

Regd. No. L. 3257

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دوھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ اٹھہ روپیہ (انگریزی) اور چھہ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل
اموزش
۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

آموزش

جلد ۶ شمارہ ۸]   لاہور   [نومبر ۱۹۵۳ء

اس شمارہ میں

مدیر : بشیر ہاشمی

معاونین : عبدالغفور چودھری
فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

نومبر سنہ ۱۹۵۳ء

جلد ـــــــــــ ۶

شمارہ ـــــــــــ ۸

سالانہ چندہ

پاکستان کے لئے ۶ روپے

غیر ممالک کے لئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

قرارداد تعزیت

سنٹرل ٹریننگ کالج۔ لاہور کے ارکان عملہ اور طلبار مرزا عبدالحکیم۔ بی۔ ای۔ ایس کی ناگہانی وفات پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ نیز جس تن دہی اور اخلاص سے وہ آخری دم تک کالج کے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو نباہتے رہے اس کو سراہتے ہوئے دعا کرتے ہیں۔ کہ خداوند تعالےٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

نیز قرار پایا کہ مندرجہ بالا ریزولیوشن کی نقول تمام اخبارات کو بغرض اشاعت بھیجی جائیں ؀

ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

[illegible]

طلبا اور ضبط

پچھلے دنوں لکھنؤ (ہندوستان) سے طلبہ کے پُرتشدّد مظاہروں کی خبریں آتی رہی ہیں مظاہرے کرنے والوں کی سرگرمیاں صرف یونی ورسٹی کے احاطہ تک ہی محدود نہیں رہیں انھوں نے چند بجلی گھروں پر حملہ کر کے شہر کے بیشتر حصّے کو برقی روشنی سے محروم کر دیا اور متعدد ڈاک خانوں کو لوٹ کر ان کے کاغذات اور فرنیچر کو نذرِ آتش کر دیا۔ شہر میں لوٹ مار کی گئی، انجام کار پولیس نے گولی چلائی شہر میں کرفیو لگایا گیا، اور اس طرح کافی مالی نقصان اور وسیع ذہنی پریشانی کے بعد بڑی مشکل سے صورت حال پر قابو پایا گیا۔

ہندوستان ہمارا قریبی ہمسایہ ہے اس لئے ہم اس کے سماجی حالات سے بے پروا نہیں رہ سکتے اس سے پہلے خود ہمارے ملک میں یہی کھیل قدرے مختصر پیمانے پر کئی بار کھیلا جا چکا ہے۔ پنجاب بنگال اور کراچی میں طلبہ نے جو ہنگامے برپا کئے تھے ان کی یاد ابھی تازہ ہے، ہم قومی زندگی کے جس نازک دور میں سے گذر رہے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ ان افسوس ناک محرکات پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی جائے جو طلبا کو انتہائی اقدامات پر ابھارتے ہیں۔ تاکہ ان رجحانات کی بروقت روک تھام کی صورتیں سوچی جا سکیں۔

ارسطو کا مشہور قول ہے کہ ریاست اس لئے وجود میں آتی ہے کہ زندگی ممکن ہو سکے لیکن بعد ازاں

اس کے وجود کا جواز صرف ایک ہے۔ یعنی وہ استوار اور تنومند زندگی کے لئے سازگار حالات مہیا کرتی رہے، یہ مقولہ اجتماعی زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے پر صادق آتا ہے۔ انسان کی معاشرتی زندگی کا ہر گوشہ کچھ بنیادی مفروضوں پر قائم نظر آئے گا۔ اگر ان مفروضوں کو ختم کر دیا جائے تو نظامِ حیات کی ساری عمارت زمین پر آرہے گی اور نتیجہ سماجی بالیدگی کی بجائے تخریب و ہلاکت ہوگا۔ غالباً آج دنیا کی کوئی ریاست بھی مثالی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان تمام ریاستوں کو ختم کر کے لوٹ مار کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ سلامتی اور بقا کا راستہ یہ ہے کہ امن عامہ کے سلسلے میں یہ ریاستیں جو بنیادی فرض انجام دے رہی ہیں اس میں ان کا ہاتھ بٹایا جائے اور ساتھ ساتھ ان کی کوتاہیوں پر تعمیری نکتہ چینی ہو۔ انسان نے معاشرتی زندگی میں جو پیش قدمی کی ہے وہ اسی سنہری اصول کی بدولت ہے اور تاریخ میں جہاں کہیں انسانوں کی کسی جماعت کے قدم پیچھے ہٹتے دکھائی دیتے ہیں وہ اسی بنیادی نکتہ کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ ہے۔

دنیا کے مہذب معاشروں نے اپنی نوع کی ابتدائی زندگی کو حصول تعلیم کے لئے وقف کئے رکھا ہے، اس کی بہت سی وجوہ ہیں جن میں سے ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ تربیت زندگی کی دوڑ میں شریک ہونے والے نوواردوں کو اجتماعی زندگی کے بنیادی مفروضوں کا خوگر بنا دیتی ہے یہ ابتدائی تربیت معاشرہ کی بنیادی قدروں کو طبیعت میں اس طرح پیوست کر دیتی ہے کہ ان کے بارے میں کسی فرد کے متعلق شک و شبہ کا امکان باقی نہیں رہتا۔ یہ امر نہ صرف معاشرے کی سالمیت کے لئے ضروری ہے بلکہ خود فرد کی جمعیت خاطر کے لئے بھی ناگزیر۔ بنیادی مفروضوں کے طبیعت ثانیہ بن جانے سے فرد کے لئے اجتماعی زندگی کے تمام راستے صاف ہو جاتے ہیں اور وہ بے کھٹکے جس سمت میں چاہے اپنی راہ معین کر سکتا ہے۔

اس تجزیہ کی روشنی میں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ جو تعلیم نظم و ضبط کی اس بنیادی ضرورت کو پورا نہیں کرتی کیا اسے تعلیم کا نام دیا جا سکتا ہے؟ اگر تعلیم سے مراد صرف کچھ واقفیت اخذ کرنا ہی ہوتا

تو شاید اس سوال کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ تعلیم کی سب سے بڑی غایت ان بنیادی قدروں کو جو و طبیعت بنانا ہے جن پر معاشرے کی بنیاد قائم ہے، وہ تعلیم جو طالب علم کو اس قابل نہیں بناتی کہ وہ معاشرتی سالمیت کی خاطر اپنے جذبات پر پابندی لگا سکے۔ جو اس میں یہ صلاحیت پیدا نہیں کرتی کہ ہنگامی اشتعال کی گرمی میں بھی پسندیدہ اور غیر پسندیدہ کے درمیان تمیز کر سکے اور جو اس میں اتنی عالی ظرفی اور بلند حوصلگی پیدا نہیں کرتی کہ وہ محدود ذاتی اور طبقاتی مفاد کو وسیع تر قومی اور ملکی مفاد پر قربان کر سکے۔ وہ تعلیم یقیناً تعلیم کے پاکیزہ نام سے پکارے جانے کی مستحق نہیں۔

موجودہ صدی نے سائنس اور ٹکنالوجی کی ہوش ربا کامیابیوں کے ساتھ چند در چند معاشرتی انقلاب بھی پیدا کئے ہیں جن کی بدولت صدیوں کے مسلّمہ مفروضے دیکھتے دیکھتے فرسودہ بن گئے ہیں ان تبدیلیوں سے تعلیم کا متاثر ہونا یقینی تھا۔ آزاد ضبط، اور اس طرح کی دوسری ترقی پسندانہ اصطلاحات اسی ہمہ گیر معاشرتی انقلاب کی پیداوار ہیں۔ لیکن یہ امر تعلیم کی اندرونی قوت کا غالباً بہترین ثبوت ہے کہ ترقی پسندی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے چھوٹی بڑی درس گاہوں میں طلبا۔ اساتذہ اور تعلیمی منتظمین کے درمیان تسلی بخش انسانی تعلقات قائم کر دیئے۔ بایں ہمہ نظم و ضبط کی ضرورت یا اس کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ مغربی ممالک کے طلبہ بخوشی ضبط کو قبول کرتے اور اس کو تعلیمی زندگی کی اساس بناتے ہیں۔ وہاں کبھی یہ بات سننے میں نہیں آئی کہ طالب علموں نے کسی مدرسے یا یونیورسٹی کے خلاف متشددانہ محاذ قائم کیا ہو اور فریقین میں کھلم کھلا ٹھن گئی ہو۔

بدقسمتی سے ہماری تاریخ کا تعلیمی باب مغرب سے مختلف ہے۔ مخصوص تاریخی اسباب کی بناء پر مقاطعہ۔ ہڑتال۔ ترک موالات اور طرح طرح کی تخریبی کارروائیاں جنگ آزادی کے پسندیدہ حربے تھے۔ اس جنگ میں بسا اوقات طلبا کو بھی حصّہ لینا پڑا۔ اور وہ ان سیاسی ہتھیاروں کے استعمال میں تاک ہو گئے۔ یہاں تک تو خیر تھی۔ مگر آزادی مل جانے کے بعد یہی ہتھیار اپنوں کے خلاف استعمال ہونے لگے۔ ہمارے طالب علم اس بنیادی نکتہ کو بھول گئے کہ جو سیاسی داؤ پیچ

ہنگامی قومی ضرورتوں کے دور میں جائز ہوا کرتے ہیں۔ حالات کے معمول پر آجانے کے بعد ان کا ارتکاب سنگین قومی جرم بن جایا کرتا ہے۔ مثلاً روس پر نازی حملے کے وقت محذوش روسی علاقوں کو اپنے ہاتھوں جلاکر خاک سیاہ کرنا اور تباہ و برباد کر دینا روسی حب الوطنی کی علامت تھی لیکن آج ہر تہمند روسی اس فعل کو بدترین قومی جرم خیال کرے گا۔ بالکل یہی حال ہلڑ بازی کے مظاہروں اور ہڑتالوں کا ہے۔ اجنبی حکومت کے زمانے میں ان کا استعمال روا ہو سکتا تھا۔ آج ان کا سہارا ڈھونڈنا ملک کے بہترین مفاد کو صدمہ پہنچانا ہے۔

معاملے کا سب سے افسوس ناک پہلو غالباً یہ ہے کہ ہمارے طالب علم بڑی آسانی سے سیاسی گرگوں کے ہتھے چڑھ جانے کے عادی ہیں۔ ان حالات میں سیاسی دوکان چمکانے کے لئے طلبا کو آلۂ کار بنانے کی خواہش اس قدر عام اور آہنی قوی ہے کہ سیاسی شعبدہ بازوں سے یہ امید رکھنا عبث ہے کہ وہ وسیع تر قومی مفاد کی خاطر اس خطرناک کھیل سے باز رہیں گے، اس خطرے کے سدِّ باب کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ ہمارے طالب علم غیر آئینی کارروائیوں کے نتائج و عواقب کو اچھی طرح سمجھنے لگیں۔ یہ شعور باقاعدہ تربیت اور رہنمائی چاہتا ہے اور یہ کام سکولوں اور کالجوں کے اساتذہ حضرات کے کرنے کا ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ طالب علموں کے دلوں سے یہ غلط فہمی پوری طرح دور کر دی جائے کہ نظم و ضبط سے کھیل کر تعلیمی اداروں کو مطالبے ماننے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی تعلیمی ادارہ شور و غوغا سے ڈر کر بنیادی قدروں کا بچاؤ کرنے کی بجائے ہتھیار ڈال دیتا ہے تو وہ ایسے لمزاجی رجحانات کے لئے راستہ صاف کرتا ہے جو کسی جگہ رکنا نہیں جانتے۔ بین الاقوامی سیاست کے موجودہ دور میں جب دو متضاد نظریہ ہائے حیات دنیا کے گوشے گوشے میں دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ہمارے نوجوان ہنگامی جذبات میں بہ جانے کی بجائے دور اندیشی اور ذمہ داری سے کام لینا سیکھیں۔ اساتذہ اور تعلیمی منتظمین پر اس تربیت کے ضمن میں جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اسے بہ طریق احسن پورا کریں گے ۔

اساتذہ کیسی نگرانی چاہتے ہیں؟

فضل احمد

نگرانی سے کیا مراد ہے

نگرانی کا لفظ سن کر طرح طرح کے مفہوم ذہن میں آئیں گے، ماں باپ بچوں کے لئے نگران کا درجہ رکھتے ہیں۔ مگر یہ نگرانی سراپا محبت اور رحمت ہوتی ہے، ان کا تجربہ اور علم بچے کی نسبت کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔ وہ بچے کی بہبود کو خود اس کی نسبت بہت اچھی طرح جانتے ہیں، اس لئے ان کی ساری دوڑ دھوپ اس بات پر صرف ہوتی ہے کہ بچہ کوئی ایسی چیز نہ کرنے پائے جو اسے دکھ پہنچانے والی ہو، ناپسندیدہ چیزوں سے روکنے کے لئے عموماً جبر اور سختی سے کام نہیں لیا جاتا۔ بلکہ ترغیب تحریص یا دوسرے نفسیاتی ذرائع سے اس کے برعکس دوسری نگرانی اس کرخت مزاج جابر اُورسیر کی نگرانی ہے جو مزدوروں کی ایک جماعت پر مامور ہو۔ یہ شخص اس بات میں یقین رکھتا ہے کہ نگران کی لغات میں نرمی، ترغیب حوصلہ افزائی اور چشم پوشی کے الفاظ کے لئے کوئی گنجائش نہیں، اس کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ مزدور طبعاً کام سے جی چراتے ہیں اور ڈر اور سختی کے علاوہ کوئی دوسری چیز انھیں کام پر لگائے نہیں رکھ سکتی۔ یہ یقین اسے اس بات پر ابھارتا ہے کہ مزدوروں کے کام اور ان کے رویے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر عیب نکالے، مزدور کا کام خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اگر اُورسیر اس میں کسی چھوٹی موٹی کمی کی طرف اشارہ نہیں کر سکتا تو وہ سمجھتا ہے کہ اس نے نگرانی کا فرض پورا نہیں کیا۔

نگرانی کی ان دو انتہائی صورتوں کے بین بین نگرانی کی اور بیسیوں قسمیں ملیں گی، اس بحث میں ہمیں تعلیمی نگرانی سے بحث کرنا مقصود ہے۔ اس لئے ہم اپنی نگاہ صرف اسی تک محدود رکھیں گے، اس نگرانی کی ضرورت پر تو آگے چل کر نظر ڈالی جائے گی، یہاں اس کی نوعیت کی

توضیح کی جاتی ہے۔

تعلیم ایک بہت ہمہ گیر عمل ہے جس کا ایک جز، تدریس ہے، تدریس کا عمل استاد کے ہاتھوں انجام پاتا ہے، اس عمل کی سمت معین کرنے اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کا کام لامحالہ کسی دوسرے ہاتھ میں ہوگا۔ یہ دونوں کام تعلیمی نگرانی کی ذمہ داری ہیں۔ استاد اور نگران دونوں ایک ہی کام میں برابر کے شریک ہیں۔ کام کا پہلا حصّہ استاد کے سپرد ہے اور آخری حصّہ نگران کے۔ دونوں کی منزل ایک ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھیں اور پوری یک جہتی سے کام کریں۔ اگر کسی وجہ سے دونوں میں بداعتمادی موجود ہے تو تدریس کے عمل کو دھکا لگے گا اور جس مقصد کے لئے تعلیمی نگرانی کا جواز تلاش کیا گیا تھا وہ پورا نہ ہوگا۔

قیمت کا اندازہ لگانا کیوں ضروری ہے اوپر کہا گیا ہے کہ تعلیمی نگرانی کے فرائض میں سے ایک فرض عمل تدریس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا ہے۔ قبل اس کے کہ اصل موضوع کو لیا جائے مناسب ہوگا کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ یہ کام کیوں ضروری ہے اور اسے تعلیمی نگرانی کے فرائض میں کیوں شامل کیا گیا ہے۔

انسانی کوشش کے راستہ میں غالباً سب سے خطرناک رکاوٹ خوش فہمی ہے، انسان اپنی کوشش کے نتائج کو بہت بڑھا چڑھا کر دیکھنے کا عادی ہے۔ اور یہ کمزوری اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں میں نظر آتی ہے۔ بے لاگ سے بے لاگ نگاہ بھی خود اپنے معاملے میں دھوکہ کھا جاتی ہے۔ اس انسانی کمزوری پر قابو پانے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہر عمل اور ہر کوشش کے نتائج کا لگاتار جائزہ لیا جاتا رہے، تاکہ سعی اور ماحصل کے درمیان ایک صحت مند تناسب قائم رہے اور منزل آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔

اس ضمن میں ایک بہت اہم نکتہ یہ ہے کہ جس فرد یا جن افراد کی کوششوں کے نتائج کو جانچا جا رہا ہو۔ جانچنے کے کام میں انھیں بھی شریک ہونا چاہیئے، اگر انھیں شریک نہیں کیا جاتا

اور کوئی بیرونی مبصران کے کام کے متعلق کوئی فیصلہ دے دیتا ہے تو یہ فیصلہ خواہ کتنا ہی بے لاگ اور حق پسندانہ کیوں نہ ہو۔ اکثر حالتوں میں اس سے خاطر خواہ فوائد حاصل نہ ہوں گے جن لوگوں کے کام کو جانچا گیا ہے، ان میں سے بہتوں کو یہ شکایت رہے گی کہ ان کی کئی ایک خوبیوں کو پوری طرح نگاہ میں نہیں رکھا گیا۔ ایسا محاسبہ اکثر کام کرنے والوں کو اپنی کوتاہیوں کا قائل نہیں کرے گا۔ اور اس طرح محاسبہ کا بنیادی مقصد بڑی حد تک فوت ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر کام کرنے والوں کو بھی جائزہ لینے کے کام میں شامل کر لیا جائے تو نتائج بہت پسندیدہ ہوں گے۔

اپنے کام کا خود جائزہ لینے کے لئے تربیت کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور یہ تربیت دینا نگران کا کام ہے، یہ خیال غلط ہے کہ خود اپنے کام کے بارے میں لوگ بے لاگ رائے نہیں دیں گے، ممکن ہے اوّل اوّل ایسا ہو، لیکن جب انھیں یقین ہو جائے کہ ان پر بھروسہ کیا جا رہا ہے تو اکثریت اس حق کا ناجائز استعمال نہیں کرے گی، اس ضمن میں ایک تجربہ کے نتائج درج ذیل ہیں۔

بارہ متعلم مدرسین ایک مدرسے میں تدریسی مشق کر رہے تھے۔ ان میں سات بی ٹی جماعت کے طالب علم تھے اور پانچ سی۔ ٹی کے۔ انھیں پہلے سے بتا دیا گیا تھا کہ اپنے ساتھیوں کے سبقوں کو اچھی طرح دیکھیں کیوں کہ مشق کے خاتمہ پر ہر ایک کو دوسروں کے کام کے متعلق رائے ظاہر کرنا ہوگی، جب کام کا جائزہ لینے کا وقت آیا تو ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک چٹ فراہم کر دی گئی جس پر بارہ کے بارہ نام درج تھے۔ کام کو خوبی کے اعتبار سے ا، ب اور ج تین درجے دیئے گئے اور ان بارہ کے بارہ اصحاب کو کہا گیا کہ ہر نام کے سامنے اپنی بہترین دانست کے مطابق کام کی خوبی کا درجہ لکھ دیں۔ اس فہرست میں ہر شخص کا خود اپنا نام بھی شامل تھا۔ اور ہر ایک کو اپنے نام پر نشان کرنا تھا تاکہ نگران کو یہ اندازہ ہو جائے کہ خود اپنے کام کے متعلق ہر رائے دینے والے کا خیال کیا ہے۔

اس جائزہ کے نتائج حسب ذیل تھے۔

(۱) سی۔ ٹی جماعت کے پانچ طلبہ میں سے کسی ایک نے بھی اپنے کام کو درجہ ا نہیں دیا۔ البتہ

ان میں سے بعض نے اپنے چند ساتھیوں کے کام کو بہت سراہا اور اسے درجہ ۱ کا حقدار قرار دیا۔
(ب) بی۔ٹی جماعت کے تین طلبہ نے بظاہر پہلے سے باہم فیصلہ کر کے ایک دوسرے کے کام کو درجہ ۱ کا حقدار قرار دیا۔ مگر خود ان کے سوا کسی اور نے ان کے کام کو یہ مقام نہیں دیا۔
(ج) بی۔ٹی کے ایک طالب علم نے خود اپنے کام کو درجہ ۱ کا مستحق قرار دیا۔ مگر گروہ کے کسی اور رکن نے اس رائے کی تائید نہیں کی۔

مندرجہ بالا تجربہ کے نتائج دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔ ان لوگوں کے لئے اس قسم کے جائزۂ نفس کا غالباً یہ پہلا موقع تھا لیکن اس کے باوجود نتائج حوصلہ افزا ہیں۔ اس طریق کار سے نہ صرف ان متعلم اساتذہ کو ایک مفید تربیت مل گئی۔ بلکہ نگران کا کام بھی نسبتاً سہل ہو گیا۔ اس نے اپنے شاہدات کی بنا پر ہر ایک کے متعلق جو رائے قائم کر رکھی تھی اس کی تائید خود ان لوگوں کی طرف سے ہو گئی۔ اس پر مستزاد یہ کہ اب اس کا فیصلہ کوئی بیرونی فیصلہ نہ رہا بلکہ جماعت کا اپنا فیصلہ بن گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اسے کچھ خام طبع افراد کے فیصلے سے انحراف کرنا پڑا۔ مگر ان افراد کا فیصلہ واقعات پر مبنی نہ تھا۔ گروہ نے ان کی تائید نہیں کی تھی۔ اس لئے اس طریق کار سے یہ امکان بہت زیادہ بڑھ گیا کہ یہ لوگ اپنے کام کی صحیح نوعیت کو پہچانیں اور اصلاح حال کے لئے مخلصانہ کوشش کریں۔

پرانی وضع کی نگرانی

عوامی تعلیم دورِ جدید کی پیداوار ہے۔ ازمنہ وسطیٰ اور قدیم زمانوں میں اجتماعی امور کی باگ ڈور پورے طور پر چند ہاتھوں میں ہوا کرتی تھی۔ یہ مٹھی بھر لوگ سیاسی، معاشی اور دوسرے اہم امور کو انجام دینا اپنی قدرتی ذمہ داری خیال کرتے تھے، خود عوام کا خیال بھی چنداں مختلف نہ تھا۔ بمصداق ع

امور سلطنت شاہان بدانند

ان حالات میں عوام کو اگر تعلیم کی ضرورت محسوس ہوتی تھی تو مذہبی کتابیں سمجھنے یا مذہبی رسوم کے ادا کرنے کے لئے، اس لئے عوامی تعلیم جیسی کچھ تھی کلی طور پر مذہبی رنگ میں ڈوبی

ہوئی تھی، اجتماعی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کا مطالعہ امراء اور شرفا کے بچوں کے لئے مخصوص تھا۔ ظاہر ہے کہ اس تعلیم کے لئے کسی مرکزی رہ نمائی یا نگرانی کی ضرورت نہ تھی۔

صنعتی انقلاب نے جہاں دنیا کی معاشی کایا پلٹ دی وہاں اس نے سیکڑوں سال پرانی معاشرتی لکیروں کو بھی مٹا دیا، بہت سے مزدور جب ایک چھت کے نیچے جمع ہو کر کام کرنے لگے تو انھیں پہلی مرتبہ اپنی اجتماعی قوت کا احساس ہونے لگا۔ تبادلہ خیال کی آسانی نے اس احساس کو چند در چند مطالبوں میں بدل دیا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا یہ مطالبے زیادہ شدید اور زیادہ واضح ہوتے گئے۔ ان میں سے ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ عوام کو علم کی روشنی سے مستفید ہونے کا حق ہے انیسویں صدی کے نصف آخر میں اس مطالبے کا دباؤ اس قدر بڑھا کہ یورپی ملکوں میں یکے بعد دیگرے عوامی تعلیم کا رواج ہونے لگا، اس عوامی مطالبہ کو پورا کرنے میں متقدر طبقہ کے سامنے یہ بات بھی تھی کہ پڑھا لکھا مزدور جدید صنعت کی ضرورتوں کو ان پڑھ مزدور کی نسبت زیادہ اچھی طرح پورا کر سکتا ہے۔

عوامی تعلیم کے رواج پانے کے ساتھ ہر جگہ مدرسوں کا جال پھیل گیا۔ ان چھوٹے چھوٹے اور الگ تھلگ تعلیمی اداروں میں تدریسی سطح کو کم وبیش ایک سا رکھنے کے لئے نگرانی ضروری نظر آئی اور اس طرح تعلیمی نگرانوں کے لئے جواز پیدا ہو گیا۔

اوپر اشارہ گذر چکا ہے کہ اس منزل پر تعلیم کا نصب العین ایسے مزدور پیدا کرنا تھا جو صنعت کاروں کی منشا کو سمجھ کر اسے خوبی کے ساتھ عملی جامہ پہنا سکیں۔ منصوبہ بندی یا انتظامی امور سے انھیں سروکار نہ تھا۔ اس طرح تعلیم کا مقصد گویا واضح طور پر متعین تھا، منزل کے اس حتمی تعین نے فلسفۂ تعلیم کو متاثر کیا۔ ہربارٹ اور دوسرے ماہرین تعلیم نے اس نکتہ پر زور دیا کہ جب منزل مقصود یقینی طور پر معلوم ہے تو اسے حاصل کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ طریقۂ تدریس کے کچھ ایسے بندھے ٹکے گر ڈھونڈے جائیں جن کی مدد سے ہر استاد منزل مقصود پر پہونچ جائے۔ غرض استاد کو تربیت گاہوں میں ان بندھے ٹکے طریقوں کی تعلیم دی جاتی تھی اور نگرانوں کے ذمے یہ فرض ٹھہرا کہ وہ دیکھیں کہ آیا ان طریقوں سے انحراف تو نہیں کیا جا رہا۔

اس تاریخی پس منظر نے نگران کو ایک ہمہ داں آمر کا درجہ دے دیا - ایسا آمر جو معیاری تدریسی طریقوں کا چلتا پھرتا پیکر تھا۔ اس کے لئے یہ کسی طرح ضروری نہیں تھا کہ استاد کو اس کی خامیوں کا قائل کرے، اس کا کام صرف آگاہ کر دینا تھا اور بس۔ اس کی مثال اس غیبی آواز کی بن گئی جس کو بے چون و چرا تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔

نگرانی کے اس تصور نے نگران کی شخصیت کو ایک عجیب و غریب سانچے میں ڈھال کر رکھ دیا۔ اچھا نگران بننے کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ ماتحتوں سے ہر حال میں ایک پُر تعظیم فاصلہ قائم رکھا جائے وہ یہ میں ایک قسم کی سختی ہو اور اپنے آپ کو علم التعلیم کے اسراروں کا خزانہ سمجھا جائے۔ پندار اور تند مزاجی کا لازمی نتیجہ بداعتمادی ہوا کرتا ہے، چناں چہ پرانی وضع کے نگران ماتحتوں کو کبھی اعتماد میں نہ لے سکے جن تعلقات کی بنیاد ہی ڈر اور خوف پر ہو ان میں صحت مندی اور پائداری کو ڈھونڈنا بے کار ہے، ادھر نگران صاحب نے بیٹھ موڑی اور ادھر ماتحتوں نے ان پر تین حرف بھیج کر اللہ کا شکر ادا کیا اور پرانی رٹ پر پھر آن رہے، ایسی نگرانی خود نگران کے لئے کچھ کم مضرت رساں نہیں۔ یہ خود فریبی طرح طرح کے نفسیاتی خوفوں کی شکل اختیار کرنے لگتی ہے، مختلف قسم کی بدگمانیاں اور شکوک ذہن پر مسلّط ہونے لگتے ہیں۔ نگران ماتحتوں کی بالیدگی اور پیش قدمی سے خوف کھاتا ہے چوں کہ جعلی شخصیت نے خود اس پر ارتقاء کے دروازے بند کر رکھے ہوتے ہیں اس لئے وہ دوسروں کے ارتقا میں اپنے لئے خطرہ دیکھتا ہے۔

نگرانی کا نیا تصوّر بیسویں صدی کی دو عالم گیر جنگوں نے صدیوں کے سوئے ہوئے عوام میں ایک نئی بیداری پیدا کی ہے، اب وہ صرف اس بات پر قناعت کرنے کے لئے تیار نہیں کہ تعلیم کی بدولت بہتر مزدوری حاصل کریں بلکہ وہ علم کی روشنی سے وہی کام لینا چاہتے ہیں جو خواص لیا کرتے تھے۔ وہ سیاسی۔ معاشی اور معاشرتی امور کے متعلق سوچنے اور ان کے طے کرنے میں رائے دینا چاہتے ہیں۔ اب تعلیم کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ عوام و خواص ہر دو کے لئے ایک ہی خدمت سرانجام دے۔ موجودہ صدی کی حیرت انگیز سائنسی اور ٹکنیکل ترقیوں نے

فلسفۂ تعلیم میں بھی بہت کچھ ردو بدل کیا ہے ۔ عالم گیر جنگوں نے تباہی اور ہلاکت کے جن بے پناہ امکانات کا پتہ دیا ہے، ان کو دیکھ کر اب یہ کہنا مشکل ہے کہ تعلیم کے لئے پہلے سے ایک متعین منزل موجود ہے جس کی طرف بندھے ٹکے طریقوں سے پیش قدمی کی جاسکتی ہے، موجودہ صدی کی برق رفتار تبدیلیوں نے اگر انسان کو کوئی سبق دیا ہے تو وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی چیز کو قرار نہیں ۔ یہاں تغیر کی رفتار خیال کی تیز روی سے بھی بازی لے جاتی نظر آرہی ہے ایسی صورت میں تعلیم کا کسی مقررہ منزل کو بنیاد قرار دے لینا زندگی کے تقاضوں سے بیگانگی اختیار کرنا ہے، زندگی کو ہر لحظہ ہنگامی حالات سے سابقہ پڑتا ہے ۔ اس لئے تعلیم کا مقصد ایسی استعداد پیدا کرنا ہونا چاہیئے جو ہر قسم کے غیر متوقع ہنگامی حالات سے بخوبی دوچار ہو سکے ۔

تعلیم کا یہ تصور جس کو جدید الفاظ میں مرتب کرنے کا سہرا جان ڈیوئی کے سر ہے ۔ سر تا پا زندگی اور حرکت سے بھرپور ہے ۔ اس میں بندھے ٹکے طریقوں اور سکون و قرار کے لئے کوئی جگہ نہیں نئی تعلیم ہر لمحہ آگے کی طرف قدم بڑھانا چاہتی ہے اور اس پیہم پیش قدمی کی بنیاد وہ انسانی تعلقات پر رکھتی ہے ۔ نئی تعلیم صرف کچھ واقفیت اور کچھ مہارتیں بہم پہونچانے کو کافی نہیں سمجھتی بلکہ اس کا یقین یہ ہے کہ ان سے اہم تر کام جو تعلیم کے ذمہ ہے ۔ وہ اچھے انسانی تعلقات کی تربیت دینا ہے ۔ کیوں کہ ایسی تربیت ہی تغیر پذیر معاشرتی زندگی کی ہنگامی ضرورتوں سے نباہ کرنے کی ضامن ہو سکتی ہے ۔

تعلیم کا یہ نیا تصور استاد کے ذمے جو کام لگاتا ہے ۔ اسے پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ استاد خود ایک وسیع اور بھر پور زندگی سے لطف اندوز ہو، ایسی زندگی جو مسلسل بالیدگی کی صورت میں ہی ممکن ہو سکتی ہے ۔ طالب علموں کو وہی استاد تلاش پیہم کا عملی سبق دے سکتا ہے جس کا اپنا ذہنی افق نت نئی وسعتوں کو محیط کرنے کا خوگر ہو ۔ استاد میں یہ استعداد پرانے ڈھنگ کی نگرانی سے پیدا نہیں کی جاسکتی جس کا سارا بھروسہ جامد اور ساکن تصورات پر ہے ۔ اس مطلب کے لئے ایک نئی قسم کی نگرانی کی ضرورت ہے ۔ ایسی نگرانی جو نگران اور ماتحتوں کے تخلیقی تعاون میں

یقین رکھتی ہو۔

جدید وضع کی نگرانی کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ نگران اور مدرس دو جداگانہ گروہوں سے تعلق نہیں رکھتے، وہ دونوں ایک مشترکہ عمل میں مل کر کام کرتے ہیں۔ عمل کا ایک حصّہ مدرس کے ذمے ہے اور دوسرا نگران کے لیکن یہ تقسیم کار دونوں میں سے کسی کو دوسرے پر فوقیت نہیں دیتی۔ عمل کی وحدت اس بات کا شدید تقاضہ کرتی ہے کہ اس کے دونوں حصّے پورے تال میل سے پورے کئے جائیں تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے، اس لئے معاشرتی سطح پر مدرس اور نگران کے درمیان کسی طرح کے پردوں کا بیچ میں آجانا ایک ایسا خطرہ ہے جو عمل تعلیم کے لئے مہلک ہے۔ نگران کو چاہیئے کہ مدرسوں کو پورے طور پر اپنے بھروسہ میں لے۔ اپنے عمل سے ان پر ثابت کرے کہ وہ ان پر کوئی چیز بہ جبر ٹھونسنا نہیں چاہتا۔ اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ منزل متعین کرنے اس کی راہ کا کھوج لگانے اور راہ طے کرنے کے سہل ترین طریقے معلوم کرنے میں استادوں کا ہاتھ بٹائے۔ رہنمائی کا یہ کام اس کے بالغ تر علم اور پختہ تر تجربہ پر مبنی ہو نہ کہ تحکم اور تلخ مزاجی پر۔

جب استادوں کو یقین ہو جائے کہ نگران ان کی عیب جوئی کے لئے نہیں بلکہ رہنمائی کے لئے موجود ہے تو نگران کو اطمینان ہونا چاہیئے کہ اس نے صحیح قسم کی تخلیقی نگرانی کی بنیاد رکھ دی۔ اب اس کا اگلا کام یہ ہوگا کہ مدرسوں کو باہمی مشورہ سے فیصلے کرنے کی تربیت دے، شروع شروع میں عموماً ایسا ہوگا کہ بہت سے افراد بحث سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کریں گے۔ وہ جلسوں میں شریک ہوں گے مگر چپ چاپ بیٹھے ہاں میں ہاں ملائیں گے بعض افراد ضرورت سے زیادہ معتبر بننے کے لئے موقع بے موقع ہر ایک سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کریں گے بعض ایسے بھی ہوں گے جو نگران کو خوش کرنے کے لئے طرح طرح کی چاپلوسی سے کام لیں گے۔ نگران کو چاہیئے کہ ان میں سے کسی گروہ سے برہم نہ ہو۔ بلکہ یہ سمجھے کہ ان تینوں گروہوں کا مخصوص طرز عمل واضح خام طبعی کی علامت ہے جو پچھلی تربیت کا نتیجہ ہے، اس خام طبعی کو دور کر کے پختگی مزاج پیدا کرنا نگران کا کام ہے لیکن اس کام کو پورا کرنے کے لئے وہ کوئی احکام جاری نہیں کرتا اور نہ ہی دھمکی اور رعب سے

کام لیتا ہے، وہ یہ سارا کام حوصلہ افزائی اور موزوں رہنمائی سے انجام دیتا ہے۔

جب استادوں کو جماعتی طور پر نصب العین مقرر کرنے اور طریقے ڈھونڈنے کا ڈھب آ جائے تو اگلا قدم ان فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کا ہے۔ یہ کام صاف طور پر نگران کی ذمہ داری ہے۔ جب جماعت آزادانہ بحث و تمحیص کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچ جائے اور کام متعین کر کے اس کے مختلف حصے مختلف افراد کے ذمے لگا دے اور یہ افراد جماعت کے فیصلے کو قبول کرلیں تو پھر یہ کام نگران کا ہے کہ ان فیصلوں پر مضبوطی سے قائم رہ کر ان پر عمل کرائے۔ اس بارے میں چشم پوشی اور کوتاہی کرنا جماعت کے وقار کو دھکا لگانا اور اس کی قوت عمل کو مفلوج کرنا ہے۔

شروع میں کہا گیا تھا کہ نگرانی کا کام دو اجزا پر مشتمل ہے۔ یعنی عمل کی سمت معلوم کرنا اور نتائج کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا۔ اوپر کی سطروں میں دیکھا گیا ہے کہ جدید وضع کی نگرانی کام کے پہلے حصے کو کیوں کر انجام دیتی ہے۔ کام کا دوسرا حصہ بھی بالکل اسی قدر اہم ہے، کیوں کہ ہم زندگی کی تمام کوششوں کو قدر و قیمت کے ترازو میں تولنے کے عادی ہیں جس کوشش کی قدر و قیمت کے متعلق طبیعت میں شک ہو، اس میں یکدلی کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ تعلیمی عمل، بہت سے استادوں کے ہاتھوں انجام پاتا ہے۔ ان متعدد افراد کی محنت کے نتائج کو جانچے بغیر انھیں لگاتار بہترین کوشش پر ابھارنا ممکن نہیں۔ لیکن جدید نگرانی یہ کام اس طور پر انجام نہیں دیتی کہ کام کرنے والوں کو معیاروں کے متعلق کچھ خبر نہ ہو۔ اس کی بجائے جدید نگرانی معیار مقرر کرنے کا کام خود استادوں کے ہاتھوں میں سونپ دے گی، اور آخر الامر خود یہی لوگ مل کر ان معیاروں کی روشنی میں اپنے کام کو جانچیں گے جائزہ کے اس طریق کی ایک عملی مثال پیچھے بیان ہو چکی ہے، اس لئے یہاں اسی قدر اشارہ کر دینا کافی ہے۔

استاد کیا چاہتے ہیں؟ کئی ایک نگران یہ کہتے سنے جائیں گے کہ استاد تو سرے سے کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے، یہ دلیل ہمیشہ ایسے نگران حضرات کی زبانی سنی جائے گی جو تحکم، تخویف اور سخت گیری کی تاثیر میں ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ان کی سختی اور دباؤ

خود استادوں کے رویّے کے ردِّ عمل ہیں۔ اگر یہ گرفت ذرا ڈھیلی ہو جائے تو سارے نظم و نسق پر پانی پھر جائے اور استاد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہا کریں۔

جو لوگ اس قسم کی دلیلوں کا سہارا ڈھونڈا کرتے ہیں وہ معاملہ کے دو اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر جاتے ہیں (۱) اساتذہ میں بددلی اور بداعتمادی کے جن جذبات کی شکایت کی جاتی ہے ان کے پیدا کرنے میں غلط قسم کی نگرانی کو بہت دخل ہے (ب) استاد یا کوئی دوسرا شخص ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ نگرانی کا خاتمہ ہو جائے اور اس طرح سمت متعین کرنے اور قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کا کام معطل ہو کر رہ جائے مطالبہ صرف اس قدر ہے کہ نگراں حضرات ایسی تکنیکوں اور طور طریقوں کے ذریعے اپنا کام انجام دیں، جو دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق ہوں۔

ہمارے ملک میں ابھی جدید وضع کی نگرانی کے کوئی قابل ذکر تجربے نہیں کئے گئے لیکن مغربی ملکوں میں نگرانی کا یہ نیا طریقہ دن بدن مقبول ہو رہا ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس قسم کی تعاون پسند نگرانی کو رواج دینے کا سہرا تعلیمی اداروں کے سر نہیں بلکہ صنعتی اداروں کے سر ہے، سب سے پہلے کچھ بڑے بڑے امریکی صنعت کاروں کو یہ احساس ہوا کہ انسانوں کو مشینوں کی طرح ہانکنے کی بجائے ان کا دلی تعاون حاصل کرنے سے یقیناً بہتر نتائج پیدا ہوں گے۔ یہ تجربہ کیا گیا اور پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ ہوا، دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں اس تحریک نے امریکی صنعت میں مضبوط جڑیں پکڑ لیں اور بالآخر دوسرے معاشرتی اداروں نے بھی صنعت کی مثال سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ آج امریکہ کے اکثر تعلیمی اداروں میں بھی تعاون پسند نگرانی کا چرچا ہے لیکن پرانی وضع کی حکمانہ نگرانی ابھی معدوم نہیں ہوئی بعض اوقات ایک ہی علاقے میں دو تعلیمی ادارے ملیں گے جن میں سے ایک تعاون پسند نگرانی کے تحت چل رہا ہے تو دوسرا حکمانہ نگرانی کے ماتحت، دونوں کی اضافی خوبیوں کا اندازہ کرنے کے لئے کچھ مطالعے بھی کئے گئے ہیں جن میں سے ایک مطالعہ کا ذکر نیچے کیا جاتا ہے۔

چند برس ہوئے ریاست الینائے (امریکہ) کی نارتھ ویسٹرن یونی ورسٹی کے پروفیسر

ہے۔ ڈبلیو ہیو گز نے اس طرح کا ایک مطالعہ کیا تھا۔ یہ مطالعہ اس یونیورسٹی کے گرمائی نصاب کے دوران میں کیا گیا، جب استادوں اور نگرانوں کی ایک کافی بڑی جماعت پروفیسر موصوف کے کورس میں شریک تھی۔ مطالعہ کی صورت یہ تھی کہ ایک سوال نامہ تیار کیا گیا جس کا جواب کورس میں حصہ لینے والے ہر فرد نے دیا۔ ان جوابوں کا تجزیہ کرنے کے بعد ان سے کچھ نتائج اخذ کئے گئے۔ یہ نتائج جو نیچے دیئے جاتے ہیں نگرانی کے مقاصد، اس کی ہیئت اور مقاصد سے متعلق ہیں۔

۱۔ مقاصد استادوں نے اس امر پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ نگران محض ان کے کام پر تنقید کریں اور عیب جوئی کے بعد مطلق العنانی سے ان کے متعلق رائے دے دیں۔ استادوں کی اکثریت نے جس مقصد کو سب سے زیادہ سراہا وہ یہ تھا کہ نگران حضرات تدریس کی تکنیک کو بہتر اور زیادہ موثر بنانے کے لئے ٹھوس تعمیری تجویزیں پیش کریں۔ دوسرا پسندیدہ مقصد یہ بیان کیا گیا کہ استادوں کی کسی جماعت کو کسی ایسے تعلیمی منصوبے کے پورا کرنے میں سرگرم مدد دی جائے جس کے نتیجے کے طور پر اس میں شریک ہونے والوں کی فنی قابلیت اور مہارت میں ترقی ہو۔

۲۔ ہیئت ترکیبی نگرانی کی ہیئت ترکیبی کے متعلق کسی قدر اختلاف رائے پایا گیا۔ اکثریت نے اس بات پر زور دیا کہ نگران کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس علم یا مہارت میں کافی دست رس رکھتا ہو جس کی نگرانی اس کے ذمّہ ہے۔ استادوں اور نگرانوں دونوں نے متفقہ طور پر یہ بات تسلیم کی کہ کسی نہ کسی شکل میں نگرانی کا وجود ازبس لازمی ہے، کیوں کہ اس قدر اہم کام کو حسنِ اتفاق کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔

۳۔ طریقے استادوں اور نگرانوں کی واضح اکثریت کی رائے میں استادوں کے کام کو جانچنے۔ ان کی خامیوں کو ظاہر کرنے اور طریقہ ہائے تدریس میں اصلاح کے ذرائع بتانے کے لئے سب سے اچھا طریق یہ ہے کہ نگران ان کے کام کو ہم کر دیکھے اور بعدازاں اس پر بحث ہو۔ ایسا معائنہ جس کے بعد استادوں کے ساتھ فرداً فرداً بحث نہیں کی جاتی بالکل بے کار تسلیم پایا گیا۔ اکثریت نے

یہ رائے بھی ظاہر کی کہ نگران کو یہ چاہیئے کہ جماعتی مطالعہ کے بارے میں حوصلہ افزائی اور رہ نمائی کرے جو نگرانی ناقص طریقوں کی بجائے قابل عمل طریقے پیش نہیں کرتی اور موجودہ کمیوں کو دور کرنے کے وسائل فراہم کرنے میں مدد نہیں دیتی وہ منفی نگرانی ہے اور اس لئے بے معنی ہے۔ استاد اس کی بجائے مثبت نگرانی چاہتے ہیں۔ ایسی نگرانی جو تخریبی نکتہ چینی کی بجائے تعمیری رہ نمائی کو اپنا شعار بنائے۔

خاتمۂ کلام

پرانی وضع کی نگرانی کا سہارا دو مفروضے تھے۔ پہلا یہ کہ نگران ہمہ دان ہے، دوسرا یہ کہ استاد بغیر ڈر یا خوف کے کام نہیں کرتے، دورِ حاضر کی تعلیمی اور نفسیاتی تحقیقات نے ان دونوں مفروضوں کا بودا پن ظاہر کر دیا ہے۔ پہلے مفروضے کا لازمی نتیجہ ایک جھوٹی شخصیت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور دوسرے مفروضے کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نگاہ اصولوں سے ہٹ کر بے معنی بار یکیوں پر جم کر رہ جاتی ہے۔ کیوں کہ ان کا سہارا لئے بغیر ہر استاد کے کام میں عیب جوئی ممکن نہیں رہتی اور عیب جوئی کے بغیر نگران اپنے کام کو ادھورا سمجھتا ہے۔ ان تمام باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ گھٹیا کام کرنے والوں کو کوئی ایسی عملی راہ نہیں ملتی جس پر چل کر وہ بہتر کام کر سکیں اور بڑھیا کام کرنے والے حوصلہ افزائی اور استحسان سے محرومی کے باعث بد دل ہونے لگتے ہیں۔ اس طور پر عمل تدریس کی اصلاح بڑی حد تک ختم ہو جاتی ہے۔

نگرانی کا نیا نظریہ اپنی بنیاد اس اہم نفسیاتی حقیقت پر قائم کرتا ہے کہ ہر انسانی کوشش کا آخری سہارا زندہ رہنے کی آرزو ہے، یہ وہ بنیادی قدر ہے جو بیشتر مذہبی۔ روحانی۔ اخلاقی اور مادی قدروں کی تہ پر کام کرتی نظر آتی ہے۔ انسان فطری طور پر ایسی کوششوں کو پسند کرتا ہے جو زندہ رہنے کی بنیادی قدر کو تقویت دیں۔ یہ بنیادی قدر کئی ایک روپوں میں جلوہ گر نظر آئے گی۔ ان میں سے ایک بہت عام شکل بڑھنے پھولنے اور بلند ہونے کی کوشش ہے، اس بنیادی نکتہ کو نگاہ میں رکھ کر جب ہم یہ سوال پوچھتے ہیں کہ کیا تحکم اور جبر پسند نگرانی اس قدر کو تقویت دیتی ہے تو جواب صریح نفی میں ملتا ہے جبر اور دباؤ کھلنے اور پھیلنے والی قوتیں ہیں ان کے ہوتے ہوئے روئیدگی اور بالیدگی کے امکانات بڑی حد تک ختم ہو جاتے ہیں۔ جب نگرانی کام کرنے والے کو ایک کڑے سانچے میں جکڑ کر رکھ دے تو یہ امید کیوں کر

کہ وہ شخص کسی سمت میں آزادانہ حرکت کر سکے گا؟ اس قسم کی نگرانی کچھ نظر فریب نتیجے تو دکھا سکتی ہے مگر یہ نتیجے ہمیشہ سطحی اور غیر پائدار ہوں گے۔ ادھر دباؤ اٹھا اور اُدھر سالوں بلکہ قرنوں کی محنت کے نتائج بخارات بن کر اڑ گئے۔

اس کے برعکس تعاون پسند نگرانی ایک بہت گہرے سرچشمے سے زندگی حاصل کرتی ہے۔ وہ زندہ رہنے کی بنیادی اکساہٹ کو تھپک کر اسے تحریک دیتی ہے، وہ بہت نرمی سے فرد کے کان میں یہ سحر پھونکتی ہے کہ تو بہت اہم ہے۔ تیری رائے اور تیری کوشش کے بغیر جماعتی معاملات کی گتھی سلجھائی نہیں جاسکتی۔ یہ امید کوئی دھوکہ نہیں رہتا۔ کیوں کہ تعاون پسند نگرانی عملاً فیصلہ کرنے اور فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری میں فرد کو اپنا شریک بناتی ہے، اس سے نگرانی کے ہاتھ کم زور نہیں بلکہ مضبوط تر ہو جاتے ہیں اور فرد کی اہمیت نفس اور خود اعتمادی کو جو تقویت ملتی ہے۔ اس کا بدل غالباً کوئی مادی انعام نہیں ہو سکتا۔

یہ خیال بے بنیاد ہے کہ تعاون پسند نگرانی نظم و ضبط کو ڈھیلا کر دے گی۔ ایسی نگرانی استادوں کو جس حد تک ضبط پسند بنا سکتی ہے، اس کا اندازہ کرنا غالباً بہت لوگوں کے لئے مشکل ہے، وضاحت کے لئے ایک مثال کا ذکر کرنا فائدہ مند رہے گا۔ پچھلے سال ریاست کنی ٹی کٹ (امریکہ) کے ایک شہر ویسٹ پورٹ کے مدارس کے متعلق ایک آئینی شاہد کا بیان سننے کا اتفاق ہوا۔ جو ان کا معائنہ کر کے واپس آرہے تھے، اس شہر میں کچھ سالوں سے ایک ایسے سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن کام کر رہے ہیں جو تعاون پسند نگرانی کے سرگرم حامی ہیں۔ ان کی رہ نمائی میں ویسٹ پورٹ کے استادوں نے کئی ایک تعلیمی اور تعمیری منصوبے مکمل کئے تھے آخری منصوبہ جس پر حال ہی میں عمل شروع کیا گیا تنخواہ سے متعلق تھا، استادوں نے باہمی مشورہ سے فیصلہ کیا تھا کہ استاد کے لئے مسلسل بالیدگی ایک ضروری شرط ہے، اس بالیدگی کی ایک لازمی شرط یہ قرار پائی کہ ہر پانچ سال کے وقفے میں استاد اپنی تعلیمی قابلیت میں کچھ اضافہ کرے، خواہ یہ اضافہ کسی یونی ورسٹی کے گرمائی نصابوں میں شرکت کر کے حاصل کیا جائے یا مقامی طور پر کسی تحقیقاتی مطالعہ میں حصہ لے کر۔ مقامی تحقیقاتی مطالعہ کو

منظور کرنے کا کام استادوں کی ایک مجلس ہی کے ذمے لگایا گیا۔

تنخواہ میں اضافے کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ صرف طول ملازمت کسی استاد کو ترقی کا حق دار نہیں بنائے گا سالوں تک ایک ہی مقام پر جامد و ساکن کھڑے رہنا کسی شخص کے لئے نیک نامی کا موجب نہیں ہو سکتا تنخواہ میں ترقی کے لئے بالیدگی کا ثبوت ملنا چاہئے، اس فنی بالیدگی کی نوعیت تعلیمی قابلیت کے اضافے کی صورت میں خود استادوں کی طرف سے متعین کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ اصول بھی مان لیا گیا کہ جو استاد کم از کم مقررہ رفتار سے زیادہ تیزی کے ساتھ تعلیمی قابلیت میں اضافہ کرے گا اس کی تنخواہ اسی مناسبت سے بڑھے گی۔ اس کے برعکس جو استاد پانچ سال کے وقفے میں فنی ارتقا کا کوئی ثبوت نہیں دے گا یعنی نہ تو وہ اس مدت میں یونیورسٹی کے گرمائی نصابوں میں حصہ لے گا اور نہ کسی منظور شدہ مقامی منصوبے کو پورا کرے گا، اس کی تنخواہ جوں کی توں رہنے کی بجائے گھٹا دی جائے گی۔ کیوں کہ استاد کے لئے بالیدگی سے محروم رہنا جرم ہے۔

یہ تمام فیصلے استادوں کے اپنے کئے ہوئے ہیں، نگران کی ذمہ داری یہ ہے کہ ان کو عملی جامہ پہنا دے یہ کہنے کی غالباً ضرورت نہیں کہ استاد خود ہی اپنے اوپر اس قسم کا ضبط مسلّط کر سکتے تھے۔ کسی جابر سے جابر نگران کی مجال نہ تھی کہ تنخواہ گھٹانے کا فیصلہ ان پر ٹھونس سکتا۔

غرض تعاون پسند نگرانی ایک تخلیقی قوت ہے، اس میں زندگی کی پوری لچک اور رعنائی موجود ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دورِ حاضر کے تقاضوں کو بہترین طریق پر پورا کرتی ہے۔ ہمارے یہاں ابھی اس کو رواج دیا جانا باقی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ پاکستان کی اسلامی جمہوریت میں نگرانی کی ایسی صورت رواج پائے جو اسلام اور جمہوریت دونوں کی روح سے قریب ہو *

تعلیم نسواں (حدیث کی روشنی میں)

عبدالغفور چوہدری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لڑکیوں سے بڑی ہمدردی تھی جو (اس وقت) انسانی زندگی اور وقار کی طرف سے برتی جانے والی سخت دل بے اعتنائی کی سب سے زیادہ شکار تھی اور بہ چیز ما قبل اسلام عرب کی معاشرتی زندگی کے دامن پر بدنما ترین داغ تھا۔ قبائلی فخر ومباہات کے انتہا پسند جذبہ نے نوزائیدہ بچیوں کے قتل کے بے رحمانہ فعل کو رواج دیا آنحضرتؐ کے ساتھیوں میں سے ایک نے ایک مرتبہ آپؐ سے بیان کیا کہ کس طرح اس نے قبول اسلام سے قبل طفل کشی کا ارتکاب کیا تھا، اس دردناک واقعہ کو سن کر آپؐ بچوں کی طرح رو پڑے، اس گڑھے سے جس میں اسے بے رحمی سے دفن کر دیا تھا نکلی ہوئی ایک معصوم چیخ کی یاد نے جو اپنے رخصت ہوتے ہوئے والدین کو اسے زندہ قبر سے نکال لینے کے لئے واپس بلا رہی تھی، آپؐ کے اخلاقی تار پود میں ارتعاش پیدا کر دیا۔

کسی قسم کے مادرانہ جذبات کے اظہار سے آپؐ بہت متاثر ہوتے تھے۔ اور جب ایک مرتبہ ایک بیوہ اپنی دو بیٹیوں کو لئے ہوئے حضرت عائشہؓ کے پاس آئی اور ان سے ایک کھجور پاکر اپنی دونوں بیٹیوں میں برابر تقسیم کی تو آنحضرتؐ وفور جذبات سے بے قابو ہو گئے اور ان سب پر رحمت بھیجی جو اپنی بیٹیوں کی نگہداشت کرتی ہیں کیونکہ وہ بلاشبہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھنے والی ہیں[1] شعبی کی روایت پر ایک حدیث ہے کہ جس نے اپنی بیٹی کو اچھی تعلیم دی۔ عمدہ طریقے پر اس کی تربیت کی اور اس کے لئے رشتہ (شادی کا) بہم پہونچایا۔ بلاشبہ خدا کی طرف سے اس کو اس کا صلہ ملے گا۔ اور علی سعد ال قادری کا قول ہے کہ جس نے تین بیٹیوں کی پرورش کی

[1] بخاری جلد پنجم صفحہ ۵۳۵ باب دربیان نیک المواد

ان کو تعلیم دی۔ ان کی شادی کی اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جنت کا حق دار ہے ؂

ہم سرسری طور پر اس امر کا تذکرہ کر چکے ہیں کہ کس طرح آنحضرتؐ عبادت کی رسمی پابندیوں کی سختی کو اس صورت میں کم کر دیتے تھے جب کوئی بچہ اس موقعہ پر اپنے بھولے پن اور ارادہ اور فطرت کی عطا کی ہوئی مراعات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپؐ کے پاس چلا آتا تھا۔ ابو قتادہ کے مطابق آپ نماز پڑھنے ہوتے تھے۔ اور ابی العث بن ابی کی بیٹی امامہ آپؐ کے کندھوں پر سوار ہوتی تھی جب آپؐ سجدہ میں جاتے تو اسے آہستہ سے زمین پر بٹھا دیتے اور سجدہ ختم کرنے پر اسے پھر اٹھا لیتے آپؐ کے قوی جثہ سے وہ معصوم ہاتھ کھیلا کرتے، وہ بے باکی اور آزادی سے شوخیاں کرتے اور آنحضرتؐ برابر مسکرایا کرتے۔ ایک مرتبہ خالد بن سعید کی ننھی بیٹی آپ کی پشت پر نشان نبوت سے کھیل رہی تھی۔ آپؐ نے بڑی مہربانی کے ساتھ اس کو ایسا کرنے کی اجازت دی اور اس کی اس معصوم شرارت میں مداخلت نہیں کی۔ آپؐ اپنے ننھے دوستوں کو زیادہ معزز لوگوں کی معیت میں حتیٰ کہ سلطنت کے ضروری کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود کبھی نہیں بھولتے تھے۔

ایک مرتبہ آپؐ کو ایک سیاہ چادر پیش کی گئی اور آپؐ نے ام خالد کو طلب کیا جو اس وقت اتنی چھوٹی تھی کہ اسے وہاں دراصل اٹھا کر لایا گیا تھا۔ جب بچی آپؐ کے پاس لائی گئی تو آپؐ نے پیار کے ساتھ اس کو چادر کے پھول بوٹوں کی طرف اشارہ کر کے متوجہ کیا اور "سانا" "سانا" کہہ کر پکارا (لفظ سانا کے معنی حبشی زبان میں خوبصورت کے ہیں) آپؐ نے یہ الفاظ اس لئے استعمال کئے کہ وہ بچی حبش میں پیدا ہوئی تھی اور صرف وہیں کی زبان سمجھتی تھی۔ بچی نے آپؐ کی مہر نبوت سے کھیلنا شروع کر دیا اس پر اس کے باپ نے اس کو سختی سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن آنحضرتؐ نے آپ سے درخواست کی کہ اسے ایسا کرنے سے نہ روکیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے ظہور پر عرب میں لڑکیوں کی زندگی پر سے حزن و افسردگی کے بادل چھٹ چکے تھے اور ہمارے پاس اس کے کافی ثبوت ہیں کہ لڑکیاں گانے گاتی تھیں۔ آلات موسیقی

؂ ابی داؤد

بجاتی تھیں۔ جھولا جھولتی تھیں۔ اور اس عہد کی دوسری لڑکیوں کی طرح گڑیاں کھیلتی تھیں اور اتنے ہی عجیب وغریب اور بے ہنگم کھلونے رکھتی تھیں جتنا کہ دنیا کے کسی اور ملک میں پائے جاتے تھے۔ آنحضرت کے زمانے میں عورتوں کو چلنے پھرنے کی آزادی آج کل کی کٹر مسلمان عورتوں کے مقابلے میں زیادہ تھی اور یہ قدرتی امر ہے کہ جو عورتیں سپاہیوں کے ساتھ میدان جنگ میں جاتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں ان کو کھیل کود اور جسمانی ورزش کا کافی موقعہ دیا جاتا ہوگا۔ تاکہ وہ خود کو اس مشقت طلب فرض کے لئے تیار رکھ سکیں۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے اپنی شادی کے شروع سالوں میں آنحضرتؐ کے ساتھ دوڑ کا مقابلہ کیا تھا اور وہ اس مقابلہ میں کامیاب بھی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کے بعد کے سالوں میں جب آپؐ نے ایک مرتبہ پھر آنحضرتؐ سے دوڑ کا مقابلہ کیا تو آپ اس مقابلہ میں ناکام رہیں۔ [1]

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی سالوں میں حضرت عائشہ رضؓ کا مکان لڑکیوں کے لئے تعلیم اور تفریح کا مرکز تھا جو بعد کو علماء اور داناؤں کا مقام اجتماع بن گیا تھا۔ آپ (حضرت عائشہؓ) کا لطف صحبت اور بچپن کے کھلونوں کا منظر کثیر تعداد میں ہمسایہ لڑکیوں کو آپ کے پاس کھینچ لاتا ہوگا جو آپ کی گفتگو اور تجربات سے مستفید ہوتی ہوں گی، جب وہ حضرت عائشہ رضؓ کے پاس بیٹھتی ہوں گی۔ اس وقت گھر میں مسرت سے لبریز زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہوگی۔ وہ اپنی ان تفریحات اور دلچسپیوں میں آنحضرتؐ کی موجودگی سے ڈرتی نہیں تھیں۔

حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ دو لڑکیاں آپ کے گھر میں جنگ بدر کے نغمات جنگ گا رہی تھیں کہ آنحضرتؐ آ گئے اور کچھ دیر کے لئے بستر پر لیٹ گئے۔ اتنے میں ابوبکرؓ موقعہ پر آ گئے اور انھوں نے لڑکیوں کو تنبیہ کی۔ اس پر آنحضرتؐ نے ان سے کہا کہ لڑکیوں کو اپنے حال پہ چھوڑ دیں، اور لڑکیاں تھوڑی دیر تک اور گاتی رہیں۔

حبشیوں کے ایک گروہ نے ایک مرتبہ عید کے روز جنگی کھیلوں (اور غالباً جنگ کے رقص کا بھی) کا انتظام کیا تھا۔ حضرت عائشہ رضؓ آنحضرتؐ کے پیچھے آپؐ کے کندھوں پر اپنی ٹھوڑی رکھے ہوئے

---

[1] ابی داؤد

عرطی تھیں اور آنحضرتؐ حوصلہ افزا الفاظ سے اُن (کھیل میں حصہ لینے والوں) کی ہمت بندھارہے تھے شارع عام پر اس قسم کے مظاہرے یقیناً عورتوں میں ضبط و نظم اور جسمانی مستعدی اور چستی کا جذبہ پیدا کرنے میں مدد دیتے ہوں گے۔

عورتوں کو (اس زمانے میں) لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ اور شفا بنت عبداللہ سے جو اس عہد کی ایک فاضل خاتون تھیں اور جن کے پاس آنحضرت اکثر جایا کرتے تھے، اور انھیں کے ہاں قیلولہ کیا کرتے تھے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ان کے پاس گئے اس وقت وہ شفا بنت عبداللہ حافصہ کے ساتھ تھیں۔ اس پر آنحضرت نے کہا تم حافصہ کو نامله (پہلو میں معمولی سوجن) کے علاج کے لئے منتر۔ افسوں کیوں نہیں سکھا دیتیں جس طرح تم نے انھیں لکھنا سکھایا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے معاملہ میں زیادہ مخصوص احکامات اور اعلیٰ ترصلوں کے دعدے کئے گئے تھے۔ لڑکوں کی تعلیم غالباً معاشرتی زندگی کا ایک معمولی جزو تھا۔ اور آں حضرت تعلیم نسواں کے زیادہ خواستگار تھے۔ اس لئے کہ اس زمانے میں اس کو معاشرتی اور تہذیبی سرگرمیوں کے دائرہ عمل میں سب سے زیادہ نظر انداز کیا جا رہا تھا۔

آنحضرتؐ کے صحابی بھی اپنی بیٹیوں کی تعلیم کی طرف سے اتنے ہی فکر مند تھے اور جابر رضؓ نے آنحضرت کے سامنے ایک مرتبہ بیان کیا کہ عبد اللہ اپنے پیچھے کم سن بچیوں کو چھوڑ مرے اور یہ کہ انھوں نے ان بچیوں کی تعلیم اور تربیت کے لئے ایک بیوہ سے شادی کی تھی۔

غلام لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں جن احادیث میں ہدایات دی گئی ہیں۔ ان سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ عورتوں کی تعلیم کا مقصد محض ان کے معاشری وقار کو بڑھانا نہیں تھا۔ بلکہ اس کی بنیاد عمومی طور پر انسانی قدر و قیمت پر شدید عقیدہ کی بنا پر دی گئی تھی۔

اسی کتاب میں غلاموں کے باب میں اس شخص کے لئے جو غلام لڑکی رکھتا ہے ہدایات ہیں۔ اس بتایا گیا ہے کہ اس (غلام لڑکی) کو کس طرح مثالی عادات و اطوار کی تعلیم و تربیت دینا چاہیئے۔ [1]

[1] بخاری ۔ باب دبیان غلامان

وزیر تعلیم پنجاب کا گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری میں ورود

عبدالحمید

چوہدری علی اکبرخاں وزیر تعلیم پنجاب افسرانِ ضلع وڈویژنل انسپکٹر مدارس ملتان اور رانا عبدالحمید خاں ایم-ایل-اے کی معیت میں ۱۱ر نومبر ۱۹۵۲ء کو ½ ۱۱ بجے صبح گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری میں تشریف لائے۔ آپ کی آمد پر گولے چلائے گئے۔ چوہدری احمد خاں بی۔ای۔ایس ہیڈ ماسٹر نے صاحب موصوف کو پھولوں کے ہار پہنائے۔ سکول رضا کار ٹروپ اور بینڈ نے سلامی دی اور قومی ترانہ گایا گیا۔

وزیر صاحب ماس ڈرل۔گروپ فینسی ڈرل۔اسکاؤٹ کیمپ۔اسکاؤٹ کرافٹ اور عبوری پل دیکھ کر خوش ہوئے۔ طلبا کی قابل تعریف کارکردگی کو سراہا اور ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ کے کام کی داد دی۔

بعد ازاں آپ مختلف جماعتوں کے کمروں میں تشریف لے گئے۔ کمروں کی دیواروں کو مناسب رموزوں اور دل کش نقشوں سے مزین دیکھ کر اظہار خوشنودی فرمایا۔ طلباء کے تفریحی مشغلوں یعنی ٹکٹوں۔ سکوں۔جھنڈوں اور تصاویر کے البم دیکھ کر محو حیرت ہو گئے اور طلباء کو شاباش دی۔

سکول ہال میں طلبا کی تقریریں سن کر محظوظ ہوئے۔معلومات عامہ کے کھیل کو جس کے ذریعے مرکزی اور صوبائی وزراء اور دیگر اعلیٰ افسران کے نام واضح کئے گئے تھے بہت پسند فرمایا۔ آخر میں سکول اسٹاف کے ساتھ فوٹو میں شمولیت فرمائی۔ اسکول وزٹ بک میں اسکول کی اعلیٰ کارکردگی پر ہیڈ ماسٹر صاحب کو مبارک باد دی ×

طالب علموں کی پسند

اویس احمد

بہت کم استادوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہو گی کہ طالب علم ان کے متعلق کس بات کو پسند کرتے ہیں اور کن باتوں کو ناپسند۔ دیانت داری اور محنت سے کام کرنے والے استاد عموماً یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کا کام سرگرمی اور دل سوزی کے ساتھ اپنا فرض ادا کئے جانا ہے اور بس۔ خواہ طالب علموں کو یہ بات پسند ہو یا نہ ہو۔ جو استاد بددلی اور لاپروائی سے کام کرنے کے عادی ہیں وہ اس عذر کی آڑ لیتے ہیں کہ طالب علموں کی پسند یا ناپسندیدگی کا خیال رکھنا اصولاً غلط ہے۔ بھلا طلبہ بھی کسی استاد سے خوش ہوئے ہیں؛ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ مدرسے میں آئیں اور چلے جائیں اور ان کی بجائے پڑھنے پڑھانے کا سارا کام استاد انجام دیں۔

انسان اگرچہ فطرت کے چہرے سے بہت سے نقاب اٹھا چکا ہے۔ اور اس طرح اس کی مادی قوت بہت بڑھ گئی ہے۔ لیکن معاشرتی تعلقات کے میدان میں ابھی اسے کئی ایک چھوٹی چھوٹی باتیں بھی معلوم نہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ فطرت کے بھیدوں کی ٹوہ لگانے کے لئے جس ہمت اور پامردی کی ضرورت ہے اس سے زیادہ حوصلہ خود اپنا دل ٹٹولنے کے لئے درکار ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی اور یا ہمی انسانی تعلقات کی پسماندگی نے آج انسان کو ایک ایسے نقطے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں وہ معاشرتی قوتوں سے زیادہ دیر آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج انسانی تعلقات کی ماہیت اور ان کی صحت مند نشو و نما کے متعلق مطالعے ہونے لگے ہیں۔ ہم نے غالباً ابھی اس سمت میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ لیکن ایسے مطالعوں کی ضرورت ناقابل انکار ہے۔

کسی استاد کے لئے اس سے بڑھ کر سبق آموز چیز شاید اور نہیں ہو گی کہ وہ اپنے متعلق

طالب علموں کے بے لاگ احساسات معلوم کرے۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے بعض اساتذہ اس تصور کو ہی ناپسند فرمائیں گے۔ ان کے نزدیک کوئی ایسی کوشش طلبہ کو شرارت پر ابھارنے کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں رکھتی لیکن یہ خیال خام طبعی کی ہی پیداوار ہو سکتا ہے۔ یہ سمجھنا اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہوگا کہ طالب علم استادوں کے متعلق کوئی رائے نہیں رکھتے۔ پہلی جماعت کے چھوٹے سے چھوٹے بچے بھی جب مدرسے میں دن گذارنے کے بعد گھروں کو واپس جاتے ہیں تو بھائی بہنوں اور ماں باپ کو اپنے دن کے تاثرات بتاتے ہیں۔ ان تاثرات میں استاد کی تدریس اور اس کے برتاؤ کو عموماً پہلی جگہ ملتی ہے جب استاد کے کام اور اس کے طور طریقوں پر اس کی پس پشت اس طرح بیسیوں محفلوں میں تنقید ہوتی رہتی ہے تو کیا یہ مناسب نہیں کہ وہ خود بھی اپنی تصویر کی ایک جھلک ان آئینوں میں دیکھ لے، یہ چیز تعلیمی اعتبار سے بھی فائدہ مند ہوگی اور اخلاقی لحاظ سے بھی۔

طالب علموں کی پسند اور ناپسندیدگی معلوم کرنے کا کام کچھ مشکل نہیں، ترقی یافتہ ملکوں میں بسا اوقات ایسا کیا جاتا ہے۔ اس کی آسان ترین صورت یہ ہے کہ استاد چند موزوں الفاظ میں مرتب شدہ سوالوں پر مشتمل ایک سوال نامہ تیار کرکے اس کی بہت سی نقلیں کروالے اور ہر ایک طالب علم کو ایک ایک نقل دے دی جائے۔ اگر ایسی نقلوں کے لئے سہولت میسر نہ آسکے تو طالب علموں کو یہ سوالات لکھوا دیئے جائیں۔ ہر سوال کے تحت میں زیادہ اغلب جوابوں کو ذیلی سرخیوں کی شکل میں درج کر دیا جائے۔ اس طرح رائے ظاہر کرنے کے لئے طالب علم کو صرف اتنا کرنا ہوگا کہ سوال کی ہر ذیلی سرخی پر نشان کر دے۔ یہ طریق بعد میں نتائج اخذ کرنے کے کام کو بہت سہل بنا دے گا۔ جب استاد ان اوراق کو جمع کرے تو اس کو صرف یہ کرنا ہوگا کہ ہر ذیلی سرخی پر دیئے گئے نشانوں کو گن لے۔

اس ضمن میں سب سے ضروری احتیاط یہ ہے کہ طلبہ کی رائے بے لاگ ہو۔ اگر کسی وجہ سے ایسا نہیں ہوتا تو ساری محنت کے ضائع جانے کا امکان ہے۔ بے لاگ رائے حاصل کرنے کی موثر تدبیر یہ ہے کہ طلبہ اپنے نام اوراق پر نہ لکھیں یعنی ان کے جوابات گم نام ہوں، چوں کہ ان

اوراق پر انھوں نے محض قلم یا پنسل سے نشان کئے ہیں۔ کوئی لفظ نہیں لکھا۔ اس لئے یہ خطرہ باقی نہیں رہتا کہ ان کا خط پہچان لیا جائے گا۔ ہمارے یہاں چوں کہ ایسے مطالعے اول اول اچنبھا معلوم دیں گے۔ اس لئے ضروری ہوگا کہ استاد زبانی بھی یہ وضاحت کردے کہ آزادانہ رائے کا اظہار کسی گزند کا باعث نہیں ہوگا۔

اس طریق کار کی وضاحت ایک عملی مثال سے ہو جائے گی، چند ہفتے ہوئے لاہور کے ایک بہت بڑے ثانوی مدرسے میں دسویں اور نویں جماعت کے کچھ طلبہ کو اس قسم کا ایک سوالنامہ دیا گیا جو حسب ذیل سوالات پر مشتمل تھا۔

(۱) اپنے موجودہ اور سابقہ اساتذہ میں سے آپ کس کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں ؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ

(ا) وہ قابل استاد ہیں۔ محنت اور دیانت داری سے پڑھاتے ہیں۔

(ب) بہت ہمدرد اور خوش خلق ہیں۔

(ج) بہت دین دار ہیں اور عملی اخلاقی سبق دیتے ہیں۔

(د) وہ کام کے سلسلے میں لاپروا ہیں۔ گپیں ہانک کر طلبہ کا جی خوش کرتے ہیں۔

(ہ) وہ ضرورت سے زیادہ نرم مزاج ہیں اور چشم پوشی کے عادی ہیں۔

(س) دیگر وجوہ (یہاں وجہ بیان کردی جائے)

(۲) اپنے موجودہ اور سابقہ استادوں میں سے آپ کو کون سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ :-

(ا) وہ آپ سے پڑھنے لکھنے کا زیادہ کام لیتے ہیں ؟

(ب) وہ اپنے کام میں باقاعدہ اور مستعد نہیں ؟

(ج) وہ بدزبان اور کج خلق ہیں اور پیٹتے ہیں۔

(د) وہ کاہل اور نالائق ہیں اور آپ سے کام نہیں لیتے۔

(۳) آپ کو ناجائز تنگ کرتے ۔ اور طرح طرح کے مطالبے کرتے رہتے ہیں

(س) دیگر وجوہ (یہاں وجہ بیان کردی جائے)

طلبہ کے جوابوں کا خلاصہ یہ ہے ۔

پہلا سوال ۔ ا ۸، ب ۷، ج ۳، د ۱، ۳ ۷، س کوئی دوسری وجہ نہیں دی گئی

دوسرا سوال ۔ ا ۷، ب ۱۰، ج ۱۷، د ۳۷، ۳ ۲، س ۔ ایک طالب علم نے ناپسندیدگی کی یہ وجہ بیان کی کہ ماسٹر صاحب مدرسے میں حقہ پیتے رہتے ہیں، دوسرے نے یہ کہ وہ لغات سے معانی دیکھ دیکھ کر پڑھاتے ہیں، دو طلبہ نے یہ وجہ دی کہ وہ دل لگی میں وقت ضائع کر دیتے ہیں۔

یہ تجزیہ از حد سبق آموز ہے، طالب علموں کی سب سے بڑی اکثریت یعنی ۸، طلبہ نے ایسے استاد کو پسند کیا جو اپنے مضمون پر حاوی ہو اور محنت اور باقاعدگی سے کام کرے، صرف ایک طالب علم نے ایسے استاد کو پسند کیا جو گپیوں اور دل لگی میں وقت کا بیشتر حصہ کاٹتا ہو۔

دوسرے سوال کے جواب میں سب سے زیادہ ناپسندیدگی ایسے استاد کے متعلق ظاہر کی گئی جو نہ خود قابل ہے اور نہ طالب علموں سے کام لیتا ہے، یہ امر قابل ذکر ہے کہ ناپسندیدگی کے معاملے میں بہت سے طلبہ نے اپنی رائے ظاہر نہیں کی۔

زیر نظر مطالعہ میں کوئی ایک سو طلبہ نے سوالنامے کا جواب دیا ۔ ان کے لئے یہ بالکل نئی چیز تھی، وقت کی کمی کی وجہ سے سوالنامے کی نقلیں نہ کرائی جا سکیں ۔ سوالات طلبہ کو لکھوا دیئے گئے اور انھوں نے جواب لکھ دیئے، ان دونوں باتوں نے بعض طالب علموں کو رائے ظاہر کرنے سے باز رکھا۔ اس کے باوجود نتائج سے ظاہر ہے کہ جوابات طلبہ کے عام خیالات کا ایک اچھا آئینہ ہیں، قارئین کی دلچسپی کے لئے ایک طالب علم کے جوابات کو نیچے نقل کیا جاتا ہے، یہ ورق باقی اوراق میں سے بلا تخصیص کھینچ لیا گیا ہے ۔

میں اپنے موجودہ استادوں میں سے ________ کو زیادہ پسند کرتا ہوں کیوں کہ وہ ہمیں بہت اچھا پڑھاتے ہیں جو ہمیں ذہن نشین ہو جاتا ہے، آج تک ہمیں جتنے استادوں سے

پڑھنے کا واسطہ پڑا ہے۔ ان میں سے ــــــــ کو میں سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں کیونکہ وہ بہت اچھا پڑھاتے ہیں۔ اور ہمارے اسکول میں ان جیسا کوئی ماسٹر نہیں۔"

موجودہ استادوں میں سے ــــــــ کو ہم بہت ناپسند کرتے ہیں، کیوں کہ وہ ہر وقت گپیں ہانکتے رہتے ہیں اور ایک ــــــــ (سبق) بیس بیس دن تک چلتا رہتا ہے۔

آج تک جن استادوں سے پڑھا ہے ان میں سب سے بُرا پڑھانے والے ــــــــ ہیں جن کو نہ تو پڑھانے کا طریقہ آتا ہے اور انگریزی کی کتاب کا ایک پیرا پڑھ کر آپ خود بخود مطلب کر دیتے ہیں اور نہ کچھ سمجھ میں آتا ہے۔"

اوپر کا اقتباس طالب علموں کی عام پسند اور ناپسندیدگی کا ایک اچھا نمونہ ہے، اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے انصافی ہوگی کہ طالب علم ایسے استاد کو پسند نہیں کرتے جو ان سے کام لے، ہاں کام لینے کے ڈھنگ میں فرق ہے، اگر استاد خود دل سوزی سے محنت نہیں کرتا اور فقط یہ چاہتا ہے کہ طالب علم ڈنڈے یا گالی گلوچ کے ڈر سے محنت کرتے جائیں تو وہ پسند نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر وہ اپنی خوش وقتی میں طلبہ کو بھی شریک کرنے کے خیال سے گپ شپ میں وقت کاٹنا چاہتا ہے تو بھی طالب علموں کی بہت بڑی اکثریت اسے ناپسند کرے گی، استاد کے پسند کئے جانے کی کارگر صورت یہ ہے کہ وہ خود دیانتداری اور ہمدردی سے کام کرے۔ یہ طریقہ اس امر کی ضمانت ہوگی کہ طالب علم بھی کام میں جی لگائیں۔

ان سطروں میں جس مطالعہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ بہت چھوٹے پیمانے پر کیا گیا، ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے مطالعوں کا عام رواج ہو۔ تاکہ استاد اپنے طالب علموں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں اور اپنی تدریس کو زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکیں، طالب علموں کی رائے معلوم کرنے کے بارے میں جھجک سے کام لینا ایک ایسی ظاہرداری ہے جو نہ جدید فلسفۂ تعلیم کا ساتھ دے سکتی ہے اور نہ دورِ حاضر کے تقاضوں کا۔ خوش گوار انسانی تعلقات آج دنیا کی منہ بولتی ضرورت ہے، یہ ضرورت ان ملکوں میں اور بھی زیادہ شدید ہے، جو ابھی قومی زندگی کے بچپنا میں ہیں۔

اور جن کے مختلف قومی عناصر کو ابھی یک رنگی اختیار کرنا باقی ہے۔ ہماری قومی زندگی میں ایسے ٹھوس عناصر کی کمی نہیں جو پائدار وحدت نگاہ پیدا کریں۔ لیکن ان کے ساتھ ہی ساتھ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں اختلاف پیدا کرنے والی ہیں۔ صحت مند انسانی تعلقات کی عدم موجودگی میں یہ چھوٹے چھوٹے اختلاف شک اور بدظنی کی ایسی گہری دھند پیدا کر سکتے ہیں، جو نیا دوں کو نگاہ سے اوجھل کر دے، حالیہ واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ خطرہ بالکل حقیقی ہے، اس کی روک تھام کی سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ آگے آنے والی نسلوں کو افہام و تفہیم کے طریقوں کی عملی تربیت دی جائے۔ سوال ناموں کے ذریعے طلبہ کو آزادانہ اظہار رائے کا موقع دینا اس تربیت کی ایک اچھی صورت ہے، یہ طریق اپنے اندر نہ صرف تعلیمی فوائد رکھتا ہے۔ بلکہ دور رس سیاسی فوائد بھی۔

مضمون نگاری

فضل الرحمان ناصر

جدید طرز کی آزمائشوں کے حامی ان کے بہت سے فائدے گنواتے ہیں لیکن اضلاع متحدہ امریکہ کے کالجوں میں جو مطالعے کئے گئے ہیں انھوں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ امتحان اور آزمائش کے یہ نئے طریق براہ راست طلبہ کی قوت تحریر پر اثر انداز ہوتے ہیں، ان آزمائشوں کے رواج سے پہلے کالج میں داخل ہونے والے ہر طالب علم کو اچھی طرح معلوم ہوا کرتا تھا کہ اگر وہ اپنے خیالات کو صاف قابل فہم زبان میں ادا نہیں کر سکے گا تو نصاب کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنا ممکن نہ ہوگا، جدید طرز کی آزمائشوں کے آتے ہی یہ بات ختم ہوگئی۔ اب طالب علم کے لئے ضروری واقفیت پر حاوی ہونا ہی کافی رہ گیا۔ نئی وضع کی آزمائشوں میں چند الفاظ اور ایک آدھ جملے سے ہی کام چلنے لگا، ان آزمائشوں کی عام مروجہ صورتیں غالباً سب کو معلوم ہیں۔ فقروں میں خالی جگہوں کو پُر کرنا۔ فقروں کے سامنے غلط یا درست کا نشان لگانا۔ کسی چیز کے متعلق بہت سے قریب المعنی بیانات میں سے ایک ایسے بیان پر نشان کرنا جو سب سے زیادہ حسب حال ہو وغیرہ وغیرہ۔ ان آزمائشوں کے عام اسلوب ہیں۔

جدید آزمائشوں کی مقبولیت کی بڑی وجہ ان کی سہولت ہے، یہ استاد اور طالب علم دونوں کے کام کو سہل بنا دیتی ہیں۔ اگر اکیلی سہولت ہی افادیت کا پیمانہ ہوتا تو جدید طرز کی آزمائشوں کو مضمون نگاری کے روایتی طریق پر ہمیشہ کے لئے فوقیت مل جاتی۔ لیکن عملاً ایسا نہیں ہوا عملی زندگی میں اکیلی واقفیت کام نہیں دیتی، اس واقفیت کو سادہ اور مؤثر پیرائے میں پیش کرنا بھی بالکل ایسا ہی ضروری ہے۔ جیسا اس کا فراہم کرنا۔ حال ہی میں امریکی کالجوں اور یونیورسٹیوں کو

صنعت کاروں اور کاروباری آدمیوں کی طرف سے بے شمار خطوط اس مطلب کے موصول ہوئے ہیں کہ ان کے فارغ التحصیل نوجوان طلبہ اور طالبات اکثر حالتوں میں قوت تحریر سے کورے ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات ان کے لکھے ہوئے خطوں کی زبان، ہجا، اوقاف اور زبان کی غلطیوں سے اس طرح بھری ہوتی ہے کہ ان کا مفہوم سمجھا نہیں جا سکتا۔

عوام کی ان شکایتوں سے چونکہ کر اب بہت سے امریکی کالجوں نے اپنے یہاں قوت تحریر کی تربیت اور ترقی کے لئے انتظامات کئے ہیں، جو مختلف ناموں سے موسوم ہیں۔ اکثر یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں یوں کیا گیا ہے کہ شعبۂ انگریزی اور دوسرے شعبوں کے کچھ استادوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی، جو ضرورت مند طلبہ کی مدد اور رہنمائی کرتی ہے، یہ مدد ایسے طلبہ کو ملتی ہے، جنہیں کوئی استاد ضرورت مند خیال کرے یا جو خود اپنے اندر قوت تحریر کی کمی کو محسوس کریں، عملہ کے جو ارکین یہ کام کرتے ہیں انھیں اس کے ساتھ تدریس کا دوسرا کام بھی کرنا ہوتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی کوششیں زیادہ تر محدود رہتی ہیں۔

حال ہی میں ایک امریکی ماہر تعلیم نے کچھ یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں اس مسئلہ کا مطالعہ کیا تھا۔ زیر مطالعہ اداروں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کیا کہ موجودہ انتظامات مضمون نگاری کی کمی کو پورا کرنے کے لئے کافی ہیں بعض نے اس بات کا اقرار کیا کہ محدود کوششوں کا ایک ناقابل انکار نتیجہ یہ ہے کہ تمام جماعتوں میں مضمون نگاری کی عام سطح اونچی ہو گئی ہے۔ ایک کالج نے اس امر کا فیصلہ کیا تھا کہ اس کے طالب علموں میں سے کوئی بھی اس وقت تک ڈگری کا حق دار نہیں سمجھا جائے گا جب تک وہ مضمون نگاری کی ایک مقررہ استعداد کو نہیں پہونچے گا، لیکن جب تک کچھ اور کالج اس تجربہ کو نہیں آزماتے اس وقت تک کسی عام نتیجے پر پہنچنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

ایک کالج کے شعبۂ انگریزی نے بیان کیا کہ اصلاحی نصاب کے رائج کرنے سے سال اول کے طالب علموں کی مضمون نگاری از خود بہتر ہو گئی ہے۔ کیوں کہ انھیں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے،

کہ اگر وہ اپنی کمی دور نہیں کریں گے تو انھیں آگے چل کر اصلاحی نصاب لینا پڑے گا۔

زیرِ مطالعہ تمام اداروں نے اس بات کا اقرار کیا کہ اعلیٰ جماعت کے طالب علموں کو تحریر کے اصلاحی نصاب میں حصہ لینے کی ضرورت ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ان میں سے اکثر نے یہ بھی کہا کہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے لئے یہ ممکن نہیں کہ اس قسم کی تربیت کا خاطر خواہ بندوبست کر سکیں ان کی رائے یہ تھی کہ جو طالب علم کالج میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتے ہوں انھیں چاہیئے کہ ثانوی جماعتوں میں قوت تحریر کی ترقی کی طرف توجہ دیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یا تو وہ کالج کے سال اول کے نصاب میں دو سال لگائیں اور یا نجی طور پر کوئی استاد رکھ کر اپنی کمی کو پورا کریں۔

چند ایک اداروں نے انگریزی پڑھنے لکھنے اور بولنے میں مہارت پیدا کرنے کے لئے خاص انتظامات کر رکھے ہیں۔ ایک ایسے ادارے نے بیان کیا کہ اس تربیت کا براہ راست نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب کل داخل ہونے والے طالب علموں میں سے ۵۰ فی صدی کامیاب ہو کر ڈگری حاصل کرنے لگے ہیں۔ پہلے یہ تناسب چالیس فی صدی سے بھی کم تھا۔

زیرِ مطالعہ تمام اداروں نے یہ امید ظاہر کی کہ ثانوی مدرسے اور غالباً ابتدائی مدرسے بھی بہت جلد اس ضمن میں اپنی ذمہ داری کو پہچانیں گے اور طالب علموں میں یہ استعداد پیدا کریں گے کہ وہ تحریر کے ذریعہ صاف طور پر اپنا مطلب ادا کر سکیں۔ اس وقت ثانوی اور ابتدائی مدرسے قرارت کے بارے میں جو توجہ دے رہے ہیں ویسی ہی توجہ مضمون نگاری کو بھی ملنی چاہیئے، امریکہ میں یہ احساس بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ موجودہ حالات میں جب ٹکنیکل پیشہ وروں تک کے لئے یہ ضروری سمجھا جانے لگا ہے کہ وہ صاف اور سادہ پیرائے میں اپنے خیالات کو لکھ یا بول کر ادا کر سکیں تو کالج اور یونی ورسٹی کے طلبہ کا اس ملکہ سے عاری رہنا کیوں کر روا ہے؛ اس کے جواب میں بہت سے طالب علموں نے صاف صاف کہا کہ ہماری تحریر و فصاحت کے اسی درجہ کو پہنچے گی جو نصاب میں کامیابی کے لئے اوسطاً ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اگر کالج یا یونی ورسٹی اس سے زیادہ اونچی سطح چاہتے ہیں تو استادوں کو

اس طرح کا تحریری کام کروانا چاہیئے اور جو طالب علم کسی قسم کی خاص دقت محسوس کریں ان کی کمی پورا کرنے کے لئے الگ انتظام ہونا چاہیئے۔

مطالعہ کے نتائج پاکستانی حالات کی روشنی میں

امریکی کالجوں اور یونیورسٹیوں کو جس مشکل کا سامنا ہے وہ دشواری ہمارے اعلیٰ تعلیمی اداروں کو بھی درپیش ہے۔ تعلیمی معیاروں کے عام طور پر پست ہو جانے کی شکایت ذمہ دار لوگوں کی زبانی ایک سے زائد بار سنی جا چکی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو شکوہ ہے کہ ثانوی مدارس طلبہ میں انگریزی سمجھنے۔ بولنے اور لکھنے کی اس قدر استعداد پیدا نہیں کرتے کہ وہ کالج میں داخل ہو کر استادوں کے لکچروں سے اچھی طرح استفادہ کر سکیں اور اپنے مطالعہ کے نتائج کو سادہ قابل فہم اور درست انگریزی میں کمرۂ امتحان میں بیٹھ کر لکھ سکیں۔ پچھلے دنوں لاہور میں ثانوی مدارس کے صدر معلمین کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس نے یہ بوجھ اپنے کندھوں سے یہ کہہ کر اتار دیا کہ ثانوی مدرسے انگریزی میں اچھی تحریر کا ملکہ کس طرح پیدا کریں جب ابتدائی مدرسے اردو میں بنیادی مہارتیں پیدا نہیں کرتے؟ ابتدائی مدرسوں کی طرف سے غالباً ابھی کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ لیکن یہ امر یقینی ہے کہ اگر انہیں کبھی مل بیٹھنے کا موقعہ ملا تو وہ بھی اپنے بچاؤ کے لئے کوئی نہ کوئی عذر ڈھونڈ لیں گے۔

لیکن کیا اس طرح یہ پیچیدہ سوال حل ہو سکے گا؟ تعلیمی معیاروں کا دن بدن گرنا ایک ایسی حقیقت ہے جو سب تسلیم کرتے ہیں۔ قومی زندگی میں اس کے نقصان دہ اثرات سے بھی کسی کو انکار نہیں۔ البتہ اسباب متعین کرنے میں اب تک اسی قدر ہوا ہے کہ ایک فریق نے دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرایا اور دوسرے نے تیسرے کو۔ اس طرح ہر الزام دھرنے والا خود اپنی جگہ شاید مطمئن ہو گیا ہو۔ لیکن مسئلہ جوں کا توں موجود ہے۔ اگر تمام تعلیمی مدارج کے کچھ بالغ نظر نمائندے مل کر اس سوال کی چھان بین کریں تو ایسے مطالعہ کے نتائج شاید ایک قابل عمل حل ڈھونڈ سکیں۔

تعلیمی طور پر یہ بات مسلم ہے کہ قوت اظہار تحصیل علم کے لئے بنیادی درجہ رکھتی ہے۔ بعض

ماہرین نفسیات نے بجا طور پر اس نکتے پر زور دیا ہے کہ خیالات اور الفاظ ایک ہی نفسیاتی کیفیت کے دو رخ ہیں۔ جو شخص سلجھے ہوئے الفاظ میں اپنا مطلب ادا نہیں کر سکتا اس کے متعلق یہ یقین کیوں کر ہو کہ اس کے خیالات سلجھے ہوئے ہیں؛ زبان کی یہی بنیادی حیثیت پڑھنے لکھنے کی استعداد کو خواندگی کا کم از کم معیار قرار دیتی ہے۔ اور اسے ابتدائی مدارس کی توجہ کا مرکز بناتی ہے۔ جو طالب علم اعلیٰ تعلیم کی خواہش کرے گا اس کو لازمی طور پر بلند درجہ کی قوت اظہار پیدا کرنی ہو گی۔ ہمارے ہاں اس بنیادی مہارت کے تنزل کی وجہ جدید وضع کی آزمائشوں کا رواج نہیں بلکہ مدارس میں طلبا کی بھرمار ہے۔ زیادہ دیر کی بات نہیں کہ صرف چیدہ چیدہ گھرانوں کے بچے مدرسوں میں آتے تھے تعداد کی کمی اور موزوں گھریلو ماحول اس بات کی ضمانت تھے کہ اوسطاً ہر طالب علم اچھے درجے کی لسانی مہارتیں پیدا کرے۔ آج یہ دونوں موافق اسباب غائب ہیں۔ تعلیم کا چرچا پھیلنے سے اب نہ صرف طلبا کی تعداد بے تحاشہ بڑھ گئی ہے۔ بلکہ ان کی اکثریت ایسے گھریلو ماحول سے آتی ہے جو مدرسے کے اثرات کو مٹانے والا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر اوسط طالب علم میں قابل قبول لسانی مہارتیں پیدا کرنا مقصود ہے تو نہ صرف کمرہ جماعت میں تعداد طلبہ کو گھٹانا پڑے گا۔ بلکہ خاص طور پر پسماندہ طالب علموں کی پڑھائی اور لکھائی کو مطلوبہ سطح پر لانے کے لئے علیحدہ اصلاحی نصابوں کا بندوبست بھی کرنا ہوگا۔ ابتدائی جماعتوں میں یہ اصلاحی نصاب صرف پڑھائی کے لئے ضروری ہوں گے۔ لیکن ثانوی جماعتوں اور کالج میں ان کی زیادہ توجہ مضمون نگاری کی استعداد کی تربیت پر مبذول ہونی چاہئے۔

امیل
یا
روسو کی تعلیم

مسلسل نمبر ۲۷

توفیر مرزا رزقی

میں ان صحبتوں، عیاریوں جرائم اور رسوائیوں کا کوئی ذکر نہیں کروں گا جو ایسی زندگی کے لوازمات میں داخل ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ دنیا کا تجربہ اس زندگی سے ہمیں بیزار کر دیتا ہے میں تو اس وقت صرف اندھی جوانی کی عام خامیوں کا ذکر کر رہا ہوں۔

یہ نوجوان اب تک اپنے خاندان والوں اور دوستوں ہی سے گھرا رہتا تھا اور ان کے فکر و خیال کا ایک مرکز واحد بنا ہوا تھا اب دفعتًا اس کا ایک ایسے خطے میں داخل ہو جانا جہاں کہ اس کی کوئی گنتی ہی نہیں، ایک عجیب و غریب تغیر پیدا کر دیتا ہے، جو شخص ایک زمانہ تک اپنا مرکز خود آپ ہی بنا رہا ہو اس کا اپنے آپ کو ایک بالکل مخالف فضا میں پانا کس قدر انوکھا انقلاب ہے۔ ذاتی اہمیت کے ان تخیلات کو جو گھر والوں میں رہنے کے دوران میں ذہن نشین ہو کر قوت پکڑ لیتے ہیں، اغیار کی صحبتوں میں فراموش کرنے کے قبل کیا کیا ذلتیں اور رسوائیاں سہنی ضروری نہ ہوں گی؛ بچے کی حیثیت سے ہر شے اس کی مطیع اور ہر شخص اس کا پروانہ بنا ہوا تھا لیکن ایک نوجوان کی حیثیت سے خود اسی کو الٹا ہر شخص کا ادب و لحاظ کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ یا اگر وہ اپنی سابقہ روش کے ذرا سے خیال کو بھی محفوظ رکھتا ہے تو اسے کس قدر سخت سبق کے ذریعہ اس کی اصلیت یاد دلائی جاتی ہے، اپنی ساری خواہشوں کو باسانی پورا کرنے کا عادی ہو جانے کی وجہ سے اس کی خواہشوں میں بہت اضافہ ہو گیا ہے، اس لئے اب وہ تنگی اور

تکلیف بہم محسوس کرتا رہتا ہے۔ وہ ہر خوشامدانہ بات کی ترغیب میں آجاتا ہے بس جو چیز دوسروں کے پاس ہو وہ اس کے پاس بھی ہونی چاہیئے، وہ ہر چیز کو دیکھ کر اس کی حرص کرنے لگتا ہے۔ ہر شخص سے حسد رکھتا ہے اور ہمیشہ سب کا حاکم بننا چاہتا ہے، تکبر اور نمود اسے نگل جاتے، اس کا ذخیرہ دل ماسوا کے درمیان جذبات حقارت اور رقابت سے بھڑک اٹھتا ہے اور یہ تمام شدید جذبات ایک دم ہی سے پھوٹ پڑتے ہیں۔ اور دنیا کے کاروبار میں ان کا ڈنک اس بچے کے دل میں کھٹکتا رہتا ہے۔ بوقت شب یہ جذبات اس کے ساتھ ہی ساتھ لوٹتے ہیں اور وہ اپنی ذات اور دوسروں سے غیر مطمئن گھر واپس لوٹتا ہے اور ہزاروں بے ہودہ تدبیروں کے ہجوم میں جنھیں ہزاروں خیالی تصورات متاثر کرتے رہتے ہیں آکر سو جاتا ہے خواب میں بھی اس کا تکبر اور نخوت اسے وہی خیالی مسرتیں اور خوشیاں دکھاتا رہتا ہے، اور اسے ہر ایک ایسی خواہش ایذا دیتی اور پریشان کرتی رہتی ہے جسے کہ وہ کبھی پورا نہیں کر سکتا ہے۔ یہ تو آپ کا شاگرد تھا، اب میرے شاگرد کی طرف توجہ فرمائیے۔

اگر امیل کو سب سے پہلے متوجہ کرنے والی کوئی رنجیدہ چیز ہو گی تو خودی کی طرف مراجعت کرنے کا پہلا احساس اس کی خوشی اور فرحت ہو گا، جب وہ دیکھے گا کہ اس نے کتنی بلاؤں اور آفتوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے تو وہ خود کو توقع سے زیادہ خوش حال اور آسودہ پائے گا۔ اپنے ابنائے جنس کی مصیبتوں میں وہ ان کا شریک ہو گا، اس لئے وہ اس شرکت میں لطف حاصل کرے گا۔ امیل ان جذبات خدا ترسی سے جو کہ وہ لوگوں کی مصیبتوں میں محسوس کرتا ہے، اور ان مصائب سے خود محفوظ رہنے کی خوشی یعنی دونوں سے بیک وقت حظ حاصل کرے گا۔ وہ اپنی ذات کے اندر اس قوت کو محسوس کرتا ہے جو ہمیں ہماری ذات کے باہر وسعت دیتی ہے اور ہماری خیر خواہی کی زائد قوتِ عمل کو کسی اور کام میں استعمال کرنے کی ہدایت دیتی ہے دوسروں کے دکھ درد کا غم خوار بننے کے لئے ہمیں ان دکھ دردوں سے واقف ہونا تو بلاشک لازم ہے لیکن انھیں محسوس کرنا ضروری نہیں ہے، اگر ہم مصیبت جھیل چکے ہیں یا مصیبت

اٹھانے کا ہمیں خوف ہوتا ہے۔ تب ہی ہم مصیبت زدوں پر رحم و ترس کھاتے ہیں، لیکن جب ہم خود ہی گرفتار بلا ہو جاتے ہیں تو پھر سوائے اپنے اور کسی پر ہم ترس نہیں کھاتے ہیں لیکن اگر ہم سب زندگی کے مصائب کے خود تابع ہونے کی وجہ سے دوسروں کے لئے محض اس حِس سے کام لیتے ہیں جس کی کہ فی الواقعی ہمیں خود ضرورت نہ رہی ہو تو اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ رحم ایک نہایت ہی پرلطف احساس ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ ہمارا نمائندہ ہوتا ہے اور اس کے برخلاف ایک سنگدل شخص ہمیشہ بدنصیب رہتا ہے، اس لئے کہ اس کی قلبی حالت دوسروں کے مصائب و آلام میں استعمال کرنے کے لئے اس میں کسی قسم کی زائد حِس کو باقی نہیں چھوڑتی ہے۔

خوش حالی کے متعلق ہم ظاہری صورتوں پر فیصلہ دینے کی طرف بہت زیادہ مائل رہتے ہیں اور فرض کر لیتے ہیں کہ خوشحالی نہایت ہی غیر متوقع مقامات پر میسر آسکتی ہے، اس لئے اس کی تلاش ایسے مقامات پر کرتے ہیں جہاں اس کا وجود ہی غیر ممکن ہوتا ہے۔ جشن و جلوس اس کے وجود کی بہت ہی مشتبہ علامتیں ہیں۔ ایک ہنس مکھ آدمی اکثر ایک ایسا بدبخت انسان ہوتا ہے جو دوسروں کو فریب اور اپنے آپ کو لاابالی اور مساوات میں ڈالے رکھنے کا کوشاں رہتا ہے، جو لوگ کلب میں زندہ دل۔ یا اباش اور قانع نظر آتے ہیں اپنے مکانوں میں تقریباً ہمیشہ افسردہ اور کڑکڑاتے رہتے ہیں اور اس تفریح کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ حقیقی قناعت نہ تفریحوں اور دل لگیوں میں ہوتی ہے اور نہ شور و غل اور اژدہام میں، ایک ایسے شیریں جذبے سے ہم بدگمان رہتے ہیں اور جب ہم اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو اسی کے خیال میں مست رہتے ہیں۔ ہم قناعت سے اس خوف کے باعث خوش رہتے ہیں کہ مبادا کہیں وہ ہمارے ہاتھ سے نہ نکل جائے حقیقتاً ایک خوش حال انسان باتیں بھی کم کرتا ہے اور ہنستا بھی کم ہے۔ بقول شخصے اپنی خوش حالی کو وہ دل ہی دل میں چھپائے رکھتا ہے، محشر انگیز کھیل تماشے اور خوشیوں کے شدید مظاہرے مایوسیوں کو ضرور پوشیدہ کر دیتے ہیں، لیکن پژمردگی عیش و عشرت کی سہیلی ہوتی ہے، آنسو اور

غم گساری ہماری شیریں ترین تفریحوں کے معاجین ہوتے ہیں اور عظیم الشان تقاریب ہنسی خوشی کے بجائے زیادہ تر آنسوؤں ہی کی دعوت دیتی ہیں۔ ہماری تفریحوں کی تعداد اور ان کی نوعتیں گو ابتدائً ہماری خوش حالیوں میں اضافہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور ہماری پرسکون اور خاموش زندگی کا دور بھی گو اسی طرح شروع شروع میں کٹھن اور پرصعوبت معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر ہم زیادہ غور سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ دل کی خوش گوار ترین عبادت ایک ایسے معتدل لطف کو حاصل کرنا ہوتی ہے جس میں کہ رغبت اور کراہیت کی بہت ہی خفیف گنجائش ہو۔ جذبات کی بے قراری تجسس اور تذبذب پیدا کر دیتی ہے اور ہنگامہ خیز خوشیوں کا کھوکھلاپن تکان پیدا کر دیتا ہے، جب کہ اپنی حالت موجودہ سے زیادہ پرلطف ہم کوئی اور چیز نہیں پاتے تو اس حالت سے ہم کبھی درماندہ نہیں ہوتے ہیں۔ اوروں کی نسبت وحشیوں کو تلاش جستجو اور اکتائے کی بہت ہی کم تکالیف محسوس ہوتی ہے، ان کے لئے ہر چیز مساوی حیثیت رکھتی ہے، ان کی ذات کے لئے مقبوضات کے نہیں۔ اور وہ کبھی نہیں تھکتے ہیں۔

دنیا دار انسان ہمیشہ نقاب پوش رہتا ہے، وہ اپنی اصلی صورت میں کبھی بہ مشکل ہی دکھائی دیتا ہے اس لئے وہ خود اپنی شخصیت تک سے بھی اجنبی ہی رہتا ہے، اور جب کبھی اسے اپنی اصلی حالت پر لوٹنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے تو وہ بڑا بے چین اور مضطرب ہو جاتا ہے، اسے یہ فکر کبھی نہیں ہوتی ہے کہ وہ کیا ہے بلکہ اسے ساری فکر یہ رہتی ہے کہ وہ کیا معلوم ہوتا ہے۔

اس نوجوان کے چہرے میں (جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے) میں ایک غیر معین لیکن ناگوار بے حیائی اور تصنع کا ایک ایسا تصور قائم کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں جو ایک سادہ لوح انسان کے لئے نہایت مکروہ اور پرحقارت ہوتا ہے۔ مگر میرے شاگرد کے چہرے پر ایک ایسی جاذبیت اور سادگی ٹپکتی ہے جو اس کے دلی سکون اور حقیقی قناعت کو ظاہر کرتی ہے ایک ایسی علامت ہے جو لوگوں کے دلوں میں احترام اور اعتماد پیدا کرتی ہے اور صرف دوستانہ تعلقات کے قیام کی منتظر معلوم ہوتی ہے، تاکہ اپنے ذاتی اعتماد سے لوگوں کو ماجور کر سکے، خیال کیا جاتا ہے کہ چہرے کی

علامتیں محض قدرت کے بنائے ہوئے بعض نقوش کا اظہار کرتی ہیں، میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایک آدمی کا چہرہ اس مظاہرہ سے کہیں بڑھ کر بالکل نادانستہ طور پر انسانی قلب کی بعض موجوں اور الفتوں کے معمولی اور مبہم اثرات کے مطابق تشکیل پاتا ہے، یہ موجیں چہرے پر نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ اور ان سے زیادہ بادثوق اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی ہے، اور جب وہ عام ہو جاتی ہیں، یعنی جب ان کی عادت ہو جاتی ہے۔ تو ان کا لازوال نشانات یا علامتیں چھوڑ جانا یقیناً ضروری ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے جو میں کہتا ہوں کہ انسان کا چلن اور خصلت اس کے چہرے پر لکھی ہوئی ہوتی ہے، اور یہ کہ بعض اوقات ہم ایک دوسرے کی حالتوں کی پُراسرار تشریحات ان قوتوں میں تلاش کئے بغیر معلوم کر سکتے ہیں جو ہمارے قابو میں نہیں ہوتی ہیں۔

ایک بچے میں دو ہی قابل امتیاز احساس ہوتے ہیں خوشی اور رنج، وہ ہنستا ہے یا روتا ہے، اور وہ کسی درمیانی احساس سے واقف نہیں ہوتا ہے، اس لئے وہ مستقلاً ایک انتہا سے دوسری انتہا تک گنتی لگاتا رہتا ہے۔ ان متواتر تغیرات کی وجہ سے اس کے چہرے پر کوئی پائدار اثر نمایاں نہیں ہونے پاتا، اور نہ کوئی علامت رونما ہوتی ہے، لیکن جب وہ بڑا ہو کر زیادہ ذی حس بن جاتا ہے تو اس کے احساس بھی زیادہ شدید اور پائدار ہو جاتے ہیں۔ اور یہ گہرے اثرات اس کے چہرے پر ایسے نشانات ثبت کر دیتے ہیں جن کا مٹنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اور روزمرہ کی کیفیت خط و خال اور پیشانی پر ایسے اثرات ڈالتی رہتی ہے جو ایک خاص مدت کے بعد اٹل اور پختہ ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی ایسے آدمیوں میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی جن کے چہروں کی علامتیں ان کی عمر کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں۔

میں ایسے چند آدمیوں سے مل چکا ہوں، اور میں نے جب ان لوگوں کا مشاہدہ کیا اور دیکھ بھال کی تو ہمیشہ یہی دیکھا کہ انھوں نے اپنا معمولی مزاج تک بدل دیا تھا، میرا یہ بالکلیہ معتقدانہ اور قطعی مشاہدہ مجھے قطعاً بعض معلوم ہوتا ہے اور ایک تعلیمی مقالہ میں جہاں یہ ایک اہم معاملہ ہے کہ ہم قلبی احساسوں کو بیرونی علامتوں کے ذریعے جانچنا سیکھیں، مجھے اس کا ذکر بے محل

معلوم نہیں ہوتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ ہمارا میرا نوجوان آدمی روایاتی اطوار کی نقل اور ایسے جذبات کی تصنع نہ کرنا سیکھنے کی وجہ سے جو ذاتی نہ ہوں کم ہر دل عزیز رہے گا، فی الحال مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ وہ زیادہ مونس و غمخوار ہوگا۔ اور مجھے یہ باور کرنا بہت دشوار معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اپنے نفس کے سوا کسی کی پرواہ نہیں کرتا ہے وہ اپنے حقیقی احساسات کو اس قدر چھپا سکتا ہے کہ اپنے آپ کو اتنی ہی مستعدی کے ساتھ خوش رکھ سکتا ہو جتنی مستعدی کے ساتھ وہ تشخص حاصل کرتا رہتا ہے، لیکن خوشی کے اس احساس کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ اپنے معقول ناظرین کی رہنمائی کرنے اور یہ دکھانے کے لئے کہ میں نے کہیں اپنی تردید نہیں کی ہے۔ میں پہلے ہی کافی عرض کر چکا ہوں۔

اب میں پھر اپنے طریقۂ تعلیم کی طرف واپس ہوتا ہوں اور یہ عرض کرتا ہوں کہ جب نازک وقت آ پہنچے تو اپنے نوجوانوں کے روبرو ایسے مناظر پیش کیجیے جو انھیں جوش دلانے کی نسبت زیادہ تر مانع ہوں، ان کے ابھرتے ہوئے تصور کو ایسے مشاغل میں لگا دیجیے جو ان کے حواسوں کو بھڑکانا تو درکنار ان کے عمل ہی کو روک دیں، انھیں ان بڑے شہروں سے علیحدہ کر دیجیے۔ جہاں شوخ اور بھڑک دار پوشاک اور عورتوں کی دیدہ دلیری فطری تعلیم میں سرعت اور تقدیم پیدا کر دیتی ہے اور جہاں ان کی نظر کے سامنے ہر شے عیش و طرب کا ایک ایسا سماں باندھ دیتی ہے جس کے متعلق اس عمر تک انھیں کچھ بھی نہ جاننا چاہیے، جب تک کہ وہ خود اپنے لئے انتخاب کرنے کے لائق نہ ہو جائیں۔ انھیں آپ ان کے ان ابتدائی گھروں میں لے آئیں جہاں دیہاتی زندگی ان کی عمر کے جذبات کو زیادہ آہستہ آہستہ نشو و نما پانے کی اجازت دیتی ہے، یا اگر کسی صنعت و حرفت کا شوق انھیں شہر میں رہنے پر مجبور کرتا ہے تو اس شوق ہی کے ذریعہ آپ ایک جھلک اور خطرناک بیکاری سے انھیں محفوظ کر دیں، ان کی صحبت ان کے مشاغل اور ان کی تفریحات کا انتخاب نہایت احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ فرمائیے، انھیں ایسی پاک اور پُر درد تصاویر کے سوا جو دلکش

تو ہوں لیکن شہوت انگیز نہ ہوں کوئی اور چیز نہ دکھائیے۔ اور ان کے حواسوں کو گرمائیے بغیر ان کی حس کو قوت پہنچائیے۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ شدت یا زیادتی کا خطرہ کسی ایک مقام پر محدود نہیں ہوتا ہے۔ اور یہ کہ غیر معتدل جذبات ہمیشہ ناقابل تلافی نقصان پہونچاتے ہیں، خود آپ کو اپنے شاگرد کے لئے ایک بیمار کی دایا یا ایک رحم کا پتلا بنانے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ رنج ومحن کا مستقل منظر دکھا کر اسے پریشان کرنے کی ضرورت ہے، اور نہ آپ کو اسے ایک ہسپتال سے دوسرے ہسپتال لے جانے کی ضرورت ہے، اور نہ پھانسی گھر سے جیل خانے لے جانے کی ضرورت ہے۔ انسانی مصائب کے مناظر سے اسے رقیق القلب بنانا ہے شفقی القلب نہیں، جب ہم ایک منظر کو دیکھ چکتے ہیں تو وہ منظر ہمیں پھر متاثر نہیں کرتا۔ عادت فطرت ثانیہ ہو جاتی ہے۔ جو چیز ہمیشہ ہماری نگاہ کے روبرو رہتی ہے وہ پھر ہمارے تصور کو متاثر نہیں کرتی ہے، اور صرف تصور ہی کے ذریعہ ہم دوسروں کے رنج والم کو محسوس کر سکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ پادری۔ مولوی۔ پنڈت اور ڈاکٹر، حکیم جو موت اور لوگوں کے مصائب کو ہمیشہ دیکھتے رہتے ہیں بے حد سنگ دل ہو جاتے ہیں۔ پس اپنے شاگرد کو آدمی کی تقدیر اور ہم جنسوں کی تکلیف سے تھوڑا بہت واقف تو ہو جانے دیجئے، لیکن اسے ان تکالیف کو بار بار نہ دیکھنے دیجئے۔ فقط ایک ہی چیز بشرطیکہ ہوشیاری کے ساتھ منتخب کی گئی ہو اگر صحیح وقت پر دکھا دی جائے تو وہ اسے رحم اور ترس سے لبریز کردے گی اور ایک ماہ تک سوچ اور فکر میں ڈالے رکھے گی، کسی شے کے متعلق رائے کا انحصار اتنا اس چیز پر نہیں ہوتا جسے وہ دیکھتا ہے، بلکہ اس معاملہ پر ہوتا ہے کہ وہ چیز پلٹ کر اس پر کیا عمل کرتی ہے اور اس پر کسی شے کے دائمی نقش کا انحصار اس نقطۂ خیال کی نسبت جس سے کہ وہ اس شے کو دیکھتا ہے اس شے پر کم ہوتا ہے۔ پس اس طرح تمثیل۔ اسباق اور تصاویر کو کبھی کبھار استعمال کر کے آپ حس کا ڈنگ کند کر دیں اور قدرت ہی کی اقتدا کرتے ہوئے فطرت کو تعویق میں ڈال دیں۔

جب وہ کوئی علم حاصل کرتا ہو تو آپ یہ امتیاز کیجئے کہ وہ اس علم سے کون سے تخیلات معلق کرے گا اور جب اس کے جذبات بیدار ہوں تو آپ ایسے مناظر انتخاب فرمائیے جو ان جذبات کو دبانے کی

قدرت رکھتے ہوں۔ ایک آزمودہ کار شخص نے جو اپنے چال چلن میں بھی اتنا ہی ممتاز تھا جتنا بہادری میں، ایک مرتبہ مجھ سے بیان کیا کہ آغاز جوانی میں اس کے باپ نے جو ایک معقول لیکن اشد مذہبی آدمی تھا یہ مشاہدہ کیا کہ وہ خود اپنی ابھرتی ہوئی حس کے باعث عورتوں کی طرف کھنچتا تھا۔ پس اس نے آزمودہ کار کو اس سے باز رکھنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ لیکن بالآخر اس کی تمام احتیاطوں کے باوجود بھی جب اس کا بیٹا (آزمودہ کار) اس کے قابو کے باہر ہونے ہی والا تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کو ایک ہسپتال میں لے جانے کی ٹھان لی اور اپنے بیٹے کو کسی چیز سے آگاہ کئے بغیر وہ اسے اس کمرہ میں لے گیا جہاں بدبخت لوگوں کی ایک تعداد جو خوفناک بیماریوں کے تحت اپنی ان بدافعالیوں کا خمیازہ بھگت رہی تھی جنھوں نے انھیں یہ دن دکھایا تھا۔ اس ڈراؤنے اور گھناؤنے منظر نے نوجوان آدمی (آزمودہ کار) کو بیمار ڈال دیا تھا۔ پھر اس کے باپ نے خفگی کے لہجہ میں بیٹے سے خطاب کیا۔

"بدنصیب خودسر جا اور اپنے ناپاک اور نجس ارمان نکال۔ اس وارڈ میں داخل ہو اور ان ذلیل اور خبیث ترین مصیبتوں کا شکار ہونے کی تجھے ہی مسرت نصیب ہو جائے گی اور تو اپنے باپ کو مجبور کر دے گا کہ وہ تیری وفات پر خدا کا شکر گذار ہو۔"

اس پرتاثیر منظر کے ساتھ جو اس نے دیکھا ان چند الفاظ نے نوجوان پر ایسا اثر کیا جو مٹائے نہ مٹ سکتا تھا، پیشے کے باعث اپنی جوانی فوجی پارک میں گذارنے پر مجبور ہونے کی وجہ سے اس نے اپنے ساتھیوں کی بداعمالیوں میں شرکت کرنے کی بجائے ان کے مضحکے اور فقروں کا نشانہ بدف بننے کو ترجیح دی۔ اس کارآزمودہ نے مجھ سے بیان کیا۔ "میں ایک آدمی تھا، اور مجھ میں ذاتی کمزوریاں موجود تھیں، لیکن آج بھی ایک فاحشہ عورت کی صورت مجھ میں لرزہ پیدا کر دیتی ہے"۔

پس آپ بھی اپنے شاگرد کو زبان سے تھوڑا ہی کہیں۔ لیکن وقت مقام اور لوگوں کو منتخب فرما کر اپنی تعلیم کے لئے مادی مثالوں پر اکتفا فرمائیے، اور پورا پورا بھروسہ رکھئے کہ وہ ضرور اثر پذیر ہو گی۔

بچپن جس طریق پر گذرتا ہے۔ اس کی کوئی بڑی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ بدی جو نمودار ہو سکتی ہے وہ لاعلاج نہیں ہوتی اور بھلائی جو پیدا ہو سکتی ہے مابعد وہ ظاہر ہو سکتی ہے۔ لیکن ان ابتدائی سالوں میں جب کہ ایک نوجوان حقیقی زندگی بسر کرنا شروع کرتا ہے، ایسا نہیں ہوتا، یہ وقت ان امور کے لئے جو اس میں ہونے چاہئیں کبھی کافی نہیں ہوتا، اور اس کی اہمیت غیر متزلزل اور متواتر توجہ کی طالب رہتی ہے، اسی وجہ سے میں اس دور کو دراز کرنے کے فن پر اس قدر زور دے رہا ہوں، عمدہ کاشت کاری کا ایک بہترین اصول یہ ہے کہ چیزوں کو جس قدر ممکن ہو سکے موخر رکھے۔ آپ کی ترقی بھی مدہم اور باوثوق ہونی چاہیے، نوجوان کو ایک دم آدمی بن جانے سے باز رکھئے جب کہ جسم نمو پر ہوتا ہے اس وقت وہ خاصتیں جو خون کو قوت پہونچانے اور رگ پٹھوں کو مضبوط کرنے کے لئے مقدر ہوئی ہیں اپنی تشکیل اور تکمیل کے عمل میں رہتی ہیں، اگر آپ ان خاصیتوں کو دوسری طرف رجوع کر دیں اور اس طاقت کو جسے ایک انسان کی تکمیل میں صرف ہونا چاہیے ایک دوسرے انسان بنانے میں صرف ہونے کی اجازت دے دیں تو دونوں ہی کم زور رہ جائیں گے اور قدرت کا کام ادھورا رہ جائے گا، اس تغیر سے ذہنی عمل بھی متاثر ہو جاتا ہے اور ذہن بھی جسم ہی کی مانند پژمردگی اور نقاہت کے ساتھ کام کرنے لگتا ہے۔ اعضا کی درازی اور طاقت دلیری یا ذکاوت کے مانند مساوی چیزیں نہیں ہیں اور میں یہ مانتا ہوں کہ ہر دو کے مابین انتصال کے ذرائع اگر ناقص ہوں تو ذہنی قوت جسمانی قوتوں کا ہمیشہ ساتھ نہیں دیتی ہے۔ لیکن وہ ذرائع کتنی عمدگی کے ساتھ تربیت کیوں نہ دیئے گئے ہوں، ہمیشہ نقاہت اور ناتوانی کے ساتھ کام کریں گے۔ بشرطیکہ وہ دونوں قوتیں قوت ارادہ کے لئے اس صرف شدہ اللاس زدہ خون کی سرمایہ ہی کی محتاج ہوں۔ جو اس مادے ہی سے محروم ہو چکا ہو، جو انسانی کل کے تمام پرزوں کو طاقت اور لچک بخشتا ہے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں جن کی کمش زندگی کا آغاز اولین موقع سے ہی ہو جاتا ہے، ذہنی قوت ایسے لوگوں کے اندر زیادہ دیکھنے میں آتی ہے، جن کی نوجوانی کے ابتدائی سال قبل از وقت بدافعالیوں سے محفوظ رہے ہوں اور وہ بلاشک و شبہ اسی باعث وہ اقوام جن کے اخلاق پاکیزہ ہوتے ہیں

عموماً ان اقوام کی نسبت ذکاوت اور دلیری میں اعلیٰ ہوتی ہیں جن کے اخلاق خراب ہوتے ہیں۔ آخر الذکر اقوام محض ادنیٰ اور معمولی خاصیتوں میں ممتاز ہوتی ہیں جنھیں وہ بصیرت، عقل مندی اور چالاکی (مکاری) کے نام سے موسوم کرتی ہیں، لیکن نیکی اور معقولیت کی وہ اعلیٰ وارفع خاصیتیں جن سے کہ ایک آدمی اپنے اعمال صالح، تقوے اور حقیقتاً کارآمد کوششوں کے باعث ممتاز اور ذی احترام بنتا ہے، ماسوا ان اقوام کے جن کے اخلاق پاک اور منزّا ہیں کسی اور قوم میں شاید باید ہی نظر آتی ہیں۔

اساتذہ کو شکایت ہے کہ اس عمر کی قوت عمل ان کے شاگردوں کو بے قابو بنا دیتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ واقعہ بھی ہے۔ لیکن کیا اس کے وہ خود ہی مورد الزام نہیں ہیں؛ جب ایک مرتبہ حواسوں کی نالی کے ذریعہ اس قوت عمل کو بہا دینے کی وہ خود اجازت دید یتے ہیں تو کیا انھیں یہ نہیں معلوم کہ اب وہ اس کا رخ نہیں بدل سکتے ہیں؛ کیا علم کا مظاہرہ کرنے والے طولانی اور دل لبھانے والے مواعظ اس کے شاگرد کے ذہن سے اس سرور کے خیالات کو محو کر سکتے ہیں جو ایک مرتبہ اس کے دل میں جگہ حاصل کر چکا ہو؛ کیا وہ اس دِل سے اس خواہش کو نکال سکتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بے قرار رہتا ہے؛ کیا وہ جذبات کی اس گرمی کو ٹھنڈا کر سکتے ہیں، جس کے معنی طالب علم جان چکا ہے؟ جس ایک مسرت واحد کا کوئی تخیل ایک شاگرد رکھتا ہے، اگر اس کی بھی مخالفت کی جائے تو کیا اس کا غصہ جوش میں نہ رہے گا؛ اور اس سخت قانون میں جو اس کے سمجھنے کے قبل ہی اس پر عائد کر دیا جاتا ہے، وہ ایک ایسے آدمی کی تلون مزاجی اور کدورت کے سوا اور کیا دیکھے گا جو اسے ستانے اور پریشان کرنے کی کوشش میں ہو؛ تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے، اگر وہ آپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دے اور آپ سے نفرت بھی کرنے لگے؛

یہ میں خوب جانتا ہوں کہ اگر کوئی شخص سبک روش ہو تو اس کو برداشت کیا جا سکتا ہے اور وہ اپنے اقتدار کی نمائش کو قائم رکھ سکتا ہے، لیکن ایک شاگرد پر کسی ایسے اقتدار کا فائدہ معلوم کرنے سے میں قاصر ہوں جو محض ان برائیوں کو ابھار کر جنھیں کہ دبانا چاہیے تھا اس کو قائم رکھا جاتا ہے۔ یہ گویا ایسا ہے کہ ایک گرمائے ہوئے گھوڑے کو ایک کھڈ پر سے جست کرا کر ٹھنڈا

کرنے کی کوشش کی جائے۔

عنفوانِ شباب کا یہ جوش تعلیم کی رکاوٹ ہونا تو بہت بعید ہے تو اس کی معراج اور اس کی منزلِ مقصود کا پیش خیمہ ہے، یہی جوش تو ہے جو جبکہ نوجوان آپ سے کم زور نہیں رہتا ہے، اس کا دل آپ کے قابو میں رہتا ہے، اوائل سن میں اس کی ابتدائی انسیت اور دل بستگی ہی وہ تھی جس کے ذریعہ آپ اس کے چلن کو قابو میں رکھتے تھے ورنہ وہ آزاد تھا، اور اب تو میں اس کو بالکل آپ کے قبضۂ قدرت میں دیکھ رہا ہوں، جب تک وہ کسی چیز سے محبت نہ رکھتا تھا وہ اپنے نفس اور ذاتی ضرورتوں کے سوا ہر چیز سے آزاد تھا۔ اور جوں ہی وہ اب محبت کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنی محبت کا محتاج ہو جاتا ہے۔ پس پہلی گرہ جو اسے اپنے ہم جنسوں سے متحد کرتی ہے لگ چکی ہے، جب آپ اس کی روز افزوں حس کی رہنمائی اس طرف فرمائیں تو یہ توقع نہ رکھیں کہ اس میں کل آدمی فوراً ہی شامل ہو جائیں گے، اور یہ کہ الفاظ "بنی نوع انسان" کے اس کے نزدیک کوئی معنی ہوں گے ایسا نہیں بلکہ یہ حس ابتداءً انھیں لوگوں تک محدود رہے گی جو اس نوجوان ہی کی مانند ہوں گے اور یہ لوگ اس کے لئے اجنبی اور غیر نہ ہوں گے۔ بلکہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو یقین طور پر اسی کی مانند غور و فکر کرتے اور محسوس کرتے ہوں گے اور جن کو وہ ایسی تکالیف اور مصیبتوں کے خطرات میں دیکھتا ہوگا جو وہ خود برداشت کر چکا ہے، اور وہ لوگ ہوں گے جو وہی لطف حاصل کرتے ہوں گے کہ وہ ان کی طرف حبِ نفس کی خاطر اور بھی زیادہ مائل ہوگا، یہ تو محض مدت مدید کی تربیت اور اپنے ذاتی اور ان احساسات کے متعلق جو وہ دوسروں میں مشاہدہ کرتا ہے، بہت غور و خوض سے کام لینے کے بعد ہوتا ہے کہ وہ اپنے انفرادی خیالات کو انسانیت کے غیر مادی تخیل کے تحت عام بنانے کے لائق ہوتا ہے اور اپنی انفرادی محبتوں میں ان مودتوں کا اضافہ کر سکتا ہے جو اس میں قومی مماثلت با امتیاز پیدا کر دیتی ہیں۔

جب ایک نوجوان محبت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو وہ دوسروں کی محبت[1] اور شفقت سے

---

[1] محبت بے غرض ہو سکتی ہے، دوستی کا یہ معاملہ نہیں ہوتا ہے۔ دوستی دیگر معاہدوں کے (باقی صفحہ ۴۸ پر)

واقف ہو جاتا ہے اور وہ ہمیشہ اس محبت کی علامتوں کی تاک جھانک میں لگا رہتا ہے۔ کیا اب بھی آپ کو یہ نہیں سوجھتا کہ اس پر آپ جدید اقتدار کیوں کر حاصل کر سکتے ہیں؟ جب کہ وہ نادان ہی تھا۔ آپ نے اس کے دل کے گرد کیا کیا بندشیں باندھی تھیں؛ جب وہ خود کود یکھنے اور یہ جاننے لگے گا کہ آپ نے اس کے لئے کیا کیا ہے اور جب وہ خود کا دوسرے نوجوانوں کے ساتھ اور دوسرے اتالیق کا آپ کے ساتھ توازن یا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے گا تو کیا محسوس کرے گا۔ میرا کہنا ہے "جب وہ دیکھے گا"، لیکن خبردار آپ خود کہیں ان کا ذکر نہ کریں۔ اگر آپ کہیں گے تو وہ اس کو خود نہ دیکھ سکے گا۔ اگر آپ اس خبر گیری کے عوض جو آپ نے رکھی ہے اس کی اطاعت گذاری کا مطالبہ کریں گے تو وہ خیال کرے گا کہ آپ تجاوز کر رہے ہیں، وہ دیکھتا ہے کہ بلا معاوضہ خبر گیری کرنے کا ذکر کرنے سے آپ کی مراد اس پر ایک قرض کا بار عائد کر کے ایک ایسے سودے کا پابند کرنے کی ہوتی ہے جو اس نے آپ سے کبھی نہیں کیا۔ اس امر کا اضافہ کہ آپ جو کچھ مطالبہ کرتے ہیں وہ اسی کے نفع کے لئے ہوتا ہے، محض بے کار ہوگا۔ اس لئے کہ یہ مطالبہ آپ اس خدمت کے عوض کرتے ہیں جو آپ نے اس کی رضامندی حاصل کئے بغیر انجام دی تھی، جب ایک قسمت کا مارا آدمی اس تسلنگ کو قبول کر کے جو سارجنٹ اسے دینا بیان کرتا ہے، اس علم بغیر کہ سارجنٹ کا کیا مطلب تھا دیکھتا ہے کہ ان کا نام درج فہرست ہو گیا ہے تو آپ اس ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں تو کیا اپنے شاگرد سے اس خبر گیری اور نگرانی کی قیمت کا مطالبہ کرنا جسے اس نے قبول تک نہیں کیا ہے، کیا اس سے بھی بڑھ کر ناانصافی نہ ہوگی؟ اگر سود خور اپنے کاروبار میں دیا اور احسان کا سرمایہ کم نہ لگایا کرے تو ناشکری عنقا ہو جائے۔ ہم ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہم پر دیا اور احسان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷ سے آگے) مانند ایک معاہدہ اور ایک سودا ہے، گو حلیہ دیگر سودوں سے زیادہ مقدس ہے۔ لفظ "دوست"، کوئی دوسرا باہمی تعلق یا رشتہ نہیں رکھتا ہے، کوئی شخص جو اپنے دوست کا دوست نہ ہو بلا شک ایک حرام خور ہے، کیوں کہ ایک شخص دوستی عطا کرنے یا عطا کرنے کا بہانہ کرتے ہی بے دوستی حاصل کر سکتا ہے۔

کرتے ہیں۔ یہ ایک کس قدر قدرتی احساس ہے ؟ آدمی کے دل میں ناشکرگذاری نہیں پائی جاتی ہے لیکن ذاتی منفعت کا وجود رہتا ہے ، ان لوگوں کی نسبت جو اپنی ذاتی اغراض کے تحت احسان کرتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو کسی کے شکرگذار نہ ہوتے ہوں ، اگر اپنی بخشش کا آپ مجھ سے سودا کریں گے تو میں قیمت کے لئے کھٹ کھٹ کروں گا۔ لیکن اگر آپ عطا کا بہانہ اس لئے کرتے ہیں کہ مابعد اس کی من مانی قیمت طلب کریں تو آپ فریب دہی اور دغا کے مرتکب ہوتے ہیں ، یہ تو بلاعوض ہبہ ہے جو انمول ہوتا ہے ، دل خود اپنا ایک قانون رکھتا ہے ، اگر آپ اس کو پابند کرنے کی سعی فرمائیں گے تو آپ اسے کھو دیں گے پس اسے اس کی آزادی عطا کر دیجئے آپ اسے اپنا بنالیں گے۔

جب مچھیرا اپنی بنسی میں چارہ لگاتا ہے تو مچھلی بے تامل اس کے پاس آجاتی ہے لیکن جب وہ اس کانٹے میں جو چارہ کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے پھنس جاتی ہے اور ڈور کو تنا ہوا محسوس کرتی ہے تو بھاگنے کی کوشاں ہوتی ہے ، کیا یہ مچھیرا ایک محسن ہے ؟ کیا مچھلی ناشکرگذار ہے کیا ہم کسی محسن کے فراموش کردہ آدمی کو اس محسن سے بے خبر پاتے ہیں ؟ اس کے برعکس وہ اپنے محسن کا ذکر کرنے میں لطف حاصل کرتا ہے اور وہ جوش محبت بغیر اس کا خیال ترک نہیں کرسکتا ہے۔ اگر اسے کسی غیر متوقع خدمت کے ذریعے اپنے محسن پر یہ ظاہر کرنے کا موقع حاصل ہوجاتا ہے کہ اس کا احسان اسے یاد ہے تو اسے اپنے احسان کا بدلہ اتارنے میں کس قدر خوشی حاصل ہوتی ہے ، اپنے محسن کو ممنون احسان بنانے میں اسے کیسی مسرت حاصل ہوتی ہے ، یہ کہنا کس قدر پرلطف ہوتا ہے۔ "اب میری باری ہے" یہ لاریب قدرت کی تعلیم ہے۔ ایک نیک عمل کبھی ناشکری کا موجب نہیں ہوسکتا ہے۔

پس اگر شکرگذاری اور احسان مندی ایک قدرتی احساس ہے تو آپ اس کے اثرات کو اپنی غلط کاریوں سے برباد نہ کریں ، اور اس کا یقین رکھئے کہ آپ کا شاگرد جس وقت آپ کی خبرگیری کی قدر و قیمت کو سمجھنے لگے گا تو وہ آپ کا شکرگذار ہوگا۔ بشرطیکہ آپ خود اس خبرگیری کی

کوئی قیمت نہ لگائیں۔ اور یہ احسان مندی اس کے دل پر آپ کو ایک ایسا اقتدار دے دے گی جسے کوئی چیز پامال نہیں کر سکتی ہے، لیکن خبردار اسے اپنا بنانے کے قبل ہی ضائع نہ ہونے دیں اور اپنی اہمیت پر کبھی مصر نہ ہوں۔ آپ نے اپنی خدمتوں پہ فخر کیا اور بس وہ ناقابل برداشت ہو جائیں گی پس اگر آپ انھیں بھلا دیں تو وہ کبھی فراموش نہ کی جائیں گی، جب تک وہ وقت نہ آ جائے جب کہ آپ اس سے ایک آدمی کے مانند سلوک کرنے لگیں اس وقت تک اس کے فرائض کا آپ کے متعلق کوئی سوال پیدا نہ ہونا چاہیئے، صرف اس کی ذات ہی کے متعلق اس کے فرائض کا ذکر رہنا چاہیئے اگر آپ اسے مانوس کرنا چاہتے ہیں تو اس کو آزادی دے دیجئے، خود چھپ جائیے تاکہ وہ آپ کو تلاش کرے اور محض اسی کے مفاد کا ذکر کرنے سے اس کے دل میں احسان مندی اور شکر گذاری کے اعلیٰ جذبات ابھاریئے، جب تک کہ وہ نوجوان سمجھنے کے قابل نہ ہو جائے میں اس سے یہ نہ کہنے دوں گا کہ جو کچھ کہا گیا تھا وہ اس کے ہی مفاد کے لئے تھا۔ ان الفاظ کے وہ صرف یہی معنی لے گا کہ آپ اس کے محتاج تھے اور یہ کہ اس نے آپ کو محض ایک خدمت گار بنا رکھا تھا لیکن اب جب کہ وہ یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ محبت کیا چیز ہے تو وہ یہ بھی جاننے لگا ہے کہ آدمی کس قسم کی پاک محبت اس چیز سے وابستہ رکھ سکتی ہے جو اسے عزیز اور پیاری ہو اور وہ سرگرمی اور انہماک جس میں آپ اس کے لئے محو رہتے ہیں، اسے اب غلامی کی زنجیریں نظر نہیں آتی ہیں۔ بلکہ ایک دوست کی محبت اور الفت دکھائی دیتی ہے، انسانی دل میں ایک دوست کی آواز سے جو دوست کی حیثیت سے پہچان لی جائے زیادہ کسی اور چیز کو وقعت اور اہمیت حاصل نہیں ہے، اس لئے ہم جانتے ہیں کہ وہ سوائے بھلائی کے کسی اور کام کے لئے نہیں بولتی ہے، ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ ہمارے دوست کو مغالطہ ہوا ہے لیکن یہ ہرگز باور نہیں کر سکتے کہ وہ ہمیں دھوکہ دے رہا ہے۔ ہم اس کے مشورہ کو وقت بے وقت قبول کرنے سے انکار ضرور کر سکتے ہیں لیکن حاشا للہ ہم اسے حقیر کبھی خیال نہیں کر سکتے۔

آخر کار ہم اخلاقی نظام تک پہونچ ہی گئے، ابھی ابھی ہم نے آدمیت کی طرف دوسرا قدم

ٹھایا ہے۔ اگر اس کا یہ موقع ہوتا تو میں یہ دکھانے کی کوشش کرتا کہ قلب کی ابتدائی تحریکوں کے ذریعے
ضمیر کے اندر ابتدائی حرکتیں کیوں کر پیدا ہوتی ہیں اور یہ کہ محبت اور نفرت کے احساسوں سے نیکی اور
بدی کے ابتدائی تخیلات کس طرح نمودار ہوتے ہیں میں دکھاؤں گا کہ انصاف اور رحم محض غیر مادی
مطلاعیں اور ایسے اخلاقی تخیلات نہیں ہیں جو عقل کے ساختہ ہوں۔ بلکہ یہ عقل کے منور کردہ دل کی
حقیقی شفقتیں اور محبتیں ہیں جو ہماری ابتدائی محبتوں کا قدرتی نتیجہ ہوتی ہیں اور یہ کہ ضمیر کی امداد بغیر
محض عقل کے ذریعہ ہم کسی قدرتی قانون کو قائم نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ تمام قدرتی حقوق اگر انسانی دل کی
کی کسی طبعی ضرورت پر مبنی نہ ہوں تو محض ایک مصنوعی خواب و خیال ہوتے ہیں۔ مگر فی الوقت میں اپنا یہ کام
نہیں خیال کرتا ہوں کہ میں اخلاقیات یا دینیات پر کوئی کتاب لکھوں یا کسی قسم کے مطالعے کا نصاب تیار کروں
بس اگر میں لوگوں کی پرداخت کے اعتبار سے اپنے احساسات اور اپنے علم کی ترتیب اور نشو و نما ظاہر کر دوں
تو بس یہ کافی ہے جو میں نے یہاں اشارتاً بیان کیا ہے، اسے شاید دوسرے لوگ عملی جامہ پہنا سکیں گے

ــا یہ اصول کہ "دوسروں سے ایسا ہی سلوک کرو جیسا تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ کریں"
ضمیر اور حس کے سوا کوئی اور حقیقی بنیاد نہیں رکھتا ہے۔ اس لئے کہ کسی معقول وجہ کی بنا پر خود اپنے
آپ ہونے کے باوجود وہ عمل کروں جو میں اس وقت کرتا جبکہ میں کوئی اور ہوتا۔ بالخصوص
جبکہ میں اخلاقی طور پر یقین رکھتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو کبھی بھی اس حالت میں نہ
پاؤں گا۔ اور اس کا کون جواب دہ ہوگا کہ اگر میں اسی اصول کی دیانتداری سے پابندی
کروں گا تو میں دوسروں سے بھی اپنے متعلق اس اصول کی پابندی کرا سکوں گا؟ بدمعاش
دونوں کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ انصاف پسند کی دیانت اور اپنی بے ایمانی اور ناانصافی کا۔ وہ
اپنے سوا ہر ایک کو خوشی خوشی انصاف پسند دیکھنے کا خواہاں رہتا ہے۔ یہ سودا آپ کچھ
بھی فرمائیں انصاف پسند کے لئے کچھ زیادہ نفع بخش نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر امنڈتے ہوئے
دل کی گرم جوشی مجھے میرے ابنائے جنس کے ساتھ مماثل کر دیتی ہے۔ اور بقول شخصے اگر
میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اس کو تکلیف نہ پہنچنے دوں کہ مبادا مجھے بھی تکلیف اٹھانی پڑے تو مجھے اس لئے
اس کی فکر ہوتی ہے کہ مجھے خود اپنی فکر ہوتی ہے۔ اور اس اصول یا کہاوت کا سبب خود
فطرت ہی میں موجود ہے جو میرے اندر جہاں کہیں بھی ہوں میری ذاتی خیر خواہی کی خواہش کو
ابھارتی رہتی ہے۔ اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ یہ کہنا بالکل (باقی صفحہ ۵۲ کے نیچے)

اس وقت تک میرے امیل نے صرف اپنی ذات کا ہی خیال رکھا ہے۔ اس لئے اس کی پہلی نظر اس کے ہم جلیسوں یا مساوی لوگوں سے اس کی ذات کا مقابلہ او معائنہ کرنے کی رہ نمائی کرے گی۔ اور پہلی بات جو اس تقابل سے پیدا ہوگی وہ ان پر تقدیم حاصل کرنے کی خواہش ہوگی وہ یہی مقام ہے جہاں حُبِّ نفس خود غرضی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہی ان جملہ جذبات کا مقام آغاز ہے جو خود غرضی کے تحت وجود میں آتے ہیں لیکن یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ آیا یہ جذبات جن کی کہ اس کی زندگی محکوم ہوگی انسانی اور شریف ہونے چاہئیں یا سخت اور جابرانہ یہ کہ آیا وہ خیرات اور خدا ترسی کے جذبات ہوں گے یا حسد اور لالچ کے۔ ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ لوگوں میں اپنا کیا درجہ حاصل کرنے کا یقین رکھتا ہے اور یہ کہ اپنی مطلوبہ حیثیت کے حصول کے لئے وہ کس قسم کی دشواریوں کو مغلوب کرنے کی توقع رکھتا ہے۔

اس کی اس تفتیش کی رہ نمائی کے لئے نوجوان کا اتفاقات کے ذریعے ان آدمیوں سے تعریف کرا دینے کے بعد جو ہم جلیسوں میں عام مشابہت رکھتے ہیں ہمیں ان لوگوں کا ان کے امتیازات و اختلافات کے ذریعے اس کو دکھانا ضروری ہے۔ قدرتی اور تمدنی عدم مساوات کا اندازہ لگانے اور کل سماجی یا تمدنی نظام کی اسکیم سمجھنے کا یہی وقت ہوتا ہے۔

سماج کا افراد میں اور افراد کا سماج میں مطالعہ کرنا ضروری ہے، جو لوگ سیاسات اور اخلاقیات کو علیحدہ علیحدہ خیال کر سکتے ہیں وہ کبھی ایک کو بھی نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ ابتدائی تعلقات میں اپنے آپ کو محدود رکھ کر اولاً ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کو ان سے کیوں کر متاثر ہونا چاہئے۔

اور ان ابتدائی تعلقات سے کون سے جذبات پیدا ہونے چاہئیں، ہم دیکھتے ہیں کہ ان جذبات کی نشو و نما کے تناسب سے ایک آدمی کے تعلقات دوسروں کے ساتھ بڑھتے اور گھٹتے رہتے ہیں۔ آدمی کی آزادی اور خود مختاری کا انحصار اتنا اس کی قوت بازو پر نہیں ہوتا۔ جتنا کہ اس کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱ سے آگے) غلط ہے کہ قدرتی قانون کے اصول محض عقل پر مبنی ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ تو ایک مضبوط اور زیادہ ٹھوس بنیاد رکھتے ہیں۔ حُبِّ نفس سے پیدا شدہ دوسروں کی محبت انسانی عدل و انصاف کا سرچشمہ ہے۔ ساری اخلاقی کیفیت قانون کے اس اقتباس کی تعلیم میں مجتمع ہے+

اعتدال پسندی پر ہوتا ہے۔ وہ شخص جس کی حاجتیں معدودے چند ہوتی ہیں وہ صرف گنتی ہی کے لوگوں کا محتاج ہوتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو ہماری مصنوعی خواہشات کو ہماری جسمانی ضروریات کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں اور الجھا دیتے ہیں اور جنھوں نے ان ضرورتوں کو انسانی سماج کی بنیاد بنا رکھا ہے اثرات کو اسباب خیال کرنے میں مسلسل غلطی کرتے رہتے ہیں اور اپنی ذاتی استدلال سے محض اپنے آپ ہی کو پراگندہ خیال بنائے رکھتے ہیں۔

چار نکات

مدارس میں ذہنی صحت کے لئے مثبت قسم کی فضا پیدا کرنے کے لئے

چار نکات پر توجہ جمی رہنی چاہیئے۔

- ۱۔ تربیتی درسگاہوں کے لئے امیدواروں کا انتخاب کرتے وقت بہتر شخصیت کے لوگوں کا انتخاب ہو تاکہ متوازن مزاج استاد تیار ہوں۔
- ۲۔ متعلم اساتذہ اور ملازم اساتذہ دونوں کو انسانی تعلقات اور مثبت ذہنی صحت کے متعلق بہتر تربیت دی جائے۔ ضرورت اس بات کی نہیں کہ استادوں کو سقیم نفسیات کا علم سکھایا جائے۔ بلکہ اس بات کی کہ انھیں صحت مند بچوں کے جذباتی طور طریقوں سے آگاہ کیا جائے۔
- ۳۔ مدرسے کے تمام کمروں میں بہتر ذہنی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔
- ۴۔ استادوں کا وقار بلند کرنے کی کوشش کی جائے۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

لاسوربن

کسی فرانسیسی ماہرِ تعلیم سے لاسوربن کے متعلق پوچھیے تو طرح طرح کے جواب ملیں گے بعض کہیں گے کہ اس کی بنیاد سنہ ۱۲۵۰ء میں پڑی جب لوئی نہم نے اپنے پادری رابرٹ ڈی سوربن کو کوپے گال سڑک پر ایک مکان اس غرض سے عطا کیا کہ وہاں دینیات کے نادار طلبہ رہیں۔ اور مطالعہ کریں بعض کی رائے یہ ہوگی کہ یہ ادارہ سنہ ۱۲۵۶ء میں شروع کیا گیا تھا۔ فرانسیسی وزارت تعلیم کی رائے میں اس کا آغاز سنہ ۱۲۵۷ء میں ہوا تھا۔ پیرس یونی ورسٹی کا کہنا ہے کہ سوربن سنہ ۱۲۵۳ء میں وجود میں آیا۔

بہرحال سوربن پیرس یونی ورسٹی کا ایک جزو ہے پچھلے سال لاسوربن کی ۷۰۰ ویں برسی منائی گئی لیکن اس موقعہ پر دنیا کے اس قدیم اور مشہور تعلیمی ادارے کے منتظمین نے تقریب میں رنگینی اور سج دھج پیدا کرنے کے لئے کسی سرگرمی کا اظہار نہیں کیا۔

عام طور پر سوربن اور پیرس یونی ورسٹی میں اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر سوربن جو کبھی ایک کالج ہوا کرتا تھا۔ اب صرف ایک عمارت ہے۔ یونی ورسٹی اس سے زیادہ پرانی ہے۔ اور اب سوربن میں صرف علم و ادب اور سائنس کے شعبے ہیں۔

غرض رابرٹ ڈی سوربن نے جس دینی درس گاہ کی بنیاد رکھی تھی وہ اسی کے نام سے موسوم ہوگئی اور رفتہ رفتہ بڑے بڑے نامور عالم اور فاضل یہاں کھچے آنے لگے۔ گویا سوربن پیرس یونی ورسٹی کی توسیع و ترقی کے لئے مرکزی نقطہ بن گیا۔ دینیات کا شعبہ جو اب یونی ورسٹی سے بالکل خود مختار

ہو چکا تھا۔ یورپ بھر میں مقتدر ترین دینی اداروں میں شمار ہونے لگا۔ یہاں تک کہ روم سے رومن کیتھولک مذہب کے اختلافی مسائل بھی اس کے سامنے پیش ہونے لگے۔ سوربن نے جون آف آرک کی مخالفت کی تھی اور ۱۴۳۱ء میں اس کے لئے سزائے موت پر زور دیا تھا۔ بایں ہمہ یہ ادارہ ایک مؤثر ثقافتی مرکز بنا رہا۔ فرانس میں سب سے پہلا چھاپہ خانہ اسی ادارے میں قائم ہوا۔ سترھویں صدی میں اس کی از سر نو تعمیر ہوئی اور عمارت وسیع تر کر دی گئی۔ اس کی موجودہ عمارت انیسویں صدی کی کے اواخر میں نپولین سوم کے عہد میں بنی۔ اس وقت سوربن میں ۸۲ پروفیسر پڑھا رہے ہیں اور طلبہ کی تعداد جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں ۸ ۹ ۷ ۶ ۱ ہے۔

بڑے کنبے اور ذہانت

۱۹۴۷ء میں سکاٹ لینڈ کے تمام گیارہ سالہ طلبہ کی ذہانت کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس سے ایک عام نتیجہ یہ نکلا تھا کہ بعض مستثنیات کو چھوڑ کر عام صورت حال یہ ہے کہ جتنا بڑا کنبہ اتنے ہی کم ذہین بچے ذہنی آزمائشوں کے نتائج اونچے پیشہ وروں اور صنعت کاروں کے طبقے میں سب سے اچھے تھے درمیانے طبقوں میں اس سے گھٹیا اور غیر تربیت یافتہ محنت کاروں کے طبقے میں سب سے گھٹیا مگر ہر طبقے میں یہ رجحان بالکل واضح تھا کہ کسی کنبے میں بچوں کی تعداد جتنی زیادہ اتنی ہی ان بچوں کی ذہنی استعداد پست۔ مسٹر جیمز بسیکومل نے اس مطالعہ کے نتائج کو طبقات وار ترتیب دیا ہے۔ پیشوں کو نو طبقوں میں تقسیم کر کے ہر طبقے کی اوسط ذہانت کو انھوں نے مندرجہ ذیل نقشے میں پیش کیا ہے۔

پیشہ	بچوں کی تعداد	ذہانت
۱۔ اعلیٰ پیشہ ور اور بڑے صنعت کار	۲ ۲۱	۸ ء ۵۱
۲۔ چھوٹے صنعت کار	۳۲۰	۷ ء ۵۲

پیشہ	بچوں کی تعداد	ذہانت
۱- تنخواہ دار ملازم	۲۳۶	۴۷،۷
۲- چھوٹے ملازم	۵۵۶	۴۳،۶
۴- کاری گر مزدور	۲۳۹۲	۳۷،۲
۶- نیم کاری گر مزدور	۱۱۹۵	۳۳،۲
۷- غیر کاری گر مزدور	۱۱۳۲	۳۱،۱
۸- کسان	۱۴۳	۳۶،۲
۹- زرعی مزدور	۴۲۸	۳۲،۳

جیمز میکول نے اس مطالعہ کے بعض دلچسپ پہلوؤں کی وضاحت بھی کی ہے بندرجہ بالا طبقوں کے بچوں کی اوسط ذہانت کا جو نقشہ اوپر دیا گیا ہے، اس کی تفصیلوں پر نگاہ ڈالنے سے بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ اگرچہ سب سے اوپر اور سب سے نچلے طبقے کی اوسط ذہانت میں کوئی بیس درجے کا فرق ہے، ذہنی آزمائشوں میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے بچے سب کے سب چوٹی کے طبقے میں ہی نہیں۔ بلکہ پست اور اوسط طبقوں میں بھی ایسے بچے موجود ہیں جنہوں نے بہت اعلیٰ نمبر پائے۔ ساٹھ یا اس سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے بچوں کی سب سے زیادہ تعداد چوٹی کے طبقے میں نہیں بلکہ کاری گر مزدور طبقہ میں پائی گئی۔ اس تجربے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ذہین ترین بچوں کی اکثریت چوٹی کے طبقوں میں پیدا نہیں ہوتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان طبقوں کی گنتی کے اعتبار سے ذہین بچوں کا فی صد تناسب ان کے یہاں باقی طبقوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چوں کہ پیشہ ور لوگ عموماً غیر کاری گر لوگوں کے مقابلے میں اعلیٰ قابلیت کے لوگ ہوتے ہیں، اور وہ عام طور پر زیادہ ذہین عورتوں کے ساتھ شادیاں کرتے ہیں، اس لئے ان کے بچوں کی بلند ذہنی سطح انہیں بڑی حد تک ورانتاً ملتی ہے لیکن

یہ نتیجہ اس بنا پر بھی بے کے قابل نہیں کہ ایسے گھروں کا عام ماحول بچوں کے لئے بہت سازگار ہوتا ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ بالاتر ذہنی سطح اسی ماحول کی پیداوار ہو۔

بہرکیف اس مطالعہ نے یہ بات اچھی طرح واضح کر دی ہے کہ رہائشی مکان میں جس قدر بھیڑ زیادہ ہوگی اسی قدر اس گھر کے بچے پست ذہنی سطح پر رہیں گے۔ مصنف کے اپنے الفاظ میں جو بچے موزوں گھریلو ماحول میں پرورش پاتے ہیں، جہاں کنبہ چھوٹا ہو اور والدیا تو اچھا پیشہ ور ہو یا کامیاب کاروباری آدمی وہاں بچوں کی اوسط ذہانت کم سازگار ماحول میں رہنے والے بچوں کی نسبت زیادہ ہوگی لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ آیا ذہنی آزمائش میں اچھی کامیابی اس وجہ سے ہے کہ بچوں کو والدین سے بالاتر ذہانت ورثہ میں ملی ہے۔ یا یہ کامیابی عمدہ ماحول کی پیداوار ہے بڑا مشکل ہے۔ چونکہ ایک ہی ماحول میں رہنے والے بچوں کی ذہانت میں بھی بہت کافی اختلاف موجود ہے اس لئے کوئی انتہائی نظریہ اختیار کرنا ممکن نہیں۔

مصنف نے بچوں کی جسمانی نشوونما کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ اور اس کے نتائج بھی گھریلو ماحول سے براہِ راست تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تعلق بالکل اسی قسم کا ہے جو گھریلو ماحول اور ذہنی سطح کے درمیان ہے۔ جو بچے بڑے کنبوں میں پلتے ہیں ان کا اوسط وزن اور اوسط قد چھوٹے کنبوں کے مقابلے میں کم ہے، جو بچے تنگ اور پرہجوم گھروں میں رہتے ہیں ان کا وزن اور قد فراخ گھروں میں رہنے والے بچوں کی نسبت کم ہے، بچوں کی جسمانی صحت اور ان کے والدین کے پیشوں میں بھی بالکل وہی نسبت ہے جو ذہانت کے بارے میں دیکھی جا چکی ہے۔ اعلیٰ پیشہ وروں اور بڑے بڑے صنعت کاروں کے بیٹے اوسطاً غیر کاری گر مزدوروں کے بیٹوں سے قد میں تین انچ لمبے اور وزن میں چھ پونڈ زیادہ ہیں۔ لڑکیوں کی صورت میں قد کا فرق ۲ ½ انچ ہے اور وزن کا فرق چھ پونڈ۔

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ بدنی صحت اور ذہانت میں بہت کم تعلق نظر آیا ہے، جو بچہ ذہنی آزمائش میں بہت زیادہ نمبر لیتا ہے وہ لازمی طور پر بہت لمبا اور بہت وزنی نہیں ہوتا ؛

سرکاری جریدہ کے اعلانات

۹۷۸۷/ٹا م۔افتخار علی بی۔اے۔ایس۔اے۔وی (۱۳۰ — ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان
نومبر ۵۳ء کو جن کے تبادلہ کے احکام گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ کے لئے جاری ہو چکے تھے گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ میں م۔محمد سرور کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے معلم انگریزی مقرر کیا گیا۔

〃 م۔محمد سرور ایم۔اے۔بی۔ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ کو م۔افتخار علی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے، تاریخ حاضری سے گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ میں معلم انگریزی مقرر کیا گیا۔

۳۱۵۷۵/ س۔فدا حسین۔بی۔اے۔ایس۔اے۔وی (۲۵۰ - ۳۵۵) اے۔ڈی۔آئی جہلم کو م۔علی محمد
نومبر ۵۳ء اے۔ڈی۔آئی کی جگہ جن کا تبادلہ شاہ پور ہو چکا ہے۔تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اے۔ڈی آئی کیمبل پور مقرر کیا جاتا ہے۔

〃 محمد اکرام بھٹی۔بی۔اے۔بی۔ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ کو جن کے احکام تقرری بطور اے۔ڈی۔آئی کیمبل پور جاری ہو چکے تھے اپنی تنخواہ پر تاریخ حاضری سے س۔فدا حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اے ڈی۔آئی جہلم مقرر کیا جاتا ہے۔

〃 م۔عبدالمجید بی۔اے۔بی۔ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) اے۔ڈی۔آئی سرگودھا کو چوہدری بشیر احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔اپنی تنخواہ پر تاریخ حاضری سے اے۔ڈی۔آئی جہلم مقرر کیا گیا۔

〃 چ۔بشیر احمد بی۔اے۔بی۔ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) اے۔ڈی۔آئی جہلم کو م۔عبدالمجید کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔اپنی تنخواہ پر تاریخ حاضری سے اے۔ڈی۔آئی سرگودھا مقرر کیا گیا۔

۳۱۵۳۲/ای م۔محمد سویان (ڈپلوما از میو اسکول آف آرٹ) امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔محمد فضل الٰہی
۳ نومبر ۵۳ء معلم ڈرائنگ کی جگہ جن کی ملازمت ثانیہ کی میعاد ۲۰ جولائی ۵۳ء کو ختم ہو گئی تھی ۶۰ — ۱۰۰ کے

گریڈ میں ۔/۷۰ روپے ماہوار پر گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ میں عارضی معلم ڈرائنگ مقرر ہوئے۔

ی/۳۱۵۳۰ م۔افتخار علی بی۔اے۔ ایس۔اے۔وی (۱۳۰ ۔۔ ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان کو ایک
نومبر ۱۹۵۳ء موجودہ آسامی پر بطور ایک زائد مدرس۔ اور م۔محمد اسماعیل خاں قادری ایم۔اے معلم انگریزی گورنمنٹ
ہائی اسکول ملتان کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ میں منسوخ کیا جا رہا ہے اپنی تنخواہ پر
تاریخ حاضری سے معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ مقرر کیا جاتا ہے۔

ی/۳۱۵۱۱ م۔عبدالحمید خالد ایم۔اے۔بی۔ٹی (۱۳۰ ۔ ۔ ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ
نومبر ۱۹۵۳ء ایک زائد مدرس کے طور پر ایک موجودہ اسامی پر اور م۔محمد کاظم بی۔اے۔ ایل۔ٹی کی جگہ جن کی
تقرری ہوئی تھی مگر وہ حاضر نہیں ہوئے۔ اپنی تنخواہ پر تاریخ حاضری سے معلم انگریزی گورنمنٹ
ہائی اسکول جہلم مقرر ہوئے۔

〃 م۔محمد طاہر قریشی۔بی۔اے۔بی۔ٹی (۱۳۰ ۔ ۔ ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ
م۔عبدالحمید خالد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر تاریخ حاضری سے معلم انگریزی
گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ مقرر ہوئے۔

〃 م۔کفایت اللہ خاں۔بی۔اے۔بی۔ٹی (۱۳۰ ۔۔ ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول
پنڈدادن خان م۔محمد طاہر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پر تاریخ حاضری سے
معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ (آزمائشی) مقرر ہوئے۔

ی/۳۱۵۱۳ مسٹر سجاد جعفری بی۔اے۔بی۔ٹی (۱۳۰ ۔ ۔ ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں
نومبر ۵۳ء (آزمائشی) م۔محمد عبدالرحیم کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول لالہ موسےٰ میں ہو چکا ہے۔
اپنی تنخواہ پر تاریخ حاضری سے معلم انگریزی (آزمائشی) گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں مقرر ہوئے۔

〃 ح۔عبدالرؤف لعیٹ بی۔اے۔بی۔ٹی۔ امیدوار۔م۔سجاد جعفری کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۱۳۰ ۔
۲۵۰ کے گریڈ میں ۔/۱۳۰ روپے ماہوار پر تاریخ حاضری سے قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول
کھاریاں مقرر ہوئے۔

ایضاً م۔ محمد اسلم بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ امیدوار۔ ج۔ رحمت اللہ کی جگہ جنھیں اپنے سکول میں ہی صدر معلم مقرر کیا گیا ہے ۱۳۰ ۔۔ ۲۵۰ کے گریڈ میں ۔/۱۳۰ روپے ماہوار پر تاریخ حاضری سے قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ مقرر ہوئے۔

ایضاً ح۔ عبد المجید ملک۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ امیدوار۔ م۔ ثناء اللہ کی جگہ جن کی تقرری ہوئی مگر وہ حاضر نہیں ہوئے تاریخ حاضری سے ۱۳۰ ۔۔ ۲۵۰ کے گریڈ میں ۔/۱۳۰ روپے ماہوار پر قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول مٹھا ٹوانہ مقرر ہوئے۔

ایضاً سید محمد یاسین شاہ ایف۔ اے۔ سی۔ ٹی امیدوار۔ م۔ محمود احمد قریشی کی جگہ جن کا تبادلہ گجرانوالہ میں ہو چکا ہے ۱۳۰ ۔۔ ۲۵۰ کے گریڈ کی ایک موجودہ آسامی پر ۔/۸۰ روپے ماہوار مقررہ تنخواہ پر تاریخ حاضری سے عارضی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب مقرر ہوئے۔

ای/۱۹/۴/۳۱ م۔ محمد علی میٹرک۔ ایس۔ وی امیدوار کو۔ م۔ نذیر احمد۔ ایس۔ وی کی جگہ جو گورنمنٹ ہائی اسکول
۳ نومبر ۵۳ء فتح جنگ میں حاضر نہیں ہوئے اور جن کی تقرری منسوخ کر کے اس اسامی کو گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ میں منتقل کر دیا گیا ہے ۳ جون ۵۳ء قبل از دوپہر سے ۶۰ ۔۔ ۱۲۰ کے گریڈ میں ۔/۷۲ روپے ماہوار پر گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ میں معلم اردو مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ مختار احمد میٹرک۔ ایس۔ وی امیدوار کو م۔ بہاؤ الدین کی جگہ جن کا تبادلہ حضرو سے میانوالی ہو چکا ہے اور اس اسامی پر جو میانوالی میں م۔ شہاب الدین کے سبکدوش ہونے سے خالی ہوئی ہے اور گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ میں منتقل کر دی گئی ہے ۲۹ جون ۵۳ء قبل از دوپہر سے ۶۰ ۔۔ ۱۲۰ کے گریڈ میں ۔/۷۲ روپے ماہوار پر معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ میں مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد علی میٹرک۔ ایس۔ وی (۶۰ ۔۔ ۱۲۰) معلم اردو (آزمائشی) گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ کو ۲۰ جون ۵۳ء قبل از دوپہر سے اپنی تنخواہ پر معلم اردو (آزمائشی) گورنمنٹ ہائی اسکول فتح جنگ مقرر کیا گیا۔ وہ اپنی آسامی اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔

〃 م۔ مختار احمد میٹرک۔ ایس۔ وی (۶۰ ۔ ۔ ۱۴۰) معلم اُردو (آزمائشی) گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ کو ۲۰ رجون ۱۹۵۳ء قبل از دوپہر سے اپنی تنخواہ پر معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو مقرر کیا گیا۔ وہ اپنی آسامی اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔

ای/۷/۳۱۵۲ م۔ فضل حسین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ۔ ۔ ۲۵۰) عارضی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بھوچال کلاں کو ۲ رنومبر ۱۹۵۳ء م۔ تہذیب الحسنین کی جگہ جن کا استعفیٰ ۷ راکتوبر ۱۹۵۳ء سے منظور کیا جا رہا ہے تاریخ حاضری سے اپنی موجودہ تنخواہ پر عارضی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کھوٹہ مقرر ہوئے۔

〃 م۔ شفیق الرحمان بی۔ ایس سی۔ امیدوار م۔ فضل حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ۔ ۱۳۰ ۔ ۲۵۰ کے گریڈ کی ایک موجودہ آسامی پر ۱۳۰/ روپے ماہوار تنخواہ پر عارضی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بھوچال کلاں مقرر ہوئے۔

ای/۳۱۱۹۰ س۔ جاوید حسین ترمذی (۶۰ ۔ ۔ ۱۴۰) معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ نارمل اسکول ناروال کو ۷ نومبر ۱۹۵۳ء ۲ رنومبر ۱۹۵۳ء سے اپنی آسامی پر مستقل کیا گیا۔

〃 م۔ کریم احمد (۶۰ ۔ ۔ ۱۴۰) معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ کو ۱۷ فروری ۱۹۵۲ء سے اپنی آسامی پر مستقل کیا گیا۔

ای/۷/۳۱۰۰ م۔ خدا بخش گورمانی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ۔ ۔ ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کوٹ عدو ۳۱ راکتوبر ۱۹۵۳ء کو م۔ فیض محمد خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اے ڈی آئی ڈیرہ غازی خاں مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ فیض محمد خاں بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ۔ ۔ ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی ڈیرہ غازی خاں کو م۔ خدا بخش گورمانی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کوٹ عدو مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ محمد اسمعیل خاں نادری بی۔ اے (آنرز) ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ۔ ۔ ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان کو ایک موجودہ آسامی پر ایک زائد مدرس کے طور پر

تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ مقرر کیا گیا۔

〃 مس۔اصغر علی گردیزی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰/- روپے مقررہ) قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ کو م۔ محمد اسمٰعیل خان قادری کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان مقرر کیا گیا۔

〃 م فیض اللہ خان۔ ایف۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (۲۵۰ - ۳۵۵) اے۔ ڈی۔ آئی۔ برائے تربیت جسمانی مظفر گڑھ کو س۔ اصغر علی گردیزی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ فوری سے اپنی تنخواہ پر سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ مقرر کیا جاتا ہے۔

〃 م۔ حبیب اللہ۔ بی۔ اے۔ ڈی۔ پی۔ ای (والٹن) امیدوار کو م فیض اللہ خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ۱۳۰ - - ۲۵۰ کے گریڈ میں ۱۳۰/- روپے ماہوار پر قائم مقام اے۔ ڈی۔ آئی برائے تربیت جسمانی مظفر گڑھ مقرر کیا گیا۔

ای/۲--۳۱ م۔ محمد عشرت اقبال بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ - - ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول

۳۱ اکتوبر ۱۹۵۳ء کھوڑہ کو م۔ عابد محمود حسن کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ عابد محمود حسن بی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ - - ۲۵۰) معلم سائنس (آزمائشی) گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ کو م۔ نواز خاں نیازی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر معلم سائنس (آزمائشی) گورنمنٹ ہائی اسکول بھکر مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ محمد نواز خاں نیازی۔ بی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ - - ۲۵۰) معلم سائنس (آزمائشی) گورنمنٹ ہائی اسکول بھکر کو جو لمبی چھٹی پر ہیں م۔ محمد عشرت اقبال کی جگہ جو تبدیل ہو چکے ہیں اس تاریخ سے جس کو م عشرت اقبال کو اپنے فرائض سے فارغ کیا جائے گا معلم سائنس (آزمائشی) گورنمنٹ ہائی اسکول کھوڑہ مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ غلام سرور۔ ایف۔ اے۔ سی۔ ٹی امیدوار کو م۔ محمد نواز خاں نیازی کی جگہ جو ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۳ء سے

لمبی چھٹی پر ہیں تاریخ حاضری سے -/۸۰ روپے ماہوار پر قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کھوڑہ مقرر کیا گیا۔

ای/۴-۰۰-۱۳۱ س۔عاشق حسین شاہ بی۔اے۔بی۔ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) اے۔ڈی۔آئی راولپنڈی کو
۱۳ اکتوبر ۵۳ء س۔امام بخش شاہ بخاری کی جگہ جو گورنمنٹ ہائی اسکول میں صدر معلم مقرر ہو چکے ہیں تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اے ڈی۔آئی۔ملتان مقرر کیا گیا۔

〃 ش۔محمد ممتاز۔بی۔اے۔ایس۔اے۔وی (۱۳۰ — ۲۵۰) اے۔ڈی۔آئی شاہ محمد کو س۔عاشق حسین شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اے ڈی آئی راولپنڈی مقرر کیا گیا۔

〃 م۔علی محمد۔ایف۔اے۔ایچ پی۔ایچ یو۔او ٹی (۶۰ — ۱۲۰) اے۔ڈی۔آئی اٹک کو ش۔محمد ممتاز کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر۔اے۔ڈی۔آئی شاہ پور مقرر کیا گیا۔

〃 م۔محمد اکرام بھٹی۔بی۔اے (آنرز) بی۔ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ کو ایک موجودہ آسامی پر اور م علی محمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر۔اے۔ڈی۔آئی اٹک مقرر کیا گیا۔

ای/۳۰۶۸۴ م۔عزیز احسن بی۔اے۔ایس۔اے۔وی (۱۳۰ — ۲۵۰) سیکنڈ ماسٹر ہائی اسکول پھالیہ (زائد) کو
۲۷ اکتوبر ۵۳ء اپنی تنخواہ پر تاریخ حاضری سے م۔دین محمد ناصر کی جگہ جن کو گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں کا صدر معلم مقرر کیا جا چکا ہے۔گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور میں معلم انگریزی مقرر کیا گیا۔

〃 خ۔عبدالمجید بی۔اے۔ایس۔اے۔وی (۲۵۰ — ۳۵۵) سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول لالہ موسیٰ کو م۔اختر سبطین کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ نارمل اسکول نارووال میں ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر گورنمنٹ نارمل اسکول پسرور میں سیکنڈ ماسٹر مقرر کیا گیا۔

〃 م۔محمد عبدالرحیم۔بی۔اے۔ایس۔اے۔وی (۲۵۰ — ۳۵۵) سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول

آموزش

جہلم کو۔ خ۔ عبدالمجید کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر گورنمنٹ نارمل اسکول لالاموسیٰ میں سیکنڈ ماسٹر مقرر کیا گیا۔

ای/۳۰۶۸۸ م۔ فیض حسین۔ ایس۔ وی (۱۵۰ ـــ ۲۵۰) گورنمنٹ نارمل اسکول شاہ پور صدر کو۔ م۔ محمد رفیق
۲۷ اکتوبر ۱۹۵۳ء کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول للّہ مقرر کیا گیا۔

م۔ محمد رفیق۔ ایس۔ وی (۶۰ ـــ ۱۴۰) معلم اردو (آزمائشی) گورنمنٹ ہائی اسکول للّہ کو۔ م فیض حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر معلم اردو گورنمنٹ نارمل اسکول شاہ پور صدر مقرر کیا گیا۔

ای/۳۰۷۰۲ م۔ عطا محمد چوہدری۔ خاص سند برائے تدریس ڈرائنگ۔ ایک امیدوار کو م۔ عبدالرشید کی
۲۷ اکتوبر ۱۹۵۳ء جگہ جن کی ملازمت ثانیہ کی میعاد ۲۰ دسمبر ۱۹۵۳ء کو ختم ہو جائے گی ۲۰ دسمبر ۱۹۵۳ء کے بعد کی اس تاریخ سے جس کو وہ حاضر ہوں ۶۰ ـــ ۱۴۰ کے گریڈ میں ۶۰/- روپے ماہوار پر قائم مقام معلم ڈرائنگ گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں مقرر کیا گیا۔

ای/۳۰۷۰۴ م۔ عبدالغنی (۶۰ ـــ ۱۴۰) معلم دستکاری گورنمنٹ ہائی اسکول شرق پور کو تاریخ حاضری سے
۲۷ اکتوبر ۱۹۵۳ء اپنی تنخواہ پر معلم دستکاری گورنمنٹ ہائی اسکول میاں والی مقرر کیا گیا۔ وہ اپنی آسامی کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ھے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو سرکاری اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ھے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ھے - جو کہ مینیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر
پنجاب ایجوکیشنل جرنل
اموزش
۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

آموزش

۶ شمارہ ۹] لاہور [دسمبر ۱۹۵۳ء

اس شمارہ میں

مدیر : بشیر ہاشمی

معاونین : عبدالغفور چودھری
فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

وزش

آموزش

لاہور

دسمبر سنہ ۱۹۵۳ء

جلد ——— ۶

شمارہ ——— ۹

سالانہ چندہ

پاکستان کے لئے ۶ روپے

غیر ممالک کے لئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

غیر معمولی اہمیت
ں کے لئے
کے لئے بھی
رفسطائی
نیا کو تباہی
ہے کہ
لیا جا
ں کے
ی خطرناک
ہیں
مال
یکہ
ہیں۔
نہ
ا
ں
ر

ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

فلمیں اور فلمی رسالے

رائے عامہ کے ڈھالنے اور اس کی تربیت میں اخبارات و رسائل۔ ریڈیو اور سینما کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اظہار خیال کے یہ عفریت، قوت سائنسی ذرائع خیر و شر دونوں کے لئے یکساں طور پر استعمال ہو سکتے ہیں، یہ عوامی تعلیم کی اشاعت اور صحت مند سیاسی شعور کی ترقی کے لئے بھی بالکل اسی طرح کارآمد ہیں جس طرح گمراہ کن اور اخلاق سوز پروپیگنڈے کے لئے۔ نازی اور فسطائی حکمرانوں نے ان جادو اثر وسائل کو کلی طور پر مٹھی میں لے کر جس طرح اپنے عوام کو بدھو بنایا اور دنیا کو تباہی اور ہلاکت کے گڑھے میں دھکیلا تھا اس کا حال سب کو معلوم ہے، اس سے یہ سبق لینا تو درست ہے کہ کسی حکومت کو خیالات پر پہرہ بٹھلانے کی اجازت نہ ہونی چاہیئے۔ لیکن کیا اس سے یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ چند نفع اندوز افراد کو اس بات کی کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ کاروباری آزادی کے پردے میں عوامی اخلاق کا بیج بیوپار کرنے لگیں، یقیناً ایسا کرنا قومی بہبود کے لئے بالکل ایسا ہی خطرناک ہوگا جیسا آزادی رائے کو ختم کرنا۔ اخبارات۔ ریڈیو اور فلم، دور حاضر کے بے پناہ طور پر موثر حربے ہیں انھیں صرف بہبود عامہ کے لئے استعمال ہونا چاہیئے کسی محدود تنگ مفاد کا ان پر چھا جانا بہرحال نقصان دہ ہے مسئلے کا یہی پہلو ہے جس نے جدید ترقی پسند ریاست کو اس بات پر مجبور کیا ہے۔ کہ وہ عوام کی امین ہونے کی حیثیت سے ان وسائل پر کڑی نگرانی رکھے جو رائے عامہ کو متاثر کرتے ہیں۔

اس اشاعت میں ہم ایک مضمون شائع کر رہے ہیں جس میں عام فلمی رسالوں کے اخلاق سوز اثرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ مضمون میں جو اقتباس دیئے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان رسالوں کا سب سے بڑا سہارا شہوانیت کی تجارت ہے۔ برہنگی اور فواحشی کو اس طرح فلمی آرٹ کے پردے میں پھیلانے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ عوام کا اخلاقی احساس رفتہ رفتہ کند ہو جائے اور

ہماری معاشرتی زندگی انھیں اخلاقی برائیوں کا شکار بن جائے جن کے بوجھ تلے آج مغربی دنیا کراہ رہی ہے۔ تغیر اور تبدیلی کے موجودہ دور میں جب بہت سی روائتی قدریں پہلے ہی ماند پڑ رہی ہیں۔ ایسا کرنا اخلاقی انارکی کو دعوت دینا ہوگا۔

تعلیم کے نقطۂ نگاہ سے مسئلے کا زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کی پسندیدہ دلچسپیاں ان پڑھ عوام کے لئے قابل تقلید مثال کا درجہ رکھ سکتی ہیں۔ اس لحاظ سے تعلیم ان دلچسپیوں کے معاملے میں بے پروائی نہیں برت سکتی۔ دیہات کی پاکیزہ اور صحت مند زندگی ہماری قومی قوت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی ہے۔ اب تک دیہاتی فضا شہروں کے مخرب اخلاق اثرات سے بڑی حد تک بچی رہی ہے۔ کیا تعلیم کی اشاعت ان پست بمضر اثرات کو اس صحت مند فضا میں لے جانے کا ذریعہ تو ثابت نہیں ہوگی؟ تعلیم کے مستقبل کے لئے یہ ازحد ضروری ہے کہ اس بارے میں اچھی طرح اطمینان کر لیا جائے۔

متحرک تصویروں میں بے پناہ تعلیمی امکانات موجود ہیں۔ لیکن ان امکانات سے فائدہ اٹھانے کے لئے کسی سوچے سمجھے منصوبے پر کاربند ہونا ضروری ہے۔ اس وقت بے مقصد جنسی اکساہٹ کا جو طوفان متحرک تصاویر سے اُٹھ رہا ہے وہ محض بدلگام ذاتی منفعت کی پیداوار ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اخلاق اور متوازن جذبات کی سلامتی کے لئے فلموں اور فلمی رسالوں کے ذریعے کسی ایسی چیز کو اچھالا نہ جا سکے جس سے اسلامی اخلاق کو ٹھیس لگنے کا احتمال ہو۔

دو مسلمان عالموں کی وفات

پچھلے چند ہفتوں میں دنیائے علم و نظر دو مایہ ناز مسلمان عالموں سے محروم ہو گئی۔ پہلے علامہ سید سلیمان ندوی وفات پا گئے اور تھوڑے دنوں بعد علامہ عبداللہ یوسف علی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ط

سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی کی تکمیل اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کی تاسیس سے جو دینی اور ثقافتی خدمت انجام دی وہ ایسا کارنامہ ہے جس پر ان کی قوم کو ہمیشہ فخر رہے گا۔

علامہ عبداللہ یوسف علی کا شمار عہد حاضر کے ان چوٹی کے مسلمان علما میں ہوتا ہے جن کے تبحر علمی کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے اور جن کی تصنیفات مشرق اور مغرب کی بہترین علمی روایات کی حامل ہیں۔

مرحوم پچھلی صدی کے خاتمہ کے قریب انڈین سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ اس زمانے میں یہ کامیابی بذات خود ایک فوق العادۃ قابلیت کی دلیل تھی۔ اس کے بعد وہ کئی ایک ممتاز سرکاری عہدوں پر فائز رہے، دو مرتبہ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ لیکن ان کی زندہ جاوید شہرت کا مدار ان کے علمی کارناموں پر ہے۔ ان کی سب سے اہم تصنیف قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اس ترجمے میں مرحوم نے اپنے علم و فضل کا سارا زور کتاب حکیم کے مطالب اور رموز کو مغرب کے سامنے ایک پُر زور، بلیغ اور جاذب پیرائے میں پیش کرنے پر صرف کر دیا ہے۔

سید سلیمان ندوی اور علامہ یوسف علی کی وفات نے ہماری زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا کر دیا ہے جو مدت تک پورا نہ ہو سکے گا۔

پیشہ ورانہ تعلیم (حدیث کی روشنی میں)

عبدالغفور چوہدری

معاشرتی اور پیشہ ورانہ زندگی میں کسی شخص کا اپنے فرائض کو پوری ذمہ داری سے انجام دینا قابلِ تحسین فعل سمجھا جاتا ہے۔ اس موضوع پر ایک حدیث ہے جو پیشہ ورانہ تعلیم کے مسئلہ پر بڑی دلچسپی کے ساتھ روشنی ڈالتی ہے۔ آں حضرتؐ نے اعلان کیا ہے کہ ایک خزانچی جو احکامات کو باقاعدگی کے ساتھ بجا لاتا ہے اور ہر شخص کو ہدایات کے مطابق حسنِ خوبی کے ساتھ رقم دیتا ہے اس کا شمار مخیر لوگوں میں ہوگا۔ یہ حدیث محض پیشہ ورانہ تربیت اور ایک معاشرتی طور پر موثر نظام تعلیم کی اہمیت پر زور نہیں دیتی ہے۔ بلکہ محدود صنعتی تعلیم کو ایک ایسی سطح پر لاتی ہے جہاں زندگی کے اس قسم کے پیشوں کی انسانی اور معاشرتی پہلوؤں کو تسلیم کیا جاتا اور انھیں سراہا جاتا ہے۔

امام محمد بن الحسن سے پوچھا گیا کہ وہ زہد و تقویٰ پر کوئی کتاب کیوں نہیں تصنیف کرتے؛ انھوں نے جواب دیا کہ "وہ تجارتی معاملات پر ایک کتاب لکھ چکے ہیں اور یہ کہ وہ تمام مقاصد کے لئے کافی ہے"۔

(اس سے) معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے عالم دینیات نے پیشہ ورانہ تربیت کے مسئلہ کو حل کرنے میں ٹھوس خدمات انجام دی ہیں۔ اور ان کی تصانیف اپنی نوعیت میں اتنی جامع تھیں کہ وہ اس مخصوص پیشہ کے فنی اور اخلاقی دونوں پہلوؤں پر محیط تھیں۔ صنعتی تعلیم کے جدید نظام کا المیہ یہ ہے کہ وہ محض روزمرہ کے تجربات پر مبنی اصولوں کی تربیت میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ اور اس سے طالب علم کو اپنے پیشہ کی معاشرتی اور اخلاقی بنیاد کے بارے میں کوئی بصیرت نہیں ملتی، یہ درست ہے کہ قوم کی پیشہ ورانہ اور کاروباری سرگرمیوں پر مذہبی احکامات عائد کرنے سے معاشی اعتبار سے ان کی ترقی میں کسی حد تک رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، لیکن ان سے قوم کے تجارتی تعلقات پر کافی اخلاقی اثر پڑتا ہے۔ ایک ایسے عہد میں جس میں ذرائع رسل و رسائل بہت قلیل تھے اور بین الاقوامی بنیاد پر

کاروباری معاملات روزمرہ کی زندگی کا نمایاں جزو نہیں تھے۔ ایک قوم کے لئے تجارت کا اخلاقی اور انسانی پہلو معاشی پہلو کے مقابلہ میں زیادہ اہم تھا۔

ایک عجیب اتفاق ہے کہ دنیائے اسلام میں پیشہ ورانہ تعلیم کا رواج غیر عملی تعلیم کے متوازی رہا ہے علماء کا ایک طبقہ ہمیشہ ایمان داری سے مالی اجرت کے خلاف اعتراض کرتا رہا ہے اور انھوں نے ہمیشہ کوئی نہ کوئی پیشہ اس مقصد کے تحت سیکھا کہ وہ اپنی مخصوص روش پر چلنے سے قبل معاشی اعتبار سے کسی دوسرے کے محتاج نہ رہیں۔ ترمذی کے مطابق پہلے (زمانہ میں) علماء ایک پیشہ سیکھتے تھے اور اس کے بعد علمی مطالعات پر رجوع ہوتے تھے۔ اس طرح پر وہ اپنی "حق حلال" کی کمائی پر قناعت کرتے تھے اور کبھی دولت مند طبقہ کے مال و دولت پر حریصانہ نظر نہیں ڈالتے تھے۔ اسلامی معاشرہ کا تعلیم یافتہ طبقہ ہر قسم کے پیشہ کو اختیار کرتا تھا۔ اور کسی پیشہ کو اپنے لئے حقیر نہیں سمجھتا تھا۔ بشرطیکہ وہ اس سے ایمان داری کے ساتھ معاش پیدا کر سکتے اور علمی دنیا میں ایک غیر محتاج روش پر آگے بڑھ سکتے ان پیشوں کی فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وافر تنوع اور انتخاب کی بڑی آزادی پیش کرتے ہیں، اور اس سے اس امر کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ اس طریقہ نے کتنی کامیابی کے ساتھ علمی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے درمیان کی خلیج کو پُر کیا تھا۔ صندوق بنانا۔ تار کھینچنا مس گری۔ جلد سازی اور کتابت چند پیشے تھے جنھیں عہد گذشتہ کے علماء اختیار کرتے تھے

کسی نظام تعلیم میں پیشہ ورانہ تعلیم کی اہمیت اور امتیازی شکل کی تعیین عوام کے معاشرتی اور سیاسی نقطۂ نظر سے ہوتی ہے۔ اگر معاشرہ نے طبقات۔ عوام اور حاکم و محکوم کے درمیان دیوار حائل کر دی ہے تو ان کے نظام تعلیم میں اس کا بہت کافی اثر پڑتا ہے اور قدیم یونانیوں کی طرح ان حالات کا آخر کار نتیجہ ایک متوازی نظام تعلیم ہوتا ہے جس میں اعلیٰ طبقات کے لئے ایک سطحی نمائشی اور خالص علمی قسم کی تعلیم ہوتی ہے اور عوام کے لئے محدود صنعتی قسم کی تعلیم ہوتی ہے۔

لیکن اسلامی معاشرہ میں اس کے ابتدائی زمانہ میں معاشرتی گروہوں کے درمیان کوئی ناقابل عبور حد امتیاز نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی عام اور پیشہ ورانہ تعلیم میں کوئی غیر منصفانہ امتیاز ہوتا تھا.....

اسلامی معاشرہ ایک سالم وحدت تھی اور اس کی آبادی میں کوئی ایسا ضابطہ پرست حاکم عنصر نہیں تھا۔
جو نسلی برتری یا ایک مخصوص نظام تعلیم کی بدولت حاصل کئے ہوئے ذہنی خصائص کی بنا پر دوسروں
پر حکومت کرنے کے حق کا دعویٰ کرتا۔ سلطنت نظم ونسق کے لئے اعلیٰ تنخواہوں کے عہدے دار رکھنے
کا دعویٰ نہیں کرتی تھی۔ بلکہ زیادہ تر عہدے ایسے ہوتے تھے۔ جو معاشرہ کے لئے رضا کارانہ طور پر
بلا معاوضہ انجام دیئے جاتے تھے، یہ حالات مشکل سے ملاؤں کی عام تعلیم کے لئے سازگار تھے
اور یہی وجہ ہے کہ ہم پیشہ ورانہ اور غیر عملی نظام تعلیم کے درمیان کوئی خلیج نہیں پاتے۔ اور غیر عملی
نظام تعلیم اور تعلیمی متفکرین ہمیں ان دو قسم کی تعلیموں کے درمیان ایک ہم آہنگ توازن قائم رکھنے کے
مروجہ دستور کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں اور نصاب تعلیم کی از سر نو تنظیم کا اصول تسلیم کرتے ہیں۔
مثال کے طور پر الغزالیؒ نظم ونسق کے کام کو زندگی کے دوسرے پیشوں کے برابر شمار کرتے ہیں
اور انھوں نے پیشہ کی جو تعریف کی ہے۔ وہ اتنی ہی وسیع اور جامع ہے جتنی جان ڈیوی کی۔ اگر
امریکی متفکرین تعلیمی نظام میں پیشہ کی ٹریننگ کی از سر نو بحالی کی حمایت کرتے ہیں اور اس کی اخلاقی
اور معاشرتی قدروں کے تسلیم کئے جانے کا مطالبہ کرتے ہیں تو الغزالیؒ نے بھی قوم کی زندگی میں
پیشوں کی معاشرتی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے ان (کی تعلیم) کو خالص ذہنی نوعیت کے دوسرے
مطالعوں پر فوقیت دی ہے۔ احیاء میں انھوں نے علم کو فرض عین اور فرض کفایہ میں تقسیم کیا ہے اور
موخر الذکر کے تحت ان تمام علوم کو شامل کیا ہے جو دنیاوی کاروبار کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے
ناگزیر ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے زراعت۔ باغبانی۔ کتائی، بنائی، خیاطی وغیرہ پیشے گنوائے ہیں
اور معاشرہ کے ایک طبقے پر ان پیشوں کی تعلیم ایک مذہبی فرض کی حیثیت سے عاید کی گئی ہے
اگر کوئی شخص کوئی پیشہ اختیار کرتا ہے تو اس لئے اس پیشہ کا علم فرض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ
سوداگر ہے تو اسے سود اور تجارتی معاملات کے تمام احکامات سے واقف ہونا چاہئے، حضرت عمرؓ
نے تجارت پیشہ لوگوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر وہ متعلقہ احکامات کے بارے میں علمیت نہ رکھیں گے
تو انھیں کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ آپ اعلان کرتے تھے کہ جو شخص تجارتی معاملات کے بارے میں

احکامات سے ناواقف ہے۔ اسے اکثر و بیشتر بازار جانا چاہیے۔

اس طرح ان لوگوں کے لئے بھی احکامات ہیں جو دوسرے مختلف پیشے اختیار کرتے ہیں مثلاً ایک حجام جراح کے لئے عمل جراحی۔ دندان سازی اور زخموں کے باقاعدہ علاج کا علم ہونا فرض قرار دیا گیا ہے۔

اب ذہنی مطالعات اور دماغی ضبط و نظم کے لئے حاصل کئے جانے والے علم پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے حساب یا طب کے نکات کی مشق کرنے کی بھی منظوری دی ہے۔ لیکن یقیناً ان کا سیکھنا مذہبی فرض نہیں ہے۔

عام اور پیشہ ورانہ تعلیم کے متقابلتی فوائد پر ان تمام اختلافات کے باوجود یہ پوری بحث بہت تازگی بخش ہے اور ان دو تصوّرات کے درمیان جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں ایک اطمینان دہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور کہیں سے بھی ان دونوں کے درمیان کسی بدمزگی یا تصادم کا شائبہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک فطری ماحصل ہے، اسلام میں معاشرہ کو ایک مسلمہ وحدت تسلیم کرنے کے تصور کا۔

مسلم مفکرین نے اس مصالحت کو کیسے تلاش کیا اور ایک اوسط شہری نے اس پر کیسے عمل کیا، یہ مصالحت پیشہ ورانہ معروفیت کے معاشرتی۔ ثقافتی یا عقلی قدروں میں نہیں پائی گئی.... ایک اوسط کارکن کو کسی خاص پیداواری عمل کے انسانی تلازم سے واقف نہیں کرایا جاتا تھا بلکہ اسے مذہبی تجربات کے ذریعے مجموعی قیمت سے تمام انسانی تلازمات کا درک دیا جاتا تھا۔ فرض عین کے علم کا مقصد اس کو معاشرہ کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے اس کے حقوق اور فرائض سکھلانا ہوتا تھا اور وہ اس امر کو تسلیم کرتا تھا کہ اپنے محدود حلقۂ عمل میں زیادہ موثر طور پر کام کرکے وہ ذاتی طور پر شیت ایزدی پر عمل کرتا ہے۔

یہی چیز اس کی قلبی مسرت کا باعث ہوتی تھی خواہ وہ کتنی ہی ذلیل حالت میں کام کیوں نہ کر رہا ہو اور یہی چیز اس میں ایسی چیزیں پیش کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی تھی جو دنیائے فن میں

حسن اور لطافت میں یکتائے روزگار شمار کی جاتی تھیں۔

اسلامی تعلیم کے وقائع میں علمی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے اتحاد و اتفاق کی مثالوں کی کمی نہیں اور ایک مشہور قصہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک حجام عالم کی امام ابوحنیفہ سے اتفاقیہ مڈبھیڑ ہوگئی جنھوں نے اپنے پیشے کے مذہبی اور انسانی پہلو کے علم کا ایسا وافر ثبوت دیا کہ وہ زبردست عالم ان کے علم کی دولت سے مالامال ہوگیا۔

امریکی تعلیم کو سُرخ خطرہ

امریکی سینٹ کی ماتحت مجلس برائے اندرونی سلامتی نے جو رپورٹ پیش کی ہے، اس میں اس نے کہا ہے کہ "اس بات کی یقینی شہادت موجود ہے کہ امریکی مدرسوں اور کالجوں پر ایسے استادوں نے دھاوا بول رکھا ہے۔ جو اشتراکی پروپیگنڈا پھیلانے کا عہد کئے ہوئے ہیں"

اس ماتحت مجلس نے جس کے صدر سینیٹر جیمز ہیں کوئی ایک سو گواہوں کے بیانوں کا خلاصہ شائع کیا ہے ان میں سے کچھ گواہوں نے مجلس کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے اس کے سوالوں کے جواب دیئے لیکن اکثریت نے تعاون نہیں کیا اور امریکی دستور کی پانچویں ترمیم کی پناہ لیتے ہوئے سوالوں کا جواب دینے سے انکار کردیا۔

ماتحت مجلس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ تعاون نہ کرنے والے استاد اشتراکی پارٹی کے رکن رہ چکے ہیں اور اس کے نظریات کی اشاعت کرتے رہے ہیں۔ ان استادوں میں سے اکثر کو کالجوں اور یونیورسٹیوں سے برطرف کیا جاچکا ہے۔

تعلیم کا رُخ کدھر ہے؟

فضل احمد

صوبائی حکومت ہر سال تعلیم پر کم و بیش تین چار کروڑ روپے صرف کرتی ہے۔ اگر اس مد میں وہ رقوم بھی شامل کر لی جائیں جو نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور والدین کی جیبوں سے نکلتی ہیں تو نہ صرف پنجاب کا سالانہ تعلیمی خرچ پانچ کروڑ روپے تک پہونچے گا۔ اصولاً یہ درست ہے کہ تعلیم پر جس قدر بھی خرچ کیا جائے وہ روپے کا بہترین مصرف ہے لیکن روپیہ صرف کرنے والے کو اس بات کا جائزہ بھی لینا چاہئے کہ آیا عملاً وہ نتائج پیدا ہو رہے ہیں جن کی خاطر اس قدر روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ غالباً یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ تعلیم کی خوبی کا انحصار اس بات پر نہیں کہ مدرسہ چھوڑتے وقت طالب علموں کے ذہن و دماغ میں کس قدر واقفیت محفوظ ہے۔ بلکہ اس بات پر کہ وہ مطالعہ و جستجو کی کونسی مستقل عادات اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں، اور ان میں یہ صلاحیت کس حد تک موجود ہے کہ اپنے فارغ اوقات کو صحت مند تفریحی مشاغل سے پُر کر سکیں۔

ہمارے نوجوانوں کے تفریحی مشاغل کا مطالعہ بہت دلچسپ اور سبق آموز حقائق کو منظر عام پر لا سکتا ہے۔ لیکن یہ کام کسی ریسرچ سکالر یا کسی تحقیقاتی کمیٹی کے کرنے کا ہے۔ اس موقعہ پر ہم اس مسئلہ کے صرف ایک پہلو سے بحث کریں گے جو اس اہم سوال پر ایک معنی خیز جزوی روشنی ڈالتا ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے چھ فلمی رسالے ہیں ان میں سے ایک انگریزی میں ہے اور باقی پانچ اردو میں۔ ممکن ہے ان کے علاوہ کچھ اور فلمی لٹریچر بھی پنجاب میں بکتا ہو۔ لیکن ان چھ رسالوں کی مجموعی اشاعت بھی ستر ہزار سے کم نہیں ہے۔ ان میں سے بعض رسالوں نے انعامی معموں کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ معموں کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ایک رسالے نے

چھوٹے موٹے کل انعام پانے والوں کی جو فہرست تیار کی ہے وہ ایک ہزار تین سو چورانوے ناموں پر مشتمل ہے۔

یہ رسالے کس قسم کی ذہنی غذا مہیا کرتے ہیں؛ اس کا کچھ اندازہ نیچے دیئے ہوئے اقتباسات سے ہو سکے گا۔

سرخیاں ۱۔ مدھو بالا کے عاشق زار کی داستان

۲۔ یاد ایام عشرت فانی۔ ثریا کی کہانی کچھ میری زبانی

۳۔ اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے

۴۔ اداکار یعقوب نے کامنی اور شیکھر کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

اشعار۔ شب و روز اب تمہارے نام کی جپتا ہوں میں مالا

مدھو بالا۔ مدھو بالا۔ مدھو بالا۔ مدھو بالا

مری تاریک راتوں میں اجالا کر کبھی آ کر

مری آپا۔ مری بھابی۔ مری امی۔ مری خالا

مضامین:۔ پہلے شمارے میں ثریا کے ایک سچے پرستار کا واقعہ شائع ہوا تھا...... اس مضمون میں ثریا کے ناشاد اور نامراد عاشق...... کا پورا پتہ درج تھا۔ سیکڑوں قارئین نے اسے خط لکھے...... اس کے سینے کے کئی عاشقانہ راز اپنے کانوں سے سنے ایک خاتون کی سرگذشت بھی پیش کی گئی تھی جو اداکار اشوک کمار کے عشق میں عین دوشیزگی کے عالم میں لاہور سے بھاگ کر بمبئی پہونچی۔ آج وہ خاتون ایک جوان بیٹی کی ماں ہے۔ مگر بڑھاپے کی آمد کے باوجود اس کے دل سے اشوک کمار کے حصول کی خواہش نہیں نکلی۔

نورجہاں کے اس حجام عاشق زار کا پورا حال بھی تحریر ہے جس نے محض اس کے نام کے سوال پر اپنے بازو کا گوشت کاٹ کر قیس عامری کے عشق کی نظیر پیدا کر دی۔

مینا کماری کا کچا چٹھا پڑھنے کے بعد..... کل محبوب پر برے سلوک کا الزام لگاکر اس کو ہزاروں روپے کا نقصان پہونچانے والی اس لڑکی کا ماضی اتنے نوجوانوں کی رنگین داستانوں سے بھرا ہوا ہے ۔

سوال وجواب:- س:- عام فلمی رسالے عریاں تصویریں کیوں شائع کرتے ہیں ؟

ج - کیوں کہ وہ بال کی کھال آتار نے کے قائل ہوتے ہیں ۔

س - آپ کے خیال میں اخلاق عریانیت یا ذہنیت سے بگڑتے ہیں ۔

ج - کوئی چیز اس وقت تک نہیں بگڑتی جب تک اسے بگاڑا نہ جائے، اخلاق کے بگاڑنے میں محض عریانی کو دخل نہیں

س - محبت اور شادی میں کیا فرق ہے ؟

ج - وہی فرق جو آزادی اور اسیری میں

س - فلمی دوستی کے سلسلے میں پتہ لکھیں ۔

ج - فلم ایکٹرس صبیحہ - وکٹوریہ پارک - مال روڈ لاہور - لیکن دوستی سے قبل اپنی جیب کا اندازہ لگا لیجئے ۔

یہ اقتباسات جو محض مشتے از خروارے کے طور پر لئے گئے ہیں - اپنی شرح آپ ہیں ۔ ان کو دیکھ کر قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نوجوانوں کے آتش گیر جذبات میں آگ لگانے اور انھیں ایک پست - بے نتیجہ ذہنی عیاشی کا چسکا ڈالنے کی اجازت کس حد تک دی جا سکتی ہے ؟ کیا قومی دولت کا ایک خطیر حصہ تعلیم پر اس لئے صرف کیا جاتا ہے کہ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد فلمی ستاروں کے ہیجان خیز اور گھٹیا قسم کے رومانوں میں کھوئی رہے اور ان کی نگاہوں کے لئے ہوا و ہوس کے یہ بندے ہی آخری افق بن کر رہ جائیں ؟ اس قماش کے ایک سال خوردہ فلمی متوالے کے الفاظ میں " کوئی محفل نہیں جہاں ایکٹرسوں کے حسن کا تذکرہ نہ چھڑتا ہو - کوئی گھر نہیں جہاں ہر فرد نے کسی نہ کسی ایکٹرس کو اپنے محبوب کا درجہ نہ دیا ہو..... طلبہ کی نشست گاہوں کی دیواروں پر ایکٹرسوں کے کیلنڈر اور کلرکوں کی جیبوں میں

ایکٹرسوں کی تصویریں بھی اکثر دیکھی گئی ہیں..... ان اخباروں کی اشاعت جن میں ایکٹرسوں کی تصاویر بھی شائع ہوتی ہیں۔ ان اخبارات سے کئی گنا زیادہ ہے جن میں لوگوں کی قسمتوں کے فیصلے درج ہوتے ہیں۔"

اوپر کا اقتباس ایک ایسے ذہنی رجحان کی خبر دیتا ہے جو دن بہ دن ترقی پر ہے۔ بے شک ہر زمانے میں بعض معاشرتی مونثرات کو قبولیت عامہ کی سند ملا کرتی ہے۔ اور جدید سائنسی تہذیب میں یہ امتیاز سینما اور ریڈیو کے حصے میں آیا ہے۔ اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں نہ کسی کو انکار ہو سکتا ہے اور نہ ہی سائنس کی ان ایجادوں میں فی نفسہ کوئی برائی۔ لیکن ہمارے ملک میں ان سے جو کام لیا جا رہا ہے اس کے بارے میں ہر ذی ہوش شہری کو تشویش ہونی چاہیئے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ پڑھے لکھے مردوں اور عورتوں میں سے بہتوں کی نگاہوں میں پردہ سیمیں کے کردار چکاچوند پیدا کیے رکھتے ہیں اور ان کی آرزوؤں کا معراج یہ بن گیا ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان ستاروں کے ساتھ لگاؤ پیدا کیا جائے۔ ان کے لئے اس کی سہل ترین صورت یہ بن گئی ہے کہ اپنے فرصت کے اوقات ان ستاروں کی سنسنی خیز رومانی دنیا میں گذاریں اور گھٹیا قسم کے سوالات فلمی رسالوں میں چھپوا کر اس پست جذباتی دنیا کی گرمی کو برقرار رکھیں۔

یہ صورت حال تعلیم کے لئے خصوصیت سے گہری تشویش کا موجب ہونی چاہیئے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ تعلیم کا مقصد محض کچھ واقفیت اور مہارتیں بہم پہونچانا نہیں، یہ دونوں چیزیں اپنی جگہ اہم ہیں، مگر ان دونوں سے زیادہ ضروری وہ ذہنی اطوار ہیں جو تعلیم پیدا کرتی ہے، پسندیدہ ذہنی اطوار کا بڑا کارنامہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ فرد کے لمحات فرصت کو پاکیزہ تفریحی مشاغل سے پُر کریں ایسے مشاغل جو روح میں فراخی، ذہن میں بلندی اور قلب و نگاہ میں تیز قوت احساس کو ترقی دیں۔ اس معیار پر پرکھنے سے ہماری تعلیم کی کیا قیمت باقی رہ جاتی ہے؟ ایک ایسے ملک کے لئے جو پیٹ کاٹ کر تعلیمی ضرورتوں کو پورا کر رہا ہو اس سوال کا تسلی بخش جواب معلوم کرنا از بس لازمی ہے فلمی رسالے مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی چھپتے ہیں اور غالباً ہمارے یہاں کی نسبت

زیادہ تعداد میں چھپتے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں چند باتوں کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ جس ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب نوّے یا اٹھانوے فی صد ہو وہاں پندرہ بیس فی صد کا پست لٹریچر کے مطالعے سے جی بہلانا زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ دوسرے ان ملکوں کی معاشی حالت ہمارے مقابلے میں اتنی مضبوط ہے کہ وہاں اگر تعلیمی مصارف کا ایک چھوٹا سا حصہ خاطر خواہ نتائج پیدا کرے تو بھی چنداں مضائقہ نہیں، تیسرے ان ملکوں میں سینما صرف دل لگی کا ایک ذریعہ ہے اور بس۔ فلمی ستاروں کو وہاں "ہیرو" کا درجہ نہیں ملتا۔ وہ نوجوان طلبہ اور طالبات کے لئے "نشانِ منزل" کی حیثیت نہیں رکھتے، اس کے برعکس ایک ایسے ملک میں جہاں شخصیت پرستی صدیوں سے عوام کے خمیر میں چلی آ رہی ہو، یہ خطرہ بالکل حقیقی ہے

پاکستان کی کل آبادی میں پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب تیرہ چودہ فی صد سے زیادہ نہیں اگر ان پڑھے لکھے لوگوں میں سے آدھے بھی پسندیدہ ذہنی اطوار سے خالی رہیں تو ہماری تعلیم کے لئے یہ ایک بہت بڑا المیہ ہوگا۔ ملک کو جن معاشی دشواریوں کا سامنا ہے وہ کسی سے چھپی نہیں ہم ایک جمہوری معاشرے کی تعمیر میں مصروف ہیں، اس عمارت کا سنگ بنیاد عوام میں ذمہ داری کا احساس ہے، یہ احساس سیاسی سوجھ بوجھ کے بغیر ممکن نہیں، جب تک عوام شہریت کے حقوق اور فرائض کو اچھی طرح نہیں پہنچانتے۔ اس وقت تک صحت مند جمہوری اقدار کا قومی زندگی میں مضبوط جڑیں پکڑنا بہت مشکل ہے جس ملک میں کل ساڑھے تیرہ فی صد آبادی لکھنے پڑھنے کے قابل ہو اور ان خواندہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد بھی ملک کی سیاسی صحت کی بجائے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے معاملات میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہو۔ وہاں تعلیم اور سیاسی شعور کو کس حد تک لازم و ملزوم قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہم بجا طور پر بار بار مطالبہ کرتے ہیں کہ ملک کی پہلی ضرورت مفت اور لازمی ابتدائی تعلیم ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اس بات کا اطمینان بھی کر لینا چاہیئے کہ کیا تعلیم کی اشاعت ہماری تنو مند دیہاتی آبادی کو ایکٹرسوں کے عشق لاحاصل میں گرفتار کر کے تو نہیں رکھ دے گی؟ اگر تعلیم کے عام ہونے سے دیہاتی گھروں کی سادہ فضا کو بھی شہروں کی طرح

ایکٹرسوں کے حسن کے تذکروں سے معمور ہوتا ہے تو ایسی تعلیم کا اہتمام کرنے سے پہلے ذمہ دار لوگوں کو اچھی طرح سوچ بچار کر لینی چاہیئے۔

مسئلے کا ایک اور پہلو بھی خاص توجہ کا محتاج ہے، برصغیر پاک و ہند میں سچی جمہوری اقدار وسیع پیمانے پر کبھی گہری جڑیں نہ پکڑ سکیں۔ اسلام ایک خاص الخاص جمہوری روح کا حامل ہے، مگر ہم اس کی آغوش میں آجانے کے بعد بھی صدیوں پرانی شخصیت پرستی کو دلوں سے نہ نکال سکے، پہلے ہمارے ہیرو فاتحین، صوفیا، مشائخ اور علماء تھے، جدید دور نے ان سب کی جادو اثری کا خاتمہ کر دیا ہے، اب ان کی جگہ عوامی ذہن پر کون کون سی شخصیتیں چھائی جا رہی ہیں، کیا فلمی ستارے ان شخصیتوں میں شامل تو نہیں؟ پڑھے لکھے لوگوں کی ایک خاصی تعداد کے بارے میں اس سوال کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے۔

قومی زندگی کی رہنمائی ان دنوں سیاسی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، نہ صرف ان کا اقتدار ایک ڈھلتی چھاؤں نظر آتا ہے بلکہ اس اقتدار کی بنیاد عموماً لوگوں کے دلوں میں نہیں۔ بلکہ وقتی مفاد اور ڈر خوف پر رکھی جاتی ہے۔ ان حالات میں یہ امر بہت اہمیت رکھتا ہے کہ عوامی نگاہوں میں کن لوگوں کی شخصیت نے چکا چوند پیدا کر رکھی ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو عام طور پر طریقوں اور روزمرہ کی دلچسپیوں کو متاثر کریں گے۔

روایتی قدامت پرستی اور غیر معمولی اہمیت نفس نے آج تک ہماری دیہاتی آبادی کو شہروں اور قصبوں کے تباہ کن اخلاقی اثرات سے بچائے رکھا تھا، اب یہ حفاظتی دیواریں گرتی نظر آ رہی ہیں۔ اب گاؤں کی نمبرداری اور رہنمائی ایسے نوجوان چوہدریوں کے ہاتھوں میں آتی جا رہی ہے جو حقّہ کی بجائے سگرٹ۔ لسی کی بجائے چائے اور تہبند کی بجائے پتلون کے شیدائی ہیں۔ یہ جدید وضع کے چوہدری فلموں اور فلمی رسالوں کے دلدادہ ہیں۔ لکھنے پڑھنے کی قابلیت عام ہو جانے پر جب گاؤں کے عام نوجوان بھی انھیں تفریحوں سے جی بہلانے لگے تو وہ دن دور نہیں جب بڑ کے سائے میں حقّے کے گرد دیہاتی سیاست پر بحث ہونے کی بجائے ایکٹرسوں کے حسن کے تذکرے چھڑا کریں گے اور اس مجلس میں ہر دیہاتی اپنی فلمی محبوبہ کی مدح کے قصیدے پڑھا کرے گا۔ کیا یہ دن صحت مند قومی زندگی کے لیئے اچھا ہوگا؟

اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو ابھی سے اس کی روک تھام کے طریقے سوچنے چاہئیں۔

غرض تعلیم کے لئے یہ سوال اس قدر اہم ہے کہ اس سے مزید لاپرواہی افسوس ناک ہو گی تاہم یہ مسئلہ اس قدر الجھا ہوا ہے کہ اس کا کوئی دو سطری حل پیش کرنا خارج از بحث ہے معاشرتی مؤثرات کی کارفرمائیاں عموماً ایسے پیچ در پیچ زیر زمیں راستے اختیار کیا کرتی ہیں جن کا کھوج لگانا طویل مطالعہ اور کافی محنت چاہتا ہے۔ ہم ذمہ دار لوگوں سے استدعا کریں گے کہ اس مسئلہ کی چھان بین کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو یہ معلوم کرے کہ وہ کون سے محرکات ہیں جو نوجوان طلبہ اور طالبات کو بالخصوص اور پڑھے لکھے بالغوں کو بالعموم پست قلمی رسالوں کے مطالعہ کی ترغیب دیتے ہیں اور ان محرکات کی تشفی کی زیادہ صحت مند صورتیں کیا ہو سکتی ہیں۔

گاندھی جی کے اس قول میں بڑی صداقت ہے کہ خواندگی تعلیم کی آخری منزل نہیں بلکہ یہ اس کا آغاز بھی نہیں۔ خواندگی ان بہت سے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے جن کی مدد سے تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے خواندگی بذات خود مقصود نہیں بلکہ ایک بلند تر مقصد کو پہونچنے کا زینہ ہے۔ یہ بلند تر مقصد خواندگی کے بغیر بھی ہاتھ لگ سکتا ہے۔ گو خواندگی اس کے حصول کا ایک عام اور سہل ذریعہ ہے۔ ایسی صورت میں وہ خواندگی کبھی پسندیدہ قرار نہیں دی جائے گی جو بلندی کی بجائے الٹا پستی کی طرف لے جائے۔

ہماری صدیوں پرانی روایات نے تعلیم کو دینی اور اخلاقی اقدار سے وابستہ کئے رکھا ہے۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہ تھا کہ اسلامی دنیا کے بڑے بڑے تعلیمی مرکز ساتھ ہی ساتھ دینی مرکز بھی تھے اور مسجد عوامی تعلیم کا نقطۂ وسط تھی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد اخلاق کو سنوارنا اور خیالات میں پاکیزگی پیدا کرنا تھا۔ لکھائی پڑھائی کو فقط اس لئے اہمیت دی جاتی تھی کہ یہ ان پسندیدہ ذہنی اطوار کے کتابی ذخیرہ کی کنجی ثابت ہوتی تھی۔ پڑھے لکھے لوگ عموماً جن کتابوں کو پڑھ کر جی بہلاتے تھے وہ اخلاقی اسباق سے بھری ہوتی تھیں۔ اور حسن و عشق کے مقبول عام قصے بھی اس رنگ سے خالی نہ ہوتے تھے۔

اس وقت ہمارے پڑھے لکھے طبقہ کا ایک بڑا حصہ خواندگی سے جو کام لے رہا ہے اس کی ایک

جیسا کہ فلمی رسالوں کے اقتباسات میں پیش ہو چکی ہے، ان رسالوں کے علاوہ بے شمار اور عریاں جنسی بحثوں سے لبریز افسانے اور ناول ہیں جو جگہ جگہ بک سٹالوں پر نظر آتے ہیں، اس پست لٹریچر کے متعلق کوئی مکمل اعداد و شمار ہاتھ نہیں لگ سکے۔ تاہم یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی بکری اردو کے معیاری افسانوں اور ناولوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے، پچھلے دنوں ایک صاحب کے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا تھا کہ ان گھٹیا کتابوں کی سرپرستی زیادہ تر پڑھی لکھی صاحبزادیوں کی طرف سے ہو رہی ہے جو نوکروں کی معرفت انھیں خریدتی ہیں۔

یہ حقائق بہت چونکا دینے والے ہیں۔ خواندگی ایک پسندیدہ شے ہے اور اس کی اشاعت و توسیع ضروری۔ مگر اسی طرح ضروری ان مقاصد پر نگاہ رکھنا ہے جو اس کی مدد سے حاصل کئے جا رہے ہوں تعلیم صرف خواندگی پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ اس کا نقطہ آغاز ہے۔ اگر خواندگی کے بعد پڑھے لکھے لوگوں کے ہاتھوں میں ایسی کتابیں نہیں دی جا سکتیں جو صحت مند ذہنی اطوار پیدا کریں تو ایسی خواندگی بے کار ہی نہیں بلکہ مضر ثابت ہو سکتی ہے۔ معاشرتی سالمیت کی بنیاد صحت مند گھریلو زندگی پر ہے جس معاشرے کی ترقی پسند عورتیں اداکارہ بننے کا ارمان دل میں لئے رکھیں "اور ٹھنڈا گوشت" اور اس قماش کے افسانے پڑھ کر جی بہلائیں اس کی سالمیت خطرے سے خالی ہو تو کیوں کر؟

ان برائیوں کے خاتمہ کا علاج یہ نہیں کہ فلم اور فلمی رسالوں کا خاتمہ کر دیا جائے، متحرک تصویر عہد حاضر کی ایک سحر کار ایجاد ہے، اس میں بذات خود کوئی برائی نہیں، البتہ اس سے کام لینے کا ڈھنگ برا بھی ہو سکتا ہے اور اچھا بھی۔ پہلی صورت تعلیم کی کوششوں پر پانی پھیر دینے والی ہوگی اور دوسری انھیں تقویت دینے والی، تعلیم اس امر سے غافل نہیں رہ سکتی کہ متحرک تصویر کا عمل اس کی موافق سمت میں ہے یا مخالف سمت میں۔

• تعلیم کے لئے اغراض و مقاصد جان کا درجہ رکھتے ہیں وہ اس بات سے کبھی بے پروا نہیں ہو سکتی کہ اس کا رخ کدھر ہے۔ تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ تجربے کے معانی کو بڑھائے اور آئندہ تجربوں کا رخ ... اضافہ کرے، یہ کام ذہنی تبدیلی پیدا کرنے سے انجام دیا جاتا ہے تعلیم کا

ماحصل وہ مستقل ذہنی اطوار ہیں جو فرد کی زندگی کے لئے بنیاد کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اور جو اس کے قلب و نگاہ کو ایک مخصوص رنگ میں رنگ دیتی ہیں، وہ انہی ذہنی اطوار کی روشنی میں اپنے ارد گرد کی اشیا کو دیکھتا ہے، اور انہی کے سانچے میں اس کے خیالات ڈھلتے ہیں، اس طرح تعلیم کی کامیابی کا اندازہ امتحانی نتائج سے نہیں بلکہ فارغ التحصیل لوگوں کے عام مشاغل سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دور حاضر کے ماہرین تعلیم صحت مند تفریحی مشاغل کو تعلیم کی کامیابی کی ایک قابل اعتماد علامت قرار دیتے ہیں۔ کاروباری زندگی میں ہر شخص کو چار و ناچار کچھ نہ کچھ حدود کے اندر رہ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن تفریحی مشاغل کے معاملے میں یہ پابندیاں بڑی حد تک اٹھ جاتی ہیں اور یہاں افراد کے ذہنی اطوار کو زیادہ صحیح رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جو تعلیم افراد میں صحت مند تفریحی مشاغل سے لطف اٹھانے کی استعداد پیدا نہیں کرتی اس کو اپنے مستقبل کی فکر کرنی چاہیئے۔

موجودہ زمانہ عوامی تحریکوں کا زمانہ ہے۔ اب وہ دور گذر چکا جب تعلیم معدودے چند لوگوں کے لئے مخصوص ہوا کرتی تھی، خواندگی کے عام کرنے کو ہم ایک بنیادی قومی ضرورت خیال کرتے ہیں، یہ دلیل بہت شد و مد سے دہرائی جاتی ہے کہ جب تک تعلیم کا چرچا ملک کے گوشے گوشے میں نہیں ہو جاتا اس وقت تک سیاسی شعور اور ذمہ داری کے احساس کی ترقی ممکن نہیں اس دلیل میں بڑا وزن ہے۔ لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ہم اس معاملے میں بھی مغرب کے تجربے کو اپنے اوپر حرف بحرف چسپاں کر رہے ہیں، مغرب میں عوامی تعلیم صنعتی انقلاب کی پیداوار تھی۔ صنعتی اور معاشرتی انقلاب ہمارے ملک میں بھی آ رہا ہے لیکن یہ اندرونی قوتوں کی طبعی پیداوار نہیں بلکہ خارجی اثرات و حالات سے عہدہ برا ہونے کی ایک ایسی کوشش ہے جو ایک چھوٹے سے فہمیدہ طبقے کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں یہ فرض کر لینا کہ خواندگی از خود خاطر خواہ نتائج پیدا کر دے گی۔ ایک ایسی خوش فہمی ہے جس کا جلد از جلد خاتمہ ہو جانا چاہیئے۔ تعلیم کو نہ صرف خواندگی کا پرچار کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ پسندیدہ دینی اور اخلاقی اقدار کا بھی، اسے ایسا ماحول پیدا کرنا چاہیئے

جو ان اقدار کے لیے سازگار ہو۔ تاکہ خواندگی ان اقدار کے پختہ کرنے کا ذریعہ ثابت ہو۔

اس وقت تک ہمارے ملک میں سائنس کی نیا کردہ سمعی اور بصری امدادوں کو زیادہ تر پروپگنڈے اور نفع بازی کے لیے ہی استعمال کیا گیا ہے۔ تعلیم کو ابھی ان سے کام لینا ہے۔ اس صورت حال کے نتائج ہمارے سامنے ہیں، جو دولت اور توانائی تعلیم کے پھیلانے پر صرف ہو رہی ہے اس کا ایک بڑا حصہ نفع بازی کی دیوانہ وار دوڑ کے باعث نا پسندیدہ ذہنی اطوار پیدا کر رہا ہے اس افسوس ناک صورت کو ختم ہونا چاہیئے۔ فلم اور اظہار خیال کے دوسرے ذرائع کو پروپگنڈے اور نفع بازی کے لیے نہیں۔ بلکہ عوامی تعلیم کے لیے استعمال ہونا چاہیئے۔ یہ اقدام جرأت عمل کے ساتھ عمیق نگاہ کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ اب تک اخلاقی اور دینی تعلیم روایتی درسی کتابوں کی اجارہ داری خیال کیا جاتا رہا ہے۔ فلم اور دوسری سمعی بصری امدادوں کو خلاف دین سمجھ کر انھیں نظر انداز کر دیا گیا۔ لیکن رفتار وقت سے اس طرح رو ٹھ جانے کے نتائج ہمیشہ افسوس ناک ہوا کرتے ہیں۔ اور آج ہم انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

غرض فلم اور فلمی رسالوں نے اس ملک میں تعلیم کے لئے جو مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ وہ گہرا مطالعہ اور دور رس مدا لجاتی اقدام چاہتے ہیں، قومی زندگی کے تعمیری دور میں بالخصوص تعلیم اپنے اغراض و مقاصد سے لمحہ بھر کے لیے غافل نہیں رہ سکتی۔ انگلینڈ اور بعض دوسرے ملکوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، جہاں خواندگی نے کوئی قابل ذکر معنوی انقلاب پیدا نہیں کیا۔ اس کے برعکس ناروے کی مثال ہے، جہاں تعلیم نے ایک خاموش مگر ہمہ گیر معاشرتی انقلاب پیدا کیا ہے اور یہ محض اس لیے کہ ناروے میں تعلیم کا مرکزی نقطہ دینی اور اخلاقی اقدار تھیں، اظہار خیال کے جدید ذرائع اور سچی اسلامی اقدار کو ہم آہنگ کرنا آج ہماری تعلیم کی منہ بولتی ضرورت ہے، اس کام کی دشواری اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ہمارے سامنے کسی ایسی کامیاب کوشش کی نظیر موجود نہیں۔ تاہم کام کی ضرورت اور اہمیت ناقابل انکار ہے۔ اور ذمہ دار لوگوں کو پورے ذرائع اور وسائل کی مدد سے اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

شام میں تعلیم

محمد عبد العزیز

تاریخی پس منظر

شام دنیا کے ان متمدن ملکوں میں شمار ہوتا ہے جنھوں نے ایک نہیں بیسیوں انقلاب دیکھے اور اس کی اپنی جغرافیائی ساخت کی وجہ سے اسے تاریخ عالم میں ہمیشہ ایک نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ دنیا کے تین قدیم براعظم ایشیا افریقہ اور یورپ کے ڈانڈے یہیں ملتے ہیں ایسے مختلف الخیال۔ مختلف اللون۔ مختلف الالسنہ اور مختلف النسل قوموں کا مقام اتصال کہا جاسکتا ہے۔ ازمنۂ قدیم اور ازمنۂ وسطیٰ میں دریائے نیل اور دریائے دجلہ کا درمیانی علاقہ صدیوں انسانی تہذیب و تمدن کا مرکز رہا۔ دنیا کی بعض تہذیبیں یہیں پلی پھولیں۔ اور بعض مذاہب نے یہیں جنم لیا۔ یہودیوں نے اسی سرزمین میں پرورش پائی۔ نصرانی عقائد کا دھارا یہیں سے پھوٹا۔ اور ساتویں صدی مسیحی میں یہی شام اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بن گیا۔ اس طرح بابل و نینوا کی تہذیب۔ مصریوں کے تمدن اور رومی مفاخر نے شام کو بہت کچھ دیا اور شام سے بہت کچھ حاصل کیا۔ بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ سکھایا۔ تہذیبیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ قومیں ابھرتی اور گرتی رہیں۔ قوموں کے اس اختلاط اور ان کی اس آمیزش سے پرانی تہذیبوں کی بنیادوں پر نئی تہذیبوں کی عمارتیں تعمیر ہوتی رہیں اور حق یہ ہے کہ سرزمین شام نے ان عمارتوں کی تعمیر کے لئے چونا گارا فراہم کیا۔ ان کے نقوش میں رنگ بھرا اور ان کے کنگروں کو جاذب نظر بنایا۔

شام کی روحانی قیادت سے قطع نظر اس کی بعض علمی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ لکھنا پڑھنا بجائے خود ایک فن ہے اور ابتدائے کار میں انسانی ذہن کو اس کی تحصیل میں بڑی کاوش کرنی پڑی ہوگی آج ہمارے پاس اظہار خیال کے لئے بہت سی زبانیں اور لکھنے کے لئے بے شمار رسم الخط ہیں جن سے ہم

اپنے مافی الضمیر کو بخوبی واضح کر سکتے ہیں لیکن جب انسان لکھنے پڑھنے سے نا آشنا تھا۔ اس کی ذہنی پرواز ان وسعتوں کی متحمل نہ تھی۔ اس وقت جن لوگوں نے انسانی ذہنوں کی رہ نمائی کی۔ ان کے یہ کارہائے نمایاں فی الواقع لائق تحسین ہیں۔ اور دنیا کو حروف تہجی سے روشناس کرانے کا فخر اس سرزمین کو حاصل ہے۔ یہ حروف تہجی اپنی ابتدائی شکل میں محض نشانات تھے جو پورے لفظ اور بعض اوقات پورے خیال کی نمائندگی کرتے تھے۔ ۸۵۰ ق م میں شامیوں سے اس فن کو یونانیوں نے سیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم[1] یونانی میں حروف یا نشانات۔ اپنی آواز شکل وصورت اور طریق نوشت میں شامی الاصل تھے یعنی داہنی طرف سے بائیں طرف کو لکھے جاتے تھے۔ اور یونانیوں کو بھی اس سلسلے میں شام کی سیادت کا اعتراف ہے۔ اس کے علاوہ رومی دور میں شام نے بعض ایسے فلسفی اور عالم بھی پیدا کیے جنھوں نے افلاطونی عقائد کی تشریح کر کے انھیں رواج دیا۔ بیروت میں رومی قانون کا ایک ادارہ قائم تھا، اس ادارے کے بعض مدرسین کی قانونی رائیں جسٹینیس (JUSTINIAN) کے مجموعہ قوانین بھی شامل ہیں۔

بازنطینی حکومت کے زوال کے بعد شام[2] مسلمانوں کی اس عظیم الشان سلطنت کا مرکز بن گیا جو مغرب میں ہسپانیہ اور مشرق میں سندھ شمال میں تاتار اور جنوب میں بحر ہند کے ساحل تک پھیلی ہوئی تھی اور دمشق اس سواد اعظم کا دارالخلافہ قرار پایا۔ اس وقت کے شام اور آج کے شام میں بہت فرق ہے صدیوں پہلے یہی شام عرب کے صحرا نشینوں کی جولان گاہ تھا۔ فوجوں کی تربیت کا گڑھ اور نئی مہمات کا مرکز۔ اسی شام نے طارق، محمد بن قاسم، موسیٰ بن نصیر جیسے فاتحین کو پالا۔ عمر بن عبدالعزیز جیسے خلیفہ کی عدالت گستری کے کرشمے دیکھے لیکن آج شام مجبور نظر آتا ہے۔ شاید اس کے قویٰ میں اضمحلال اور تعطل پیدا ہو چکا ہے، اس کی فضا فاتحین کے نعروں، مال غنیمت کے انباروں سے معمور نہیں ہے۔ حتیٰ کہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سرزمین سے عربوں کی ساری جذبۂ عدل اور جذبۂ جہاں گیری اور احساس جہاں داری بھی

---

[1] پروفیسر حتی نے "تاریخ شام صفحہ ۱۱۰" پر حروف تہجی کے متعلق پوری بحث کی ہے جس سے اس موضوع پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ آگے چل کر حروف کی ابتدائی تشکیل اور مختلف علاقوں میں ان کی ترقی یافتہ شکلوں کا ایک چارٹ بھی دیا ہے۔

[2] پرانے زمانے میں شام سے مراد وہ خطۂ زمین ہے جسے آج کل شام فلسطین اور شرق اردن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ (تاریخ شام صفحہ ۳۰)

رخصت ہوگیا۔ خلافت آل عثمان کے زوال کے بعد عربوں نے غیرشعوری طور پر فرنگی مدنیت اور فرنگی تہذیب و تمدن کو اپنانا شروع کردیا۔ آج لباس۔ انداز گفتار اور خیالات و عقاید میں شام مغرب کے دوش بدوش ہے اس کے بڑے بڑے شہر لندن و نیویارک سے کم نہیں، اس لئے اس ملک کی ثقافتی۔ ذہنی، سماجی۔ روحانی جسمانی اور تعلیمی زندگی کے تجزیئے کے لئے اس کے ماضی اور حال کو جاننا ضروری ہے۔

موجودہ شام فرنگی مبصرین سیاست اور ہنگامی حالات کی تخلیق ہے، پہلی عالم گیر جنگ میں فرنگی ملوکیت نے ایشیائی ممالک کو اپنے پنجۂ اقتدار میں لینے کی آخری کامیاب کوشش کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ایک طرف مادی وسائل کی فراوانی اور مغربی تہذیب کی چمک دمک اور دوسری طرف خلافت آل عثمان کی تنگ نظری نے عوام کو مفلوج و معطل کردیا تھا، اور جب کسی قوم میں انحطاط رونما ہوتا ہے تو اس کی سماجی زندگی میں ایسے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں جو اس عالی شان عمارت کی تباہی کا موجب بن جاتے ہیں، عربوں اور ترکوں میں جمود پیدا ہو چلا تھا، مغربی نظریۂ قومیت نے مسلمانوں کو از سر نو ترک و تتار۔ آریائی اور شامی طبقوں میں تقسیم کردیا۔ اور گروہی نفرت کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا کہ اجتماعیت ختم ہوگئی اور ملوکیت فرنگیوں کے زیر سایہ پرورش پانے لگی۔ ترک خرگاہی اور اعرابی دالاگہر دونوں آپس میں ایسے الجھے کہ رفتہ رفتہ دونوں کا شیرازۂ حیات بکھر گیا۔ اور جنگ کے اختتام پر دولت عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے سامراجی طاقتوں نے آپس میں تقسیم کرلیا۔ شام پہلی عالم گیر جنگ کے بعد فرانس کی تولیت میں دے دیا گیا۔ انجمن[1] اقوام اس کی نگراں مقرر ہوئی۔

موجودہ شام اور تعلیم

اس سے پہلے مغربی تہذیب کے اثرات شام اور اس کے نواحی علاقوں میں کم کم پہونچتے تھے، لیکن اس اختلاط مغربی خیالات کے ساتھ ساتھ مغربی لباس، اور مغربی تمدن کی آمیزش بھی شروع ہوگئی۔ تعلیم اور تعلیم گاہوں پر بھی اس کا نمایاں اثر پڑا۔

---

[1] انجمن اقوام (LEAGUE OF NATIONS) پہلی عالم گیر لڑائی کے بعد قائم کی گئی۔ لیکن قوموں کے جھگڑے اور ان کے تنازعات کا مناسب حل تلاش کرنے میں ناکام رہی اور دوسری عالم گیر لڑائی کے شروع ہونے کے ساتھ ہی اس ادارے کا خاتمہ ہوگیا۔ انجمن سامراجی طاقتوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھی، اس لئے اس سے عدل و انصاف کی توقع باقی نہ رہی، موجودہ انجمن اقوام کی ایک دوسری شکل ہے جس کے متعلق اقبال نے بہت پہلے یہ کہا تھا ـ من ازیں بیش نداتم کہ کفن دزدے چند۔ بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند۔

چوں کہ روابط کا یہ سلسلہ فرانس اور شام کے مابین شروع ہوا۔ اس لئے شام میں جو نظامِ تعلیم قائم ہوا وہ فرانسیسی نظامِ تعلیم ہی سے مستعار لیا گیا ہے اور اس عمارت کی تعمیر میں جو سنگ وخشت لگائے گئے وہ فرانس ہی سے آئے۔ فرانس میں عام تعلیم چودہ سال تک جاری رہتی ہے۔ شام میں بھی اسی نظامِ تعلیم کو رواج دیا گیا اس چودہ سالہ تعلیم میں ابتدائی وسطانی اور ثانوی تعلیم شامل ہیں۔ لیکن شام میں بچوں کی تعلیم وتدریس کا ذریعہ کبھی کوئی بیرونی زبان نہ بن سکی، مادری زبان ہی آپس میں افہام وتفہیم خیالات کے اظہار اور امتحان کا ذریعہ بنی رہی، یہ بھی عربوں کا ایک مستحسن اقدام ہے، مغربی تہذیب کی بھڑک میں جہاں انھوں نے اپنی بہت سی پرانی روایات کا خون کر دیا ہے کم سے کم اپنی زبان کو تو گم درِ غیر ہونے سے بچا لیا، اس سے عربی زبان میں نئے خیالات اور نئے رجحانات کو داخل ہونے کا موقع ملا۔ اور اس سے زبان اور زیادہ مالدار ہو گئی عربی زبان کی تدریس کے ساتھ ساتھ مغربی زبانوں میں فرانسیسی کو داخل نصاب کر لیا گیا، فرانسیسی عربی کی طرح لازمی زبان تھی جو شام کے ابتدائی مدرسوں میں بھی مادری زبان کی طرح پڑھائی جاتی تھی اور چوں کہ حکومت کا تعلیمی مشیر بالعموم فرانسیسی ہی ہوتا تھا، اس لئے وزارت معارف کے کاروبار اور اس کی پالیسی مرتب کرنے میں اسے جا و بے جا دخل دینے کا کافی موقع ملتا تھا، شام سے جو طلبہ بیرونی ممالک میں مدرسی کی تربیت کے لئے بھیجے جاتے تھے ان میں سے بیشتر فرانسیسی درس گاہوں میں تعلیم پاتے تھے، یہ تربیت یافتہ مدرسین فرانسیسی خیالات اور فرانسیسی نظامِ تعلیم کو بھی اپنا کر آتے تھے، اس لئے شامی درس گاہوں میں فرانسیسی اثرات کا ہونا ناگزیر تھا۔

۱۹۴۳ء میں شام آزاد ہو گیا اور فرانس کی تولیت سے نکل کر اپنے معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ آزادی کے بعد ملک میں انتخابات ہوئے، اور ان انتخابات میں قوم پرستوں کی جیت ہوئی اور انھوں نے اپنی آزاد حکومت بنائی۔ ظاہر ہے کہ یہ حکومت فرانسیسی تاثرات سے پاک ہو گی، اب اس کے سامنے ایک ایسا تعلیمی نظام بروئے کار لانے کا مسئلہ پیش ہوا۔ جو ملکی اور ملی تقاضوں کو بھی پورا کر سکے اور جو قوم کو جدید دنیاوی علوم سے بھی روشناس کرا سکے۔ تاکہ تعلیمی فضا پر فرانسیسی اثرات کے جو بادل چھائے ہوئے تھے وہ بھی صاف ہو جائیں۔ بہر طور اس نئی حکومت کے پیش نظر ایک ایسا عربی نظامِ تعلیم قائم کرنا تھا جو

آنے والی نسلوں کے لئے مفید ہو سکے۔

نئی حکومت کے لئے اس مقصد کی تکمیل آسان نہیں تھی۔ کسی نظام تعلیم کو مفید بنیاد دینا بجز ملک کرنا اور ان حالات میں کہ ملک بیرونی سیاسی طاقتوں کے زیر اثر رہا ہو۔ بڑی ہمت کا کام تھا لیکن شام کی وزارت معارف نے اس سلسلے میں فہم و فراست اور ہمت سے کام لیا اور شام کی تعلیمی تعمیر نو کے لئے ساطع الحصری کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ الحصری کا شمار دولت عثمانیہ کے اونچے ماہرین تعلیم میں ہوتا تھا۔ حکومت کے زوال کے بعد الحصری نے کچھ دنوں شاہ فیصل کے ساتھ شام کے وزیر معارف کی حیثیت سے کام کیا۔ اور جب شاہ فیصل کو شام سے نکلنا پڑا تو الحصری بھی شام سے عراق آگیا اور یہاں بحیثیت ناظم تعلیمات کام کرنا شروع کیا۔ عراق کا موجودہ نظام تعلیم الحصری ہی کا رہین منت ہے۔ ۱۹۴۱ء میں اس نے عراق کو چھوڑا۔ اور لبنان میں سکونت اختیار کر لی۔ لیکن اسی سال حکومت شام نے اس سے اپنے تعلیمی نظام کو درست کرنے کی استدعا کی۔ الحصری نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔ اس نے شام کے نظام تعلیم اور اس کی آئندہ ضروریات کا جائزہ لیا اور اس سلسلے میں سولہ رپورٹیں شائع کیں۔ جو ۱۹۴۷ء میں کتابی شکل میں چھپ چکی ہیں۔

اس رپورٹ کے مندرجات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ الحصری نے مروجہ تعلیم کے رخ کو موڑنے کی کوشش کی اور شامی تعلیم کو فرانس کے اثر سے نکال کر اس نے ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہا جس کی روح مغربی نہ ہو مشرقی ہو۔ اس کی ان تھک کوششوں سے شام کی وزارت معارف نے ایک ایسا قانون منظور کیا جس کی دفعہ ۱۲ کی رو سے ابتدائی مدرسوں میں بیرونی زبان کی تدریس کو نصاب سے خارج کر دیا گیا۔ اور ثانوی مدارس کی پہلی جماعت میں ایک بیرونی زبان کا پڑھنا لازمی قرار دے دیا۔ مگر فرانسیسی زبان کو اور دوسری بیرونی زبانوں پر فوقیت نہیں دی گئی۔ اس طرح اب اس زبان کی حیثیت لازمی زبان کی نہیں۔ اختیاری زبان کی ہو کر رہ گئی۔

۱۹۴۵ء میں فرانس نے ایک مرتبہ پھر شام پر اپنا اقتدار جمانا چاہا۔ بلکہ شام کو ایک لقمہ تر سمجھتے ہوئے انھوں نے دمشق پر بم باری بھی کی۔ اس سے فرانس اور شام کے تعلقات اور خراب ہو گئے تب مبیونی فرانسیسی مدارس کا

مقاطعہ کردیا۔ اس مقاطعہ کی وجہ سے ان ۔۔ ۔ کے ارباب حل وعقد کو ان مدارس کو مجبوراً بند کردینا پڑا۔ اور انتہائی کوششوں کے باوجود حکومت اور ان مدرسوں میں مفاہمت نہ ہو سکی۔ فرانسیسی مدارس حکومت کے منظور کردہ نصاب کو پڑھانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اور اس شرط کو منظور کئے بغیر انھیں درس و تدریس کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ شام کی تاریخ میں یہ ایک معرکۃ الارا واقعہ ہے جس کا اثر ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی پر براہِ راست پڑا۔ اب وہی مدرسے جو مغربی تہذیب کی تربیت گاہیں تھیں اور جہاں عربی زبان وادب اور مذہب وثقافت کی تدریس ممنوع تھی۔ شام کی نئی نسلوں کی ذہنی جسمانی اور روحانی تربیت گاہیں بن گئیں۔

مشکلات اور اِن کا حل

ان مدارس میں طلبہ کی مجموعی تعداد ۳۰۵۹۱ تھی۔ ان کے یکایک بند ہوجانے سے تعلیمی مفاد کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہی نہیں یقینی بھی تھا۔ ہزاروں طلبہ تعلیمی سہولتوں کے عدم اہتمام کی وجہ سے مارے مارے پھرنے لگے اور یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس کا حل وزارت معارف کے لئے بظاہر دشوار تھا۔ اس پر مستزاد تعلیم کی بڑھتی ہوئی مانگ نے اس دشواری میں اور اضافہ کردیا۔ مگر حکومت نے اپنی استطاعت اور اپنے وسائل کے مطابق حالات پر قابو پانے کی جان توڑ کوشش کی۔ ان مزید تعلیمی اخراجات کو پورا کرنے کے لئے کچھ رقم سرکاری میزانیئے میں سے مخصوص کردی اور نئے ثانوی مدارس اور ۵۲ نئے ابتدائی مدارس کھولنے کا اہتمام کیا، پرانے مدرسوں میں ایک ایک درجے میں کئی کئی فریق کھول لینے کا حکم دیا۔ اب تک شام میں نجی تعلیمی اداروں کی بہت کمی تھی، اس کی وجہ لوگوں کی تعلیم سے بے توجہی تھی۔ اور جب عوام میں کسی کام کے کرنے کی دلچسپی اور لگن نہیں ہوتی تو اس کام کی رفتار سست ہوجایا کرتی ہے۔ مگر اس نئے ماحول میں عوامی کوششوں سے نئے مدرسے کھلنے لگے۔ حکومت نے بھی ان کی سرپرستی کی اور ان کی مالی مشکلات میں ان کی حسب ضرورت امداد کی۔ اس طرح شام کے بڑے بڑے شہروں مثلاً دمشق۔ حلب اور حمص وغیرہ میں ثانوی مدارس کی تعداد اور ثانوی مدارس میں تعلیم پانے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا صرف شام کے اچھے بڑے شہروں ہی میں طلبہ کی تعداد میں ۰۳۹۱ کا اور اضافہ ہوگیا اور ابتدائی مدارس میں

۱۸،۷۰۴ کا۔ وزارت معارف نے باقاعدہ بھی اور رول کو رجسٹر کرنا شروع کیا۔ ان مدرسوں میں پڑھنے والے طلبا کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ فرانسیسی مدارس کے بند ہونے کے بعد اس میں ۸۵۲۲ کا اور اضافہ ہو گیا لیکن اس کے باوجود بہت سے طلبا ایسے تھے جو ان اداروں میں بھی داخل نہ ہو سکے ان میں سے بیشتر نے لبنان کے مدرسوں میں داخلہ لے لیا۔

اگر اہل شام فرانسیسی مدارس کے خلاف یہ اقدام نہ کرتے تو اس ملک میں ایک مربوط اور مرکزی نظام تعلیم کا قیام مشکل ہو جاتا۔ اور ممکن تھا کہ بعض اصلاحات جو شام کے ماہرین تعلیم کی کوششوں سے بروئے کار آ سکیں۔ ان کا یہ کا سا تصور بھی ذہن میں نہ آ سکتا۔ ہمارے ملک میں اب تک اس اصلاح کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ ہر شہر اور ہر قریئے میں بیرونی انجمنوں کے مدرسے موجود ہیں جن میں ہمارے بچے تعلیم پاتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ حصول آزادی کے بعد بھی ہم ان مدارس میں تعلیم دلانا اپنا سب سے بڑا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں، اگرچہ ہمیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ جو تربیت انہیں ان اداروں میں دی جاتی ہے وہ ہماری قومی اور ملی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی۔ بلکہ اکثر وہ ہمارے خیالات وعقاید اور ہمارے رجحانات کے منافی ہوتی ہے۔

شام کا نظامِ تعلیم

شام کا نظام تعلیم بھی عراقی نظام تعلیم کی طرح مرکزی ہے یعنی وزارت معارف ہی عوام کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے، ہمارے ملک میں اس مرکزی نظام تعلیم کا تصور قدرے مشکل ہے۔ ہمارا نظام تمام تر غیر مرکزی ہے، ہر صوبہ اپنی علاقائی ضرورت کے مطابق اپنے علاقے میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتا ہے، مرکزی حکومت کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن اس کے برعکس شام میں وزارت معارف ہی ان تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کا اس سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ مدرسوں کی مالی امداد، مدرسین کی فراہمی، نصاب کا تعین اور امتحانات کا انتظام و انصرام یہ سب کچھ وزارت معارف ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

وزیرِ معارف

قانونی تعلیم محریہ ۱۹۴۵ء میں شام کے محکمۂ تعلیم کے نظام کار کی توضیح کی گئی ہے۔ ان سطور میں نظام کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جائے گا۔ اس نظام تعلیم مرکزی حیثیت

وزیر معارف، کی ہوتی ہے۔ وزیر معارف شاہی کابینہ کا رکن ہوتا ہے اور پارلیمان کو جواب دہ۔ وہ ناظم تعلیمات کے تعاون اور اس کی امداد سے اس محکمے کے نظام کو چلاتا ہے اور اس کی نگرانی کرتا ہے۔ یوں تو ملک میں تعلیمی سہولتیں بہم پہونچانے کا ذمہ دار ناظم تعلیمات ہوتا ہے اور وہی اس محکمے کے کاروبار کا براہ راست نگراں بھی ہوتا ہے۔ لیکن سارے کام وزیر معارف کے نام اور اس کی ہدایات کے مطابق ہوتے رہتے ہیں۔

ناظم تعلیمات

وزیر معارف کے بعد اس محکمے کا سب سے ذمہ دار افسر ناظم تعلیمات ہوتا ہے۔ وہ وزارت معارف کے متعلق کاروبار اور اس کے مختلف شعبوں کی نگرانی کرتا ہے، مدرسوں میں طلبہ کی تعلیم و تربیت کا انتظام اور تعلیمی لوازم کا فراہم کرنا اس کا سب سے اہم فرض سمجھا جاتا ہے۔ ناظم تعلیمات کی امداد کے لیے تین ناظم اور ہوتے ہیں۔ ناظم تعلیمات ثانویہ۔ ناظم تعلیمات ابتدائیہ۔ ناظم تعلیمات جسمانی۔ یہ تینوں محکمے کے نظام کو چلانے میں اپنے اپنے شعبوں کے ذمے دار اور معاون ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر صوبے میں ایک اور ناظم ہوتا ہے جو اپنے اپنے علاقوں میں ابتدائی تعلیم کی ترویج اور اس کے انتظام و انصرام کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ فرانس کی تولیت کے زمانے میں ان کے اختیارات بہت محدود تھے لیکن آزادی کے بعد ان کے اختیارات میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔ مگر یہ بے چارے اب تک دوہری ذمہ داری کی چکی میں پستے رہتے ہیں۔ تعلیمی پالیسی اور انتظامات کے سلسلے میں وہ اپنے مرکزی نظام کے تابع ہوتے ہیں اور اپنی روزمرہ ضروریات اور اپنے احکام پر سرکاری چھاپ لگانے کے لیے انھیں صوبائی حاکموں کا توسل ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اور دوہری حکومت اور دوہری ذمہ داری سے بالعموم کام میں بہت سی خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اب اس خرابی کو دور کرنے کی کچھ کوشش کی جا رہی ہے لیکن اس وقت تک کوئی معقول نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

وزارت معارف کے روزمرہ کام چلانے کے لیے جو سات شعبے مسلسل مصروف کار رہتے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) شعبۂ تقرری (۲) شعبۂ محاسب (۳) شعبۂ تعمیرات (۴) شعبۂ ساز و سامان (۵) شعبۂ مراسلات (۶) محافظ خانہ (۷) شعبۂ شماریات۔

ان میں سے پہلا شعبہ محکمہ تعلیمات کی ضرورت کے مطابق اس محکمے میں کام کرنے والوں کی تقرری وغیرہ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس میں مدرس کلرک اور دوسرے کارکن شامل ہوتے ہیں۔ دوسرا شعبہ بھی اپنے کام کی نوعیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ مصارف کا اندازہ لگانا۔ میزانیہ تیار کرنا۔ اخراجات کی پڑتال کرنا اس شعبے کا کام ہے۔ تیسرا شعبہ مدرسوں کے نقشے بناتا ہے۔ اور پھر ان کی تعمیر کا انتظام کرتا ہے۔ چوتھا شعبہ مدرسوں کی ضروریات کے مطابق فرنیچر کتابیں اور دوسرے تعلیمی لوازم مہیا کرتا ہے۔ باقی تین شعبے ہی اس طرح اپنی اپنی حدود میں رہ کر اس نظام تعلیم کو چلانے میں ایک دوسرے کی امداد کرتے رہتے ہیں۔ ادارتی اشتراک عمل اور تعاون کا راہی سے کسی اچھے نتیجے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

ناظرین تعلیمات

تعلیم کی اس انتظامی مشین کے ساتھ ساتھ وزارت معارف کے ماتحت ناظرین تعلیمات کا بھی ایک شعبہ ہوتا ہے، اس شعبے کا سب سے بڑا افسر ناظر اعلیٰ کہلاتا ہے، ان ناظرین تعلیمات کے فرائض کی فہرست تو بہت طویل ہے۔ المختصر مدرسوں کے پرنسپل اور مدرسین کے کام کی جانچ پڑتال اور محض جانچ پڑتال ہی نہیں نصاب تعلیم۔ مدرسے کی سماجی زندگی اور دوسرے اہم امور میں ان کی امداد کرنا بھی ان کے فرائض میں داخل ہے۔ اگر مدرسین میں نیا ولولہ اور نیا عزم و جوش نہ ہو تو مدرسے کی میکانکی فضا میں جمود طاری ہو جاتا ہے۔ ناظرین تعلیمات کا کام اسی جمود و تعطل کو توڑنا ہوتا ہے، صرف ان کے کام کو دیکھ کر اچھا برا لکھ دینا ہی کافی نہیں۔ ان کی خامیوں کو ایک ایک کر کے گن دینا ہی درست نہیں۔ ان خامیوں کو دور کرنے کے طریقے بتانا بھی انھیں کا فرض ہے۔ ناظرین تعلیمات کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ مدرسوں کے عام حالات طلبہ کی ذہنی اٹھان اور مدرسوں کی ضروریات کی اطلاع وزارت معارف کو پہونچاتا رہے۔ اور مدرسہ اور وزارت کے درمیان ایک ایسا رابطہ قائم کر دے جو ملک کی فلاح و بہبود کے لئے نہایت مفید ثابت ہو۔ انتظامی امور کے پیش نظر ناظرین تعلیمات کو مزید دو طبقوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

(۱) ثانوی مدارس کے ناظرین تعلیمات اور (۲) ابتدائی مدارس کے ناظرین تعلیمات

ثانوی مدارس کے ناظرین تعلیمات کا تقرر مخصوص مضامین میں مہارت کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اور

اسی کے مطابق اسی نوعیت کا کام ان کے سپرد کیا جاتا ہے۔ ان ناظرینِ تعلیمات کا مرکزی دفتر دمشق میں ہوتا ہے اور یہیں سے وہ دوسرے مقامات پر مدرسوں کی دیکھ بھال کے لئے جاتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے سپرد ابتدائی مدرسوں کی نگرانی کا کام ہوتا ہے ان کا کسی مدرسی مضمون میں تربیت یافتہ یا کسی مخصوص مہارت کا حامل ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ اس صوبے میں ان کی تعداد ایک اور بعض حالات میں ایک سے زیادہ بھی ہوتی ہے۔

تعلیمی کمیٹی وزارت معارف کا تیسرا شعبہ تعلیمی کمیٹی ہے یہ تعلیمی کمیٹی بھی ناظم تعلیمات کے زیر قیام کام کرتی ہے اور ایک صدر اور تین رکن پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ محکمہ تعلیم کے دوسرے افسروں، مدرسوں اور کارکنوں میں سے کسی شخص کو اپنا ممبر بنا سکتی ہے۔ یہ کمیٹی فی الحقیقت پیشہ ورانہ اور تکنیکی ہوتی ہے، جو نصاب تعلیم کے انتخاب اور قانون تعلیم کے احترام کرانے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس کا کام بہت وسیع اور غیر محدود ہے۔ تعلیمی زندگی کی بہت سی ضروریات اس کے احاطۂ کار میں آجاتی ہیں۔ مثلاً

(۱) مدرسوں کے لئے نصاب کا تعین۔ کتابوں کا انتخاب اور ان کا فراہم کرنا۔

(۲) دوسری زبانوں سے کتابوں کے ترجمے کرانا، مضامین لکھنا اور رسائل و جرائد جاری کرنا۔

(۳) دوسرے ممالک کے تعلیمی تجربوں کے متعلق معلومات فراہم کرنا اور ان وسائل و ذرائع کا جائزہ لینا جن کی مدد سے ان نئے تجربوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

(۴) مدرسی نظام کے اعداد و شمار جمع کرنا۔

(۵) مدرسین کے تربیتی اداروں کے لئے نصاب مقرر کرنا، اس کے علاوہ کانفرنسوں کا اہتمام کرنا۔

(۶) تعلیمی تجربے کرنا۔

اس کمیٹی کے اس مختصر سے خاکے ہی سے اس کے دستِ کار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تعلیمی ضروریات کی تمام تر شاخیں اسی ضمن میں آجاتی ہیں، اس لئے اس کے اچھے یا برے ہونے پر نظام تعلیم کے اچھے یا برے ہونے کا انحصار ہوتا ہے۔ اس لئے تعلیم کے بعض مخصوص ماہروں کو اس کمیٹی کا

رکن ضرور بنایا جاتا ہے۔ اور اس انتخاب میں بالخصوص اس امر کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض ایسے ماہرین بھی ہوں جو بین الاقوامی زبانوں پر بھی قدرت رکھتے ہوں، یا کم سے کم اِن زبانوں کو جانتے ہیں جن کے توسل سے اچھے اچھے تعلیمی مواد کے ملنے کی توقع ہو سکتی ہے، اس سے صرف یہی مفہوم عبارت ہوتا ہے کہ دوسرے ممالک کے تجربے اور ان کی رفتار ترقی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکے اس کے ساتھ ساتھ تعلیم سے براہ راست متعلق اور مربوط رکھنے کے واسطے ان اراکین کے لئے کسی نہ کسی تعلیمی ادارے میں کم سے کم تین پیریڈ فی ہفتہ پڑھانا بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ ان کی معلومات سے نئے مدرسین بھی متمتع ہو سکیں، اس کے علاوہ ان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ مدرسین کے اجتماعات کو خطاب کریں اور پرانے مدرسین کو جدید خیالات سے روشناس کرا کے ان کے ذہنوں سے قدامت کا زنگ اتار دیں صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے سے نئے تعلیمی نظریات کو اپنایا جا سکتا ہے۔

کام کی سہولت کے پیش نظر کیمیٹی کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

(۱) ادارۂ نصاب (۲) ادارۂ تحقیقات (۳) ادارۂ ترجمہ و تصنیف

دوسرے متعلق شعبے ناظم تعلیمات اور اس کے زیر اہتمام تعلیم کے مختلف شعبوں کے علاوہ جو تعلیم کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں تین اور ایسے ادارے ہیں جن کا براہ راست تعلق وزارت معارف سے ہوتا ہے۔

۱۔ محکمہ آثار قدیمہ:۔ اس محکمے کے جملہ کاروبار ایک ناظم کے زیر اہتمام ہوتے ہیں۔ شام پرانی تہذیبوں کا مرکز رہا ہے اس لئے یہاں ایسی پرانی عمارتیں موجود ہیں جو تاریخی خلا میں روشن میناروں کا کام دے سکتی ہیں۔ ان عمارتوں کی حفاظت تعلیمی اور تاریخی نقطۂ نگاہ سے نہایت ضروری ہے، اس لئے ناظم آثار قدیمہ ان کی دیکھ بھال اور بعض تاریخی مقامات کی کھدائی کا انتظام کرتا ہے۔

۲۔ جامعۃ الشام:۔ ۱۹۴۵ء تک اس یونیورسٹی میں صرف قانون اور طب کے دو شعبے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اسے دورِ جدید کی ایک عمدہ درس گاہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

۳۔ عرب اکادمی:۔ یہ اکادمی پہلی عالمگیر لڑائی کے بعد ۱۹۲۰ء میں قائم کی گئی تھی جو تمام اور دوسرے مسلم ممالک کے

ارکان پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کا مقصد عربوں اور دوسری مسلم اقوام میں تعلیمی اور ثقافتی رابطہ قائم کرنا اور ان میں مذہبی اور سیاسی بیداری پیدا کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ عوامی تقریروں کا اہتمام کرتی ہے۔ اپنا ایک جریدہ نکالتی ہے جس میں اس اکادمی کے ارکین کی تحقیقات اور دوسرے مفید مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ اس اکادمی کے زیر اہتمام ایک عمدہ کتب خانہ بھی ہے جس میں بیس ہزار سے زیادہ مطبوعہ کتابیں اور چار ہزار ... م مخطوطات ہیں۔

امریکہ کے نئے تعلیمی کمشنر

مسٹر بی۔ ایم تھرسٹن۔ اضلاع متحدہ امریکہ کے نئے تعلیمی کمشنر مقرر ہوئے ہیں۔ عہدہ کا چارج سنبھالنے کے بعد مسٹر تھرسٹن نے یہ قسم کھائی تھی کہ جب تک وہ اپنے محکمہ اور اپنے کام کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کر لیتے وہ اس وقت تک کوئی اخباری بیان جاری نہیں کریں گے۔ اس سے پہلے مسٹر تھرسٹن ریاست کنیکٹی کٹ میں عوامی تعلیم کے ناظم رہ چکے ہیں۔ اس حیثیت میں انھوں نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان میں سے زیادہ نمایاں یہ ہیں۔ (۱) ثانوی مدرسے کا نصاب بہت متنوع ہونا چاہیے۔ جس قدر یہ تنوع زیادہ ہوگا اسی قدر مدرسہ کی قوت ماسکہ زیادہ ہوگی۔ (۲) مدرسے کو سیاسی اعتقاد فروشی کا اڈہ نہ بننا چاہیے۔ مدرسہ سیاسی جماعتوں کے متعلق پڑھائے گا ضرور مگر اسے ان کی تائید و حمایت نہ کرنی چاہیے۔ (۳) گرچہ کو عوامی مدرسوں کا سہارا ڈھونڈے بغیر اپنے راستہ پر گامزن رہنا چاہیے کیوں کہ عوامی مدرسہ ہی متحدہ امریکہ کی ضمانت ہے (۴) پیشہ ورانہ تعلیم کی توسیع ہونی چاہیے کیوں کہ لوگ لازمی طور پر یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچوں کو مختلف پیشوں میں مہارت حاصل کرنے کے لیے تربیت ملے۔

شخصیت کی نشو و نما

اویس احمد

شخصیت کیا ہے اور اس کی مناسب نشو و نما کس طرح کی جا سکتی ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا کوئی مختصر دو لفظی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس قدر تو متفقہ طور پر مسلّم ہے کہ مقاصد تعلیم اور عمل تعلیم دونوں میں شخصیت کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ لیکن اس محور توجہ کی اصل ماہیت کیا ہے اور اس تک پہنچنے کے لئے بے خطا راستہ کون سا ہے۔ اس بارے میں مختلف لوگ مختلف نظریئے پیش کریں گے۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ ایک شخص ہمیں بہت متاثر کرتا ہے لیکن جب اس تاثیر کی تحلیل کی نوبت آتی ہے تو حتمی طور پر کسی خوبی پر انگلی رکھنا مشکل نظر آتا ہے۔ کیا یہ تاثیر اس لطیف ذاتی جوہر کی پیداوار ہے جو علم و کمال کے ظاہری محاسن کے منہا کر دینے کے بعد باقی رہ جاتا ہے؛ کیا یہ فرد کی مقناطیسی کشش کا نتیجہ ہے کیا یہ ان گہرے ذہنی سرچشموں کی رہین منت ہے جن سے خود فرد بھی آگاہ نہیں؛ یا کیا یہ فرد کی پوری ہستی کا پرتو ہے؛ شخصیت کے سے انانیت سے معمور تصوّر کے بارے میں یہ اختلاف رائے کسی حیرانی کا موجب نہ ہونا چاہیئے۔ یہ خیال عموماً زیادہ قرین صحت نظر آئے گا کہ شخصیت اپنی وسعت میں فرد کی پوری ہستی سے کسی طرح کم نہیں۔ ہاں دونوں میں ایک واضح فرق ضرور موجود ہے۔ جب ہم کسی کی شخصیت کا ذکر کرتے ہیں تو ذہن میں اس کے وہ اطوار خصوصیت سے موجود ہوتے ہیں جو اس کو دوسروں سے علیحدہ کرتے ہیں۔ ایسے نرالے اوصاف جو عمومیت سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کی ہستی کا تصوّر کرنے وقت ذہن میں اس نرالے پن کا ہونا ضروری نہیں۔

شخصیت کے بارے میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ کوئی ساکن اور جامد تصور نہیں، یہ کوئی ایسی شے نہیں [illegible] حالت یا ایک سطح پر آ کر رک گئی ہو بلکہ یہ ایک رواں دواں بڑھنے پھولنے والی چیز ہے جس کا

خمیر تعلّم اور بالیدگی کے عناصر سے تیار ہوتا ہے اور جو ظاہری اور باطنی محاسن کی رنگا رنگ بہار کی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے، اس طرح عادات و اطوار شخصیت کا کوئی ظاہری خول نہیں بلکہ خود اس کا لازمی جز ہیں۔ ایک اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ باطنی محاسن کی تشکیل میں گرد و پیش کے مادی اور ذہنی ماحول کو بڑا دخل ہے۔ اندرونی ابھار خواہ کتنا قوی کیوں نہ ہو۔ وہ بیرونی اثرات کو کلّی طور پر باطل نہیں کر سکتا دراصل بیرونی عوامل کی یہ جری قوت ہی شخصیت کے لئے سیکھنے اور بڑھنے پھولنے کے مواقع پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ بیرونی قوتیں اندرونی مؤثرات کے ساتھ ٹکرانے کے لئے موجود نہ ہوتیں تو شخصیت کے اجاگر ہونے کے اکثر مواقع ختم ہو جاتے۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کہ جن شخصیتوں نے تاریخ کے رخ پر گہرا اثر ڈالا ہے، انھیں زندگی میں بڑے کٹھن ماحول سے سابقہ پڑا۔ یہ ماحول ان کے لئے اس لئے کڑا ثابت ہوا کہ ان کی اندرونی قوت نے ماحول کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا اور مروجہ راستوں کو چھوڑ کر اپنے لئے ایک الگ راہ نکالنا چاہی۔ اگر مروجہ طور طریقوں کو قبول کر لیا جاتا تو ماحول ان کے لئے بھی باقی لوگوں کی طرح بالکل موافق ہو جاتا لیکن یہ موافقت ان شخصیتوں کی بلندی کو ختم کر کے رکھ دیتی۔

غرض ذاتی جوہر اگر بیج کا درجہ رکھتا ہے تو ماحول کے گوناگوں عناصر گرمی ہوا اور دوسرے قدرتی اسباب کا جو اس بیج کو پھوٹنے اور بڑھنے پھولنے میں مدد دیتے ہیں۔ اس ذاتی جوہر اور ماحول کے لگاتار عمل اور ردّ عمل کے نتیجہ میں شخصیت جنم لیتی اور مسلسل بلندی کی طرف بڑھنا جاری رکھتی ہے۔ اس کی مثال اس پاکیزہ کلمہ کی ہے جو ایک پاکیزہ درخت کی طرح اپنی جڑیں مضبوطی سے قائم رکھتا ہے اور اس کی چوٹی آسمان کو چھونے لگتی ہے،، اس کے برعکس ایک مسخ شدہ شخصیت کی مثال "اس پلید کلمہ کی ہے جو ایک خبیث درخت کی طرح سطح زمین کے بالکل اوپر ہی ٹکا رہتا ہے اور اس کا کوئی مقررہ ٹھکانا نہیں ہوتا"

شخصیت کو ترقی دینے کے معاملے میں اوپر کے نقطہ کو اچھی طرح نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ شخصیت بہت سے عناصر سے مل کر بنے گی۔ ان کے تحلیلی مطالعہ میں یہ خطرہ بالکل حقیقی ہے کہ آنکھ ان جزئیات کے گورکھ دھندے میں ہی کھو کر رہ جائے اور اسے ان بکھرے ہوئے ذرّوں میں کوئی نظم و ربط

دکھائی نہ دے۔ اس خطرے سے بچنے کی صورت یہی ہے کہ ان اجزا کے ساتھ ساتھ شخصیت کے پس منظر کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جو ان منتشر اجزا کو وحدت بخشتا ہے۔ شخصیت کے معاملے میں کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کو دیکھنے کی صلاحیت پیدا کئے بغیر کوئی نگاہ کامیاب مطالعہ یا رہنمائی نہیں کر سکتی۔ ماحول کے طرح طرح کے تقاضے فرد کو مختلف حالات میں مختلف ردّ عمل پر مجبور کرتے ہیں اطوار و کردار کے ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو ایک مرکزی نقطے سے منسلک کئے بغیر فرد کی شخصیت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایک لڑی میں پرو دئے جانے کے بعد ان متعدد اطواروں کا باہمی تضاد ختم ہو جاتا ہے۔ اب وہ بے تعلق نہیں رہتے بلکہ ایک دوسرے کی شرح بن جاتے ہیں اور سب کے سب مل کر شخصیت کے رنگ و روپ کو ظاہر کرتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ شخصیت کو ترقی دینے کے ذرائع بہت پیچیدہ لیکن باہم مربوط ہیں اور بنیادی پس منظر کے ڈھانچے میں یہ سب کے سب اپنی اپنی جگہ ٹھیک بیٹھتے ہیں۔ ان ذرائع کی نوعیت انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ ان کا تعلق اندرونی بالیدگی سے بھی ہے اور بیرونی کارکنوں کی پیدا کردہ تبدیلیوں سے بھی۔ ان وسائل کے ہاتھ لگنے کی صورت یہ ہے کہ طالب علم اور استاد یا والدین کی توجہ بنیادی پس منظر کے اندر رہتے ہوئے ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ کی طرف منتقل ہوتی رہنی چاہئے تاکہ شخصیت کے ضروری اجزا میں سے کوئی بھی مناسب غور و پرداخت سے محروم نہ رہ جائے۔

شخصیت کے تمام عناصر کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں، ذیل میں صرف زیادہ نمایاں اجزا پر ایک نظر ڈالی جائے گی یہ اجزا وہ ہیں جو تعلیم کے ذریعے ترقی پا سکتے ہیں۔

تعلیم کی پہلی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ مؤثر بدنی اور ذہنی قوت پیدا کرے۔ یہ درست ہے کہ اس قوت سے کام لینے کے لئے عزم اور توازن کی ضرورت ہو گی لیکن جب تک اس قوت کا وجود نہ ہو اس وقت تک عزم اور متوازن مزاجی اکیلے زیادہ کام نہیں دے سکتے۔ اس میدان میں تعلیم کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہوگا کہ فرد کی فطری صلاحیتوں میں کس قدر وسعت ہے، ان صلاحیتوں کو جگانے کے لئے کون سے محرکات کام دیں گے اور ان کو پختگی کی منزل تک پہونچانے کے لئے کن مادی لوازمات اور سہولتوں کا

خمیر تعلّم اور بالیدگی کے عناصر سے تیار ہوتا ہے اور جو ظاہری اور باطنی محاسن کی رنگارنگ بہلہ کی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے، اسی طرح عادات و اطوار شخصیت کا کوئی ظاہری خول نہیں بلکہ خود اس کا لازمی جزو ہیں ایک اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ باطنی محاسن کی تشکیل میں گرد و پیش کے مادی اور ذہنی ماحول کو بڑا دخل ہے۔ اندرونی ابھار خواہ کتنا قوی کیوں نہ ہو۔ وہ بیرونی اثرات کو کلی طور پر باطل نہیں کر سکتا دراصل بیرونی عوامل کی یہ جری قوت ہی شخصیت کے لئے سیکھنے اور بڑھنے پھولنے کے موقعے پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ بیرونی قوتیں اندرونی موثرات کے ساتھ ٹکرانے کے لئے موجود نہ ہوتیں تو شخصیت کے اجاگر ہونے کے اکثر مواقع ختم ہو جاتے۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کہ جن شخصیتوں نے تاریخ کے رخ پر گہرا اثر ڈالا ہے، انھیں زندگی میں بڑے کٹھن ماحول سے سابقہ پڑا۔ یہ ماحول ان کے لئے اس لئے کڑا ثابت ہوا کہ ان کی اندرونی قوت نے ماحول کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا اور مروجہ راستوں کو چھوڑ کر اپنے لئے ایک الگ راہ نکالنا چاہی۔ اگر مروجہ طور طریقوں کو قبول کر لیا جاتا تو ماحول ان کے لئے بھی باقی لوگوں کی طرح بالکل موافق ہو جاتا۔ لیکن یہ موافقت ان شخصیتوں کی بلندی کو ختم کر کے رکھ دیتی۔

غرض ذاتی جوہر اگر بیج کا درجہ رکھتا ہے تو ماحول کے گوناگوں عناصر گرمی ہوا اور دوسرے قدرتی اسباب کا جو اس بیج کو پھوٹنے اور بڑھنے پھولنے میں مدد دیتے ہیں۔ اس ذاتی جوہر اور ماحول کے لگاتار عمل اور ردّ عمل کے نتیجہ میں شخصیت جنم لیتی اور مسلسل بلندی کی طرف بڑھنا جاری رکھتی ہے۔ اس کی مثال "اس پاکیزہ کلمہ کی ہے جو ایک پاکیزہ درخت کی طرح اپنی جڑ میں مضبوطی سے قائم رکھتا ہے اور اس کی چوٹی آسمان کو چھونے لگتی ہے"، اس کے برعکس ایک مسخ شدہ شخصیت کی مثال "اس پلید کلمہ کی ہے جو ایک خبیث درخت کی طرح سطح زمین کے بالکل اوپر ہی اکھڑا رہتا ہے اور اس کا کوئی مقررہ ٹھکانا نہیں ہوتا"

شخصیت کو ترقی دینے کے معاملے میں اوپر کے نقطہ کو اچھی طرح نگاہ میں رکھنا ضروری ہے شخصیت بہت سے عناصر سے مل کر بنے گی۔ ان کے تحلیلی مطالعہ میں یہ خطرہ بالکل حقیقی ہے کہ آنکھ ان جزئیات کے گورکھ دھندے میں ہی کھو کر رہ جائے اور اسے ان بکھرے ہوئے ذرّوں میں کوئی نظم و ربط

دکھائی نہ دے۔ اس خطرے کے سدِ باب کی صورت یہی ہے کہ ان اجزا کے ساتھ ساتھ شخصیت کے پس منظر کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جو ان منتشر اجزا کو وحدت بخشتا ہے شخصیت کے معاملے میں کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کو دیکھنے کی صلاحیت پیدا کئے بغیر کوئی نگاہ کامیاب مطالعہ یا رہنمائی نہیں کر سکتی۔ ماحول کے طرح طرح کے تقاضے فرد کو مختلف حالات میں مختلف ردِّ عمل پر مجبور کرتے ہیں اطوار و کردار کے ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو ایک مرکزی نقطے سے منسلک کئے بغیر فرد کی شخصیت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایک لڑی میں پروئے جانے کے بعد ان متعدد اطوار کا باہمی تضاد ختم ہو جاتا ہے۔ اب وہ بے تعلق نہیں رہتے بلکہ ایک دوسرے کی شرح بن جاتے ہیں اور سب کے سب مل کر شخصیت کے رنگ و روپ کو ظاہر کرتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ شخصیت کو ترقی دینے کے ذرائع بہت پیچیدہ لیکن باہم مربوط ہیں اور بنیادی پس منظر کے ڈھانچے میں یہ سب کے سب اپنی اپنی جگہ ٹھیک بیٹھتے ہیں۔ ان ذرائع کی نوعیت انفرادی بھی ہے اور جماعتی بھی۔ ان کا تعلق اندرونی بالیدگی سے بھی ہے اور بیرونی کارکنوں کی پیدا کردہ تبدیلیوں سے بھی۔ ان وسائل کے ہاتھ لگنے کی صورت یہ ہے کہ طالب علم اور استاد یا والدین کی توجہ بنیادی پس منظر کے اندر رہتے ہوئے ایک نقطے سے دوسرے نقطے کی طرف منتقل ہوتی رہنی چاہئے۔ تاکہ شخصیت کے ضروری اجزا میں سے کوئی بھی مناسب غور و پرداخت سے محروم نہ رہ جائے۔

شخصیت کے تمام عناصر کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں، ذیل میں صرف زیادہ نمایاں اجزا پر ایک نظر ڈالی جائے گی یہ اجزا وہ ہیں جو تعلیم کے ذریعے ترقی پا سکتے ہیں۔

تعلیم کی پہلی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ موثر بدنی اور ذہنی قوت پیدا کرے، یہ درست ہے کہ اس قوت سے کام لینے کے لئے عزم اور توازن کی ضرورت ہو گی لیکن جب تک اس قوت کا وجود نہ ہو اس وقت تک عزم اور متوازن مزاجی اکیلے زیادہ کام نہیں دے سکتے۔ اس میدان میں تعلیم کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہو گا کہ فرد کی فطری صلاحیتوں میں کس قدر وسعت ہے، ان صلاحیتوں کو جگانے کے لئے کون سے محرکات کام دیں گے اور ان کو پختگی کی منزل تک پہونچانے کے لئے کن مادی لوازمات اور سہولتوں کا

فراہم کرنا ضروری ہے؛ علم کے معاملے میں فرد کی ذہنی صلاحیتوں، اس کی ضرورتوں اور اس کے ماحول کے کیا تقاضے ہیں؛ موثر قوت فکر کو کس طرح بیدار کیا جا سکتا ہے اور اسے کس نہج پر لگانا چاہیئے؟ یہ وہ چند سوال ہیں جن کے تسلی بخش حل استاد اور والدین کو تلاش کرنے ہوں گے۔ ایسا کیے بغیر شخصیت کی ایک اہم شرط پوری ہونے سے رہ جائے گی۔

معلم کو چاہیئے کہ پسندیدہ محرکات کو جزو طبیعت بنائے۔ یہ محرکات مختلف قسم کی پسندوں، دلچسپیوں، عادتوں، قدروں اور نصب العینوں پر مشتمل ہوں گے۔ ان کے بارے میں یہ تسلی ہو جانی چاہیئے کہ کیا یہ ایسے ہیں کہ فرد کے لئے اطمینان بخش ہیں اور معاشرے کے لئے فائدہ مند ہیں؛ کیا یہ مکمل طور پر آزاد فیصلے کی پیداوار ہیں؛ کیا پوری شخصیت کے آئینہ دار ہیں؛ کیا ان کے حصول کے لئے بدنی اور ذہنی کاوش بخوشی قبول کی جاری ہے، خواہ یہ مقاصد بالواسطہ پیش نگاہ ہوں یا بلا واسطہ؛ ان محرکات کے مختلف عناصر کی اضافی قدر و قیمت درخور نگاہ رکھا گیا ہے؛ نشوونما کے مختلف مدارج پر ان اقدار کو کیا درجہ ملتا رہا اور ان کے بنیادی پس منظر میں کس حد تک سخت جانی موجود ہے؛ پیچھے کہا جا چکا ہے کہ بدنی اور ذہنی قوت سے کام لینے کے لئے صحیح قسم کے محرکات چاہئیں۔ ایسے محرکات کو وجود میں لانے کے لئے تعلیم کو اوپر دیئے ہوئے حل ڈھونڈنے ہوں گے۔

تعلیم کو چاہیئے کہ موثر معاشرتی مراسم و روابط پیدا کرنے کی صلاحیت کا بیج بوئے اور اسے پوری طرح ترقی دے تاکہ بارآور انسانی تعلقات کے لئے زمین تیار ہو جائے۔ صحت مند اور روانی باہمی تعلقات آج بہت سے معاشروں کی منہ بولتی ضرورت ہے۔ ان کے بارے میں موزوں تربیت حیرت انگیز نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اس بات کا یقین کرنے کے لئے کہ پسندیدہ سماجی اقدار پیدا ہو رہے ہیں تعلیم کو بہت سے سوالوں کے جواب معلوم کرنا ہوں گے۔ مثلاً کیا بچہ اچھی طرح سمجھ گیا ہے کہ معاشرے میں فرد کا کیا مقام ہے؛ کیا وہ اجتماعی زندگی میں فرد کی صحت مند آزادی کا مطلب سمجھ چکا ہے؛ کیا وہ خیالات اور جذبات کے وسیلے سے بھی اپنے دل کی بات دوسروں پر واضح کر سکتا ہے؛ کیا وہ اپنی اور دوسروں کی خودی سے اس حد تک آگاہ ہے کہ عدم قبولیت

اور غیر دوادنا ہی کے خطروں سے بچا رہے؛ اوائل زندگی میں گھریلو ماحول اور خاندانی بدمزگیوں نے اس کے تحت الشعور میں جو خلفشار پیدا کئے تھے کیا وہ ان کی زد سے معقول حد تک محفوظ ہو چکا ہے؟ کیا اس کے دل میں خود اپنے لئے اور دوسروں کے لئے احترام موجود ہے؟

تعلیم کو چاہیئے کہ جذبات میں پختگی پیدا کرے تاکہ نئی اور غیر متوقع صورت حال کے ساتھ نباہ کیا جا سکے۔ موجودہ دنیا برق رفتاری سے بدلنے والی دنیا ہے۔ زمانۂ قدیم اور ازمنۂ وسطیٰ کی وہ دنیا جو صدیوں تک اپنے بنیادی خدوخال کو بحال رکھا کرتی تھی اب ایک کہانی بن چکی ہے۔ آج تعلیم کے لئے ممکن نہیں کہ نئی پود کو ایک ایسی زندگی کے لئے تیار کرے جس کی تصویر پہلے سے سامنے موجود ہو۔ ایسی صورت میں ہنگامی حالات سے عہدہ برا ہونے کی قابلیت بہت ضروری بن جاتی ہے اور آج تعلیم اس ضرورت سے آنکھیں بند نہیں کر سکتی، وہ جس شخصیت کی تعمیر کرے گی اس میں اس قابلیت کو نمایاں جگہ ملے گی۔ اس ضروری استعداد کو پیدا کرنے کے لیے تعلیم کو بہت سی باتوں کے متعلق اطمینان کرنا ہوگا۔ مثلاً اسے یہ پوچھنا ہوگا کہ تعمیری کوشش اور بددلی کے درمیان جذبات کے کون کون سے پردے حائل ہیں؟ کیا بچہ جذبات کے تلاطم سے سہم جاتا ہے، کیا وہ تکلیف دہ جذبات کے بوجھ تلے دب جاتا ہے۔ کیا وہ امڈتے ہوئے جذبات کے مقابلے میں بے بس ہو جاتا ہے؟ کیا وہ جماعتی زندگی کی روح افزا رونق اور ذوق جمالیات سے لطف اٹھانا جانتا ہے، یا ان لذات سے محروم ہے؟ کیا اس میں اتنا جیالا پن موجود ہے کہ حقائق کے سامنے تن کر کھڑا ہو جائے اور انہیں ان کے سچے روپ میں دیکھے؟ کیا فریب نفس نے اسے اس طرح بہکا تو نہیں دیا کہ کمزوری کے احساس کو دبانے کے لئے واقعات سے آنکھیں بند کر لے یا اگر بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مارے بھی تو غلط طریق پر؟ اس کے دل کی دنیا میں مدافعت کے جو بے پناہ ذرائع ہیں ان سے کام لینے کے طریقوں سے وہ کس حد تک آگاہ ہے؟ کیا اس میں یہ ہمت موجود ہے کہ ضرورت کے وقت دوسروں سے مدد قبول کر سکے؟

اوپر کی سطروں میں جو چند در چند سوال درج کئے گئے ہیں ان میں شخصیت کی نشوونما کے متعلق

بڑے بڑے مقاصد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ان مقاصد کو حاصل کرنا آسان نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نگاہ کے سامنے نہ رہیں۔ یہ مقاصد تعلیمی نصابوں کے مقرر کرنے اور روزمرہ کے اسباق میں رہنمائی کریں گے، جہاں تک ان کے حصول کا تعلق ہے جس کا بہت کچھ مدار استاد کی فنی مہارت اور علم النفس سے اس کی آگاہی پر ہوگا تعلیم کا ایک اہم مقصد شخصیت کی ترقی ہے۔ اس کام کو وہی استاد انجام دے سکے گا جو خود ایک موثر شخصیت کا حامل ہو۔

نوآموز اساتذہ بہت آسانی سے اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ شخصیت کا مدار بیشتر ظاہری عناصر پر ہے۔ لباس اور ظاہری طور طریقے شخصیت کی علامتوں میں شمار ہوں گے، لیکن ان سے کہیں زیادہ اہم وہ اندرونی قوت ہے جو ان بدلنے والے ظواہر کے لئے بنیاد کا درجہ رکھتی ہے اور جس کا سب سے بڑا مظہر علم اور بالیدگی میں مسلسل اضافہ ہے۔ ایسا اضافہ جو فلک بوس بلندی پر پہنچ جانے کے بعد بھی رکنا نہیں جانتا۔ ظاہری علامات پہلا تاثر پیدا کرنے میں مدد دیتی ہیں لیکن اس تاثر کو باقی رکھنے کے لئے کسی پائدار اندرونی جوہر کی ضرورت ہے، چوں کہ استاد اور طلبہ کا تعلق ایک دیر تک رہنے والا تعلق ہے، اس لئے اس کی شخصیت کے وہی عناصر بچوں کو متاثر کریں گے جو پائدار نوعیت کے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ استاد کے لئے حقیقت پسند ہونا ایک بہت بڑی خوبی ہے، یہ خوبی اسے جعلی روپ دھارنے سے روکے رکھتی ہے، وہ ہر رنگ میں اور ہر حال میں اپنی حقیقی شخصیت سے چمٹا رہتا ہے، وہ جعلی شخصیت اختیار نہیں کرتا۔ یہ چیز زود و بدیر خود بخود بالیدگی کی تمنا پیدا کرتی ہے۔ بغرض علم اور بالیدگی کی پیاس اور حقیقت پسندی وہ سہ گانہ ستون ہیں جن پر شخصیت تعمیر کرنے والے استاد کی اپنی شخصیت استوار ہونی چاہئے ؂

ایمیل یا روسو کی تعلیم

توقیر مرزا برزتی

مسلسل ۲۸

قدرتی ریاست کے اندر کیوں کر یہ غیر ممکن ہے کہ آدمی آدمی میں اس قدر زیادہ فرق ہو جائے کہ ایک دوسرے کا محتاج ہو جائے، اس لئے درحقیقت اس قدرتی ریاست کے اندر ایک واقعی اور لازوال مساوات قائم رہتی ہے۔ تمدنی ریاست کے اندر حقوق کی ایک مصنوعی اور باطل مساوات قائم ہوتی ہے اس مساوات کو قائم رکھنے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں وہ اس حکومت کو الٹا برباد کرنے کی خدمت انجام دیتے ہیں اور کمزوروں پر جور و ستم ڈھانے کے لئے قوام کی قوت زبردست کی شریک ہو کر اس اعتدال کی نوعیت کو جو قدرت نے ان کے مابین قائم کیا ہے بالکل غیر متوازن کرا دیتی ہے[۱]۔ اس پہلے ہی اختلاف سے ظاہری اور باطنی چند دیگر اختلافات جو تمدنی نظام میں پائے جاتے ہیں نمودار ہو جاتے ہیں کہ یہ قلت پر اور مفاد عامہ خانگی منفعت پر ہمیشہ قربان کیا جاتا ہے۔ اور یہ نمائشی انسانی انصاف اور ماتحتی ہمیشہ تشدد کے آلہ کار اور ظلم اور زیادتی کے ہتھیار بنے رہتے ہیں اور رہیں گے، اس کا یہ مطلب ہوا کہ اعلیٰ جماعتیں جو باقی جماعتوں کے لئے اپنے وجود کے کارآمد اور مفید ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، درحقیقت دوسروں کو نقصان پہنچا کر محض اپنی ذاتی منفعت ہی کی فکر میں لگی رہتی ہیں اس لئے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ از روئے حق و انصاف وہ لوگ کس قدر لحاظ کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ اگر وہ مرتبہ جو وہ حاصل کر چکے ہیں ان کی ذاتی خوش حالی کے موافق ہے۔ تو

۱؎ ہر ایک ملک کے قوانین کی عالمگیر حیثیت یہی ہوتی ہے کہ کمزور کے مقابلے میں زبردست کا ساتھ دیا جائے اور اس شخص کے مقابلے میں جو بالکل نادار ہو اس شخص کا ساتھ دیا جائے جو کچھ نہ کچھ رکھتا ہو۔ یہ نقص ناگزیر ہے جس کی کوئی استثنا نہیں ہے ÷

ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی تقدیر کے متعلق کیا رائے قائم کرے؛ اس وقت ہمیں اسی مطالعہ سے تعلق ہے۔ لیکن اسے اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہمیں قلب انسانی کے علم سے ابتدا کرنی چاہیئے۔

اگر یہ سوال نوجوانوں کے لئے ایک آدمی کو محض اس کی نقاب ہی میں دکھا دے جانے کا ہوتا تو آدمی کو خصوصی طور پر دکھانے کی ضرورت ہی نہ ہوتی اور وہ ہمیشہ نوجوانوں کی نظر کے سامنے ہی رہتا لیکن کیوں کہ نقاب بمنصبہ آدمی نہیں ہے اور اسی لئے نقاب کی ظاہری شکل سے انہیں گم راہ نہ ہونا چاہیئے۔ پس جب آپ اپنے شاگرد کے لئے آدمیوں کی تصویر اتاریں تو ایسی ہی اتارئیے جیسا کہ وہ ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ (آپ کا شاگرد) ان لوگوں سے متنفر ہو جائے۔ بلکہ اس لئے کہ ان کی حالت پر ترس کھائے اور ان کے مانند ہونے کی کبھی کوئی خواہش نہ رکھے۔ میرے خیال میں یہ ایک معقول ترین نظریہ ہے، جو ایک آدمی اپنے ساتھی انسانوں کے متعلق رکھ سکتا ہے۔

اس مقصد کے تحت ہمیں اس راستے کے بالکل خلاف راہ اختیار کرنی ہے، جو ہم اس وقت تک اختیار کئے ہوئے تھے۔ اور نوجوان کی اصلاح اس کے ذاتی تجربات کی نسبت دوسروں کے تجربات کے ذریعہ کرنی ہے، اگر لوگ اسے دھوکہ دیں گے تو وہ ان سے نفرت کرنے لگے گا۔ لیکن اگر وہ یہ دیکھے کہ لوگ گو اس کے ساتھ احترام سے پیش آتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں تو وہ ان کی حالت پر افسوس کرے گا اور ترس کھائے گا۔ فیثا غورث کا قول ہے۔ دنیا کا نظارہ اولیمپک کے کھیل تماشوں کے مانند ہے۔ کچھ لوگ بیع و شرا میں مصروف ہیں اور محض اپنے ہی منافعوں کا خیال رکھتے ہیں، دوسرے عملی حصہ لیتے ہیں، اور نام وری اور شہرت حاصل کرنے کی سعی میں رہتے ہیں اور محض جو بدترین لوگ نہیں ہیں محض سیر تماشے ہی پر قناعت کرتے ہیں"۔

میں آپ سے چاہتا ہوں کہ ایک نوجوان کے لئے آپ ایسی صحبت کا انتخاب فرمائیے کہ جن لوگوں میں وہ اٹھے بیٹھے ان کے متعلق اچھے خیالات رکھے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے دنیا سے واقف ہونے کی اس طرح تعلیم دیں کہ وہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اسے گہری نگاہ سے دیکھے، اسے یہ بتائیے کہ آدمی فطرتًا نیک ہے اور اسے یہ محسوس بھی کرائیے اور اپنے پڑوسیوں کے متعلق اسے خود فیصلہ کرنے دیجیئے، لیکن

اسے یہ دکھا دیجئے کہ سماج نے لوگوں کو کیوں کر ذلیل اور گم راہ بنا دیا ہے۔ اور ان کے ان سب عیوب کا منبع ان کی پیش قدمی میں دکھائے اور اسے افراد کے احترام کی طرف مائل کرائے لیکن مجمع سے نفرت ہی کرنے کا میلان رکھنے دیجئے۔ اسے یہ دکھائیے کہ سب آدمی تقریباً ایک ہی قسم کا نقاب استعمال کرتے ہیں لیکن اسے یہ بھی معلوم کرا دیجئے کہ بعض چہرے اس نقاب کی نسبت جو انھیں پوشیدہ کئے ہوئے ہوتا ہے زیادہ خوب رو ہوتے ہیں۔

یہ ضرور تسلیم کرنا چاہئے کہ اس طریقے میں بھی نقائص موجود ہیں اور اسے روبہ عمل لانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ دوسروں کو دیکھنے کا بہت جلد عادی ہو جائے۔ اور اگر آپ اسے دوسروں کے اعمال بہت باریک بینی کے ساتھ دیکھنا سکھا دیں تو آپ اسے دوسروں کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں پُرحقارت۔ عیب جو۔ جلد باز اور قطعی بنا دیں گے۔ بدیوں کی تلاش اور جستجو میں وہ ایک پُرحقارت مسرت حاصل کرنے لگے گا۔ اور حقیقی خوبیوں کو پہچاننے سے بھی محروم ہو جائے گا۔ وہ کم از کم بدی کے منظر کا عادی ہو جائے گا اور بدمعاشوں کو بے دریغ بالکل اسی طرح دیکھے گا۔ جس طرح ہم بدنصیبوں کو بلا ترس کھائے دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ پھر جلد ہی بنی نوع آدم کی کج روی بجائے عبرت کے ایک بہانہ بن جائے گی اور وہ کہے گا "آدم کا خمیر ایسا ہے" اور اسے مابقی سے مختلف رہنے کی کوئی خواہش نہ رہے گی۔

لیکن آپ نظریاتی تعلیم کے ذریعے اسے نہ صرف انسانی قلب بلکہ ان بیرونی وجوہ کے استعمال سے بھی واقف کرانے کے خواہاں ہوتے ہیں جو ہمارے میلان کو بدیوں کی طرف پھیر دیتی ہیں اور جب اس طور پر ایک دم سے احساسی معاملات سے اسے آپ عقلی مضامین کی طرف منتقل فرما دیتے ہیں۔ تو آپ علم الٰہیات کا طریقہ استعمال فرماتے ہیں جسے کہ وہ ابھی سمجھنے کے لائق نہیں ہوتا ہے۔ آپ اسی غلطی میں جا پڑتے ہیں جس سے کہ اس وقت تک اس قدر احتیاط کے ساتھ احتراز کیا گیا ہے اور اس کو آپ ایسے سبق دینے لگتے ہیں جو سبقوں ہی کے مانند ہیں۔ اور آپ نوجوان کے دل میں اس کے ذاتی تجربے اور ذاتی عقل و فہم کو ترقی دینے کی بجائے استاد کے

تجربے اور اقتدار کو جگہ دیتے ہیں۔

تاریخ کا مطالعہ

ان دونوں دکانوں کو بیک وقت دور کرنے اور نوجوان دل کو خراب کرنے کے خدشے کے بغیر انسانی دل کو اس کی دست رس میں لانے کے لئے ہیں دیگر اوقات اور دیگر مقامات پر نوجوان کو دور ہی سے لوگوں کا نظارہ کراؤں گا تاکہ وہ مشاہدہ تو حاصل کر سکے۔ لیکن اس میں کوئی حصہ نہ لے سکے۔ تاریخی مطالعہ کا بس یہی وقت ہے۔ اس کی امداد سے وہ کوئی فلسفیانہ درس حاصل کئے بغیر لوگوں کا مطالعہ کر سکے گا۔ تاریخ کی امداد سے وہ افراد کو کسی خواہش یا تاثر کے بغیر ایک تماشائی کی نگاہ سے دیکھ سکے گا۔ وہ لوگوں کو ایک جج کی نگاہ سے دیکھے گا۔ ان لوگوں کے شریک یا ان پر الزام لگانے والے کی نگاہ سے نہ دیکھے گا۔

آدمیوں کو جاننے کے لئے آپ کو ان کے افعال دیکھنے لازمی ہیں، محفل میں ہم آدمیوں کو گفتگو کرتا ہوا سنتے ہیں وہاں اپنے الفاظ کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے افعال کو پوشیدہ رکھتے ہیں لیکن تاریخ میں یہ پردہ اٹھ جاتا ہے اور ان کے افعال کے لحاظ سے ان کو جانچا جاتا ہے۔ ان کے اقوال بھی ان لوگوں کے سمجھنے کے لئے ہماری امداد کرتے ہیں، اس لئے کہ ان کے قول اور فعل کا مقابلہ کرنے سے ہمیں نہ صرف یہ دکھائی دینے لگتا ہے کہ وہ کیا ہیں۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بظاہر کیا معلوم ہوتے ہیں۔ وہ جس قدر اپنے آپ کو چھپاتے ہیں اتنے ہی زیادہ کاملاً نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسا نقطۂ نظر قائم کرنا کہ جس کے ذریعے ایک شخص اپنے ابنائے جنس کا صحیح اندازہ لگا سکے بہت دشوار کام ہے۔ تاریخ کا ایک خاص نقص یہ ہے کہ اس میں آدمیوں کے اعمال صالح کی نسبت ان کی بداعمالیوں کو زیادہ رنگا جاتا ہے۔ انقلابات اور حادثات ہی تاریخ کو دل چسپ بناتے ہیں۔ جب تک کوئی قوم پرسکون اور پرامن حکومت کی اطمینان بخش فضا میں خاموشی کے ساتھ پھولتی پھلتی رہتی ہے تاریخ ساکت رہتی ہے۔ اور اقوام کا ذکر محض اسی وقت کرتی ہے جب کہ خود مکتفی رہنے کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے اپنے ہمسایوں کے کاروبار میں مداخلت کرنے یا ان کو اپنے کاروبار میں مداخلت کرنے دیتی ہے۔ تاریخ ان قوموں کو شہرۂ آفاق بنا

...... جو ... بہ تنزل ہوتی ہیں۔ ہماری تواریخ کی تمام کتابوں کی ابتدا اس مقام سے ہوتی ہے جہاں انتہا ہونی چاہئے۔ زوال پذیر اقوال کا ہمارے پاس نہایت مفصل اور صحیح احوال موجود ہے لیکن جس کی کمی ہے وہ ان اقوام کی تاریخ ہے جو بڑھ رہی ہیں، وہ اس قدر خوش حال اور اچھی ہیں کہ تاریخ میں ان کے متعلق ہمارے واسطے کچھ بھی مواد نہیں ہے۔ اور واقعی ہم اپنے ہی زمانے میں دیکھ رہے ہیں کہ کامیاب ترین حکمتوں کا اثر ترین حصہ جاہوتا ہے۔ ہم محض برائیوں کا ہی ذکر سنتے ہیں بھلائیاں تو شاید و باید ہی کبھی بیان کی جاتی ہیں محض شریر النفس ہی شہرت پاتے ہیں اور نیکوں کو بھلا دیا جاتا ہے، یا حقارتاً ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے اور اس طرح فلسفہ کے مانند تاریخ بھی بنی نوع آدم کو ہمیشہ ذلیل اور رسوا ہی کرتی رہتی ہے۔

علاوہ ازیں یہ ناگزیر ہے کہ جو واقعات تاریخ میں بیان کئے جاتے ہیں وہ حقیقی واقعات کی صحیح تصویر ہوتے ہوں وہ موزخین کے دماغ میں صورت بدل لیتے ہیں اور ان کی ذاتی دلچسپیاں انھیں ڈھال دیتی ہیں اور تاثرات ان کی رنگ آمیزی کر دیتے ہیں۔ ان کے ناظر کو ٹھیک اسی حالت میں کون پہنچا سکتا ہے، جہاں کہ وہ واقعات کو ان کی اصلی حالت میں دیکھ سکے، جہالت یا طرفداری ہر چیز کو پوشیدہ کر دیتی ہے۔ ایک ہی تاریخی واقعہ کو تبدیل کئے بغیر کسی معاملے کے حالات کو محض گھٹانے یا بڑھا دینے سے کس قدر مختلف اثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہی چیز کئی پہلوؤں یا متعدد نقطہ ہائے نظر سے دیکھی جا سکتی ہے اور وہ بہ مشکل وہی چیز نظر آسکتی ہے، تاہم سوائے دیکھنے والے کی نظر کے اور کسی چیز میں تبدیل نہیں ہوتی ہے کیا جب آپ مجھ سے کوئی حقیقی واقعہ بیان فرماتے ہیں تو حق کی کوئی عزت افزائی فرماتے ہیں۔ لیکن آپ تو اسے بالکل ہی مختلف صورت دیدیتے ہیں؟ کتنی ہی مرتبہ کم و بیش ایک درخت یا کسی چٹان کے دائیں یا بائیں جانب ہونے یا غبار آلود ہوائی جھونکوں نے لڑائیوں کے فیصلے کر دیئے ہیں اور کسی کو اس کا علم بھی نہ ہوا، کیا یہ واقعہ مورخ کو اس بات سے منع کرتا ہے کہ وہ آپ کو فتح اور شکست کا سبب اتنے ہی وثوق سے بتائے کہ گویا مقام واقعہ پر خود موجود تھا، لیکن جب کہ میں واقعات کے اسباب ہی سے لاعلم ہوں تو واقعات

میرے لئے کیا اصلیت رکھتے ہیں، اور بھلا میں کسی ایسے واقع سے جس کی حقیقی وجہ ہی میں نہ جانتا ہوں کیا سبق حاصل کر سکتا ہوں، مؤرخ بے شک مجھے ایک نہ ایک وجہ ضرور بتاتا ہے۔ لیکن وہ اسے ایجاد کرتا ہے اور تنقادی (جس کی کہ ہم اس قدر دھوم دھام سنتے ہیں) محض قیاس کرنے کا ایک فن ہے جس کے ذریعے متعدد دروغ گویوں میں سے ایک جھوٹ جو سچ سے زیادہ ملتا جلتا ہوتا ہے چن لیا جاتا ہے۔

کیا آپ نے کبھی کلوپیٹرا (CLEOPATRA) یا کسانڈرا (CASSANDRA) کا حال پڑھا ہے۔ یا اس قسم کی کوئی اور کتاب ملاحظہ فرمائی ہے؟ مصنف کوئی مشہور واقعہ چن لیتا ہے، اور اسے اپنے مطلب کے مطابق بنا لیتا ہے۔ اور پھر اس واقعہ کو وہ اپنی ایجاد کردہ تصنیفات کسی خیالی تصویر یا ایسے لوگوں سے جن کا کبھی وجود بھی نہ ہوا ہو مزین و مرصع کر لیتا ہے اور اس طرح اپنے قصے کو دلچسپ بنانے کی غرض سے وہ مصنوعی کہانیوں کے انبار لگا دیتا ہے۔ افسانوں اور آپ کی تاریخوں میں مجھے سوائے اس کے کوئی اور فرق نظر نہیں آتا کہ افسانہ نویس زیادہ تر اپنے تصورات سے کام لیتا ہے اور مؤرخ عالمانہ طور پر محض دوسروں کے تصورات کو نقل کر دیتا ہے اور آپ کہیں تو میں یہ بھی تصور کر لیتا ہوں کہ فسانہ نویس برے بھلے مقاصد کا ضرور خیال رکھتا ہے۔ لیکن مؤرخ تو شاید ہی کبھی خیال کرتے ہیں۔

آپ مجھ سے فرمائیں گے کہ آدمیوں اور ان کے اطوار کی ایک صحیح تصور کے مقابلہ میں ... [illegible] ... بہتر کیا۔ انسانی قلب کا صحیح فوٹو اتار دیا جائے تو لگا یہ معاملہ کہ واقعات کی ... یادداشت ترتیب کی بجائے بالکل غیر اہم ہو جاتا ہے، اس لئے کہ آپ بالآخر یہ فرمانے لگتے ہیں کہ دو ہزار سال قبل جو ہو چکا ہے اس سے ہمیں کیا تعلق ہے؟ آپ درست فرماتے ہیں بشرطیکہ تصاویر بلا شبہ صحیح اور حقیقی پیش کر دی گئی ہوں۔ لیکن اگر ماڈل زیادہ تر مؤرخین کے تصور ہی کی نمائش ہو تو آپ کیا اسی مغالطہ کا شکار نہیں ہو رہے ہیں جس سے پہلو تہی کرنے کا آپ مصمم ارادہ کر چکے ہیں اور مؤرخین کے سپرد وہ اختیارات نہیں فرما رہے ہیں جو

آپ اپنے استادوں کو دینے کے تیار نہیں ہیں۔ اگر میرے شاگرد کو محض نفیس نفیس تصویریں یا ہی دیکھنی ہوں گی تو ان تصاویر کو میں خود بناؤں گا۔ وہ کم از کم اس کے لئے زیادہ موزوں اور مناسب تو ہوں گی۔

ایک نوجوان کے لئے بدترین مؤرخین وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ صرف واقعات ہی واقعات بتائیے اور اسے اپنی رائے بذاتِ خود قائم کرنے دیجئے۔ پس بنی نوعِ آدم سے وہ اسی طرح واقف ہو سکتا ہے۔ اگر وہ ہمیشہ مصنف ہی کی رائے پر عمل کرتا ہے گا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ محض دوسرے کی عینک سے دیکھ سکتا ہے۔ اور جب وہ عینک اس کے پاس نہیں ہوتی ہے تو وہ کچھ دیکھ ہی نہیں سکے گا۔ میں جدید تاریخ کو ترک کرتا ہوں۔ نہ صرف اس لئے کہ اس میں کسی شخصیت کا ذکر نہیں ہے اور ہمارے سب لوگ مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلکہ اس لئے اور بھی کہ ہمارے مورخین کلیتًا نتائج میں مستغرق رہنے کی وجہ سے سوائے شوخ تصاویر کے اور کسی بات کا خیال ہی نہیں کرتے ہیں اور یہ تصاویر اکثر کسی کی بھی نمائندگی نہیں کرتی ہیں (۱)۔ قدیم مورخین عمومًا تصاویر کم دیتے ہیں اور اپنے فیصلوں میں زیادہ تر ذکاوت اور معمولی فہم سے کام لیتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بھی انتخاب کرنے کے لئے بڑا وسیع میدان ہے اور آپ کو عاقل ترین سے ابتدا نہ کرنی چاہیئے۔ بلکہ سادہ ترین کا انتخاب فرمانا چاہیئے میں پالیبیس (PALY BIUS) یا سالسٹ (SALLUST) کی تاریخ ایک نوجوان [کو] پڑھنے دوں گا اور ٹیسیٹس (TACITUS) کی تصنیفات صرف سن رسیدہ لوگوں کے لئے [ہیں۔] نوجوان ان کو نہیں سمجھ سکتے۔ انسان کے قلب کی گہرائی معلوم کرنے کی کوشش کے قبل آپ پر [لاز]م ہے کہ انسانی افعال میں لوگوں کے دلوں کی سادہ ترین تصویر دیکھنا سیکھیں۔ اصولوں کا مطالعہ

---

(۱) مثلًا گوی لیارڈینی (GWEE LARDINI) اسٹریڈا (STREDA) میشوائل (MACH) [...] EAVE اور کہیں کہیں خود ڈی تھاد (DE THOU) کو ملاحظہ فرمائیے۔ تقریبًا ویرٹاٹ (VERTAT) [تنہ]ا ایک شخص ہے جو خیالی تشبیہات یا تصاویر کے بغیر تفصیلی بیان دینا جانتا ہے۔

شروع کرنے کے قبل آپ کو لازم ہے کہ آپ واقعات معلوم کرنے کے قابل ہو جائیں۔ اصولوں کی شکل میں فلسفہ کا مطالعہ صرف تجربے کار لوگوں کے لئے ہی موزوں ہے۔ نوجوان کو عام واقعات کی بحث میں کبھی نہ جانا چاہیئے۔ اس کی جملہ تعلیم انفرادی واقعات تک ہی محدود رہنی چاہیئے۔

میرے خیال میں مورخین کا صحیح نمونہ تھیوسیڈیڈیز (THUCYDIDES) ہے۔ وہ بلا اظہار رائے واقعات بیان کر دیتا ہے اور کسی ایسے واقعہ کو حذف نہیں کرتا ہے جو ہمیں خود فیصلہ کرنے کے لائق بنانے کے لئے موزوں نہ ہو۔ وہ جو کچھ بیان کرتا ہے اسے اپنے ناظر کے روبرو پیش کر دیتا ہے۔ اور واقعات اور ناظرین کے مابین حائل ہونے کی بجائے وہ خود پوشیدہ ہو جاتا ہے اور ہم کوئی کتاب پڑھتے ہوئے نہیں بلکہ واقعات کا مشاہدہ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے اس نے سوائے جنگ و جدال کے اور کوئی ذکر ہی نہیں لکھا ہے۔ اور اس کی تاریخ میں ہمیں دنیا کا صرف اقل ترین سبق دینے والا جزو یعنی لڑائیاں ہی لڑائیاں نظر آتی ہیں۔ دس ہزار کی پسپائی کی خوبیاں اور قتل عام اور سیزر (CAISES) کی شرحیں اور تفسیریں تقریباً ایک ہی حیثیت رکھتی ہیں۔ مشہور ابوالعصر اور ہیروڈوٹس (HERODOTS) جو تشبیہات اور اصول کے ذریعے آزادی، روانی، سادگی اور تفصیل بیانی میں اعلیٰ ترین حظ اور دلچسپی پیدا کرنے والا خیال کیا جاتا ہے۔ ایک بہترین موثر ہوتا اگر یہ تفصیلات کہیں کہیں اسے ایسی طفلانہ حماقت میں نہ گرا دیتی جو نوجوان کے ذوق کو بنانے کی بجائے بگاڑنے کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ اس کا مطالعہ کرنے کے قبل ہمیں قوت تمیزی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ میں لیوی (LIVY) کا کوئی ذکر نہیں کرتا اس کی باری بھی آجائے گی۔ لیکن لیوی ایک مدبر شیریں کلام اور فصیح البیان الغرض وہ سب کچھ ہے۔ جو ایک نوجوان کے لئے ناموزوں ہے۔

تاریخ کا علم عام طور پر ناقص ہے کیوں کہ تاریخ میں محض موثر اور صاف و صریح واقعات درج ہوتے ہیں۔ جو نام مقام اور تاریخ کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان واقعات کی دھیمی ارتقائی رفتار جو اس طرح معین طور پر درج نہیں کی جا سکتی ہنوز غیر معلوم ہی رہتی ہے۔ ہم اکثر کسی لڑائی کی ہار جیت میں ایک ایسے انقلاب کی ظاہری وجہ معلوم کرتے ہیں جو قبل وقوع جنگ لاعلاج ہو سکتا ہے

بہت سے بعض ان واقعات کو تو فنکار اکثر اپنے جنون کی توضیح پیش ہی ایسے اخلاقی اسباب سے جو عکسی ہے جو چیزیں دور نظر معلوم کر سکتے ہیں ۔

تصفیانہ ذہنیت نے ہمارے زمانے کے بہت سے مورخین کے خیالات اس جانب پلٹ دیئے ہیں لیکن مجھے شبہ ہے ۔ ان کی حسنت سے ہماری قوت کو کبھی کوئی فائدہ حاصل ہوا ہے یا نہیں ظرافت کے جنون نے سب کو مساویانہ طور پر مغلوب کر رکھا ہے ۔ کوئی شخص چیزوں کو ان کی اصلی حالت میں دیکھنے کا متلاشی نہیں ہوتا ۔ بلکہ محض اسی حد تک دیکھتا ہے جس حد تک کہ وہ اس کے طریقے یا نظام کی موافقت کرتی ہیں ۔

ان سب باتوں کے ساتھ اس واقعہ کا اور اضافہ فرما لیجیے کہ تاریخ ہمیں لوگوں کی نسبت ان کے افعال کا مظاہرہ کراتی ہے ۔ کیوں کہ وہ لوگوں کو بعض منفرد اوقات پر محض پوری پوشاک میں ملبوس دیکھتی ہے ۔ ایک سیاست دان کا وہ محض اسی وقت فوٹو لیتی ہے جبکہ وہ جلوہ نمائی کے لئے تیار ہوتا ہے ۔ تاریخ اس سیاس کے گھر تک نہیں جاتی ہے ۔ نہ اس کے مطالعہ میں ساتھ رہتی ہے ۔ نہ اس کے خاندان اور دوستوں میں جاتی ہے ، وہ اس کو محض سیاست دکھاتی ہے ۔ وہ اس سیاس کی شخصیت کی بجائے اس کے لباس ہی کی تفصیل زیادہ بیان کرتی ہے ۔

میں انسانی قلب کے مطالعہ کی غرض سے انفرادی ہستیوں کی سوانح حیات سے ابتدا کرنے کو ترجیح دوں گا ، اس لئے کہ ان میں آدمی اپنے آپ کو بیکار پوشیدہ رکھتا ہے ۔ مورخ ہر جگہ اس کے ساتھ پہونچتا ہے ، وہ نہ تو اس کے ساتھ ایک پل کی رعایت کرتا ہے اور نہ اس کا کوئی کونہ چھوڑتا ہے کہ جہاں ناظر کی گہری نظر سے وہ نجات حاصل کر سکے اور جب آدمی یہ خیال کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو چھپا رہا ہے ۔ بس اسی وقت مصنف اسے صاف طور پر الم نشرح کر دیتا ہے ۔

مانٹین (MONTAIGNE) کا بیان ہے کہ "جو لوگ سوانح اس طور پر لکھتے ہیں کہ واقعات کی نسبت تخیلات میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور ظاہر کی نسبت باطن پر زیادہ متوجہ رہتے ہیں انہی مصنفین کو میں ترجیح دیتا ہوں ۔ لہذا پلوٹارک (PLUTARCH) ہر لحاظ سے میرا محبوب شخص ہے "

یہ بالکل صحیح ہے کہ لوگوں کی اجتماعی یا قومی ذکاوت و فراست انفرادی آدمی کی خصلت سے بالکل مختلف اور جدا ہوتی ہے اور یہ کہ ہمارا انسانی قلب کا علم بالکل ناقص رہے گا۔ اگر ہم اس کی جانچ جمہور کے اندر نہ کریں۔ مگر واقعہ یہ بھی کچھ کم صحیح نہیں ہے کہ لوگوں کا اندازہ لگانے کے لئے ہمیں افراد کا مطالعہ کرنا لازم ہے اور یہ کہ جو شخص ہر فرد کے میلانات کا کامل علم رکھتا ہے وہ ان میلانات کے جملہ اجتماعی اثرات کی پیش بینی قومی جماعت میں کر سکتا ہے۔

ہمیں اب پھر قدیم مصنفین کی طرف ہی رجوع کرنا ضروری ہے کیوں کہ بوجوہ مندرجہ بالا اور نیز اس وجہ سے بھی کہ جملہ عام اور مروجہ لیکن حقیقی اور مخصوص تفصیلات کو جدید طرز والوں نے جلا وطن کر دیا ہے، عصر جدید کے مصنفین نے لوگوں کو ان کی خانگی زندگی میں بھی اتنے ہی فریب میں ڈال دیا ہے جتنا کہ عام زندگی میں۔ شائستگی جو ادب میں بھی اتنی شدت سے برتی جاتی ہے جتنی معشیت میں ہمیں عوام کے روبرو کوئی ایسی بات کہنے کی اجازت نہیں دیتی جسے ہم اس کے سامنے عملاً نہ کر سکتے ہوں اور کیوں کہ ہم آدمی کو صرف اس کے اداکاری کے لباس میں دکھا سکتے ہیں۔ اس لئے ہم ایک آدمی کو اپنی کتابوں میں اس سے کبھی زیادہ نہیں دیکھ سکتے جتنا کہ ہم اسے تماشہ گاہ (STAGE) پر دیکھتے ہیں۔ بادشاہوں کی سوانح سینکڑوں بار بھی لکھی جائیں تب بھی بے کار ہیں۔ ہمیں اب کوئی دوسرا سوٹونیس (SUETONINS) میسر نہیں آ سکتا۔

پلوٹارک (PLUTARCH) کی خوبی انہی تفصیلات میں پنہاں ہے جنھیں لکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ پلوٹارک ایک انوکھی اور تر الی شان کے ساتھ بڑے آدمیوں کی تصویر معمولی اور ادنیٰ چیزوں میں کھینچتا ہے اور وہ اپنی تماثیل کے انتخاب میں اس قدر خوش نصیب ہے کہ ایک لفظ یا تبسم یا اشارہ ہی اس کے سورما (HERO) کی فطرت ظاہر کرنے کے لئے اکثر کافی ہوتا ہے۔ ہینی بال (HANNI BAL) اپنے خوف زدہ سپاہیوں کو ایک چٹکلے سے ہمت دلاتا ہے اور ہنستا ہوا لڑائی پر لے جاتا ہے جو تمام اٹلی کو اس کے قدموں میں سرنگوں کر دیتی ہے۔ ایجیس لاس (AGESILAUS) ایک لکڑی پر سواری کرتا ہوا مجھے ایک بڑے بادشاہ کے فاتح کا دلدادہ بنا دیتا ہے۔ سیزر (SAESAR)

ایک عزیب تماؤں میں سے گذرتے وقت اپنے دوستوں سے گفتگو کرتا ہوا نا دانستہ اس باغی کا راز فاش کر دیتا ہے جس نے یہ اقرار کیا تھا کہ وہ محض پامپی (POMPEY) کے مساوی ہونے کا خواہاں ہے سکندر اعظم خاموشی کے ساتھ ایک گھونٹ پی جاتا ہے یہ اس کی زندگی کی لاثانی گھڑی ہے۔ ارسٹیڈیز (ARISTIDES) اپنا نام خود سیپ پر لکھتا ہے اور اس طرح اپنے خطاب کا خود کو مستحق ثابت کر دیتا ہے۔ فلوپمین (PHILOPEEMEN) کا لبادہ ایک کنارے رکھا ہوا ہے۔ اور وہ خود اپنے میزبان کے باورچی خانے میں لکڑیاں چیرتا ہے تشبیہات یا تصویر کھینچنے کا یہ حقیقی فن بھی ہے۔ ہماری سیرت ہماری مورت میں نہیں دکھائی دیتی اور نہ ہماری خصلت اعلیٰ کارناموں میں نظر آتی ہے۔ یہ تو معمولی چیزیں ہوتی ہیں جو ہماری اصلیت کو آشکارا کرتی ہیں، عوام میں جو فعل کیا جاتا ہے وہ یا تو بازاری ہوتا ہے یا بالکل مصنوعی اور ہمارے عصر حاضر کے مصنفین اس قدر شان دار ہیں کہ وہ ہمیں اس کے سوا کچھ اور بتاتے ہی نہیں ہیں۔

ایم۔ ڈی۔ ٹورین (M.D.TURENNE) بلاشبہ گذشتہ صدی عظیم ترین انسانوں میں تھا مصنفین نے ایسی تھوڑی سی تفصیل کے ذریعہ جو ہمیں اس سے واقف کراتی اور اس کا گرویدہ بناتی ہے اس کی سوانح عمری کو دل کش بنانے کی جرات کی ہے۔ لیکن نہ معلوم ان مصنفین نے ایسی کتنی اور تفصیلات کو نظر انداز کرتے میں مجبوری محسوس کی ہوگی جو اگر ہم پر ظاہر ہو جاتیں تو ہمیں اور بھی زیادہ اس سے واقف اور اس کا مزید دل دادہ بنا دیتیں، میں یہاں صرف ایک ہی واقعہ نقل کرتا ہوں جو مجھ تک نہایت مستند ذریعہ سے پہونچا ہے اور جسے پلوٹارک کبھی نظر انداز نہ کرتا اور رام سائے ...... (RAMSAI) اس سے واقف بھی ہوتا تو کبھی ظاہر نہ کرتا۔

ایک دن گرمیوں میں وسکاونٹ ٹورین سفید کرتی پہنے اور رات کی ٹوپی لگائے اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا ہوا تھا۔ باورچی خانہ کا ایک ملازم آیا اور وسکانٹ کے اس لباس سے دھوکہ کھا کر اسے باورچی خانہ کا دوسرا ملازم خیال کیا جس سے کہ اس کی بے تکلفی تھی اپس دبے پاؤں پیچھے سے قریب جا کر اچھا خاصہ ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا جس شخص کو یہ تھپڑ مارا گیا تھا وہ فوراً ہی پیچھے مڑا تو ملازم نے دیکھا کہ وہ تو اس کا آقا تھا۔ پس اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ تھر تھر کانپنے لگا اور بدحواس ہو کر

دوزانو گرپڑا، اور عاجزانہ طور پر عرض کرنے لگا "عالی جناب مجھے چارج کا دھوکہ ہوگیا" وسکاونٹ نے متفرہ چہرے کو سہلاتے ہوئے جواب دیا "خیر اگر چارج بھی ہوتا تب بھی تمہیں اتنے زور کا طمانچہ مارنے کی ضرورت نہ تھی" کم بخت سوانح نگارو! بھلا تم میں یہ واقعہ لکھنے کی ہمت کہاں ہے۔ تم تو ہمیشہ انسانیت اور احساس کے فقدان ہی میں رہو، اپنے پتھر جیسے دلوں کو بے ہودہ شائستگی اور تہذیب کے اندر ہی پوشیدہ رکھو اور اپنے تکبر و شرف کے ذریعہ خود کو ذلیل و خوار ہی کرتے رہو۔ لیکن پیارے نوجوانوں جب تم اس واقعہ کو پڑھو اور اس تنگ دلی سے جو گو موقع کے لحاظ سے برتی گئی ہے متاثر ہو تو جب کبھی نام اور خاندان کا سوال آئے اس وقت اس بڑے انسان کی انکساری کو بھی ملحوظ رکھنا۔ یاد رکھو کہ یہی وہ ٹورین ہے جو اپنے بھتیجے کی فوقیت کو ہمیشہ تسلیم کرتا رہا۔ تاکہ سب لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ بچہ ہی شاہی خاندان کا سردار ہے۔ اس تصویر کو دیکھو اور اس کی بنا پر قدرت سے محبت کرو، عوام کے تاثرات سے نفرت کرو اور آدمی کو اس کی اصلی صورت میں دیکھو۔

یہ تمیز کرنے کی قابلیت چند ہی لوگوں میں ہوگی کہ نوجوان کی رہ نمائی اگر ہوشیاری سے کی جائے تو اس قسم کی کتابوں کا نوجوان کے غیر مکدر دل پر کیا اثر ہوگا۔ کم عمری ہی میں بکثرت کتابوں کے بوجھ سے دب جانے اور ان کتابوں کو بلا سوچے سمجھے پڑھنے کا عادی ہو جانے کی وجہ سے ہم جو کچھ پڑھتے ہیں اس کا ہمارے دل پر بہت ہی کم اثر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ذہن انہی جذبات اور تاثرات کو پہلے ہی قبول کر چکتے ہیں جن سے تواریخ اور سوانح بھری پڑی ہیں اور ان کتابوں کا یہ جو کچھ اثر ہوتا ہے وہ فطری ہوتا ہے، اس لئے کہ ہم غیر فطری ہو گئے ہیں اور دوسروں کو اپنے ہی خیال کے تحت جانچتے ہیں لیکن میرے ایمیل کا تصور فرمائیے جس کی اٹھارہ سال کی عمر تک محض اس مقصد کے تحت خبر گیری کی گئی ہے کہ اس کا صحیح فیصلہ اور تندرست دل محفوظ رہے۔ اس کا اس وقت تصور فرمائیے جبکہ پردہ اٹھتا ہے اور اس کی نظر پہلی مرتبہ دنیا کی تماشہ گاہ پر پڑتی ہے۔ یا یہ تصور باندھئے کہ وہ پچھوائی کے پیچھے کھڑا ہو کر اداکاروں کو اپنے لباس بدلتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ اور ان رسیوں اور چرخیوں کو گن رہا ہے جو اپنے مصنوعی مظاہر کے ذریعہ تماشائیوں کی نظروں کو فریب میں ڈالتی رہتی

ایمیل کی پہلی ہی حیرت زدہ نظر اپنے ہم جنس انسان کے متعلق اس کے دل میں فوراً ایک حیا سوز اور پُرحقارت اثر پیدا کردے گی اور وہ تمام نسل انسانی کے خود اپنے آپ کو دھوکے میں ڈالنے اور اس طفلانہ حماقت میں ذلیل ہونے کے نظارے سے افسردہ خاطر ہو جائے گا اور اپنے بھائیوں کو محض ایک خواب وخیال کی خاطر باہم دگر دست وگریبان ہوجاتا اور درندوں کی صورت اس لئے اختیار کرتا ہوا دیکھ کر کہ وہ آدمی رہنے پر قانع نہیں رہ سکتے ہیں۔ ایمیل بہت غمگین اور رنجیدہ ہوگا۔

شاگرد میں فطری میلان پیدا کردینے کے بعد بلا شبہ اگر استاد کتابوں کی پڑھائی کے انتخاب میں کسی قسم کی بردباری اور اختیار تمیزی کو کام میں لائے تو وہ شاگرد کو کتاب کے مضمون کے متعلق گو کتنی ہی کم سوچ و فکر میں ڈالے لیکن یہ مشق ایک عملی فلسفہ کے نصاب کا کام دے گی اور ایک ایسا فلسفہ ہوگا جو ان تمام خالی خولی پیش بندیوں سے زیادہ قابل فہم اور زیادہ کامل طور پر ذہن نشین ہونے والا ہوگا جن سے کہ ہمارے اسکولوں میں بچوں کے دماغ کند اور پراگندہ کردیئے جاتے ہیں پرہس (PYRR HUS) کی پرافسانہ تدابیر کو سمجھنے کے بعد سینیس (CINEAS) نے اس سے یہ دریافت کیا تھا کہ دنیا کی فتح سے اسے کون سا حقیقی فائدہ حاصل ہو سکے گا۔ جب کہ اس قسم کے عظیم مصائب سے دوچار ہوئے بغیر وہ اس فتح کا لطف اٹھا ہی نہیں سکتا۔ ہمارے دل میں تو ایک برجستہ کہاوت کے طور پر یہ ایک وقتیہ دلچسپی ہی پیدا کرتا ہے۔ لیکن ایمیل اس کو ایک بڑا عاقلانہ خیال سمجھے گا جو خود اس کے دل میں بھی پہلے ہی پیدا ہو چکا ہے۔ اور جسے وہ کبھی بھول نہیں سکتا ہے۔ کیوں کہ اس کے دل میں کسی ایسے مخالف تاثر کا وجود ہی نہیں ہے جو اس کے دل نشین ہونے کے مانع ہو سکے۔ جب ایمیل اس دیوانے شخص کی زندگی کا مزید حال پڑھے گا تو اس کو معلوم ہوگا کہ اس کی تمام عظیم الشان تدابیر ایک عورت کے ہاتھوں اس کی موت پر منتج ہوئی تھیں پس اس فوری بہادری کی ستائش کرنے کی بجائے اس جلیل کپتان کی جراءت آزمائیوں اور اس سیاسی ظلم کی تدبیروں میں سوائے اس بدبخت منزل کی طرف زیادہ مسافت طے کر جانے کے جو زندگی اور تدبیروں دونوں کو شرم ناک موت کی دعوت دے رہی تھی ایمیل اور کیا دیکھ سکتا ہے؟

کل فاتح مارے نہیں گئے۔ تمام غاصب اپنی تدبیروں میں ناکام رہے ہیں۔ بازاری تاثرات سے آلودہ ذہنوں کو ان میں بہت سے خوش اور شاد معلوم ہوں گے۔ لیکن وہ شخص جو تہ کو دیکھتا ہے اور لوگوں کی خوش حالی ان کے دلوں کی حالت سے معلوم کرتا ہے وہ ان لوگوں کی بدنصیبی کو ان کی کامیابیوں تک میں دیکھ لیتا ہے۔ وہ انھیں ان کی پیش قدمیوں اور حصول مقاصد کی دائمی ناکامیوں کے بعد ہانپتا ہوا دیکھتا ہے۔ وہ ان لوگوں کو کوہ الپس کے ان ناتجربہ کار مسافروں کے مانند دیکھتا ہے جو ہر بلندی کو جو انھیں نظر آتی ہے آخری خیال کرتے ہیں اور جب اس بلندی کی چوٹی پر پہونچتے ہیں تو انھیں یہ دیکھ کر بے حد مایوسی ہوتی ہے کہ اس کے بعد ابھی اور بلند تر چوٹیاں موجود ہیں۔

اگسٹس (AUGUS HES) اپنے ہم وطنوں کو مطیع اور تمام مخالفین کو فنا کر دینے کے بعد دنیا کی عظیم ترین سلطنت پر چالیس سال حکمراں رہا۔ لیکن یہ تمام وسیع قوت اسے اس وقت دیواروں سے سر پھوڑنے اور اس کے محل کی فضا کو آہ و فغاں سے پُر کرنے سے باز نہ رکھ سکی جب کہ وہ ویرس (WARUS) کے روبرو کھڑا ہو کر چلّا رہا تھا کہ اس کے مقتول شدہ فوجی دستوں کو دوبارہ زندہ کر دیا جائے۔ اگر اس نے اپنے تمام دشمنوں کو پامال کر دیا تھا تو اس کی ان کھوکھلی فتوحات نے اس کو کون سا فائدہ پہونچا دیا حالاں کہ ہر قسم کی مصیبت اس کی راہ میں حائل رہتی تھی۔ اس کی زندگی کو عزیز ترین دوستوں سے خطرہ رہتا تھا۔ اور خود اس کو اپنے تمام عزیز و اقارب کی موت یا ذلت کا ماتم اور سوگ منانا پڑتا تھا۔ بدنصیب آدمی دنیا پر حکومت کرنا چاہتا تھا، حالاں کہ اپنے گھر پر حکومت کرنے میں وہ ناکام رہا۔ اس غفلت کا کیا نتیجہ ہوا؟ یہ کہ اس نے اپنے بھتیجے، اپنے متبنیٰ بچے اور اپنے داماد کو عین عالم شباب میں ہلاک ہوتا ہوا اور اپنے پوتے کو چند ساعت زیادہ زندہ رہنے کی خاطر مجبوراً گدّے کے اندر بھری ہوئی گھاس کھاتے ہوئے دیکھا۔ اس کی بیٹی اور نواسی اس کے کلنک کا ٹیکہ لگانے کے بعد فوت ہوئیں۔ ایک عبرت انگیز برے سے ... سے اور دوسری ایک معمولی تیر انداز کے ہاتھوں جیل میں ماری گئی۔ اگسٹس خود اپنے بدنصیب خاندان کا آخری پسماندہ رہ جانے کی وجہ سے اپنی بیوی ... کرانا ... کرنے پر مجبور ہو گیا۔ دنیا کے مالک کی یہ تقدیر تھی

شان و شوکت جاہ و جلال اور خوش نصیبی کے لئے اس قدر شہرہ آفاق ہے۔ میں یہ باور کرنے کو تیار نہیں کہ کوئی شخص بھی جو اگسٹس کے جاہ و جلال اور اس کی تقدیر کا دل دادہ ہو انہیں اسی قیمت پر قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔

میں نے اپنی مثال کے طور پر ہوس کو لیا ہے۔ لیکن ہر انسانی جذبے کا کھیل ہر اس شخص کو جو متقدمین کی خطاؤں سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو عقل مند اور صالح بنانے کے لئے تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے، اسی کی مماثل سبق دیتا ہے۔ وقت قریب ہے کہ جب جوانی کو اگسٹس کی سوانح حیات کی نسبت انتھونی (ANTHONY) کی سوانح حیات کی تعلیم زیادہ قوت کے ساتھ متاثر کرے گی۔ ایمیل کو شاید ہی یہ پتا ہوگا کہ وہ اپنے جدید مطالعوں کے متعدد اجنبی مناظر میں کس مقام پر ہے لیکن یہ وہ پہلے ہی جان لے گا کہ جذبات کے پیدا ہونے کے قبل ہی ان کی فریب آوری سے کیوں بچا جائے اور یہ دیکھ کر کہ ان جذبات نے ہر زمانے میں لوگوں کو کیوں کر اندھا کر دیا تھا وہ اس سے پہلے ہی خبردار ہو جائے گا کہ اگر وہ اپنے آپ کو ان جذبات کے حوالے کر دے گا تو وہ اس آنکھوں کو بھی کیوں کر اندھا کر دیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سبق ایمیل کے لئے بالکل ناموزوں ہے اور شاید بوقت ضرورت وہ بے موقع اور ناکافی ثابت ہوں۔ لیکن یاد رکھئے کہ اس مطالعہ سے میرا مطلب اسے اس قسم کے سبق دینے کا نہیں ہے۔ ابتدائی طور پر دوسرا مقصد تھا۔ اور بے شک اگر یہ مقصد پورا نہ ہوا تو الزام استاد پر رہے گا:

یاد رکھئے کہ جوں ہی خود غرضی پیدا ہو جاتی ہے نفسانیت دوسروں کے ساتھ ہمارے تعلقات میں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہنے لگتی ہے اور نوجوان اپنے آپ سے مقابلہ کئے اور اپنی نفسانیت کی طرف رجوع ہوئے بغیر دوسروں کو کبھی نہیں دیکھتا ہے۔ جس طریقے پر نوجوانوں کو تاریخ کا مطالعہ کرایا جاتا ہے

غلام تاثرات ہی ہوتے ہیں، جو ہمارے دل کے اندر جذبات کو ہمیشہ ابھارتے رہتے ہیں، جو شخص محض دیکھتا ہے جس کا وجود ہو اور محض اسی چیز کی قدر کرتا ہے جسے وہ جانتا ہے وہ شاید و باید ہی غصہ میں ... فیصلوں کی غلطیاں ہماری خواہشات میں گرمی پیدا کر دیتی ہیں۔

کل فاتح مارے نہیں گئے۔ تمام غاصب اپنی تدبیروں میں ناکام د رہے۔ بازاری تاثرات
آلودہ ذہنوں کو ان میں بہت سے خوش اور شاد معلوم ہوں گے۔ لیکن وہ شخص جو نہ کو دیکھتا ہے
لوگوں کی خوش حالی ان کے دلوں کی حالت سے معلوم کرتا ہے وہ ان لوگوں کی بدنصیبی کو ان کی کامیا
تک میں دیکھ لیتا ہے۔ وہ انھیں ان کی پیش قدمیوں اور حصول مقاصد کی دائمی ناکامیوں کے بعد
ہوا دیکھتا ہے۔ وہ ان لوگوں کو کوہ الپس کے ان ناتجربہ کار مسافروں کے مانند دیکھتا ہے جو ہر بلند
کو جو انھیں نظر آتی ہے آخری خیال کرتے ہیں اور جب اس بلندی کی چوٹی پر پہونچتے ہیں تو انھیں
بے حد مایوسی ہوتی ہے کہ اس کے بعد ابھی اور بلندتر چوٹیاں موجود ہیں۔

اگسٹس (AUGUSHES) اپنے ہم وطنوں کو مطیع اور تمام مخالفین کو فنا کر دینے کے بعد
دنیا کی عظیم ترین سلطنت پر چالیس سال حکمراں رہا۔ لیکن یہ تمام وسیع قوت اسے اس وقت دیوا
سے سر پھوڑنے اور اس کے محل کی فضا کو آہ و فغاں سے پُر کرنے سے باز نہ رکھ سکی جب کہ وہ ویرس (RUS
کے رو برو کھڑا ہو کر چلا رہا تھا کہ اس کے مقتول شدہ فوجی دستوں کو دوبارہ زندہ کر دیا جائے۔ اگر اس
اپنے تمام دشمنوں کو پامال کر دیا تھا تو اس کی ان کھوکھلی فتوحات نے اس کو کون سا فائدہ پہونچا د
حالاں کہ ہر قسم کی مصیبت اس کی راہ میں حائل رہتی تھی۔ اس کی زندگی کو عزیز ترین دوستوں سے خا
رہتا تھا۔ اور خود اس کو اپنے تمام عزیز و اقارب کی موت یا ذلت کا ماتم اور سوگ منانا پڑتا تھا۔ بدنصیب
آدمی دنیا پر حکومت کرنا چاہتا تھا حالاں کہ اپنے گھر پر حکومت کرنے میں وہ ناکام رہا۔ اس غفلت
کیا نتیجہ ہوا؟ یہ کہ اس نے اپنے بھتیجے اپنے متبنیٰ بچے اور اپنے داماد کو عین عالم شباب میں ہلاک ہو
ہوا اور اپنے پوتے کو چند ساعت زیادہ زندہ رہنے کی خاطر مجبوراً گدّے کے اندر بھری ہوئی گھاس
کھاتے ہوئے دیکھا۔ اس کی بیٹی اور نواسی اس کے کلنک کا ٹیکہ لگانے کے بعد فوت ہوئیں۔ ایک
غیر آباد جزیرے میں فوت ہوئی اور دوسری ایک معمولی تیر انداز کے ہاتھوں جیل میں ماری گئی...
اگسٹس خود اپنے بدنصیب خاندان کا آخری پسماندہ رہ جانے کی وجہ سے اپنی بیوی کی بدولت
ایک خوں خوار شخص کو اپنا وارث تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا، دنیا کے مالک کی یہ تقدیر تھی۔ جو ا

شان و شوکت جاہ و جلال اور خوش نصیبی کے لئے اس قدر شہرہ آفاق ہے۔ میں یہ باور کرنے کو تیار نہیں کہ کوئی شخص بھی جو اگسٹس کے جاہ و جلال اور اس کی تقدیر کا دل دادہ ہو انہیں اسی قیمت پر قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔

میں نے اپنی مثال کے طور پر ہوس کو لیا ہے۔ لیکن ہر انسانی جذبے کا کھیل ہر اس شخص کو جو متقدمین کی خطاؤں سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو عقل مند اور صالح بنانے کے لئے تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے، اسی کی مماثل سبق دیتا ہے۔ وقت قریب ہے کہ جب جوانی کو اگسٹس کی سوانح حیات کی نسبت انیھونی (ANTHONY) کی سوانح حیات کی تعلیم زیادہ قوت کے ساتھ متاثر کرے گی۔ ایمیل کو شاید ہی یہ پتا ہو گا کہ وہ اپنے جدید مطالعوں کے متعدد اجنبی مناظر میں کس مقام پر ہے لیکن یہ وہ پہلے ہی جان لے گا کہ جذبات کے پیدا ہونے کے قبل ہی ان کی قریب آوری سے کیوں بچا جائے اور یہ دیکھ کر کہ ان جذبات نے ہر زمانے میں لوگوں کو کیوں کر اندھا کر دیا تھا وہ اس سے پہلے ہی خبردار ہو جائے گا۔ کہ اگر وہ اپنے آپ کو ان جذبات کے حوالے کر دے گا تو وہ اس آنکھوں کو بھی کیوں کر اندھا کر دیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سبق ایمیل کے لئے بالکل ناموزوں ہے اور شاید بوقت ضرورت وہ بے موقع اور ناکافی ثابت ہوں۔ لیکن یاد رکھئے کہ اس مطالعہ سے میرا مطلب اسے اس قسم کے سبق دینے کا نہیں ہے۔ ابتدائی طور پر یہ دوسرا مقصد تھا۔ اور بے شک اگر یہ مقصد پورا نہ ہوا تو لزام استاد پر رہے گا:

یاد رکھئے کہ جوں ہی خود غرضی پیدا ہو جاتی ہے، نفسانیت دوسروں کے ساتھ ہمارے تعلقات میں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہنے لگتی ہے اور نوجوان اپنے آپ سے مقابلہ کئے اور اپنی نفسانیت کی طرف رجوع ہوئے بغیر دوسروں کو کبھی نہیں دیکھتا ہے، جس طریقے پر نوجوانوں کو تاریخ کا مطالعہ کرایا جاتا ہے

لہ یہ کلام تاثرات ہی ہوتے ہیں، جو ہمارے دل کے اندر جذبات کو ہمیشہ ابھارتے رہتے ہیں، جو شخص محض اسی چیز کو دیکھتا ہے جس کا وجود ہو اور محض اسی چیز کی قدر کرتا ہے جسے وہ جانتا ہے وہ شاید و باید ہی غصہ میں آتا ہے۔ ہمارے فیصلوں کی غلطیاں ہماری خواہشات میں گرمی پیدا کر دیتی ہیں۔

ں سے میں دیکھتا ہوں کو جن لوگوں کی صورت وہ دیکھتے ہیں اُسے بڑے نام اختیار کر لیتے ہیں۔ اور
سا دیکھتا ہوں کہ آپ انھیں ایک سیسرو (CICERO) یا ایک ٹروجن (TROJAN)
ایک سکندر بنانا چاہتے ہیں اور جب کبھی وہ پھر اپنے آپے میں آتے ہیں تو آپ ان کی دل شکنی
رماتے ہیں اور ہر ایک کو محض اس کی اصلیت میں ہونے کی وجہ سے آپ افسردہ بنا دیتے ہیں۔ میں
ں سے انکار نہیں کرتا کہ اس طریقۂ کار میں چند فائدے ضرور ہیں لیکن جہاں تک اصل کا تعلق ہے
رسوئے اتفاق سے کسی وقت جب کہ وہ اس قسم کا مقابلہ اور موازنہ کر رہا ہو اس میں اپنی اصلیت
چھوڑ کر کوئی دوسرا شخص بننے کی خواہش پیدا ہو جائے تو وہ خواہش چاہے سقراط بننے کی ہو چاہے
کیٹو (CATO) میں اپنے کام میں قطعاً ناکام رہوں گا، جو شخص اپنے آپ کو ایک اجنبی روپ
بں خیال کرنے لگتا ہے وہ جلد ہی اپنی ہستی کو بالکل فراموش کر دیتا ہے۔

یہ فیلسوف نہیں ہوتے جو لوگوں کے متعلق اکثر و بیشتر معلومات رکھتے ہیں، فیلسوف تو لوگوں کو
محض فلسفیانہ تخیلات کی پیش بین نظر سے دیکھتے ہیں، میں فیلسوفوں سے زیادہ متعصب اور غیر آزاد
کسی اور کو نہیں جانتا ہوں۔ ایک وحشی بھی ہمارے متعلق زیادہ سنجیدگی اور معقولیت کے ساتھ اندازہ
لگا لیتا ہے، فیلسوف اپنے ذاتی عیوب سے واقف ہوتا ہے اور ہماری برائیوں پر ناخوش ہوتا ہے اور
دل ہی دل میں کہتا ہے "ہم سب مساویانہ طور پر برے ہیں" وحشی ہمیں کوئی اثر لئے بغیر دیکھتا ہے
"وتم پاگل اور دیوانے ہو" اس کا کہنا صحیح ہے اس لئے کہ کوئی شخص برائی کی خاطر برائی نہیں کرتا ہے۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

نظم و نسق کی تعلیم

حلقۂ لندن کی اعلیٰ ٹکنولوجیکل تعلیم کی مشاورتی کونسل کے سالانہ جلسہ پر سر رانلڈ ویکس نے جو خطبہ دیا اس میں منجملہ دوسری باتوں کے، انھوں نے نظم و نسق کی تعلیم کا بھی ذکر کیا۔ موصوف نے کہا :-

ایک اور مسئلہ جو تمام حاضرین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا نظم و نسق کی تعلیم ہے۔ پچھلے چند سالوں میں اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ قومی مشاورتی مجلس کو اس ضمن میں تردّد کی ضرورت نہیں۔

ٹکنیکل کالجوں میں جو تربیت ملتی ہے وہ اس مسئلہ کا صرف ایک پہلو ہے، ہر قسم کے نظم و نسق کی تربیت کا اہتمام صنعتوں، یونیورسٹیوں، سرکاری محکموں، رضاکار جماعتوں اور ٹکنیکل کالجوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔ ان گوناگوں کوششوں کے انداز کار اور ان کی اضافی افادیت کا جائزہ لینا مشکل ہے نظم و نسق کے معانی بہت وسیع ہیں۔ اس کی ذیل میں ہر قسم کی نگرانی کا کام (فورمین سے لے کر مینیجنگ ڈائرکٹر تک) آ جائے گا۔ لہٰذا اگر اس اہم کام کے بنیادی اصولوں کے بارے میں اتفاق رائے بھی [illegible]ئے تو بھی ہمیں بہت سی مختلف ضرورتوں کا لحاظ رکھنا ہوگا، قومی مشاورتی مجلس کی رائے یہ تھی [illegible] جودہ سہولتوں کا ایک واضح خاکہ تیار ہو جانا چاہیئے۔ اس کی روشنی میں مختلف نصابوں کی جانچنا اور آئندہ ترقی کی سمت تعین کرنا ممکن ہوگا۔

[illegible] معلوم ہوا ہے کہ برطانوی انسٹی ٹیوٹ برائے نظم و نسق پہلے ہی ایک ایسا نقشہ تیار کرنے میں [illegible] ہے۔ ان حالات میں ہم تجزیہ کا کام ہاتھ میں لینے سے پہلے اس جماعت کی محنت کے نتائج کا

استفادہ کریں گے۔

یہ مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن کے نتائج بہت دوررس ہیں۔ معاشی بقا کی جدوجہد میں نظم ونسق پہلی ضرورت ہے۔ اگر ہم اس کے مختلف طریقوں کا تجزیہ کر کے ان کی قدر وقیمت کا اندازہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہم ایک ایسی چیز معلوم کر لیں گے جو ہماری صنعت کے لئے از بس فائدہ بخش ہوگی۔

مشاورتی مجلس کی کارروائیوں میں صنعت کار اور ماہرین تعلیم مل کر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کا تعلق صنعت کی تعلیمی ضرورتوں سے ہے۔ ممکن ہے یہ دونوں گروہ آپس میں اتفاق نہ کر سکیں، لیکن اس طرح ہر فریق ایک دوسرے کے انداز کار سے باخبر رہتا ہے، یہ امر حیرت کا موجب ہے کہ صنعت کار لوگوں کی کتنی بڑی تعداد نے مشاورتی مجلس کی وساطت سے نظام تعلیم کے متعلق واقفیت حاصل کی اسی طرح ان ماہرین تعلیم کی تعداد بھی کم حیران کن نہیں، جن کو اسی ذریعہ سے صنعتوں کے متعلق واقفیت ہوئی۔

اچھے انسانی تعلقات

ٹیچرز کالج کولمبیا یونی ورسٹی کے ڈاکٹر ٹی۔سی۔آلی نے اپنے ایک حالیہ خطبے میں اچھے نکات بیان کئے جو استاد اور طالب علموں کے درمیان اچھے انسانی تعلقات پیدا کرنے میں اہمیت رکھتے ہیں:

(۱) استاد کی نگاہ میں طالب علم محض اعداد نہ ہونے چاہئیں بلکہ انسان۔ ہر بچہ مدرسے میں اسی قدر دل چسپی لے گا جس قدر توجہ اسے خود استاد کی طرف سے ملے گی۔

(۲) پیش قدمی کی رسی کو جچے تلے انداز میں استعمال کیا جائے اس کا یہ مطلب ہے کہ نفس مضمون کو طالب علم کے سامنے ایسے رنگ میں پیش کیا جائے جو اس کی استعداد کے حسب حال ہو۔

(۳) طالب علم کے لئے اپنے ظاہری بھرم کا قائم رہنا اشد ضروری ہے۔ یہ چیز کوئی غیر ضروری پندار نہیں۔ طالب علموں کی مشکلوں کا حل ذاتی سطح پر ہونا چاہئے، یہ مشکلیں دوسروں کے لئے کسی صورت میں ہنسی کا سامان نہ بننی چاہئیں۔

(۴) یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ دبے ہوئے جذبات خواہ وہ طالب علم کے ہوں یا استاد کے

اکثر حالتوں میں حرکت انگیز ہوتے ہیں ۔

(۵) اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کمرۂ جماعت میں کام کی بات سکھانے کے لئے کچھ نہ کچھ وقت ضرور نکالا جائے۔ ایسی بات جو طالب علم کے لئے ذاتی طور پر معنی رکھتی ہو۔

(۶) والدین کو تعلیم کے عمل میں شریک سمجھا جائے، انھیں خوامخواہ مخالف نہ خیال کیا جائے ۔

نئے نگران کے لئے مفید اشارے

ریاست نیویارک کے ایک تجربہ کار سپرنٹنڈنٹ آف سکولز مسٹر ڈانلڈ ڈبلیو۔ ڈنن کا ایک مضمون مندرجہ بالا موضوع پر مارچ ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے نئے مقرر ہونے والے نگران کو مندرجہ ذیل مشورے دیئے ہیں ۔

(۱) نوجوانوں پر صحت مند اثر ڈالنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کے اپنے مقاصد بلند اور کردار پاکیزہ ہو ۔

(۲) دوسروں کو راستہ دکھانے سے پہلے انسان کو پہلے اپنے آپ پر قابو رکھنا سیکھنا چاہیئے ۔

(۳) رہ نمائی کے اوصاف پیدا کرنے کے لئے انسان کو اپنے اندر علم۔ تفاہمت، حق پسندی اعتماد، اور استحسان کی خوبیاں پیدا کرنی چاہئیں ۔

(۴) بچوں اور نوجوانوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ رہ نما اپنے سارے ماتحتوں میں اس طرح بھروسہ اور جذبہ پھونک سکے کہ وہ اپنی بہترین کوشش مشترکہ کام کی نذر کرنے پر تیار ہو جائیں ۔

(۵) ایک مضبوط تعلیمی نظام قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قابل ترین لوگوں کی خدمات حاصل کرنے کے معاملے میں ذاتی پسند یا عدم پسندیدگی انتخاب کو کسی طرح متاثر نہ کرنے پائے ۔

تعلیمی آرڈی ننس

ملایا کی فیڈریشن نے ایک تعلیمی آرڈی ننس منظور کیا ہے جس کی رو سے چھ سے بارہ سال تک کی

عمر کے تمام بچوں کو مدرسوں میں بھیجنا مقصود ہے آرڈی ننس کی رو سے ماں باپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس عمر کے بچوں کو مدرسے میں بھیج کر تعلیم دلائیں. تعلیم انگریزی اور ملایا زبان میں ہو گی۔

آرڈی ننس کی منشا یہ ہے کہ سب نسلوں کے بچوں کو قومی مدرسوں میں ایک ساتھ تعلیم دے کر ایک متحدہ قومی نگاہ پیدا کی جائے، یہ مدرسے چھے سالہ مفت تعلیمی نصاب پیش کریں گے۔ نصاب دو قسم کا ہوگا۔

(ا) وہ نصاب جس میں ملایا زبان ذریعۂ تعلیم ہو گی لیکن سارے نصاب میں اول سے آخر تک انگریزی زبان بھی پڑھائی جائے گی۔

(ب) وہ نصاب جس میں انگریزی زبان ذریعۂ تعلیم ہو گی لیکن تیسرے سال کے آغاز سے ملایا زبان کی پڑھائی بھی شروع کر دی جائے گی۔

اس کے علاوہ (ا) اور (ب) مزید دو قسم کے مدرسے ایسے بچوں کو کوبو اور تامل زبان کی تعلیم دیں گے جن کے والدین اس بات کا مطالبہ کریں بشرطیکہ ایسے بچوں کی تعداد کم از کم پندرہ کو پہو نچتی ہو۔ بالعموم بچوں کو ایسے مدرسوں میں داخل ہونا ہو گا جو ان کے گھروں سے قریب ہوں ایسی خاص حالتوں میں جہاں مذہبی وجوہ موجود ہوں اس شرط کی پابندی ضروری نہ ہو گی

آرڈی ننس سرکاری اور منظور شدہ مدرسوں میں مذہبی تعلیم کے لئے بھی اہتمام کرتا ہے، مذہبی تعلیم کے بارے میں عام اصول یہ قائم کیا گیا ہے کہ طالب علم کو اسی مذہب کے متعلق تعلیم دی جائے جو مذہب اس کے والدین کا ہے، خواہ یہ تعلیم اس مدرسے میں دی جائے جہاں طالب علموں کی تعداد اسے ممکن بنائے یا کسی اور جگہ۔ اگرچہ غیر سرکاری منظور شدہ مدرسے اس بات پر مجبور نہیں کہ ایک سے زیادہ مذہبوں کی تعلیم کا بندوبست کریں۔ تاہم وہ کسی طالب علم کو ایسی مذہبی تعلیم یا عبادت میں حصہ لینے پر مجبور نہیں کر سکتے جس کو اس کے والدین پسند نہ کریں۔ کوئی بچہ اس وقت تک غیر مذہب کی تعلیم یا عبادت میں شامل ہونے کا مجاز نہیں جب تک اس کے والدین اس امر کی تحریری درخواست نہ کریں۔ اگر والدین اس امر کی درخواست کریں کہ ان کے بچے کو کلی طور پر مذہبی تعلیم

مستثنیٰ قرار دے دیا جائے، تو مدرسہ ایسا کر دے گا۔ ایسے بچوں کو ملایا۔ کو یو اور تامل زبان کے ذریعے اخلاقی تعلیم دینے کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان بچوں کی تعداد کافی ہو۔ مذہبی تعلیم کی نگرانی کے لئے خاص انتظام کیا گیا ہے۔

ایک اور آرڈی ننس کے ذریعے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے ایک فنڈ قائم کیا گیا ہے یہ رقم استادوں کی تربیت۔ مدرسوں کی تعمیر ان کے ساز و سامان اور دوسری تعلیمی ضرورتوں پر صرف ہوگی ایک اور آرڈی ننس کے ذریعے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کاروباری لوگوں سے ہر سال جو رقوم لطور لائسنس وصول ہوتی ہیں۔ وہ تعلیمی فنڈ میں جمع ہوں گی۔

سوڈان میں تعلیم نسواں کی رفتار

۱۹۵۱-۵۲ء کے سرما میں سوڈان میں لڑکیوں کی انجمن اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ ناپسندیدہ روایات کے خلاف جنگ کی جائے اور تعلیم نسواں کو ترقی دی جائے۔ ستمبر ۱۹۵۲ء میں انجمن نے ایک مجلس مباحثہ قائم کی جس میں تین سو سے زائد سوڈانی لڑکیوں نے حصہ لیا۔ اس اجلاس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ سوڈانی عورتوں کے لئے اور ایسی جماعتیں کھولی جائیں جو انھیں لکھنا پڑھنا سکھائیں اور ثقافتی میل ملاپ کے مواقع پیدا کریں۔

اگست ۱۹۵۲ء میں لڑکیوں کے لئے سات نئے مدرسے کھولے گئے۔ لیکن لڑکیوں کی تعلیم کی مانگ بدستور بڑھتی جا رہی ہے اور بہت سی ہونہار لڑکیوں کو صرف اس لئے داخل نہیں کیا جاتا کہ مدرسوں میں گنجائش نہیں۔ استادوں کے لئے جن متعدد تجدیدی نصابوں کا اہتمام کیا گیا ان میں سے صدر معلمات کی ایک چار روزہ کانفرنس بھی تھی جس میں صوبہ نیل ازرق کی اڑتیس کی اڑتیس صدر معلمات نے شرکت کی۔

سرکاری جریدے کے اعلانات

شعبۂ مدارس ــــــــــ صیغۂ رجال

ای/۱۴/۸۴ ۳۳۷۷ سید اصغر علی گریڈ بی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (-/۱۳۰ روپے ماہوار مقررہ) قائم مقام معلم انگریزی
۱۷ ؍نومبر ۱۹۵۳ء گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ کو (جن کے تبادلہ کے احکام برائے گورنمنٹ ہائی اسکول جاری
ہو چکے تھے) تاریخ حاضری سے م۔ غلام رسول کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول
علی پور میں بطور قائم مقام معلم سائنس ہو چکا ہے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ میں قائم مقام
معلم انگریزی مقرر کیا جاتا ہے۔

" م۔ فیض الحسن نقوی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بنا رنجور
(آزمائشی) کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد سرور کی جگہ جو گورنمنٹ ہائی اسکول گجرانوالہ میں تبدیل
ہو چکے ہیں۔ اپنی تنخواہ پر بطور معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ (آزمائشی) مقرر کیا جاتا ہے۔

" م۔ محمد انور۔ ایف۔ اے۔ سی۔ ٹی۔ ایک امیدوار کو م۔ فیض الحسن نقوی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
۸۰ روپے ماہوار (مقررہ) پر تاریخ حاضری سے عارضی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول
رنیالہ خورد مقرر کیا جاتا ہے۔

ای/۱۴/۸۶ ۳۳۷۷ م۔ محمد علی پیرزادہ ایف۔ ایس سی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایک امیدوار (جن کے تقرری کے احکام بطور
۱۷ ؍نومبر ۱۹۵۳ء قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول علی پور جاری ہو چکے تھے) ایک موجودہ آسامی پر
بطور ایک زائد مدرس تاریخ حاضری سے ۱۳۰ ــ ۲۵۰ کے گریڈ میں ۱۳۰ روپے ماہوار پر
قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ مقرر کیا گیا۔

" م۔ غلام رسول ایف۔ ایس سی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول

منظفر گڑھ کو اپنی تنخواہ پر تاریخ حاضری سے م محمد علی پیر کی جگہ اور اس آسامی پر جو مس محمد عبداللہ شاہ کے گورنمنٹ ہائی اسکول بھالیہ میں تبدیل ہو جانے پر پیدا ہوئی تھی بطور قائم مقام معلم سائنس گورنمنٹ ہائی اسکول علی پور میں تبدیل کیا گیا۔

ی/۳۲۷۸۷ س۔ علی حیدر شاہ۔ میٹرک۔ ایس وی (۶۰ — ۱۲۰) قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول
۱۰ ر نومبر ۱۹۵۳ء چکوال کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد نواز کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول رینالہ خورد میں ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پر قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ مقرر کیا گیا۔

〃 حافظ محمد لطیف منشی فاضل۔ ادیب فاضل۔ او۔ ٹی۔ ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے۔ س علی حیدر شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ۶۰ — ۱۲۰ کے گریڈ میں ۶۰ روپے ماہوار پر قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال مقرر کیا جاتا ہے۔

ی/۳۲۷۹۱ م۔ عبدالحفیظ ایس۔ وی (۶۰ — ۱۲۰) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول قصور کو تاریخ حاضری سے
ار نومبر ۱۹۵۳ء م۔ محمد شفیع کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ میں معلم اردو مقرر کیا جاتا ہے۔

〃 م۔ غلام حسین ایف۔ اے منشی فاضل۔ ایس۔ وی۔ ایک امیدوار کو م۔ عبدالحفیظ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اور ایک موجودہ آسامی پر تاریخ حاضری سے ۶۰ — ۱۲۰ کے گریڈ میں ۶۰ روپے ماہوار پر قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول قصور مقرر کیا جاتا ہے۔

ی/۳۲۷۹۳ مسٹر اے۔ ایف جوزف۔ میٹرک۔ ڈی۔ ایم۔ ایس معلم دستکاری گورنمنٹ ہائی اسکول میاں نوالی کو
ار نومبر ۵۳ء تاریخ حاضری سے م۔ محمد عبدالجامع کی جگہ جن کی خدمات ختم کر دی گئی ہیں۔ اپنی تنخواہ پر گورنمنٹ گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ میں معلم دست کاری مقرر کیا جاتا ہے۔

۳۲۷۸۱ میر قمرالدین بی اے (آنرز) بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی گجرات کو تاریخ
۔۔مبر ۵۳ء حاضری سے م۔ شوکت علی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی اٹک مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ شوکت علی۔ ایس۔ اے۔ وی (۱۳۰ — ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی اٹک کو تاریخ حاضری سے

مقرر کیا گیا۔

ای/۳۲۸۱۳ خان ریاض لیاقت۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول
۱۷ نومبر ۵۳ء مری کو تاریخ حاضری سے م۔ عبد المجید خاں کی جگہ جن کی تقرری بطور اے۔ ڈی۔ آئی شیخوپورہ
ہو چکی ہے اپنی تنخواہ پر معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول باغبانپورہ لاہور مقرر کیا گیا۔

ای/۳۲۸۳۱ مس اختر احسن۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹرس مدارس لاہور (پی۔ ای۔ ایس
۱۷ نومبر ۵۳ء درجہ دوم آزمائشی) ۱۳ اکتوبر ۵۳ء بعد دوپہر سے حکومت پنجاب کی ایک منظور کردہ آسامی پر
اپنی تنخواہ پر اور ایک سو روپیہ ماہوار زائد الاؤنس پر انچارج وظائف پنجاب مقرر کیا گیا۔

ای/۱۰۱۶۸ م۔ محمد حسین۔ ایس۔ وی منشی فاضل معلم زراعت (۶۰ ـــ ۱۲۰) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول
۱۳ نومبر ۵۳ء پنڈی بھٹیاں کو تاریخ حاضری سے م۔ عبد الرحمان کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ گورنمنٹ پرائمری اسکول
چوبرجی لاہور میں معلم اردو مقرر کیا گیا۔

" م۔ عبد الرحمان ایس۔ وی (۶۰ ـــ ۱۲۰) معلم اردو گورنمنٹ پرائمری اسکول چوبرجی لاہور کو
تاریخ حاضری سے م۔ محمد حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول
پنڈی بھٹیاں مقرر کیا گیا۔

ای/۳۲۲۴۷ م۔ غلام سرور بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں۔
(آزمائشی) کو تاریخ حاضری سے م۔ عبد الباری بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کی جگہ جو مستعفی ہو چکے ہیں اپنی
تنخواہ پر معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال (آزمائشی) مقرر کیا گیا۔

ای/۳۲۲۴۶ پیرزادہ عبد العلی مولوی فاضل۔ او۔ ٹی۔ ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ اقبال حسین کی جگہ جو
۱۲ نومبر ۵۳ء سبکدوش ہو چکے ہیں ۶۰ ـــ ۱۲۰ کے گریڈ میں۔ ۶۰ روپے ماہوار پر قائم مقام معلم ع۔ ی
گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور مقرر کیا گیا۔

ای/۳۲۲۴۸ میر محمد محسن۔ بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی۔ رجسٹرار محکمانہ امتحانات پنجاب کو ۱۶ جنوری ۵۳ء قبل
۱۱ نومبر ۵۳ء دوپہر سے مسٹر سعادت علی خاں کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں۔ پی۔ ای۔ ایس درجہ اول (برائے رجال)

۳۵۰ — ۴۰ — ۵۰۰؍ ۴۰ — ۹۵۰ / ۵۰ — ۱۲۰۰ (عارضی) سے پی۔ ای۔ ایس درجۂ اول
(صیغہ رجال) ۳۵۰ — ۴۰ — ۵۰۰؍ ۴۰ — ۹۵۰ / ۵۰ — ۱۲۰۰ (مستقل) میں ترقی دی گئی۔

" ق۔ محمد نجیب اللہ۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس (درجہ دوم) ڈپٹی انسپکٹر مدارس قسمت ملتان کو
۱۷ اکتوبر ۵۳ء سے مسٹر غلام نبی بٹ کی جگہ جو اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک سے باہر گئے ہیں۔ اپنی تنخواہ پر
صدر معلم گورنمنٹ نارمل لالہ موسیٰ مقرر کیا گیا۔

ای/۳۲۱۸۱ م۔ عبدالحمید ایم۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) نائب انسپکٹر برائے سائنس راولپنڈی
۱۰ نومبر ۵۳ء (آزمائشی) کو تاریخ حاضری سے ایک موجودہ آسامی پر منتخب گریڈ ۲۵۰ — ۱۵ — ۵۵۰ (آزمائشی)
سے پیچھے ہٹا کر عام گریڈ ۱۳۰ — ۲۵۰ (مستقل) میں منتقل کیا گیا۔

ای/۳۱۹۶۲ م۔ عبدالغنی ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول گجرانوالہ کو تاریخ حاضری سے
۹ نومبر ۵۳ء م۔ احمد شاہ کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول رانگلہ
مقرر کیا گیا۔

" م۔ بشیر خاں میٹرک۔ ایس۔ وی۔ ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالغنی کی جگہ جن کا تبادلہ
ہو چکا ہے اور ایک موجودہ آسامی پر ۶۰ — ۱۴۰ کے عام گریڈ میں ۶۰ روپے ماہوار پر قائم مقام معلم
گورنمنٹ ہائی اسکول گجرانوالہ مقرر کیا گیا۔

ای/۱۶۴۵۲ م۔ عبدالحکیم۔ بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (۱۳۰ — ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول فتح جنگ کو
۳۱ اکتوبر ۵۳ء تاریخ حاضری سے م۔ عبدالرحیم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول
جہلم مقرر کیا گیا۔

ای/۱۶۴۶۳ م۔ بشیر گل۔ ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول فتح جنگ (رخصتی) کو تاریخ
۳۱ اکتوبر ۵۳ء حاضری سے مس منظور حیدر (رخصتی) کی جگہ جن کا تبادلہ کر دیا گیا ہے اپنی تنخواہ پر معلم اردو (رخصتی)
گورنمنٹ ہائی اسکول مری مقرر کیا گیا۔

" م۔ منظور حیدر ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول مری (رخصتی) کو تاریخ حاضری سے

میر قمر الدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اے۔ڈی۔آئی گجرات مقرر کیا گیا۔

ای/۳۲۸۱۴ خان ریاض لیاقت۔بی۔اے۔بی۔ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول
۱۷ نومبر ۵۳ء مری کو تاریخ حاضری سے م۔عبدالمجید خاں کی جگہ جن کی تقرری بطور اے۔ڈی۔آئی شیخوپورہ
ہو چکی ہے اپنی تنخواہ پر معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول باغبانپورہ لاہور مقرر کیا گیا۔

ای/۳۲۸۳۱ مس۔اختر احسن۔ایم۔اے۔بی۔ٹی۔پی۔ای۔ایس۔ڈسٹرکٹ انسپکٹرس مدارس لاہور (پی۔ای۔ایس
۱۷ نومبر ۵۳ء درجہ دوم آزمائشی) ۳۱ اکتوبر ۵۳ء بعد دوپہر سے حکومت پنجاب کی ایک منظور کردہ آسامی پر
اپنی تنخواہ پر اور ایک سو روپیہ ماہوار زائد الاؤنس پر انچارج وظائف پنجاب مقرر کیا گیا۔

ای/۱۰۱۷۸ م۔محمد حسین۔ایس۔وی منشی فاضل معلم زراعت (۶۰ — ۱۲۰) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول
۱۳ نومبر ۵۳ء پنڈی بھٹیاں کو تاریخ حاضری سے م۔عبدالرحمان کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔گورنمنٹ پرائمری اسکول
چوبرجی لاہور میں معلم اردو مقرر کیا گیا۔

" م۔عبدالرحمان ایس۔وی (۶۰ — ۱۲۰) معلم اردو گورنمنٹ پرائمری اسکول چوبرجی لاہور
تاریخ حاضری سے م۔محمد حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول
پنڈی بھٹیاں مقرر کیا گیا۔

ای/۳۲۲۳۷ م۔غلام سرور بی اے۔بی۔ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں۔
(آزمائشی) کو تاریخ حاضری سے م۔عبدالباری بی۔اے۔بی ٹی کی جگہ جو مستعفی ہو چکے ہیں اپنی
تنخواہ پر معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال (آزمائشی) مقرر کیا گیا۔

ای/۳۲۲۲۶ پیرزادہ عبدالعلی مولوی فاضل۔او۔ٹی۔ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔اقبال حسین کی جگہ
۱۲ نومبر ۵۳ء سبکدوش ہو چکے ہیں ۶۰ — ۱۴۰ اگلے گریڈ میں۔ ۶۰ روپے ماہوار پر قائم مقام معلم ع۔ی
گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور مقرر کیا گیا۔

ای/۳۲۲۳۸ میر محمد محسن۔بی۔ایس سی۔بی۔ٹی۔رجسٹرار محکمانہ امتحانات پنجاب کو ۱۶ جنوری ۵۳ء قبل
۱۱ نومبر ۵۳ء دوپہر سے مسٹر سعادت علی خاں کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں۔پی۔ای۔ایس درجہ اول

(۳۵۰ — ۲۰ — ۵۰۰، ۲۰/ ۹۵۰ — ۵۰/ — ۱۲۰۰ (عارضی) سے پی۔ ای۔ ایس درجہ اول
(صیغہ رجال)۔ ۳۵۰ — ۲۰ — ۵۰۰، ۲۰/ ۹۵۰ — ۵۰/ — ۱۲۰۰ (مستقل) میں ترقی دی گئی۔

" ق۔ محمد نجیب اللہ۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس (درجہ دوم) ڈپٹی انسپکٹر مدارس قسمت ملتان کو ۱۷ اکتوبر ۵۳ء سے مسٹر غلام نبی بٹ کی جگہ جو اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک سے باہر گئے ہیں۔ اپنی تنخواہ پر صدر معلم گورنمنٹ نارمل لالہ موسیٰ مقرر کیا گیا۔

ی/۲۲۱۸۱ م۔ عبدالحمید ایم۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) نائب انسپکٹر برائے سائنس راول پنڈی
انومبر ۵۳ء (آزمائشی) کو تاریخ حاضری سے ایک موجودہ آسامی پر منتخب گریڈ ۲۵۰ — ۱۵ — ۳۵۵ (آزمائشی) سے پیچھے ہٹا کر عام گریڈ ۱۳۰ — ۲۵۰ (مستقل) میں منتقل کیا گیا۔

ی/۳۱۹۶۲ م۔ عبدالغنی ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول گجرانوالہ کو تاریخ حاضری سے
نومبر ۵۳ء م۔ احمد شاہ کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ مقرر کیا گیا۔

" م۔ شبیر خاں میٹرک۔ ایس۔ وی۔ ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالغنی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اور ایک موجودہ آسامی پر ۶۰ — ۱۴۰ کے عام گریڈ میں ۶۰ روپے ماہوار پر قائم مقام معلم گورنمنٹ ہائی اسکول گجرانوالہ مقرر کیا گیا۔

ا/۱۶۴۵۲ م۔ عبدالحکیم۔ بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (۱۳۰ — ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول فتح جنگ کو
ا اکتوبر ۵۳ء تاریخ حاضری سے م۔ عبدالرحیم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم مقرر کیا گیا۔

ا/۱۶۴۶۳ م۔ شیر گل۔ ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول فتح جنگ (رخصتی) کو تاریخ
اکتوبر ۵۳ء حاضری سے س۔ منظور حیدر (رخصتی) کی جگہ جن کا تبادلہ کر دیا گیا ہے اپنی تنخواہ پر معلم اردو (رخصتی) گورنمنٹ ہائی اسکول مری مقرر کیا گیا۔

" م۔ منظور حیدر ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول مری (رخصتی) کو تاریخ حاضری سے

م۔ قیصر محل (رخصتی) کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر معلم اردو (آزمائشی) گورنمنٹ ہائی
اسکول فتح جنگ (رخصتی) مقرر کیا گیا۔

ای/۱۷۴۵۸ — ۳۱ اکتوبر ۵۳ء
م۔ محمد عبد اللہ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول
کیمبل پور کو تاریخ حاضری سے م۔ نذیر احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر معلم
انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول میاں والی مقرر کیا گیا۔

〃
م۔ نذیر احمد بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول میاں والی
(آزمائشی) کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد عبد اللہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ
معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور (آزمائشی) مقرر کیا گیا۔

شعبہ مدارس ـــــــــ صیغہ نساء

ای/۳۲۴۸۴ — ۱۳ نومبر ۵۳ء
مسز م بشوکت بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ اسکول کھاریاں کو
بطور قائم مقام صدر معلمہ کام کر رہی تھیں خود اپنی آسامی پر اس تاریخ سے جب مس خورشید با
بطور صدر معلمہ اپنا کام سنبھالیں۔ اپنی سابقہ تنخواہ پر نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ اسکول کھاریاں
کیا گیا ہے۔

ای/۳۲۲۳۳ — ۱۱ نومبر ۵۳ء
مسز ڈی بلال۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ اسکول لیہ کی خدمات
۴ جنوری ۱۹۵۱ء قبل دوپہر سے ختم کر دیا گیا ہے، وہ دانستہ طور پر لمبے عرصے تک غیر حاضر رہی ہیں

ای/۳۲۲۸۲ — ۱۱ نومبر ۵۳ء
مسز ایم نیازی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ — ۳۵۵) ڈسٹرکٹ انسپکٹرس مدارس سرگودھا کو مس ایچ اکرم
جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر ڈسٹرکٹ انسپکٹرس مدارس میاں والی مقرر کیا گیا

〃
مس۔ ایچ اکرم۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) ڈسٹرکٹ انسپکٹرس مدارس میاں والی کو مسز ا
کی جگہ جو رخصت پر ہیں تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر صدر معلمہ (قائم مقام) گورنمنٹ ز
ہائی اور نارمل اسکول میاں والی مقرر کیا گیا۔